

پیشکش کا اپنا مقام نامہ

فروری 2016

شعاع
پاک

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خلفہ کی کتابت گاہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

نائب مدیر اعلیٰ — رخصتہ جمیل

مدیر منظم — اذریاض

مدیر قاری — امست المصور

مدیر فن — شہان رشتیل

مدیر ادارت — خجالد جیلانی

رکن آل پاکستان سوز و گداز سوسائٹی
رکن کونسل آل پاکستان نوجوان سوسائٹی

MEMBER
APNS
CPNE



READING
Section



10 رضیہ جمیل

پہلی شمع

11 ریاض حسین قمر

حمید

11 فردا حسین عطرال

نعت

12 ادارہ

نئی کی باتیں

152 سیاہ حاشیہ صائمہ اکرم

68 ہماری کہانی سمیرا حمید

238 وہ اک نظر نگہت عبداللہ



282 شاہین رشید

دستک

17 مسرر از احمد

بندھن

23 دقا لہور

جب تجھ سے تانا

52 حنا یاسمین

تصیروں کے فیصلے

63 ترة العین رائے

وہ جو چلے

190 ندا حسنین

آخری چال

138 ثمنہ فرحان

سکون قلب

95 آئینہ ملک

ہزاروں خوابیں



34 رخسانہ نگار عثمان

ایک تھی مثال

263 فیض احمد فیض

ظلم

264 اختر شہباز

غزل

264 عابد معروف

غزل



100 آسیہ رزاقی

تم میری ہو

198 مصباح اعوان

ستارہ زلیست

زیر سالانہ بیک کیلئے رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شمع 31 بجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، سلسلہ کو کسی بھی اعداد سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی کی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



مستقل سلسلے

280	امت الصبور	271	تاریخ کے جھروکے	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	265	موسم کے کواں	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	286	خوبصورت بننے	واصفہ سہیل	ایتنی خالے ہیں
		268		شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
		267		خالہ جیلانی	کھٹا کسی پیہ
		28		امتنہ زرین	سیر و جہاں

فروری 2016

جلد 30، نمبر 6
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلورین حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰/۱۲ پی ایچ ای، ایچ ایس ای، سوگامی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

READING
Section



شعاع فروری کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
وقت کی رفتار تیز ہوئی ہے تو تبدیلی کا عمل بھی تیز ہو گیا ہے۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ سوچ، فکر،
عمل، رشتے، اقدار ہر چیز تیزی سے بدل رہی ہے۔ تفسیر ہی راز حیات ہے۔ صنعتی زندگی، عالمی دہشت گردی،
خوف، انتشار اور پریشانی نے سوچ و فکر پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ تیز تر تبدیلی کے اس عمل میں انسان
پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی پہچان کم ہو گئی ہے۔ اس کی فطرت میں جو عنصر شامل کیے گئے ہیں ان سے انحراف نے
اسے کون قلب سے محروم کر دیا ہے۔

انسان نے ازل سے ہی اس کائنات کو سنوارنے کے، آنے والے زمانوں کو بہتر بنانے کے، تیرگی کو روشنی
میں بدلنے کے اس محدود زندگی کو لامحدود بنانے کے خواب دیکھے ہیں اودان کی تعبیر پلنے کی کوششوں نے ہی
زندگی کو ترقی کی بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے۔

عہد حاضر کی برقی رفتار زندگی اور ہر لمحہ تیزی سے بدلتی دنیا میں وہ خواب دھندلا گئے ہیں۔ اس ہما ہی
میں انسان اپنی نظرت اپنے اصل سے پھر کر زندگی کی سچائیوں کی پہچان کھو بیٹھا ہے۔
جو کچھ ہمیں دکھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے۔ ہمیں نظر آتا ہے، وہ پورا سچ نہیں ہے۔ حقیقت اس سے دود
کہیں پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ حقیقت کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس نظر کی ضرورت ہے جو ہر تعصب
سے پاک ہو۔ تہذیبی لسانی اختلافات، مذہب، مسلک ہر تفریق سے بالاتر ہو۔ غلط اور صحیح کی پہچان رکھی ہو۔
اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے نکال کر وسعتوں سے ہم کنار کیجیے۔ ایک اچھا انسان بہت قیمتی ہوتا ہے۔
خواہ وہ اپنا ہو یا پرانا۔ وہ جہاں بھی رہے۔ اس کے وجود کی خوشبو اور دگر دگر فضا کو معطر رکھتی ہے۔ اپنی سوچ کے
دارے کو وسیع کر کے معنویت دیں۔ تب ہی باہمی اعتماد کی فضا ہمارے ہوگی اور ہمیں اود ہمارے بعد آنے والوں کے
مستقبل کو استحکام مل سکے گا۔

اس شمارے میں،

- ، آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ تم میری ہو،
- ، مصباح اعوان کا مکمل ناول۔ ستارہ ذیبت،
- ، نگہت عبداللہ، صائمہ اکرم اور سمیرا حمید کے ناولٹ،
- ، خایا سمین، قرۃ العین رائے، آئینہ ملک، ثمینہ فرحان اور ندا حسنین کے افسانے،
- ، کرکٹر سرفراز احمد اور خوش، محنت سرفراز کا بندھن،
- ، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ، جب تجھ سے نانا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
- ، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- ، خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی ذہانت کے آئینہ دار، آپ کے خط صرف آپ کی رائے جاننے کا ذریعہ نہیں بلکہ ہمارے اود ہماری
قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث بھی ہیں۔ شعاع پڑھ کر اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

READING
Section



نامور کو ایک پل میں کر دے تو گناہ بھی
گر کرم فرمائے تو بن جائیں بگڑے کام بھی

عمر و میوں کی رات اندھیری تھی ڈھل گئی
شمع تھی اُن کے نور کی سینے میں جل گئی

تو جسے چاہے کشادہ رزق ہو اُس کو عطا
ہو غضب تیرا تو مانگیں بھیک سارے اغنیاء

مجھ کو میرے حضور کے در پہ مبتلا لیا
قسمت میری رب کے کرم سے بدل گئی

دستِ قدرت میں ترے ہر ذی نفس کی جان ہے
جو تجھے مانے اکیلا صاحبِ ایمان ہے

دیکھا جو روضہ پاک تو آنسو نکل پڑے
جو بات دل میں تھی وہ زباں سے نکل گئی

گلشنِ ہستی کو تو چاہے تو ویرانہ کرے
صاحبِ فہم و ذکا کو چاہے دیوانہ کرے

ہو کھٹ پہ سر جھکایا تو محسوس یہ ہوا
بدلی میرے گناہوں کی میرے سر سے ٹل گئی

ہے پرندوں کو فضاؤں میں اڑانا تیرا کام
مجرموں کو سیدھی راہوں پر لگانا تیرا کام

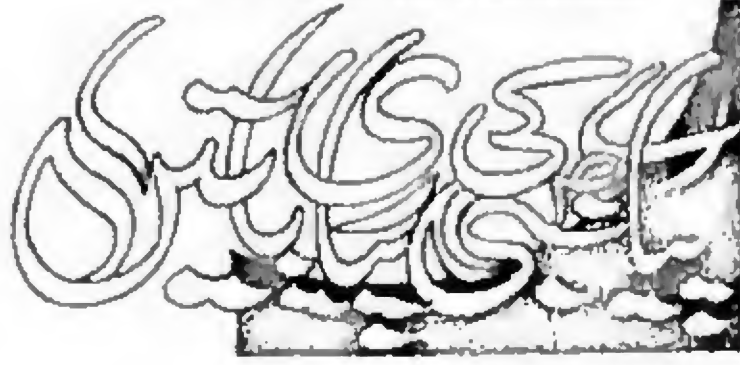
ساعل نے میرا ہاتھ لیا تمام اے فدا
کشتی میری بھنور سے سلامت نکل گئی

تو اگر چاہے بنیں مثلِ گلستانِ رنگزار
قادرِ مطلق یقیناً ہے تو ہی پروردگار

فدا حسین فدا عطرال

خشک بیجوں سے نکلے سبز کوئل بالیقین
تیری قدرت کا جہاں بھر میں کوئی ثانی نہیں

ریاض حسین قرۃ



اعتدال کی راہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”اعتدال اختیار کرو اور سیدھے رہو۔ تم میں سے
کسی کو بھی اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔“
حاضرین نے کہا۔

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو بھی
نہیں؟“

فرمایا ”مجھے بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ مجھے
اپنی رحمت اور اپنے فضل میں چھپالے۔“ (مسلم)
فوائد و مسائل :

1- اعتدال کا مطلب افراط و تفریط سے اجتناب
ہے، یعنی نہ تو بدعت کا ارتکاب کیا جائے اور نہ
فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی جائے۔

2- جنت اصل میں اعمال کا بدلہ نہیں بلکہ اللہ کی
خاص رحمت ہے کیونکہ بندے کے نیک اعمال اللہ
کے احسانات کے مقابلے میں انتہائی حقیر ہیں بلکہ ان
اعمال کی توقع بھی اللہ کا احسان ہے۔

3- اصل مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور جہنم سے
نجات ہے۔

4- نیک اعمال کا مقصد اللہ کی رحمت کا حصول ہے۔
اس کے نتیجے میں جنت بھی مل جائے گی اور جہنم سے
بچاؤ بھی ہو جائے گا۔

دکھاوے اور شہرت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

READING
Section

”اللہ عز و جل فرماتا ہے: میں دوسرے شریکوں کے
مقابلے میں، شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔
جس نے (بظاہر) میرے لیے عمل کیا، اس میں
میرے سوا کسی اور کو بھی شریک کر لیا تو میں اس سے لا
تعلق ہو جاتا ہوں۔ اور وہ (عمل) اسی کے لیے ہوتا
ہے جس کو اس نے (میرا) شریک بنایا۔“ (مسلم)
فوائد و مسائل :

1- کسی اور کو شریک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ
دکھاوے کے لیے کام کیا جائے جس کے ذریعے سے
اسے دنیوی مفاد حاصل ہو یا لوگوں کی نظر میں مٹتی اور
پارسا کھلائے۔

2- ایسا عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔

3- وہ عمل دوسرے کے لیے ہونے کا مطلب یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ اس کا کوئی ثواب نہیں دیتا۔ اگر ریاکار
ثواب کا طالب ہے تو اسی انسان سے ثواب لے جس کو
دکھانے کے لیے اس نے کام کیا ہے۔ ظاہر ہے انسان
دوسرے انسان کو نیکی کا بدلہ نہیں دے سکتا، اس لیے
قیامت کے دن ریاکار کو شرمندگی ہوگی اور اسے عمل کا
کوئی ثواب یا فائدہ نہیں ملے گا۔

4- ریاکاری شرک اصغر ہے۔ اس سے وہ عمل تباہ
ہو جاتا ہے جس میں ریا شامل ہو، تاہم یہ شرک اکبر
نہیں جس کی سزا دائمی جہنم ہے۔

صرف اللہ کے لیے

صحابی رسول حضرت ابو سعد بن ابوفضالہ انصاری
رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے تمام انسانوں کو جمع کرے گا اور وہ دن ایسا ہے جس میں کوئی شک نہیں تب ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا: جس نے اللہ کے لیے کیے ہوئے عمل میں (کسی کو) شریک کیا وہ اس عمل کا ثواب غیر اللہ ہی سے مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ دوسرے شریکوں کے مقابلے میں شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہے۔“ (ترمذی)

فوائد و مسائل :

- 1- ریاکاری قیامت کے دن رسوائی کا باعث ہے۔
- 2- ثواب دینا صرف اللہ کا کام ہے، لہذا کوئی کسی سے کوئی ثواب حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے ریاکاری والے اعمال بے کار ہیں جن کا ثواب نہ اللہ تعالیٰ دے گا نہ عوام دے سکیں گے۔
- 3- ریاکاری قیامت کے دن شرمندگی کا باعث ہو گی۔

دجال سے زیادہ خطرناک

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ”انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس (گھر سے) باہر تشریف لائے جب کہ ہم مسیح و دجال کا ذکر کر رہے تھے آپ نے فرمایا: ”کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح و دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟“

ہم نے کہا: کیوں نہیں (فرمائیے۔)“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”چھپا ہوا شرک۔ (وہ یہ ہے) کہ آدمی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اپنی نماز کو خوب صورت بناتا ہے۔“ (احمد)

فوائد و مسائل :

- 1- ریاکاری و دجال سے زیادہ خطرناک اس لیے ہے کہ دجال کھلا دشمن ہے، اس کا کفر واضح ہے جبکہ ریا کار کا عمل بظاہر نیکی کا عمل ہوتا ہے۔
- 2- اسے پوشیدہ شرک اس لیے کہا گیا ہے کہ کسی

بت درخت، قبر، چاند، سورج وغیرہ کی پوجا کرنے والا یا اسے سجدہ کرنے والا سب کو نظر آتا ہے کہ یہ غیر اللہ کی عبادت کر رہا ہے۔ اس کا شرک واضح ہوتا ہے۔ لیکن ریاکاری کرنے والا بظاہر اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے یا رکوع سجود میں مشغول ہوتا ہے اسے دیکھ کر یہاں نہیں چلتا کہ یہ اللہ کی رضا کے لیے نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ اپنے نفس کی پوجا کر رہا ہے۔

3- اگر نیکی کرنے والے کی نیت یہ ہو کہ اس کی تعریف کی جائے تو یہ ریا ہے لیکن اگر اس کی نیت یہ نہیں، لوگوں کو ویسے ہی اس کی نیکی کا علم ہو جاتا ہے اور وہ تعریف کرتے ہیں، اس میں مکمل کرنے والے کا قصور نہیں۔

4- جس طرح یہ جائز نہیں کہ نماز پڑھنے والے کو کوئی دیکھ لے تو وہ نماز لمبی کر دے، اس طرح یہ بھی درست نہیں کہ لمبی سورت پڑھنا شروع کی ہے، اچانک کوئی آگیا تو نماز مختصر کر دے بلکہ اپنی پہلی نیت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

5- نماز کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی یہی حکم ہے، مثلاً ”صدقہ، جہاد وغیرہ۔“

شہرت کے لیے

حضرت جناب (بن عبد اللہ بن سفیان) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو دکھلاوا کرے گا اللہ اس کی حقیقت ظاہر کر دے گا اور جو شہرت کے لیے نیکی کرتا ہے اللہ اس کی تشہیر کرے گا۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل :

- 1- ریاکاری کرنے والا کام اس لیے کرتا ہے کہ لوگوں میں اس کی خوبی کی شہرت ہو اور وہ اس کی تعریف اور عزت کریں لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے اس کی یہ بری نیت ظاہر کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ بدنام ہو جاتا ہے اور اس کی عزت ختم ہو جاتی ہے۔
- 2- اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب مخلوق کے سامنے یہ ظاہر فرما دے گا کہ یہ شخص اخلاص کے ساتھ نیکی نہیں کرتا تھا جس سے سب کے سامنے اس کی بے عزتی ہو جائے گی۔

حسد کا بیان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حسد (رشک) صرف دو ہی کاموں میں جائز ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا اور اسے حق کی راہ میں خرچ کرنے پر لگا دیا۔ (اس پر رشک کرنا چاہیے۔) اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے (دین کی) سمجھ دی وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ ”حسد“ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کسی کو اللہ کی طرف سے نعمت ملی ہو تو اسے دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہو کہ اس کی یہ نعمت ختم ہو جائے۔ یہ جذبہ رکھنا بہت برا گناہ ہے۔ اس حدیث میں حسد سے مراد ”رشک“ ہے، یعنی یہ خواہش کرنا کہ جیسی نعمت اس کے پاس ہے وہ کسی مجھے بھی مل جائے یہ جائز ہے۔

2۔ حسد تو کسی پر بھی جائز نہیں۔ رشک بھی دنیا کی دولت، شہرت اور حکومت پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی کا نیک عمل ہی اس قابل ہے کہ اس طرح کا عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

3۔ خونیوں میں سب سے زیادہ قابل رشک دو خویاں ہیں: سخاوت اور علم۔ یہ عمل بھی تب خونیوں میں شمار ہو سکتے ہیں جب اللہ کی رضا کے لیے خلوص کے ساتھ انجام دیے جائیں ورنہ شہرت کے لیے حاصل کیا جانے والا علم اور خرچ کیا جانے والا مال سخت ترین سزا اور شدید عذاب کا باعث ہو گا۔ اللہ محفوظ رکھے۔

صرف دو کام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”حسد (رشک) صرف دو کاموں میں جائز ہے۔ ایک اس آدمی سے (رشک کرنا چاہیے) جسے اللہ نے قرآن (کا علم) دیا وہ رات کے اوقات میں بھی اس پر قائم رہتا ہے اور دن کے اوقات میں بھی۔ اور (دوسرا) وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا وہ رات کے اوقات میں بھی اسے (نیکی کے کاموں میں) خرچ کرتا ہے اور دن کے اوقات میں بھی (اس پر رشک کرنا چاہیے۔)“ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ قرآن پر عمل کرنا بھی ہے اور نماز کے قیام میں اس کی تلاوت بھی، خواہ فرض نمازوں میں ہو یا نوافل و تہجد میں۔

2۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ مسجدوں کے بیناروں اور دیواروں کی زیب و زینت کے بجائے علماء اور طلباء پر خرچ کرنا زیادہ ثواب ہے۔ اسی طرح مسجد کے مفلس یا مقروض نمازی اور مسجد کے قرب و جوار میں رہنے والے مدد کے مستحق غریب آدمیوں کو دینا زیادہ ضروری ہے۔ مسجد سادہ رہے تو افضل ہے۔

ظلم و زیادتی

حضرت ابو بکرہ (نفع بن حارث ثقفی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زیادتی اور قطع رحمی سے بڑھ کر کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی جلدی دے دیتا ہے جب کہ اس کے ساتھ اس کے لیے آخرت کا عذاب بھی سنبھال رکھتا ہے۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

- 1- ظلم و زیادتی سے پرہیز کرنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اسلام کی اہم خوبی عدل اور رحم ہے۔
- 2- ظلم اور رشتہ داروں سے بد سلوکی کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی خواہ ظلم کسی انسان پر کیا جائے یا کسی حیوان پر۔

مسلمان کی تحقیر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”انسان کے لیے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے (یا اسے حقیر جانے لے)۔“

فوائد و مسائل :

- 1- مسلمان کو ذلیل کرنا یا اسے حقیر اور کم تر سمجھ کر بد سلوکی کرنا بہت بڑا جرم ہے۔
- 2- حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی میں صرف یہی عیب ہو، کوئی اور عیب نہ ہو تو اسے برا آدمی قرار دینے کے لیے یہی عیب کافی ہے۔

تواضع

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تواضع اختیار کرو اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل :

مسلمان پر ہر قسم کی زیادتی کرنا حرام ہے۔

احتیاط اور تقویٰ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عطیہ (بن عروہ) سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بندہ تقویٰ کے (بلند) مقام تک نہیں پہنچتا حتیٰ کہ حرج والی چیز سے بچنے کے لیے وہ چیز بھی چھوڑ دے جس میں حرج نہیں (لیکن شک ہے کہ شاید منع

(ترمذی)

افضل کون ہے

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: ”کون سا آدمی افضل ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہر صاف دل والا، سچی زبان والا۔“

صحابہ نے عرض کیا: ”سچی زبان والا تو ہم جانتے ہیں، صاف دل والا کون ہوتا ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پرہیزگار، پاک باز، جس (کے دل) میں نہ کوئی گناہ ہو، نہ زیادتی، نہ کینہ نہ حسد۔“ (مکارم الاخلاق)

فوائد و مسائل :

- 1- نسل کی صفائی اور پاکیزگی آخرت میں نجات کا باعث ہے۔
- 2- متقی آدمی دوسروں سے افضل ہے۔
- 3- کینہ کا مطلب ہے دل میں ناراضی رکھنا تاکہ موقع ملنے پر بدلہ لیا جاسکے۔ یہ بہت ہی بری عادت ہے۔

متقی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! متقی ہو جا، تو سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہو جائے گا۔ قناعت پسند بن جا، تو سب سے زیادہ شکر گزار ہو جائے گا۔ لوگوں کے لیے وہی کچھ پسند کر جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، تو مومن بن جائے گا۔ اپنے ہمسائے کے ساتھ ہمسائیگی کا اچھا تعلق رکھ، تو مسلم بن جائے گا، اور ہنساکم کر دے کیونکہ زیادہ ہنسی دل کو مرہ کر دیتی ہے۔“ (ابن ماجہ)

فوائد و مسائل :

- 1- جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اعمال عبادت میں شامل ہیں، اسی طرح گناہوں اور مشکوک کاموں سے پرہیز کرنا بھی عبادت کا ایک پہلو ہے۔ زیادہ عبادت

ملے کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”اللہ کے ہاں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔“ (الحجرات۔ 13)

اچھی رائے عامہ

حضرت ابو زہیر (معاذ بن رباح) ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”انہوں نے کہا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نباؤہ یا بناؤہ کے مقام پر ہم سے خطاب فرمایا یہ مقام طائف کے قریب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہو سکتا ہے تم جنتیوں اور جہنمیوں کو الگ الگ پہچان لو۔“

ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کس علامت سے؟“

فرمایا: ”اچھی رائے کے اظہار سے اور بری رائے کے اظہار سے۔ تم ایک دوسرے پر اللہ کے گواہ ہو۔“

فوائد و مسائل :

1۔ نیک متقی آدمی اسی کی تعریف کر سکتا ہے جس میں وہ واقعی اچھی صفات دیکھے کیونکہ متقی خوشامد اور چالوسی نہیں کر سکتا۔

2۔ نیک متقی آدمی اسی کو برا کہے گا جس میں واقعی

بری عادات موجود ہوں کیونکہ وہ جھوٹ بول کر کسی کو بدنام نہیں کرتا۔

3۔ اچھی تعریف (یا لوگوں کی اچھی رائے) سے مراو ہر قسم کے عوام کی رائے نہیں بلکہ توحید و سنت پر کاربند نیک لوگوں کی رائے مراوے جن میں سب سے بلند مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے لہذا جس شخص کے بارے میں ایسے عظیم افراد اچھی رائے رکھتے ہوں وہ یقیناً ”نیک اور جنتی آدمی“ ہوگا۔

4۔ خوارج، معتزلہ اور جہمید وغیرہ کے گمراہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہ اور تابعین نے ان کی آراء کو غلط قرار دیا ہے اور پوری قوت سے ان کی تردید فرمائی ہے۔

گزار وہ ہے جو عبادت کے دونوں پہلوؤں نظر رکھے۔

2۔ موجود نعمتوں پر مطمئن نہ ہونا اور مزید کی حرص رکھنا دل میں شکر کے جذبات پیدا نہیں ہونے دیتا۔ شکر کے لیے ضروری ہے کہ موجود نعمتوں کی اہمیت اور فوائد کو مد نظر رکھا جائے۔ اس سے اللہ کے احسانات کا احساس پیدا ہوگا اور بندہ شکر گزار بن جائے گا۔

3۔ مومن کی امتیازی صفت دوسروں سے حسن سلوک ہے۔

4۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ زیادہ اختلافات ان سے پیدا ہوتے ہیں جن کے ساتھ زیادہ میل ملاپ ہوتا ہے اور انسان کو ہمسایوں سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے لہذا ہمسایوں سے حسن سلوک کا عادی سب کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آتا ہے اس طرح وہ صحیح مسلمان بن جاتا ہے۔

5۔ زیادہ ہنسنا غفلت کو ظاہر کرتا ہے اور غفلت وبے پروائی مردہ دلی کی علامت ہے اور دل جب مردہ ہو جائے تو اسے اپنے اخروی نفع و نقصان کا احساس نہیں رہتا۔

اس لیے ہنسی مذاق کی زیادتی بری بات ہے البتہ خندہ پیشانی اچھی صفت ہے۔

حسب و شرف

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”حسب مال ہے اور شرف تقویٰ ہے۔“

(ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ لوگ مال کو دیکھ کر عزت کرتے ہیں۔ اونچے خاندان کا ایک آدمی غریب ہو جائے تو اس کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ لوگوں کے ہاں یہ کیفیت ہے۔

2۔ اصل چیز جو عزت و احترام کا باعث ہونی چاہیے وہ کسی کی نیکی اور پرہیزگاری ہے۔ اصل شرف یہی ہے اس لیے آخرت میں تقویٰ کی بنیاد پر ہی عزت

READING
Section

آل راؤنڈر سرفراز احمد ہر خوش بخت سرفراز

شاہین رشید

ہمارے پیارے قارئین کی اکثریت ہم سے فرمائش کرتی ہے کہ آپ کھلاڑیوں کے انٹرویوز بھی کیا کریں۔ تو ہم ان کی خدمت میں یہی عرض کرتے ہیں کہ کسی بھی فیلڈ کے سہیلوں کے اتنے خرے نہیں ہوتے جتنے ہمارے کھلاڑیوں کے۔ خصوصاً کرکٹ کے کھلاڑیوں کے ہوتے ہیں۔ مگر پھر جب کسی کرکٹر کو اچھا پر فارم کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو پھر دل چاہتا ہے کہ اسے بھی آزمالوں۔ اور پھر ایسے کھلاڑی کو آزمانے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا کہ جس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ”دھوکا نہیں دے گا“ مگر یہ سب فلمی کتابی اور جذباتی باتیں ہیں۔ اور ایسا مجھے ”سرفراز“ کو آزمانے کے بعد محسوس ہوا۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ یہ کھلاڑی اس جملے میں ”دھوکا نہیں دے گا“ بالکل بھی فٹ نہیں آتا۔ ہاں البتہ ہم ان کی مسز ”خوش بخت“ کی تعریف ضرور کریں گے جنہوں نے ایک فون کال پہ ہمیں انٹرویو دیا۔ اور انٹرویو کے مکمل ہونے میں دو چار سوال ہی رہ گئے تھے کہ لائن کٹ گئی اور پھر وہ لائن آدھا گھنٹہ انگیج رہی۔ سوچا شاید فون خراب ہو گیا ہو گا۔ (پی ٹی سی ایل پہ کال کی تھی) پھر جب فون ٹھیک ہوا، ہم نے کال کی۔ خوش بخت کہیں جا چکی تھیں۔ ہم نے اپنا موبائل نمبر دیا۔ اور اس انٹرویو کے لکھنے تک خوش بخت کی بھی کوئی کال نہیں آئی۔ قصور ان کا نہیں ہے، بلکہ اس شہرت اور عزت کا ہے جو انہیں قبل از وقت مل گئی۔

خوش بخت نے جتنا بھی انٹرویو دیا، بہت اچھا دیا۔ خوش بخت!) اور سرفراز کے بارے میں جو

معلومات ہمیں ہیں وہ آپ کے کوش گزار کریں گے اور ہاں اس انٹرویو کے لیے ہم سرفراز کی پھوپھو ”صالحہ عزیز“ کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے انٹرویو کا موقع فراہم کیا۔

”کیسی ہو ”خوش بخت“ اور شادی کی بہت مبارک باد ہو۔ ہماری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے۔“

”جی اللہ کا شکر ہے اور بہت شکریہ مبارک باد دینے کا۔“

”آپ کا نام ”خوش بخت“ ہے اور ایک بہت ہی مشہور شخصیت کا نام بھی خوش بخت ہے، تو کیا ان سے متاثر ہو کر آپ کا نام رکھا گیا؟“

”جی بالکل۔۔۔ جب خوش بخت نعتیں پڑھتی تھیں اور ٹی وی پہ پروگرام کرتی تھیں تو میری دادی نے سوچ لیا تھا کہ جب میری پوتی ہوگی تو میں اس کا نام ”خوش بخت“ رکھوں گی۔“

”دادی ہوں یا نانی“ انہیں تو ”پوتوں“ کی آرزو ہوتی ہے اور آپ کی دادی نے پوتی کی خواہش کی حیرت ہے؟“

”اصل میں ان کے دو پوتے تھے تو وہ چاہتی تھیں کہ ایک پوتی بھی ہونی چاہیے، تو بس اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔“

”پہلے اپنے بارے میں بتاؤ کہ کہاں سے آپ کا تعلق ہے اور۔۔۔؟“

”جی۔۔۔ میرے والدین کا تعلق انڈیا سے ہے لیکن پیدائش یہاں پاکستان کی ہے۔ میں والدین کی طرف سے ”ہسید“ ہوں۔ میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن نہیں

ہوں بلکہ مجھ سے بھی چھوٹی ایک بہن ہے۔ میں 6 جون 1996ء کو پیدا ہوئی۔ کراچی میں ہی اور میں اپنی فیملی میں بھی اور اپنے خاندان میں بھی پہلی لڑکی ہوں جس کی شادی ہوئی ہے۔

”شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا؟ اور کیا ریلیشن ہے سرفراز سے آپ کا؟“

”ہماری شادی کو چھ ماہ ہو گئے ہیں یعنی 19 مئی کو شادی ہوئی اور 25 مئی کو ولیمہ ہوا اور ان سے کوئی ریلیشن نہیں تھا۔ البتہ سرفراز اور میرے بھائی کرکٹ کھیلا کرتے تھے تو ان کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا اور دونوں فیملیز ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی تھیں۔“

”تو کبھی سرفراز کو دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ یہ میرے شریک سفر بن جائیں؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا کبھی نہیں سوچا۔۔۔ اور نہ ہی اس نظر سے دیکھا تھا، ہمیشہ سرفراز بھائی کہہ رہی میں انہیں بلاتی تھی۔“

”جب ان سے آپ کا رشتہ طے ہوا تو یہ شاید کافی مشہور ہو چکے تھے، تو مشہور شخصیت کا پروپوزل آنا خوشی کا باعث بنا؟“

”جب ہماری منگنی ہوئی اس وقت یہ ٹیم میں نہیں تھے۔ ہماری منگنی تین سال رہی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ابو کو لمبے عرصے کے لیے ملک سے باہر جانا تھا اور وہ جانے سے پہلے منگنی کروانا چاہتے تھے۔ منگنی کیا تھی یوں سمجھیں کہ بات یہی ہوئی تھی اور شادی اس لیے نہیں ہو سکتی تھی کہ میں اپنی پردھائی مکمل کرنا چاہتی تھی مگر تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی میری شادی ہو گئی اور شادی کے بعد بھی پردھائی جارہی ہے۔ میں اکاؤنٹنگ کے 4th سمسٹر میں ہوں اور گھر والوں کی طرف سے بہت پریشور ہے کہ اپنی پردھائی مکمل کرو۔ مارچ میں میرے پیپر ہیں۔“

”جب منگنی ہوئی تو سرفراز ٹیم سے ڈراپ تھے تو کبھی ان کے فیوچر کے لیے فکر مند ہوتی تھیں؟“

”نہیں۔۔۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا اور اس وقت تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ یہ ٹیم میں واپس بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ بس بات یہی ہو گئی تو ہو گئی رزق دینے والا تو خدا ہے وہی وسیلہ بناتا ہے۔“

”شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ اور گھر والوں سے تعلقات کیسے ہیں؟“

”جی شادی دھوم دھام سے ہوئی، کیونکہ ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی تو بہت لمبے گھر رہا گھر میں اور سرفراز کے گھر کی دو سری شادی تھی میں دو سری بہو ہوں اور ماشاء اللہ گھر والوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔“

”گھر اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟“

”بہت فرق پایا۔ ہم بہت زیادہ براڈ مائنڈ اور ماڈرن فیملی۔۔۔ میں۔۔۔ یہاں رشتہ داروں کا Influence ذرا زیادہ ہے، تو بس ایڈجسٹ ہونے میں بھی کافی دیر لگی۔“

”مطلب۔۔۔ ”سعبایا“ حجاب“ لیتی ہیں؟ ہنی مون تو حج عمرہ ہو گا؟“

”جی بالکل۔۔۔ خیر وہ تو میں منگنی اور شادی سے پہلے بھی پہنتی تھی مگر بہت باقاعدگی سے نہیں۔ ہاں شادی کے بعد باقاعدگی سے لینے لگی ہوں۔ ہنی مون ہمارا ہوا نہیں، ویسے ہم سری لنکا گئے۔ پھر لاہور گئے۔ کیونکہ ان کے میڈیجنر چل رہے تھے، بس جو ایک ہنی مون ہوتا ہے وہ نہیں مناسکے۔“

”جب یہ ٹیم کے ساتھ جاتے ہیں تو آپ بھی ساتھ جاتی ہیں؟“

”جی میں ان کے ساتھ جاتی ہوں لیکن ان پر کھیل کا بہت پریشور ہوتا ہے تو پھر ہم انجوائے نہیں کر سکتے۔ وہ تو ایک ٹرپ ہوتا ہے اور بزنس ٹرپ کی طرح ہوتا ہے اور ٹرپ میں بھی ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ کبھی کہیں تو کبھی کہیں ہوتے ہیں۔ یہ تو گھر میں بھی شادی کے بعد رہے کبھی نہیں۔ کبھی ایک ہفتہ تو کبھی دس دن، بس اس طرح رہے ہیں۔ تقریباً دو مہینے یہ گھر میں رہے مگر مسلسل نہیں۔“

Downloaded From Paksociety.com

”تم زیادہ تر سرفراز کے ساتھ ملک سے باہر رہتی ہو۔ تو بڑی جٹھانی یا سسرال میں کوئی ماسنڈ تو نہیں کرتا؟“

”میری بڑی جٹھانی مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی ہیں اور ہماری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے، ہم دوستوں کی طرح ہیں اور گھر میں امی ہوتی ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”منگنی کے دوران ملاقاتیں ہوتی تھیں، کیونکہ یہ تو گولڈن پیریڈ ہوتا ہے؟“

”نہیں ملاقات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف فون پر بات ہوتی تھی اور آپ صحیح کہہ رہی ہیں کہ یہ گولڈن پیریڈ ہوتا ہے اور دل تو چاہتا تھا مگر وہ تو نکل گیا اب یہی گولڈن پیریڈ ہے۔“

”ان کے لیے ایک جملہ ”دھوکا نہیں دے گا“ بہت مشہور ہوا؟“

”گھر میں تو ایسا کچھ نہیں سننے کو ملا۔ البتہ یونیورسٹی

میں بہت سننے کو ملتا تھا تو مجھے ورلڈ کپ کے دوران اپنا ایک مسٹر ڈراپ کرنا پڑا کہ ہر طرف سے یہی آواز

آتی تھی کہ دھوکا نہیں دے گا۔“

”سرفراز کے میچز جانماز پر بیٹھ کر دیکھتی ہو یا ویسے ہی؟“

”ہمت نہیں ہوتی ان کی امی کو دیکھ کر سیکھا ہے کہ بینک نہیں دیکھتی، بس جانماز پر بیٹھنا ہے دعا کے لیے تو ان کی دیکھا دیکھی میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں۔ لیکن اگر اسٹینڈیم جاتی ہوں تو پھر تو وہاں بیٹھ کر دیکھنا ہی پڑتا ہے اور پھر ہم سب پاکستانی مل کر دعا کر رہے ہوتے ہیں۔“

”سب کھلاڑیوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا ہے اور یہ لائف اچھی ہے یا پہلے والی؟“

”جی بالکل ہے۔ جن کی شادیاں ہو گئی ہیں ان کے ساتھ گیٹ ٹو گیدر رہتی ہے۔ یہ لائف اچھی ہے لیکن ذمہ داریاں بہت ہیں اور اچھی لگتی ہیں یہ ذمہ داریاں۔“

”گھریلو ذمہ داریاں تم پر زیادہ ہیں یا جٹھانی پر؟“

”اب تو ہماری باریاں بن گئی ہیں۔ ایک دن میں کھانا بناتی ہوں، ایک دن بھابھی اور مل بانسٹ کے کام

کرتے ہیں۔ کسی ایک پہ بوجھ نہیں ڈالتے، ہم سیلیوں کی طرح رہتے ہیں۔“
”اپنی شادی کو خود انجوائے کیا، رسمیں ہوئی تھیں؟“

”انجوائے نہیں کر سکی، کیونکہ میڈیا اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ رخصتی کے وقت بہت رونا آ رہا تھا تو چھوٹی بہن بار بار کہہ رہی تھی کہ مت رو، میک اپ خراب ہو جائے گا اور رسمیں کرنے کا تو وقت ہی نہیں ملا۔ اتنے لوگ تھے کہ کچھ نہیں ہوسکا۔ ہزار بارہ سو لوگ بلائے تھے اور ڈھائی ہزار لوگ آگئے۔“

بارات اور ولیمہ کا جوڑا سسرال کی طرف سے تھا اور بہت خوب صورت تھا اور میں ساتھ نہیں گئی تھی، میری ساس اور نند نے مل کر تیاری کی تھی اور مجھے پتا

تھا کہ جو چیز آئے گی اچھی آئے گی اور سچی بات تو یہ ہے کہ چونکہ میرا سمسٹر چل رہا تھا تو میرے پاس ٹائم ہی نہیں تھا شاپنگ کا اور میرے گھر سے میری تیاری میری امی نے کی تھی۔“

”کس لباس میں پسند کرتے ہیں؟“

”میں نے بتایا تاکہ ان کا گھرانہ مذہبی ٹائپ کا ہے اور میں ان کے ساتھ جہاں جاتی ہوں عبایا میں ہی جاتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ ویسے بھی یہ اشار ہیں۔ پبلک فگر ہیں، سرمایہ ہیں ملک کا، تو ہمیں اپنے لباس کا خیال رکھنا چاہیے، تاکہ کوئی ان کی بیوی کے متعلق بات نہ کر سکے۔ میں حجاب لیتی ہوں تو لوگ میری تعریف ہی کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر لوگ سیکھتے ہیں۔“

”سرفراز مزاج کے کیسے ہیں؟ اور فضول خرچ کون ہے؟“

”بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ وپے کسی شریف انسان کو چھیڑنا نہیں چاہیے اور چھڑ جائیں تو بس پھر مت پوچھیں کہ کیا ہوتا ہے اور فضول خرچ تو ہم دو لوگ ہیں، ہمیں اوسے پھر لائن کٹ گئی۔ خیر۔“

سرفراز کے بارے میں ہم آپ کو بتائیں گے۔“
”سرفراز کے والد بیڈ منٹن کے بہترین کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ ان کے ”تیا“ کرکٹ کے کھلاڑی رہ چکے ہیں اور تیا زاد بھائی کرکٹ کھیلتے تھے اور چونکہ گیمز کے سب شیدائی تھے تو سرفراز کو بھی کرکٹ سے لگاؤ ہوا۔ 22 مئی 1987ء میں کراچی میں جنم لینے والے سرفراز نے کرکٹ کا آغاز 2006 میں کراچی کی طرف سے فرسٹ کلاس کھیل کر کیا۔ سرفراز کا گھرانہ بنیادی طور پر ایک مذہبی گھرانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرفراز نے پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک ”مدرسے“ میں تعلیم حاصل کی اور 1997ء میں قرآن پاک حفظ کر کے حافظ قرآن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ والد صاحب چونکہ مذہبی معاملات میں سخت تھے۔ لہذا سب ہی بہن بھائیوں کی تربیت میں دینی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔“

سرفراز کو کھیل میں والد سے زیادہ والدہ نے سپورٹ کیا۔ سرفراز نے کئی محلے میں کرکٹ کھیل کر کرکٹ سیکھی اور اس طرح جب انہوں نے کلب جوائن کیا تو انہیں 2000ء میں انڈر 15 میں کھیلنے کا موقع ملا۔ ”کے سی سی اے زون 6 سے“ پھر انڈر 19 کھیلنے کا موقع ملا اور یوں یہ کھلاڑی اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔“

سرفراز احمد کی فیملی پانچ بھائیوں اور دو بہنوں اور والدین پر مشتمل ہے۔ 19 مئی 2015ء میں ان کی شادی خوش بخت صاحبہ سے ہوئی جو ان سے تقریباً ”گیارہ سال چھوٹی ہیں۔ بقول سرفراز کے کہ مجھے تو اپنی شادی انجوائے کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، کیونکہ 19 مئی کو شادی ہوئی اور 21 مئی کو ٹوئنٹی کھیلنے کے لیے یہ لاہور چلے گئے۔ 25 مئی کو اپنا ولیمہ کر کے 26 مئی کو واپس لاہور چلے گئے۔ سرفراز کو ہنی مون منانے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے یہ بیگم کے ساتھ حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں اور کرکٹ کے سلسلے میں جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنی



بیگم کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں اور آپ کو بتا ہی ہے کہ ہمارے ملک میں تو باہر کی ٹیمیں آتی نہیں ہیں۔ لہذا ہماری ہی ٹیم کو ملک سے باہر جانا ہوتا ہے۔ ایک انٹرویو میں سرفراز احمد نے کہا کہ شادی کے بعد میری زندگی میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ مجھے اب اپنی چیزوں کے لیے کسی کو آواز نہیں دینی پڑتی۔ اپنی چیزوں کو خود سے ڈھونڈنا بھی نہیں پڑتا۔ ہر چیز قرینے سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود ہوتی ہے۔ کپڑے استری ہوتے ہیں۔ پہلے زندگی میں بہت بے ترتیبی تھی۔ اب ترتیب آگئی ہے۔ اب زندگی زیادہ اچھی اور آرگنائزڈ ہو گئی ہے۔

سرفراز اپنے پروفیشنل مسائل اپنی بیگم سے شیئر نہیں کرتے کہ میڈیا کا دور ہے بات ادھر سے ادھر بھی جاسکتی ہے۔ اس لیے اپنے قریبی ساتھیوں سے اور کرکٹ کی نامور شخصیات سے بات چیت کرتے

سرفراز نے بیگم کو رو نمائی میں سونے کی زنجیر دی تھی، جبکہ ان کی بیگم نے انہیں پرفیوم کا تحفہ دیا تھا۔ سرفراز کو ابھی تک اپنی بیگم میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ انہوں نے اپنی بیگم کو ایک سلیقہ شعار اور فرماں بردار ہی پایا ہے۔ ہر بات کو جلدی مان جانے والی۔ بقول سرفراز کے کہ۔ ”میں وقت کا بہت پابند ہوں۔“ اور بیگم کو کہیں جانے کے لیے تیاری کا جو ٹائم دیتا ہوں اس ٹائم پر تیار نہ ہوں تو مجھے برا لگتا ہے۔ مجھے انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ (مگر شاید انتظار کرنا اچھا لگتا ہے۔) میں تقاریب میں وقت پر پہنچنے کا قائل ہوں۔ اسے آپ میری اچھی عادت کہہ سکتے ہیں۔

”دھوکا نہیں دے گا“ کے بارے میں سرفراز کا کہنا ہے کہ یہ ڈائلاگ میرے ساتھ چیک کے رہ گیا ہے مگر میں اس ڈائلاگ کو اب سیریس نہیں لیتا۔



ہیں۔

READING
Section

ماہنامہ شعاع فروری 2016 22



مڑتی ہوئی گھیاں چھوڑی ہیں
 کھلتی ہوئی گھیاں چھوڑی ہیں
 جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
 ہر طاق میں گزیاں چھوڑی ہیں
 جب تجھ سے نانا جوڑا ہے
 مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا باپ کا گھر چھوڑ کر بیادیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پورا ایک زمین سے اکھاڑ کر دسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پورا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔
 غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک بڑھی لکھی نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان بڑھ لوگ 'گالم گلوچ' لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے و قال لاہور

”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ یہ جملہ پڑھتے ہی دل چاہا کہ وہ سب کچھ جو مجھ پر بیت گیا ہے آپ سب سے بھی شیر کروں، کیونکہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اپنے گھر والوں سے بھی نہیں کی جاسکتیں۔ چلیں جی! دل کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔

س۔ ”شادی کب ہوئی؟“

ج۔ ”میری شادی 26 نومبر 2006 کو ہوئی۔“

س۔ ”شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟“

ج۔ شادی سے پہلے بہت خوش باش زندگی تھی۔ ڈائجسٹ پڑھنا، سیر و تفریح کرنا، دوستوں سے ملنا ملانا بازاروں میں شاپنگ کرنا، بہنوں سے گپیں لڑانا وغیرہ۔ غرض ہر خوشی، ہر تہوار، ہر فنکشن دل بھر کر انجوائے کیا۔ پڑھائی جست کر کی اور ہر میدان میں کامیابی حاصل کی۔

س۔ ”اس رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا والدین کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟“

ج۔ ”آہ۔ اس رشتے میں سراسر میری مرضی شامل تھی، میرے والد حیات نہیں والدہ ادھر راضی نہیں تھیں کیونکہ ہم سیدھے اور یہ دوسرے مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے ماں کو راضی کیا۔ ڈانٹ کھائی مار کھائی، لیکن پروا نہ کی۔ اصل میں میری سوچ تھی کہ جو لوگ لومینج کرتے ہیں شاید وہ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی میری سب سے بڑی بھول تھی جو آج تک جھلکتی رہی ہوں۔“

س۔ ”ذہن میں جیون سا تھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون سا تھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟“

ج۔ میرے نزدیک خوب صورتی، شکل و صورت کا کوئی اتنا ایشو نہیں ہے۔ میں تو چاہتی تھی کہ جیون سا بھی ایسا ہو جو دکھ سکھ کا سا بھی ہو۔ محبت کرنے والا ہو جس کے ساتھ آپ ہوں تو زندگی کا ہر غم مٹ جائے۔

اب میں سمجھی کہ جسے میں اپنے لیے ٹھیک سمجھ رہی ہوں اس میں یہ سب خوبیاں بھی ہوں گی لیکن میرے خوابوں کا تاج محل محض شادی کے چھ سات دن بعد ہی دھڑام سے گر گیا وہ بھی جب میری والدہ مجھے ایک آدھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جانے آئیں اور میں اپنے زیور پہننے لگی تو تالے میں سے سب چیزیں غائب۔

میں اتنی حواس باختہ ہوئی فوراً ”اپنی ساس سے پوچھا“ ای میری چیزیں نہیں مل رہیں۔“
تو انہوں نے آنکھیں چرائیں اور کہا ”مجھے کیا پتا“
میرے میاں آئے ان سے پوچھا تو کہنے لگے ”وہ سب میں نے نکالے ہیں۔“

اس وقت تو میں چپ ہو گئی کیونکہ اپنی ماں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی چپ کر کے چلی گئی لیکن شکر ہے میں نے پہلے ہی دیکھ لیا کیونکہ ان کا ارادہ میرے گھر والوں پر الزام لگانے کا تھا۔

س۔ ”منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟“

ج۔ منگنی شاید دو تین مہینے رہی کیونکہ منگنی کے فوراً بعد انہوں نے شادی پر زور ڈال دیا تھا۔ شادی سے پہلے فون پر روز بات ہوتی تھی اور میں اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ کوئی شخص ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر مجھے چاہتا ہے لیکن قسمت تو شاید میرا مذاق اڑا رہی تھی اور میری بے وقوفی پر قہقہے لگا رہی تھی۔ ملاقات بھی ایک دو دفعہ ہو ہی گئی تھی۔

س۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے خیالات کیا تھے؟“

ج۔ شادی سے پہلے بہت ہی نیک خیالات تھے۔ میں نے سوچا تھا اپنے سسرال والوں کی نمدست سے ان کے دل جیت لوں گی لیکن شروع شروع میں بہت پریشانیاں اٹھائی ہیں۔

میں جتنی کوشش کر سکتی تھی وہ میں نے کی۔ اپنی ساس کے ساتھ ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی جو وہ کہتیں وہ کرتی لیکن شروع شروع میں بہت مشکل پیش آئی کیونکہ اپنے گھر میں تو کبھی مل کر پانی بھی نہ پیا تھا۔
س۔ ”شادی کے لیے آپ کو تعلیم چھوڑنا پڑی یا

قربانی دینی پڑی؟“

ج۔ ہاں جی! ابھی میں نے اور تعلیم حاصل کرنی تھی اور میری والدہ نے منگنی بھی اس شرط پر کی تھی کہ دو سال شادی کا نام نہیں لینا لیکن میرے سسرال والوں نے بہت دباؤ ڈالا اس لیے شادی کرنی پڑی اور قربانی بھی دی جوتا نہیں سکتی۔

س۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین میں کوئی بد مزگی پائی؟

ج۔ چونکہ میری والدہ ان کو جانتی نہیں تھیں۔ اس لیے وہ میری سیکورٹی کے لیے حق مہر زیادہ لکھوانا چاہتی تھیں اس وجہ سے تھوڑی بد مزگی ہوئی لیکن رسموں میں کچھ بھی نہ ہوا۔ حق مہر میں پانچ ہزار اور زیور لکھا گیا پانچ ہزار تو اسی وقت مجھے دیے دیے گئے اور زیور نکال لیا گیا۔ بری بھی کچھ خاص نہ تھی میں نے بھی اپنی والدہ کو تنگ نہ کیا تھا کہ مجھے فلاں چاہیے ڈھمکاں چاہیے۔ بس میں نے کہا تھا آپ شادی ساوکی سے کریں کیونکہ مجھے ان پر بہت اعتماد تھا جو جلد ہی ٹوٹ گیا اور میں اپنی ماں کی دوراندیشی کی قائل ہو گئی کہ انہوں نے مجھے ضرورت کی ہر چیز دی تاکہ میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں اور اس بات کے طعنے آج تک ملتے ہیں کہ میں زیادہ کچھ نہیں لائی۔

شادی کے بعد

READING
Section

ماہنامہ شعاع فروری 2016 24

س۔ ”شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟“

ج۔ کچھ خاص نہیں؟ نہ تعریف کی اور نہ ہی تنقید۔ بس نصیحتیں۔ جس میں فرائض بتا دیے گئے اور حقوق ندادے۔

س۔ ”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟“

ج۔ شادی کے بعد پوری زندگی ہی بدل گئی ہے۔ میں اپنے سسرال والوں کو پھر وہی مار جن دے دیتی ہوں۔ لیکن جس کی خاطر آئی، اس نے ہی مان نہ رکھا تو کسی اور سے کیا گلہ۔

اور آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مجھے ان سے کوئی خاص محبت یا عشق نہ تھا بلکہ میں صرف ان کی خاطر شادی پہ مجبور ہوئی میں نے سوچا کہ اتنا گڑگڑا کر اتنی چاہت سے میرا ساتھ چاہتے ہیں تو کسی سے تو شادی کرنی ہے ان سے ہی کر لوں کیونکہ میں نے اپنے خاندان میں بہت سے مسائل دیکھے تھے تو میں نے سوچا جو آپ سے چاہت کرے بس اسی سے شادی کرو۔

لیکن میری پوری زندگی ہی بدل گئی اور وہ شخص جسے میں جانتی تھی وہ تو کہیں گم ہی ہو گیا اور جو سامنے آیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

س۔ ”شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

ج۔ مکلاوے کے اگلے دن سے ہی۔ سب سے پہلے میں نے ہنڈیا بنائی تھی اور اس وقت سے آج تک بس کام ہی کام۔

س۔ ”میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟“

ج۔ جی بالکل بالکل! میری امی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔ میں ان میں بھی کیڑے نکالا کرتی تھی (سوری) لیکن بعد میں شروع میں تو ساس نے کہا کہ میں کھانا بنایا کروں۔ میں نے بنایا بھی لیکن اس طرح کہ ہانڈی میں

گھی وہ ڈال کر دیتی تھیں کہ بہت ضائع کر دیتی ہوں اور گرم مسالہ پیاز وغیرہ وہ اپنے کمرے میں چھپا کر رکھتی تھیں اور جب وہ فوت ہوئیں ان کے بید کے نیچے سے یہ ڈھیر سارا پیاز چینی، چمچ اور گرم مسالہ نکلا۔

کتنے افسوس کی بات ہے ناں کہ کوئی ان چیزوں کو کتنا زیادہ استعمال کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے جتنی ضرورت ہے اتنا ہی ناں لیکن سمجھنے کی بات ہے۔ اور پھر تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے خود ہی پکانا شروع کر دیا کہ میں چیزیں ضائع کرتی ہوں تو بس پھر نہ پوچھیں کہنا تو نہیں چاہیے لیکن دو سال میں اچار سے رولی کھاتی رہی لیکن سائن کھانے کا حوصلہ مجھ میں نہ تھا۔ ان کی زندگی میں میں دو دفعہ پریگنٹ ہوئی اور کھانا مشکل ہو گیا۔ اس حالت میں تو ویسے ہی اچھا کھانے کو دل کرتا ہے لیکن اتنا برا کھانا کھانا پڑتا اور پھر تھے کر کے حشر ہو جاتا۔ اس لیے میں اچار ہی کھاتی رہی۔

س۔ ”میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟“

ج۔ ٹوٹلی ڈفرنٹ! میکے میں آزادی، خوشگوار ماحول اور سکون۔ لیکن سسرال میں سخت ماحول، باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی اب تو بہت فرق آگیا ہے اب تو میں اپنے سات سال کے بیٹے کے ساتھ کہیں بھی چلی جاتی ہوں لیکن پہلے تو دم گھٹتا تھا۔ ذرا بھی باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

اب بھی میکے مہینے میں ایک دن جانے کی اجازت ہے اور رات رکنے کی بھی نہیں۔ میں ان نو سالوں میں ناراض ہو کر ہی میکے رہی ہوں۔ صلح کی صورت میں کبھی نہیں حتیٰ کہ بھائیوں کی شادیوں میں شرکت بھی غیروں کی طرح کرتی رہی ہوں۔ اور ماحول کا فرق اس لحاظ سے بھی کہ ہمارے سسرال میں کوئی بیمار ہو تو الزام بہوؤں پر کہ تعویذ دھاگے کرتی ہیں۔

جب میری ساس فوت ہوئیں بہت عرصہ تک میرے میاں کا موڈ ٹھیک نہ ہوا کہ (نعوذ باللہ) جیسے موت کا قانون میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور

ان کی والدہ کو میں نے مارا ہے اپنے تعویذوں سے۔
یقین کریں کبھی ایسا خیال بھی نہ آیا اور نہ کسی بابے
وغیرہ کو جانتے ہیں۔

س۔ ”سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور
کن پر تنقید ہوئی؟“

ج۔ بہت سی باتوں پر تنقید ہوئی کیونکہ میں انیس سال
کی تھی جب شادی ہوئی۔ کام کبھی کیا نہ تھا۔ پیپر کے
اگلے دن شادی کی تقریبات تھیں لہذا کوشش تو بہت
کی لیکن پھر بھی تنقید بہت ہوتی رہی حالانکہ میری
عادت ہے کہ جو بات کسی کو مجھ میں بری لگے۔ میں وہ
بات ہی ختم کر دیتی ہوں لیکن سسرال تو پھر سسرال ہے
نا اور اب جا کر کبھی کوئی تعریف کر ہی دیتا ہے۔ بھولے

بھٹکے

اور ایک بات اور آپ سے شیر کروں گی کہ ایک
دفعہ شادی میں جانا تھا۔

میری ساس نے مجھے ’میری جٹھانی کا زیور اور
برہسلٹ پہنا دیا اور گھر آکے میں نے واپس دیا لیکن
جب میری ساس فوت ہو میں اور جٹھانی نے واپس مانگا
تو میرے میاں نے کیا کیا (صرف اس لیے کہ والدہ پر کوئی
بات نہ آئے کہ ساری چیزیں انہوں نے جو سنبھالی
تھیں یہ کیا کہ گھر آئے اور الماری کی تلاشی لینے لگے
اور ایک شاپر میری طرف پھینکا کہ اس میں کیا ہے میں
نے دیکھا تو برہسلٹ میں اتنی حواس باختہ ہوئی کہ سمجھ
ہی نہ پائی کہ کیا قصہ ہے نہ اتنی چالاکی ہو شکاری تھی۔
میں نے پریشانی میں ان سے کہا کہ اب تو سب مجھ پر
الزام لگائیں گے ایسا کریں کہ میں اپنی والدہ سے کہتی
ہوں وہ نیا بنواویں آپ یہ اپنے پاس رکھ لیں اور اس
بات کو انہوں نے اپنے پورے گھر میں پھیلا دیا کہ اس
کے پاس سے نکلا ہے اور یہ ایسے کہہ رہی ہے۔

لیکن میری جٹھانیاں اچھی تھیں وہ مجھے جانتی
ہیں۔ سمجھتی ہیں۔ انہوں نے کہا ہمیں تم پر اعتماد

ہے۔ اس بات پر آج بھی دل خون کے آنسو روتا ہے اور

میں اپنے میاں کو کبھی بھی لسی بھی صورت اس بات
کے لیے معاف نہیں کروں گی۔

س۔ سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟
سسرال میں گھر پلو امور اور خاندانی معاملات میں
آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟“

ج۔ بالکل نہیں کوئی مقام نہیں ملا اور میں سمجھتی ہوں
کہ میاں اچھا تو سب اچھا اس لیے کسی سے گلہ نہیں
اور رہی رائے کی بات تو کبھی کوئی خاندانی معاملے پر
میرے سامنے بات ہی نہیں کی جاتی۔ میرے میاں تو
ہر بات مجھ سے چھپا کے رکھتے ہیں حالانکہ اگر ان کے
خاندان میں کسی کا رشتہ بھی ہو تو مجھے اور میری جٹھانی کو
نہیں بتایا جاتا کیونکہ ہماری نظر لگتی ہے۔ میں اور میری
جٹھانی ہم دونوں ان کی فیملی کا حصہ جو نہیں ہیں۔

س۔ ”سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد
تک پوری ہو میں؟“

ج۔ میری توقعات جو میرے میاں سے تھیں وہ پوری
نہیں ہو میں باقی تو دور کی بات ہے۔ آپ سب سے
گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میرے
میاں کو میرے حق میں اچھا کر دے۔ مہینے میں ایک
ہزار ملتا ہے اور اس میں اپنی ضرورت کی چیزیں لینی
ہوتی ہیں مثلاً ”سیمپو وغیرہ۔ اور سال میں عید پر ایک
ہزار روپیہ اور بڑی عید پر پانچ سو یا پھر کبھی وہ بھی نہیں۔
اس کے علاوہ کبھی میری کوئی ضرورت پوری نہیں
کی۔ میں یوشنز پڑھاتی ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ
بناتی ہوں یا اپنے بیٹے کی کوئی چیز لینی ہو تو۔ یہ نہیں کہ
میرے میاں کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ بہت اچھا
کھاتے ہیں لیکن بس مجھے نہیں دیتے۔

میرے سسرال والے بھی سمجھاتے ہیں لیکن ان پر
رتی برابر اثر نہیں ہوتا اور میں بس اچھے دنوں کی آس
میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں اس لیے میں کبھی
فارغ نہیں بیٹھی کہ یہ سوچیں میرا جینا حرام کر دیتی
ہیں۔

س۔ ”بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں

READING
Section

بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے مثلاً ”پہلا بچہ۔“

ج ہا۔ واقعی بچوں کی پیدائش بڑا امتحان ہے اور میرا تو اس لیے کہ نو مہینے ٹینشن میں رہی ماریں کھائیں، طعنے نے آتے ساتھ ہی پریگنٹ ہو گئی تھی اور میاں کا رویہ انتہائی خراب۔

اسی ٹینشن میں آپریشن ہوا سب نے کہا بچہ بہت کمزور ہے دو مین دن تک دیکھا نہیں۔ پھر میاں آئے کہا۔

”تمہیں اپنے بچے کی ذرا پروا نہیں۔“

میں پریشان ہو گئی اور پھر جو انہوں نے خبر دی میرا دل پھٹ ہی گیا وہ یہ کہ میرا بچہ معذور تھا۔ جی! اس کے دونوں ہاتھ ہی نہیں تھے جب میری امی کو پتا چلا تو وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس آئیں اور کہا۔

”میں تو تمہیں اب بھی نہیں بتانا چاہ رہی تھی کیونکہ تمہارا بی بی پہلے ہی بہت ہائی تھا۔“

بس وہ بھی ایک قصہ ہے سب نے اتنی باتیں کیں کسی نے کہا ہائے بہت کھاتی تھی۔ یقین کریں کبھی ساس نے مرضی کا سالن نہیں بنایا تھا لیکن الزام تو موجود تھا تا کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ نہیں سمجھا تو کوئی ایک ماں کا درد۔ جس نے پہلی دفعہ ایسا بچہ دیکھا تھا۔ اور اس کا تالو بھی اونچا تھا۔ مدرفیڈ نہیں لے سکتا تھا لیکن سب نے کہا پلانا ہی نہیں چاہتی۔

اور ایک سال بعد میں دوبارہ پریگنٹ ہوئی اور جب میں جانے لگی تو میرا بچہ بہت بیمار تھا اور جب میرا آپریشن ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی ڈنٹھ ہو گئی۔

مجھے جب واپس گھر آنا تھا تب پتا چلا لیکن دل کو ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا اور میں روتی رہتی تھی اسپتال میں۔ تب بھی سب نے بڑی باتیں کیں بتانے لگوں تو صفحات بھر جا میں۔ قصہ مختصر یہ کہ دو دفعہ ماں بنی اور دونوں دفعہ سخت اذیت کائی اور اب یہ حال ہے کبھی نام لوں تو کہتے ہیں۔

”میں نے نہیں پیدا کرنا بیمار عورت ہو اور میں خرچہ افورڈ نہیں کر سکتا نہ میں بچوں پر خرچ کر سکتا

س۔ ”آپ جوائنٹ سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند کرتی ہیں؟“

ج۔ جوائنٹ فیملی سسٹم میں بہت ٹینشن ہوتی ہے کوئی نہ کوئی آپ کی ٹانگ کھینچنے میں لگا رہتا ہے اور خاص کر تب جب میاں بیوی لڑتے ہوں تو پھر باقی سب سے بہت شرم آتی ہے کیونکہ اگر میاں بے ہودہ الزامات لگانے والا ہو تو دوسروں سے نظر ملانا مشکل ہو جاتا ہے۔

س۔ ”آپ نے سرال کا ماحول بہتر بنانے کی کوشش کی؟ اور اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں؟“

ج۔ سرال کا ماحول بہتر کیسے ہو سکتا ہے جب سب اپنے آپ کو مکمل سمجھیں تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہمارے سرال میں سب نماز پڑھتے ہیں دنیا کی نظر میں بہت ہی اچھے اور شریف ہیں لیکن یہ تو کوئی گھر والوں سے پوچھے کہ کیا حال ہے دنیا ان کی اتنی تعریف کرتی ہے ہمیں تو غلط کہہ سکتی ہے مگر انہیں نہیں کیونکہ ہر کسی کے کام آتے ہیں اور بہت اخلاق سے ملتے ہیں۔

اگر نہیں ملتے تو سرالی رشتے داروں سے اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق کیا ہوا ہے۔

میرے میاں نے آج تک کبھی عید تہوار گھر میں نہیں منایا ان کا کام ہی ایسا ہے۔ کبھی کہیں لے کر نہیں گئے اور نہ ہی عید شب برات گھر میں گزاری ہے بس پیسے کی دھن ہے جو لگی ہوئی ہے۔

میں بہت سالوں سے شعاع خواتین پڑھ رہی ہوں لیکن کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ لیکن جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے دل چاہ رہا تھا کہ لکھوں اپنی داستان حیات۔ کیونکہ اس میں میں یہ نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ ماں باپ کے فیصلے ہمیشہ درست ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تجربے کی آنکھ سے وہ دیکھ لیتے ہیں جو ہم نادان لڑکیاں نہیں دیکھ پاتیں اور ایک شخص کی اندھی محبت میں اپنے گھر والوں کی سچی محبت کو ٹھوکر مار دیتی ہیں۔



عراق اشک یار ہیں ہم

مصنف: سلمیٰ اعوان
تبصر: آمنہ زرین

خطوں اور انجان لوگوں کے رہن سہن، عادات و اطوار، موسمی حالات کو متعارف کروانا یقیناً "ایک ایسا عمل ہے جو پڑھنے والے کو لکھنے والے کا احسان مند کرتا ہے۔"

سفر نامے کو عموماً "دلکش مناظر، خوب صورت مقامات اور دلچسپ واقعات کا بیانیہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر مصیبت زدہ علاقوں کا سفر؟ وہ سرزمین کہ کرب و بلا سے پیوستہ، وہ سرزمین کہ تباہی و بربادی کی مثال دیتے وقت جس کا نام استعارہ بن چکا ہو؟

ایک ایسی سرزمین کے سفر کا ارادہ کرنے والی خاتون کو آپ کیا کہیں گے؟
اور پھر اپنے ارادے کو مجسم کروینا؟
وہ... اعصاب!

عراق کا احوال ست رنگی کرنوں جیسا ہے۔ شاندار ماضی کی روشنی حال کی درماندگی میں بھی ماند نہیں پڑی۔ عراق کی تاریخی حیثیت آپ کو اس کے مقام کی آگہی دے گی اور صاحبان علم و ہنر کی قدردانی عراقیوں کے بالیدہ شعور کی خبر۔ ہارون اور زبیدہ کا احوال آپ کو محفوظ کرے گا۔ تو اوب اور موسیقی کے نامور لوگوں کا ذکر حیران۔ امام ابو حنیفہ، عبدالقادر جیلانی، جنید بغدادی، معروف کرخی اور دیگر بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کا احوال اس سرزمین کے تقدس کی گواہی دے گا۔ دجلہ اور فرات کے نصیب میں لکھی دل گداز تاریخ، قدیم در سگاہوں، مساجد اور قبرستان کا احوال آپ کو سوز و اہم میں مبتلا کرے گا۔ اور وہیں پر الف لیلا کے شاہکار کرداروں کو مجسموں کی صورت میں نصب دیکھ کر بے پایاں مسرت کے احساس میں شریک ہونا بھی آپ کے حصے میں آئے گا

سفر تخیل کا ہوا حقیقی، اپنے اندر ایک ایسی کشش رکھتا ہے جو اس کے چاہنے والوں کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ سفر کی خواہش انسان کے تخیل کو مسافر بنا دیتی ہے اور حقیقی سفر انسان کو!

مسافر کو سفر کا حوصلہ عطا کرنے والا محرک کیا ہے؟ وسائل؟ بہت سوں کو میسر ہیں مگر وہ مسافر نہیں! مسافر کو سفر پر جانے سے کیا چیز روک سکتی ہے؟ وابستگی، آرام و آسائش سے دستبرداری اور ان ہونی کا خوف؟

مگر کیا مسافر رکتا ہے؟

اور اگر مسافر عورت ہو، تنہا ہو اور پاکستانی سماج کا حصہ ہو تو۔۔۔ قابل داد!! پاکستانی معاشرہ عورت کو بھلے بہت کچھ دیتا ہو۔ مگر مسافرت اختیار کرنے کی آزادی؟ شاذ و نادر۔۔۔ ایسے میں اگر کوئی اسی جنم میں اپنی خواہش کو حسرت کے درجے پر پہنچنے سے روک پائے تو اعصاب یقیناً "قابل رشک قرار دیے جاسکتے ہیں۔" زیر نظر کتاب ایک ایسی ہی خاتون سے ملاقات کا ذریعہ ہے جن کو مسافر بننے سے نہ کسی وابستگی نے روکا اور نہ ہی زندگی کے ان سب جھمیلوں نے۔ جن میں ہر کوئی یہ سوچ کر الجھا رہا ہے کہ جب یہ ختم ہوں گے۔ تب!

مگر آفرین ہے ہر اس مسافر پر۔ جو تب کے بجائے اب اور ابھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر مسافر کی تقدیر دوسرے بہت سوں سے خود بخود منفرد ٹھہرتی ہے!

لگن پالینے کا سودا ہے، جو من میں سما جائے تو پھر چین سے بیٹھنا؟ سفر پر لکھنا کسی ایسے ہی جذبے کا مظہر ہے جو ہم جیسے گھس گھسنوں کے لیے قابل رشک ہے مگر سفر کو جستجو اور دریافت کا ذریعہ بنا دینا۔ ناواقف

علی بابا چالیس چور کی مرجانہ، شہر زاد اور شہریار کے کرداروں کو مجسم دیکھنا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس کے بچپن کی طلسماتی کیفیت سے ملوانے کا تجربہ ہے! تو چلیے جھلکیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں!

سفر وسیلہ ظفر ضرور ہے لیکن صعوبت بھی سفر سے مشروط ہے۔ یعنی پکی پکانی کھیر صرف گھر میں مل سکتی ہے اور لذت دریافت کو پانے کے لیے خود کو حالات کی سختی، موسم کی شدت اور تمام تر متوقع کمی بیشی کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اور خاتون کا تو کل سونے پہ سہاگہ! وابستگی سے مراد رشتے ناتے تھے، اور خاتون، وادی، نانی کے رتبے پر فائز، ڈی ہائیڈریشن کی مریض۔ جولائی کا مہینہ اور صحرائی سرزمین کا درجہ

حرارت 55 کو پہنچا ہوا۔

”پانی تو ایسا تھا کیتلی میں پی ڈالو اور دم پر لگا لو۔ تیل کے گھر میں ہونے کے باوجود گاڑی کا ایر کنڈیشنر آن نہیں تھا۔ کھلے شیشوں سے دواغ کی ہوا افرائے مارتی اندر آتی تھی۔“

زیارتی پیکج پر عراق جانے والے ایک گروہ کے ساتھ ان کو جانے کا موقع ملا تو ٹھہرنے کا موقع اور سہولیات بھی اسی حساب سے تھیں۔ سفر برنگنے سے پہلے عراق کے موسمی دار سے بچنے کے لیے ہمہ وقت ابر کے ٹکڑے کی فرمائش بھی نوٹ کروائی۔ بھئی دینے والے کی مرضی ہے۔ تو مانگنے والے بھی اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ جو چاہے مانگ لیں۔ مانگنا ہی تو دراصل شان کبریائی کا اعتراف ہے۔

لیکن بعض نعمتوں کا ظہور مانوس نہیں لگتا کیونکہ وہ مطلوبہ سائچے میں ڈھل کر سامنے نہیں آتا۔ ہم گمان کی دھند میں چھپی حقیقت کو پہچان نہیں پاتے۔ مگر وہ بادل کا ٹکڑا نہ سی اخلاق کی صورت میں ظاہر ہو گیا!

اخلاق۔ تاریخ، سیاحت اور گائیڈ سے دلچسپی رکھنے والا نوجوان ٹیکسی ڈرائیور۔ ایم ایس سی کیمیکل انجینئرنگ بمباری میں مارے گئے خاندان کا صدمہ

لیے ایک بار خود کشی کی کوشش کے بعد اس پیشے سے وابستہ۔ پیارا اخلاق!

اہم مقامات، راستوں کا انتخاب، موسم کے مطابق سفر اور آرام کے اوقات کا تعین، اہم افراد سے ملاقات، سوال جواب اور معلومات کا ذریعہ، دن رات اخلاق کا ساتھ میسر رہا۔ تو کیا بادل کا ٹکڑا۔؟

خیر یہ تو میرے خیال کی اختراع رہی۔ چلیے۔ عراق اور جانی عراقیوں کا حال اور احوال صدام حسین کے بارے میں دو مختلف موقف سامنے آئے۔ اور امریکہ کے بارے میں ایک۔

لفظ امریکہ کہنے کی دیر تھی۔ دونوں بوڑھیوں نے انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ کیسا حزن و یاس آنکھوں میں ابھرا تھا؟ کیسی بے بسی کا اظہار تھا چہرے پر؟

”امریکہ اور برطانیہ ہمارے تین لاکھ سے زائد معصوم بچوں کے قاتل ہیں۔ میں نے بڑوں کی گنتی نہیں کی۔ انہوں نے صدام کو تو ہٹا دیا مگر ملک برباد کر دیا۔ وہ ہمارے لیے نہیں اپنے مقاصد کے لیے آئے ہیں۔“ اور ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ تھی۔ ”وہ ہمیں آزادی دلانے نہیں بلکہ حملہ آور بن کر ہمارا تیل لوٹنے آئے ہیں؟“

”اس جمہوریت کے علم بردار نے جو ہمیں آمر سے آزاد کروانے آیا تھا۔ اس نے قید خانوں کو Taboo بنا دیا ہے۔ خوب صورت عورتوں کے شوہروں کی پکڑ دھکڑ، ان کا گھروں کے اندر سے اغوا، ان کی عصمت ریزی، بعد میں کہیں انہیں جلائے، کہیں پھینکنے، کہیں زندہ صورت جیلوں میں ٹھونسنے، کہیں ان کی دوسرے ملکوں میں اسمگلنگ، بچے کہیں، مائیں کہیں اور شوہر کہیں۔“

یہ ایک سرگرم عراقی خاتون کا اظہار خیال تھا اور دیکھیے عراقی خاتون کی سیاسی بالغ نظری کا ایک عمدہ اظہار۔

”شیعہ مسلک سے تعلق کے باوجود مجھے حکومت کا

یہ روئیہ قطعی پسند نہیں۔ امریکی ان کے سونڈھوں پر سوار ہیں۔ سنی عورتیں اس تشدد کا زیادہ نشانہ بنیں اور بن رہی ہیں۔ ابھی بھی جیلوں میں بے شمار ہیں۔ جنہوں نے مزاحمت کی اور مقامی پولیس اہلکاروں اور امریکی فوجیوں کو قتل کیا۔“

عراق عوام کا سیاسی شعور اور بالغ نظری متاثر کن ہے۔ ایک ہی جگہ پر بیٹھے ہوئے لوگ مختلف موقف کا اظہار نہایت آزادی اور آسانی کے ساتھ کرتے ہیں جبکہ ہمارے لیے یہ خاصا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھیں ایک میاں بیوی سے کی گئی گفتگو اور ان کی مختلف آرا۔

”صدام نے ہر عراقی کو پڑھا لکھا بنایا۔ یہ کریڈٹ اسے دینا پڑے گا۔ صحت کو اس نے بڑی اہمیت دی۔ پورے عراق میں تقریباً دو سو پچاس فلٹریشن پلانٹ لگائے۔ صنعتیں اس کی ترجیح تھیں۔ وہ اول و آخر ایک عراقی تھا۔ ظالم و جابر تھا۔ آزادی رائے پر پابندی تھی مگر لوگوں کی بہتری اور خوشحالی کا خواہاں تھا۔ (بیوی)

”اندازاً“ کوئی پونے تین لاکھ ایرانی ڈھائی لاکھ عراقی اس بے کار جنگ میں ختم ہوئے۔ کوئی اسی ہزار تعداد زخمیوں اور دس لاکھ کے قریب متاثرین تھے۔ دنیا نے تماشا دیکھا اور اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور خوش ہوئے کہ دو مسلمان ملک جو بڑھتی ہوئی طاقت تھے کمزور ہوئے۔ کاش صدام سمجھ دار ہوتا۔ کاش امام خمینی بصیرت سے کام لیتے اور دونوں ملک تباہ ہونے سے بچ جاتے۔“ (شوہر)

خلیج جنگ کے اسباب و نتائج ہوں، عراق پر عائد پابندی یا انا کی بھینٹ چڑھنے والے ایرانی، عراقی مسلم کے خون کی ارزانی کا ذکر ہو۔ صدام براہ راست ایک اہم کردار ہے۔ اس کی وجہ سے کیا ہوا۔ جو ہوا۔ اس کو روکا جاسکتا تھا، اس کی ذاتی زندگی، خود پرستی، قسم مزاحی کی تفصیلات اہم عراقی شخصیات اور عام لوگوں سے گفتگو کے نتیجے میں ہماری فہم تک رسائی حاصل کرتی ہیں اور نتیجہ؟ فرد واحد کی انا نے غاصب قوتوں کو

گھر کے اندر تک کا راستہ دکھایا۔ اور اپنے لوگوں کو کرب و بلا میں مبتلا کر کے۔ صدام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

عراق۔؟ مگر۔ زندگی۔۔۔ رواں دواں ہے! ”یورینیم شیلوں کی بھرمار نے ماحول کو، زمین کو اور پانیوں کو زہر آلود کر دیا ہے۔ اب اس صدر شئی کا حال سن لیجئے جہاں بم شیلنگ نے بڑے بڑے گڑھے پیدا کر دیے ہیں۔ پینے کے پانی اور سیوریج کے پائپوں میں سوراخ ہو جانے سے دونوں کے پانی مل گئے ہیں۔ آب زہریلا جا رہا ہے۔ ایسے میں عراق کی ماہر سائنس دان مائکرو بیا لو جی میں لی ایچ ڈی ڈاکٹریدی میری اماش جب اس پر آواز اٹھاتی تھی تو اس ثبوت کے ساتھ کہ عراقی فصلوں اور بچوں میں یہ بیماریاں پہلے کبھی نہیں تھیں

جتنی خلیج کی جنگ کے بعد ہوئی ہیں تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یہی سلوک ہماری دوسری سائنس دان ڈاکٹر رہا بظ کے ساتھ ہوا۔“

”آخر یہ کیسیائی مواد صدام کے ہاتھوں کیوں بیچا گیا؟ اسے گیس بنانے کی اجازت کیوں دی گئی؟ کروڑوں اور ایرانیوں کا ختم مارنے کے لیے کہ شاہ ایران کے بعد انہیں مشرق وسطیٰ میں اپنے مطلب کا بندہ چاہیے تھا۔“

یہ عراقی فوج کے سابق کرنل کے ساتھ ملاقات میں ہونے والی گفتگو تھی۔ جس میں پاکستان کا ذکر بھی ہوا۔ ہمارے ایک آمر نے فلسطینیوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔۔۔ بیشتر پاکستانی تاحال اس سے بے خبر ہیں۔۔۔ خیر بے خبری تو ہمارا طرہ امتیاز بنتی جا رہی ہے کیونکہ خبر کا معیار شاویوں، طلا قوں اور عدالت میں پیشیوں کو چٹ پٹا کرنے کی سطح پر آچکا ہے۔

”ذرا پل بھر کے لیے سوچیں کہ آپ عراقی ہیں۔ آپ کی سرزمین اور اس کی باسیوں کو بے موت مارا جا رہا ہو تو آپ کے لیے ممکن ہے کہ آپ نہ بولیں۔ اپنی آواز بلند نہ کریں۔ نتیجتاً گرفتاری، جیل جانا اور پھانسی کے پھندے پر چڑھنا آپ کا مقدر بنتا ہے۔“

آپ ہتھیار اٹھاتے ہیں بقول ان بڑے ملکوں کی وضع کردہ اصطلاح کے دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ خود مرتے اور دس لوگوں کو مارتے ہیں مگر یہ سب ہو گا۔ جتنی ہمت، استعداد اور آپ جس مقام پر ہیں آپ نے اسے استعمال کرنا ہے اگر آپ میں اخلاص ہے اور آپ کو اپنے وطن سے محبت ہے۔“

مسلمان حکمرانوں کو واحد چیز جو درکار ہے، خوف خدا ہے اور اسی کا قحط و راصل حکمرانی اور آمریت کی بدترین مثالیں قائم کرتا ہے! عراقی عوام کا سیاسی شعور میں بالغ نظری کا مظاہرہ عام دکھائی دیتا ہے۔ مگر عوام کے پختہ شعور کے وارث، حکمران بن بیٹھتے ہیں اور اس معاملے میں مسلم اقوام کا حل چھپا ہوا کب ہے۔؟

تحریر اپنے لکھنے والے کا حال دل تو بیان کرتی ہی ہے۔ کچھ راز مزاج کے بھی کھولتی ہے۔ سلمیٰ اعوان کی تحریر میں موجود سادگی و راصل ان کی فطری سادگی ہے۔ درویشی، توکل اور ممتا کے جذبات کا خمیر و راصل خلوص نیت سے اٹھتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ بھی خود کو اس محبت کے دائرے میں موجود پاتے ہیں۔ کیسے؟ احساس کی شراکت کے ذریعے! روزمرہ زبان میں سادہ تراکیب اور مادری زبان کا تڑکا و راصل ان کی تکلف برطرف طبیعت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور محبت کی وسعتوں سے لطف اندوز ہونا ہو تو تکلف نامی رکاوٹیں راستے میں کہاں ٹھہرتی ہیں؟ ہر خطر مقامات کا سفر، خطرہ مول لینے کی عادت تو ہے مگر خود کو کائنات کے رب کے سپرد کرنے کا وتیرہ بھی شامل حال ہے۔ جو بھی جیسا بھی ملے۔ نخرے میں وقت کا ضیاع بالکل نہیں! مجھے تو لگتا ہے۔ سفر و راصل درویشوں کا ہی طرہ امتیاز ہے۔ وہی کر سکتے ہیں جو میں، کیوں؟ نہیں کے دروازے بند کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں!

خیر۔۔۔ ”صد شکر کمرے میں مناسا فرج تھا۔ کسی سے پلیٹ چھری مانگی۔ کپڑا بچھا کر آدھے تریوز کو دوائی جان کر ٹھونسا۔ صبح سے اناج بنام کی ایک کھیل اندر نہیں گئی تھی۔ نسرین اوٹھتی تھی۔ فرج میں بقیہ آدھا رکھ

کر اسے کھانے کا کہا۔ منہ ہاتھ دھویا۔“

”ناشتہ حسب معمول غریبانہ سا تھا۔ تین چار عورتیں پرائیٹھے پکانے میں ہلکان ہو گئی تھیں۔ رات کا سالن تھا اور چائے۔ چلو شکر، نوبے اٹھ کر بغیر کہیں جائے یہ نیم ٹھنڈا نیم گرم نصیب تھا۔“

”آنسو پونچھتی، ناک صاف کرتی اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ نسرین نے کوئی دو بجے اٹھایا۔ وہ میرا اور اپنا کھانا لے آئی تھی۔ گروپ کے سی صاحب کی نیاز کا مزے وار کھانا۔“ چلیں یہ تو درویشی سامان طعام تھا۔ مگر جہاں جہاں ان کی میزبانی کی گئی تو عراقیوں کی مہمانداری کا لازمی جزو قہوہ اور کھجور رہا۔“ چائے کے نام پر تو وہی کڑوا کیلا قہوہ تھا

پر ساتھ میں ایک پلیٹ میں کھجوریں تھیں۔ مغز اخروٹ میں گندھی ہوئی۔ کیا مزے کی چیز تھی۔“

چھوٹی سی نان نما روٹی پر کریم اور تازہ گھی نکالی ہوئی کھجوروں کا لیپ سا کیا ہوا تھا۔ (خبض) جانیے عراق کے کھانے اور ان کے نام۔۔۔

تب ہی بڑے سے طباق میں تلوں سے سجا شد بھرے کوٹ سے دمکتا جلیبی جیسے بلوں میں الجھا گرم گرم سمون خوشبو میں اڑاتا کمرے میں آکر تپائی پر سج گیا تھا۔“

”ابلے ہوئے چاولوں کا ڈھیر جس پر بھنا ہوا گوشت، مونگا کٹا ہوا پیاز، ٹماٹر، کھیرے کا سلاو۔ آفتابہ آیا، وہیں ہاتھ دھلائے گئے اور سب بمعہ اس عمر رسیدہ کھانا لانے والے کے، سنی کے گرد بیٹھ گئے اور ہاتھوں سے کھانا شروع ہو گیا۔

بغداد۔۔۔ قدیم تہذیب، علم و ہنر کا عالمی گہوارہ۔۔۔ دجلہ اور فرات کے بغیر اس کا ذکر ادھورا ہے۔ کتابوں سے محبت کا ورثہ آج بھی روشن حوالہ ہے۔ ہارون رشید اور زبیدہ کا بغداد۔۔۔ خلیفہ منصور، جعفر برکی اور مستنصر کا بغداد۔۔۔ امام غزالی، امام ابوحنیفہ، جنید بغدادی، معروف کرخی، عبد القادر جیلانی کا بغداد، الف لیلیٰ کا بغداد۔۔۔ دیکھیے کچھ قدیم اور جدید بغداد کی جھلکیاں۔!

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”خليفة منصور نے بغداد کی بنیاد رکھی تو اپنی پوری مملکت سے نامی گرامی کاریگر ماہر تعمیرات اور جید ریاضی دان بلوائے کہ عمارتیں اصول ہندسہ کے مطابق تعمیر ہوں۔ ان ماہرین کے افسر اعلیٰ امام ابو حنیفہ تھے۔ امام اعظم نے ایک ایک اینٹ شمار کرنے کے بجائے لکڑی کے لمبے پیمانوں سے اینٹیں ماپنے کا طریقہ رائج کیا۔ بعد میں ان کا یہی طریقہ رائج ہوا۔“

”دجلہ کی اہمیت مقدم کہ عراق کا دل بغداد اور بغداد کی جان دجلہ اس کے پانیوں نے شاہوں کے بے وفائیوں اور قہر و غتاب کے دکھ جھیلے ہیں۔ جعفر برکلی کی لاش کے تین ٹکڑے دجلہ کے تین پلوں پر لٹکائے گئے اور سراسر اس پل پر جسے باب المدام کہتے ہیں۔ ذہانت، فطانت و سخاوت اور خلیفوں سے محبت و رفاقت اور وفاداری جیسی خوبیوں سے مالا مال یہ سر زمینوں اس پل پر لٹکا شہریوں کے لیے سامان عبرت اور پانیوں کے لیے وجہ غم و درد بنا رہا۔“

سیدون اسٹریٹ کی اندرونی گلیوں میں پرانے بغداد کی وہ جھلکیاں تھیں جنہیں دیکھنے کے لیے میں مری جا رہی تھی۔ وہی تنگ تنگ گلیاں، چھجے دار بالکونیاں، محرابی لمبی کھڑکیاں، گلیوں میں گھلتے تنگ تنگ دروازے، گھروں پر برستی کہنہ جی، کہیں کہیں کوئی نیا بنا ہوا گھر۔ قہوہ کیفے کے دکانیں، حقہ پیتے، تاش کھیلتے لوگ۔“

اعتنائی سٹریٹ، دسویں صدی کے ایک ایسے شاعر کے نام سے منسوب ہے، جو اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ منہجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ جس کا کہنا تھا، جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔ میرا کاغذ، قلم اور حرف اس سے زیادہ موثر ہیں۔“ تکبر ذات کا نشہ چڑھا تو پیغمبری کا دعوا بھی کر دیا۔ سیاسی خواہشوں کا ہیجان تھا۔ قید بامشقت بھی کالی اور اپنی خواہشوں میں ناکام بھی ہوا۔ مگر شاعر کے طور پر کمال کو پہنچا۔

بغداد نے اپنے دور کی عظیم علامت کو یاد رکھا ہوا ہے! علی بابا اسکو آروہ جگہ ہے جہاں الف لیلیٰ کے کرداروں اور مناظر کو مجسموں کی صورت نصب کر کے

دنیا بھر کے سیاحوں اور ان کرداروں کے مداحوں کی سرت کا سامان کیا گیا ہے۔

بغداد کا ایک حوالہ عالمی معیار کی درس گاہوں کی کثرت بھی ہے۔ درس گاہوں، کتب خانوں اور کتابوں سے محبت کا ورثہ عراقی آج بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

”اتنی بڑی دکان تھی کہ میں حیرت سے گنگ اسے دیکھے چلے جاتی تھی۔ لڑکا مجھے لے کر غری سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اترے۔ یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادنیٰ چہرہ تھا۔ جہاں چوبلی ہنچوں پر دھڑے خوب صورت گدے نما کشنوں پر چند لوگ بیٹھے تھے کے کشن لگاتے، بحث و مباحثے میں الجھے ہوئے دکھے تھے۔“

چلیے۔۔۔ مستنصریہ۔۔۔!

”میں پہلے ایوان سے پہلے صحن میں داخل ہو کر ساکت کھڑی اپنے سامنے زردی مائل مٹی رنگ کی اینٹوں سے بنی دو منزلہ عمارت کی بالکونیوں، ان پر کندہ بھاری پٹیوں کو دیکھتی تھی۔ دنیا کا عظیم ترین، قدیم ترین صدیوں کا اثاثہ سنبھالے، میلوں کے رقبے میں پھیلی یہ درس گاہ اپنی عظمتوں کے ساتھ اس عہد کو خراج پیش کر رہی تھی جو کبھی تہذیب و ثقافت کا دنیا بھر میں مرکز تھا۔ جہاں پر پڑھنے کے لیے پوری اسلامی دنیا سے طلبہ آتے اور ریاضی، ادب، طب، فلسفہ، انجینئرنگ، قانون اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سنی مسلک کے چاروں عقائد، حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی کے لیے الگ الگ ڈپارٹمنٹ تھے۔“

”تعمیر کا سال 526ھ یا 1226 کہہ لیجیے۔ بننے میں کوئی چھ سال لگے۔ بنانے والے کا ذوق کہ دجلہ کو ہمسایہ بنایا۔ کشادہ کمریے طلبہ کے کلاس روم تھے۔ ان کی اقامت گاہیں تھیں۔ کاغذ، قلم، روشنائی کی فراہمی مدرسے کی ذمہ داری، ہوسٹل میں طلبہ کو کھانے پینے سے لے کر میڈیکل تک کی سہولت بھی حاصل تھی۔“

”شاہی کتب خانے سے 160 اونٹوں پر لاوا کر کتابیں یہاں لائی گئی تھیں۔ انہیں اس انداز میں

ترتیب دیا گیا تھا کہ طلبہ آسانی سے جو کتاب نکالنا چاہتے نکال لیتے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی لائبریری میں اسی ہزار کتابیں تھیں۔“
مستنصر کو علم سے محبت تھی جس کا اظہار مستنصر کے ہر انداز سے تھا۔“

جی۔۔۔ اپنے عہد میں حکمران جس چیز سے محبت کرتے ہیں، اسی کی نشانیاں چھوڑ کر جاتے ہیں۔۔۔ ہمارے خطے میں۔۔۔!

”حمورابی Oblish دیکھی۔ سنگ مرمر کی اس بلندو بالا چہار پہلو ستون نے چوراہے کو سجا رکھا تھا۔ بابل کا عظیم بادشاہ حمورابی، دنیا کا پہلا قانون ساز جس کے دو سو بیاسی مکاتیب آج بھی قانون دانوں کو حیرت زدہ کرتے ہیں۔“

”بابل کے باغات تو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہونے کا شہرہ رکھتے ہیں۔۔۔ مگر بادشاہ حمورابی اور اس کے کارناموں سے جانکاری پہلی مرتبہ ہوئی۔۔۔ اور یہ بھی کہ باغات کیوں اور کیسے بنوائے گئے۔۔۔ ہر عہد اپنی نشانیاں چھوڑ کر جاتا ہے اور وہ نشانی آنے والے زمانوں کو اس کمال کی ذوق اور ذہنی ایچ کی خبر دیتی ہے۔!

ہم جس عہد میں جی رہے ہیں۔۔۔ آنے والے زمانوں کو کیا خبر ملے گی؟ مکہ اور مدینہ کے بعد مسلم دنیا کے لیے زیارت کے حوالے سے تیسرا مقدس ترین شہر نجف اشرف!

شیر خدا کے شہر کی قدم بوسی، مزار کا منظر اور عقیدت کا احوال دلکش ہے۔ عراق کی تاریخی، علمی، مذہبی، سیاسی اور جغرافیائی اہمیت جان لینے کے بعد اپنی کم علمی کا اعتراف تو کرنا ہی پڑتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اگر دنیا میں مہم جو نہ ہوتے تو۔۔۔ دنیا کو دوسرے خطوں کی خبر کیسے ملتی؟

تقدیر کا آخری باب ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے جب تک کہ ہم خود اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیں۔ کتاب کا سراپا۔۔۔ لکھتے وقت، خاتون کو آخری باب کے احوال کی خبر۔۔۔ ہر بھی ان کا حوصلہ برقرار رہا

۔۔۔ ایک بُرے واقعے کے بعد وہ اپنے تمام تر کیمہ ریکارڈ سے محروم ہو گئیں۔۔۔ جس کا ذکر ’دلگھڑا ہے!‘ اور اختتامی نوٹ ’تاریخ کی ایک خاص خاتون‘ ایک تو خاتون اور پھر اتنی خاص، جرؤڈ بیل کے اوپر ہے۔۔۔ اس کے کارنامے ایک ہی باب میں تعارف کے طور پر شامل ہیں۔۔۔ 1868ء میں پیدا ہوئیں۔۔۔ برطانیہ میں اور بلوغت کی عمر تک مشرق وسطیٰ کے سحر میں جکڑی گئیں۔۔۔ اور پھر یہیں کی ہو رہیں۔۔۔ زبانوں پر عبور حاصل کیا۔۔۔ مقامی کچر کا جائزہ لیا۔۔۔ پہاڑ کی چوٹیاں سرکیں اور تقدیر نے ان سے عراق کی بنیاد رکھنے کا کام لیا۔ بانی عراق کہلائیں۔۔۔ مزید کے لیے کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

تحریر ذریعہ مواصلات تو نہیں مگر یہ آپ کو دور دیں لے جانے کا وصف رکھتی ہے۔ لفظ اس کا ایندھن ہیں اور مطالعہ اس کا ڈرائیور۔۔۔!

ہر مسافر اپنے سفر میں دوسروں کو شریک کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور اگر کوئی ایسا کرے تو شریک ہونے والوں کو شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ یقین کریں، شکر گزاری بہت خاص بنا دیتی ہے۔ اس کو بھی جس کے پاس بہت کچھ ہے۔۔۔ اور اس کو بھی جس کے پاس وہ سب نہیں۔۔۔!

قارئین سے

علاست اس طویل غیر حاضری کی وجہ تھی۔۔۔ جو میں پوچھے بغیر بتانے کو اپنا فرض خیال کرتی ہوں۔ بعض اوقات صلاحیت، شوق، وسائل۔۔۔ ان سب کی موجودگی بھی آپ کو مائل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ ایسے میں یاد دہانی بند کواڑوں پر دستک جیسا اثر رکھتی ہے۔ ان سطور کے ذریعے ان احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جنہوں نے اپنی محبت اور خلوص سے۔۔۔ کاغذ اور قلم سے میرے تعلق کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ دعاؤں میں شامل رکھنے کی درخواست کے ساتھ تبصرے پر آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ شعاع، پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے سلامتی اور عافیت۔۔۔ دعائیں!

(آمنہ زریں)

READING
Section

یکتھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو" سے لگاؤ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سناچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالا خرا ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹ اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹ سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

پچھیسوین قینڈل

Downloaded From
Paksociety.com



Downloaded From
Paksocietyty.com

REA
Sect



ورودہ سامنے کھڑے شہزاد کو دیکھ کر لمحہ بھر کو چونک سی گئی۔
 ”واثق بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔“ اس کے تعارف کرانے پر اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ”وہ آفس میں ہوں گے۔“ وہ رک کر پھر سے بولی۔

ورودہ پنک کمر کے سادہ سے سوٹ میں لاپرواہی سے دوپٹا کندھوں کے اطراف ڈالے شہزاد کو گلابی شام کا ہی کوئی حصہ لگی۔

اس کے سیدھے سیاہ ریشمی بالوں کی لٹیں چہرے کے دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ آنکھوں میں بچوں کی سی معصومیت اور سادگی تھی۔

شہزاد لمحہ بھر کو بھول ہی گیا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا۔
 ”تو کیا آپ سیٹ کریں گے بھائی کا۔“ اس کی اتنی لمبی چپ سے ورودہ نے یہی اخذ کیا تو پوچھنے لگی۔
 ”آپ کی ماما آتی ہیں عاصمہ آنٹی تو گھر پر ہوں گی۔“ اسے لمحہ موجود میں آنے میں چند ثانیے لگے اور ورودہ اس کی اس بات پر مزید حیران سی ہو گئی۔

”ماما۔۔۔ ماما سے آپ کو کیا کام ہے؟“ وہ اپنی حیرانی چھپا نہیں سکی تو پوچھنے لگی۔
 ”ابکچو کلی مجھے آنٹی ہی سے کام ہے پلیز اگر آپ انہیں جا کر بتائیں کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اینڈ اس ارجنٹ۔“

شہزاد کو زیر کی التجائیہ نظریں یاد آئیں تو لہجے میں کچھ منت ہی سمو کر بولا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔
 ”میں کہتی ہوں جا کر ماما سے آپ آجائیں اندر بیٹھ جائیں۔“ اسے جاتے جاتے خیال آگیا تو اسے دعوت دیتے ہوئے کہہ گئی۔

”تھمنکس۔ آپ ورودہ ہیں نا۔“ وہ اس کی دعوت پر نظروں میں پسندیدگی لیے اسے دیکھ کر بولا۔
 ”آپ۔۔۔ کو۔۔۔ میرا نام معلوم ہے؟“ وہ کچھ ناپسندیدگی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”واثق کافی ذکر کرتا ہے تو۔۔۔“ وہ صفائی دینے والے انداز میں جلدی سے کہہ گیا۔
 ”آپ پلیز بیٹھیں یہاں میں ماما کو آپ کا پیغام دے کر آتی ہوں۔“ وہ کچھ ناراض سی ہو کر اسے بیٹھنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔

شہزاد احتیاط سے ہاتھ میں پکڑا بڑا سالفا فہ اپنے ساتھ رکھتے ہوئے لاؤنج میں بیٹھ گیا۔
 ”معلوم نہیں عاصمہ آنٹی کس طرح ری ایکٹ کریں۔“ وہ انتظار کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔



”آپ شاید ناراض ہیں مجھ سے۔“ پری زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ واثق نے سختی سے ہونٹ بھیچ رکھے تھے۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ جیسے بات ہی نہیں کرنا چاہتا ہو۔ پری اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

”واثق! آپ شاید مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے، لیکن جس طرح آپ مجبور ہیں اسی طرح میں بھی مجبور ہوں۔ اپنے دل اور اپنے جذباتوں کے ہاتھوں۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں۔ میں اپنے دل سے آپ کی خواہش کمرچ کر نکال دوں۔“

بولتے بولتے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے جذبات چھپاتا تو نہیں چاہ رہی تھی لیکن جانے کیوں دل بھر آ رہا تھا۔

READING
Section

میں نے بہت کوشش کی واثق۔ پلیز آپ مجھے معاف کر دیں ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کچھ برا نہیں کرنا چاہتی مگر میں بے بس ہوں رہی۔ اس نے بہت آہستگی سے واثق کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ واثق کو جیسے کسی سانپ نے ڈنکسا مارا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پرے کھینچا تھا۔

”صرف تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے میں تمہیں لفٹ نہیں دینا چاہتا تھا“ کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم باز نہیں رہ سکتیں۔“

وہ نفرت بھرے لہجے میں پھنکار کر بولا۔

”میں بتا چکی ہوں آپ کو“ نہیں ہے میرا خود پر اختیار۔“ وہ یوں ہاتھ پرے جھٹکے جانے پر زخم خوردہ لہجے میں چیخی تھی۔

”تو بہتر ہے پھر اپنا کہیں سے علاج کراؤ یا جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے، وہ کرو لیکن مجھ سے کوئی امید کبھی نہیں رکھنا“ نہ میرے رستے میں یوں بار بار آکر میرا دماغ خراب کرو۔“ وہ اسی نفرت بھرے لہجے میں غرا کر بولا، جیسے پہلے چلایا تھا۔

پری کو شدید ذلت کا احساس ہوا تھا۔

”تمہیں چاہوں تو تمہاری یہ گھٹیا حرکتیں تمہارے فادر کو بتا سکتا ہوں لیکن خدا کی قسم مجھے ان کی عزت کی شرمسار دیتی ہے، وہ اتنے اچھے رکھ رکھاؤ والے انسان ہیں اور میرا دل کبھی یہ ماننے سے بھی انکار کرتا ہے کہ تم واقعی میں ان کی بیٹی ہو بھی یا نہیں۔“ وہ حقارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سٹ اپ۔ آپ کو مجھے گالی بولنے کا کوئی حق نہیں۔“ پری کا چہرہ شدید غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

”اگر تم غور کرو تو تم صرف گالی کی مستحق نہیں ہو،“ وہ حقارت سے بولا تو پری کا جی چاہا وہیں چلتی گاڑی سے کود جائے۔

”روکیں گاڑی! اترنا چاہتی ہوں میں۔“ وہ غصے میں کانپتی آواز میں چیخی۔

”میں نے تمہیں گھر تک ڈراپ کر دیا ہے“ آخری بار تمہیں سمجھا رہا ہوں، خود کو سنبھال لو تو زیادہ بہتر ہے، ورنہ کسی دن زیادہ بڑا نقصان اٹھاؤ گی۔ اگر تمہیں اپنا نہیں تو اپنے باپ کی عزت کا ہی کچھ خیال کر لو۔“ واثق نے جھٹکے سے بریک لگائی تھی۔

پری کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ہوئے بچا تھا۔

”شاید میں پہلے اس بارے میں کچھ سوچ لیتی لیکن اب چاہے میں فائدے میں رہوں یا بہت بڑا نقصان اٹھاؤں میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ وہ اسے چیلنج کرنے والے انداز میں غرا کر بولی۔

”اس سے تو بہتر ہے تم خود کشی کر لو، اگر ایسا ہی خود کو تباہ کرنے کا شوق ہے تو۔“ واثق نے تمسخر سے اسے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

پری غصے میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

”اس کا فیصلہ آنے والے کچھ دنوں میں ہو جائے گا، ہم تینوں میں سے خود کشی کون کرتا ہے۔ آپ میں یا وہ مثال۔“ کہہ کر اسے دیکھتی رہی، پھر گاڑی کا دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گئی۔

اور گلی کے موڑ پر آتی مثال سکتے کے عالم میں دور جاتی واثق کی گاڑی کو دیکھتی رہ گئی۔

”مجھے لاکھ روپے۔“ دانی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

READING
Section

”کچھ بھی نہیں ہے یہ رقم اسٹن میں تو آپ ساتھ کے کسی پڑوسی ملک میں نہیں جاسکتے، وہی وزٹ نہیں کر سکتے، تمہیں تو یار! دنیا کا کچھ بھی پتا نہیں ہے۔“ جاوید منہ بنا کر بولا۔
والی کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

”لیکن میں اتنی بڑی آئی مین اتنی رقم ارتیج نہیں کر سکتا۔“ اس نے دل کڑا کر کہا ہی دیا۔
جاوید اور اس کا دوست اسے تاسف سے دیکھتے رہے۔

”اوکے جیسے تمہاری مرضی۔ میرے پاس تو تین چار اور آپشنز بھی ہیں اور وہ شام سے پہلے مجھے رقم بھی دے دیں گے۔ مجھ سے تو تمہارے اس دوست نے تمہارے لیے بڑی منت سماجت کی تھی تو میں نے تمہارے بارے میں سوچا اپنی دے ہم نکلتے ہیں۔“ جاوید کندھے جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔
”یار! تم بہت بچھتاؤ گے، یہ گولڈن چانس تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتے اڑیاں رگڑتے یہیں پڑے رہو گے اور وہ شہری لوگ تمہیں جینے دیں گے نہ مرنے۔“ اس کا دوست اسے شرمندہ کرتے ہوئے کچھ خوف زدہ کر رہا تھا۔

”جانتا ہوں یار! لیکن یہ رقم۔“ والی ہتھیلیاں مسل کر بولا۔
”یار! طریقہ بتایا تو تھا میں نے آج شام تک اگر بندوبست نہیں کر سکا تو کھیل ختم، اوکے۔“ والی پریشان سا اسے دیکھتا رہا۔ کھیل تو اسے ختم نہیں کرنا تھا۔



”تمہارے پایا آفس چلے گئے مگر ٹھیک نہیں ہوتے تو نہیں جاتے۔“ عفت کے چہرے پر لکھی ناگواری صاف پڑھی جا رہی تھی۔

”میری دن میں بھی ان سے بات ہوئی تھی۔ ہی از آل رائٹ۔ مگر ظاہر ہے تمہیں ان کو دیکھے بغیر چین تو ملے گا نہیں، اگر تم یہ سب نہیں کر سکتی تو ان کو کیسے پتا چلے گا کہ تم ان سے کتنا پیار کرتی ہو۔“ آخر میں اس کا لہجہ طنز اور حقارت سے بھرا تھا۔

”ٹھیک کہا آپ نے عفت ماما! میں جب تک انہیں دیکھوں گی نہیں تو مجھے واقعی میں سکون نہیں ملے گا۔“ وہ عفت کو جواب دیتے ہوئے قدرے اطمینان سے بولی۔ عفت جل کر رہ گئی۔
”آج کل تو خیر وہ یوں بھی آفس سے لیٹ آتے ہیں، کوئی بہت خاص پروجیکٹ ملا ہوا ہے انہیں۔“ وہ پھر سے ایک نیا بہانہ گھڑتے ہوئے بولی۔

”اب آئی ہوں تو کچھ انتظار کر لوں گی، انہیں دیکھنا تو ہے مجھے۔“ وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے میگزین اٹھا کر بولی۔

وہ اب میگزین کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ عفت کو فٹ سے اسے دیکھتی رہی۔
”مجھے جانا تھا ایک ضروری کام ہے۔“ وہ جیسے منہ میں بڑبڑاتی۔

”میں نے آپ کو رکنے کے لیے تو نہیں کہا۔ آپ کو جہاں جانا ہے آپ چلی جائیں۔“ وہ سر ہلا کر بولی تھی۔ ”یا آپ کو لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے آپ گھر اکیلا چھوڑ کر میری موجودگی میں نہیں جانا چاہتیں۔“ وہ ڈنکار کچھ طنز سے بولی تھی۔

”سمجھ دار تو تمہیں نہیں کہوں گی۔“

”بہت ہوشیار۔۔۔ چالاک بلکہ مکار سمجھتی ہی نہیں۔ مانتی بھی ہیں آپ مجھے۔“ وہ تیزی سے عفت کی بات

کالت کر بولی۔

”تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟“ عفت کو اس کے اس انداز پر غصہ آگیا۔

”عفت ماما! دلوں کے بھید اللہ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تو اور ہمارے اعمال ہماری تقدیر بناتے ہیں۔ اعمال نیت کے محتاج ہوتے ہیں جس کی جیسی نیت ہوتی ہے اسے اس کا پھل اچھی بری تقدیر کی شکل میں ملتا ہے ہم میں سے کس کی نیت کیسی ہے اس کا فیصلہ آنے والے چند سالوں میں خود بخود ہو جائے گا نہ آپ کو بہت انتظار کرنا پڑے گا نہ مجھے۔ کس کو کیا ملے گا معلوم ہو جائے گا۔“

وہ ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں عفت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”تم مجھے ذلیل کرنے کے لیے یوں برا بھلا کہنے کے لیے میرے گھر میں آئی ہو کہ میری نیت خراب ہے میرے اعمال برے ہیں میری قسمت بہت بری لکھی جا رہی ہے یہ سب بکو اس کرنے آئی ہو تم یہاں۔“ عفت غصے میں تلملا کر رہ گئی تھی۔

مثال تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ آپ۔۔۔“ وہ گہرا سانس لے کر قدرے نرم لہجے میں بولنے لگی۔

”بس کرو اپنے باپ سے ملو اور جاؤ یہاں سے۔ مثال! میں تمہیں اپنی برداشت سے بھی بہت زیادہ سہہ چکی ہوں۔ اس لیے زیادہ بہتر یہی ہو گا کہ تم میرا مزید امتحان نہیں لو۔“

عفت مٹھیاں پیچ کر ضبط کے کن مرحلوں سے گزر رہی تھی مثال کو اندازہ ہو رہا تھا۔

”مطلب؟ میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔۔۔“ وہ شاید عفت کو چڑانے کے لیے پوچھنے لگی۔

”اتنی سادہ نہیں ہو تم۔ بہت بار تم سے براہ راست اور بہت بار ان ڈائریکٹ کہہ چکی ہوں۔ مت آیا کرو یہاں۔ چھوڑو ہمارا پیچھا۔ بخش دو ہمیں۔“ وہ جیسے پھٹ کر بولی۔

”بہت مشکل ہے۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ عفت پھنکاری۔

”میں اپنے لیے دعا نہیں مانگتی صرف اپنے پیار کے لیے مانگتی ہوں ان کی زندگی صحت اور سکون کے لیے۔ اور جب تک میرے پیار ہیں میں یہاں آتی رہوں گی کیونکہ مجھے یقین ہے اللہ پیار کے لیے مانگی ہوئی میری کوئی دعا رد نہیں کرے گا۔“

وہ بہت یقین بڑے مان بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ لہجہ بھر کو تو عفت گنگ سی رہ گئی۔

اس نے ایسی بات کہہ دی تھی جو عفت کو لا جواب کر گئی تھی۔ پری زور سے دروازہ بجاتی اندر آئی تھی۔

مثال نے صرف نفرت بھری نظر سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کان لچ ڈریس کے ساتھ اس کا انداز بالوں کا اسٹائل چہرے کی سنوری نوک پلک اس کی فطرت کی غمازی کر رہے تھے۔

”آپ ہر وقت اس کے ساتھ کیوں سر پھوڑتی رہتی ہیں ماما! یہ لطف۔۔۔ لیتی ہے آپ کو مجھے یوں اذیت پہنچا کر۔“

مت بات کیا کریں اس سے۔ ”وہ اندر آتے ہی نفرت بھرے انداز میں ماں سے بولی تھی۔“

اس کے لہجے میں جو بے زاری اور حقارت تھی۔ وہ مثال کو چونکا گئی۔ اسے کچھ دیر پہلے کا وہ کہہ رہے منظر یاد آگیا۔

”میں کب اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں مگر جب یہ خود بار بار آکر ہماری برداشت کا امتحان لے لے گی تو میں

کتنی دیر تک خاموش رہ سکتی ہوں۔“ عفت چہرے پر مظلومیت اور دکھ سجا کر بولی۔

”کب تک آئے گی مت منہ لگایا کریں اسے خود ہی تھک کر جان چھوڑ دے گی ہماری۔“ وہ ماں کو جیسے دلا سا

دست پہنچا رہی تھی بولی۔ دونوں باتیں کرتی باہر نکل گئی تھیں۔

READING
Section

”مجھے جانا ہے کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر، تم خیال رکھنا۔“ عفت اسے ہدایات دے رہی تھی۔

مثال رنجیدہ اندھال سی صوفے پر گر سی گئی۔

اگر میں واثق سے پوچھوں گی پرنی کے ساتھ آنے کی وجہ۔ تو ایک نیا جھگڑا جبکہ اس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ وہ اس ٹاپک پر نہ تو کوئی آرگو منٹ دے گا نہ بات کرے گا۔ اگر یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا میرے یوں خاموش رہنے سے تو وہ سخت پریشان سی سرپکڑ کر بیٹھ گئی۔



”کیا ہے اس میں؟“ عاصمہ ناگوار نظروں سے سامنے کھڑے شہزاد کو دیکھ کر بولی۔

شہزاد لفافہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ ”آپ کی امانت۔“ وہ مختصراً بولا۔

”تمہارے پاس تو میری کوئی امانت نہیں تھی کبھی بھی۔ کیونکہ ہم پہلے سے نہیں جانتے ایک دوسرے کو۔“ وہ

کچھ رکھائی سے بولی۔ ”ہاں واثق کے حوالے سے ہماری کچھ جان پہچان ہے۔“ اس کا انداز حتمی والا تھا۔

شہزاد لمحہ بھر کو خاموش رہ گیا۔

”آپ کی امانت ہے یہ اور یہ مجھے آپ ہی تک پہنچانی تھی۔ آپ اسے کھول کر دیکھیں گی تو آپ کی سمجھ میں

آجائے گا۔“ وہ کچھ رک کر بولا۔

”مگر میں یہ نہیں لینا چاہتی۔ بہتر ہے تم اسے واپس لے جاؤ۔“ وہ اسی خشک لہجے میں کہہ رہی تھی۔

شہزاد متذبذب سا کھڑا رہ گیا۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے آئی؟“ وہ کچھ دیر بعد قدرے نرم لہجے میں بولا۔ عاصمہ نے کچھ جواب نہیں

دیا۔

”آپ میرے پایا کو جانتی ہیں؟“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر آہستگی سے بولا۔

”میں اس شخص کا نام نہیں سننا چاہتی بہتر ہے اگر تم اس کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو چلے جاؤ

یہاں سے مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“

وہ اپنے شدید اندھے جذبات پر بمشکل بند باندھ کر سرخ پھیرے کا پتی آواز میں بولی تھی۔

شہزاد نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔ میں چلتا ہوں خدا حافظ۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور چلا گیا۔ عاصمہ کچھ دیر

یو نہی کھڑی رہی پھر آنکھیں صاف کرتی مڑی اور چونک گئی۔ شہزاد جاچکا تھا وہ لفافہ وہیں پڑا تھا۔



”کیوں آپ کو بتا کر نہیں گئی مثال؟“ واثق کچھ ناگواری سے بولا۔

عاصمہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ خود اس وقت بہت الجھی ہوئی تھی۔

”عدیل بھائی کی طبیعت اچھی نہیں تھی؟ نہیں دیکھنے لگی ہے۔“ عاصمہ خود کو سنبھال کر بولی۔

”مگر میری تو انکل سے ایک گھنٹہ پہلے بات ہوئی ہے۔ وہ اپنے آفس میں تھے اور ٹھیک تھے۔“

”مگر تم نے انہیں کال کیوں کی تھی؟“ عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں کچھ خاص نہیں۔ آفس کے سلسلے میں کچھ کام تھا۔“ وہ سرسری لہجے میں بولا۔

”پتہ ہے کہتیں تو رکھنے کا۔ میں اسے لے جاتا۔“

اس نے کہا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ میں بھی ساتھ چلتی ہوں لیکن اس نے کہا کہ وہ زیادہ رکے گی نہیں۔ بس

تھوڑی دیر میں آجائے گی اور تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہے ہو۔ آجائے گی کچھ دیر میں وہ۔ تم فریش ہو جاؤ۔ میں چائے بنوائی ہوں تمہارے لیے۔“
عاصمہ کہہ کر باہر نکل گئی۔
واثق کچھ الجھا ہوا جانے لگا تو میز پر ڈالفاہ دیکھ کر چونکا پھر سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔



مثال دروازہ کھولے سامنے کھڑے سیفی کو دیکھ کر سکتیہ میں رہ گئی۔
سیفی کے چہرے پر بڑی جان دار معنی خیز مسکراہٹ تھی جیسے دونوں میں بڑی مدت کی شناسائی ہو اور اب ایک عرصے کے بعد سامنا ہو رہا ہو۔

”ہاؤ آریو؟“ وہ مسکرا کر اس کے چہرے پر نظریں جمائے بولا۔

مثال نے زور سے ہونٹ بھیج لیے۔

”کم آن یار! کیا شادی مرگ ہو گیا مجھے یوں اپنے سامنے اتنے ٹائم کے بعد دیکھ کر۔ ریلی مثال آئی مس یو یار!“
وہ بے تکلف لہجے میں گویا تھا۔

”بہت دنوں تک میں خود کو جھٹلاتا رہا کہ میرے اندر جو یہ ڈپریشن سا ہے یہ یونہی بے وجہ ہے۔“ وہ اس کے کچھ اور قریب ہوا۔

”شٹ اپ!“ وہ دھیمی آواز میں غرائی۔

”وہ تم تھیں مثال جس نے میرے لیے سب راستے بند کر دیے تھے جس طرف کو بھی بھاگ کر جانا چاہتا تھا وہاں میرا رستہ روکے کھڑی تھیں۔“ وہ جانے کیا کچھ بول رہا تھا۔ مثال تو لگا اس کا دماغ بھک سے اڑ رہا ہے۔

”تم نے میرے لیے ہر رستہ بند کر دیا، میرے پاس تمہارے پاس آنے کے علاوہ اور کوئی چوائس نہیں بچی ہو آئی ہو تو کم ڈیر۔“ وہ بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے لگا۔ مثال کو جیسے ہزار واٹ کا کرنشلگا۔

”بکواس بند کرو تم تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی اور مجھ سے یہ ساری بکواس کرنے کی۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ جیسے اس کا پورا وجود کپکپا رہا تھا۔

”تم نے تمہارے خیال نے۔ اور اگر میں سچ بولوں تو تمہاری محبت کی شدت نے مجھے یہ ہمت یہ طاقت دی کہ میں نے سب کچھ۔ اپنا فیوج اپنا کیریئر اپنے خواب اپنے رشتے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور صرف تمہارے خیال کی طاقت مجھے یہاں تک لے آئی۔ دیکھ لو محبت کا کمال۔“

وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا بول رہا تھا۔ مثال کے کان میں سائیں سائیں کرتے سن تو رہے تھے مگر اس کا مفہوم وہ نہیں سمجھ پارہی تھی۔ بس آنکھیں پھاڑے ٹکر ٹکرا سے دیکھے جارہی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے اس بھیا نک رات کے منظر تیرنے لگے تھے جب یہ شیطان بدروح کی طرح اس کو برباد کرنے جا رہا تھا۔

مثال نے پوری قوت سے اسے دھکا دے کر باہر نکالنا چاہا۔ سیفی نے بہت مضبوطی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔

وہ شاید اس حملے کی توقع کر رہا تھا سوچو کتنا تھا۔

”تو۔ تم نے مزید بکواس کی تو میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ ختم کر لوں گی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔“ وہ ایک دم

جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

READING
Section

وہ کہاں ہے کس جگہ ہے کیا بات کر رہی ہے۔ سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔
 ”ارے۔ ارے اتنا غصہ میری جان! میرے چلے جانے کا تمہیں۔ ایسا رنج تھا۔ تم نے مجھے بھی بتایا ہی نہیں۔
 میں پہلے ہی بھاگا چلا آتا۔“ وہ الٹا اس کے غصے کو دیوانگی قرار دے رہا تھا۔
 ”دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔ سنا تم نے۔“ وہ کانپتی آواز میں چیختی۔
 ”تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں میری جان! میں واقعی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا۔“ وہ اس کے
 ہاتھ زور سے اپنے ہاتھوں میں دبائے جذباتی پن سے کہہ رہا تھا۔
 ”واؤ انٹر سٹنگ۔ یہ کون سی فرینڈلی ریسٹنگ ہو رہی ہے یہاں پر۔“ پری ایک دم سے آکر ان کے بالکل قریب
 کھڑے ہو کر بولی تھی۔

سیفی نے ایک دم سے مثال کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ مثال تو ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔
 ”میں سفیان ہوں سیفی۔ سفیان احسن کمال۔“ سیفی تھوڑا سا گھبرانے کے بعد فوراً ”سنبھل چکا تھا۔
 ”اوہ تو آپ ہیں وہ سیفی۔“ پری ہونٹ سکیرٹے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”اور آپ تو شاید پری ہیں نہیں نا؟“ وہ بھی جواباً ”ان ہی نظروں کا تبادلہ کرتے ہوئے سر اٹھنے والے انداز میں
 بولا تھا۔

”آف کورس۔ میرے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ مثال کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے آپ کا۔“
 ”جھگڑا۔ تھا اب نہیں ہے۔“ سیفی زور دیتے ہوئے بولا۔ مثال اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسی
 وقت دروازے کی اس آہٹ سی ہوئی تینوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔
 واثق وہاں کھڑا کچھ متذبذب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آئیے واثق بھائی! آئیے نا وہاں رک کیوں گئے۔ آئی میں یوں دروازے پر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آئیں
 نا۔ آپ کا اپنا تو گھر ہے یہ۔“ پری کچھ دیر پہلے والے غصے کے بجائے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے
 اپنائیت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”یہ کون ہیں؟“ سیفی بےوجہ ہی الجھا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے کچھ الارم کیا تھا۔
 ”ارے آپ کو نہیں پتا مثال نے نہیں بتایا آپ کو یہ واثق احمد ہیں مثال آپ کے شوہر ابھی کچھ ہی ماہ پہلے تو
 شادی ہوئی ہے بڑے ڈرامائی انداز میں دونوں کی۔“

”شادی۔ مثال کی۔“ سیفی کے لیے شاک تھا دہرا کر بولا۔
 ”کمال ہے اتنی بڑی نیوز آپ کے علم ہی میں نہیں تھی۔“ پری اس کی حیرت کو ہوا دیتے ہوئے بولی۔
 ”مثال! چلو میں لینے آیا ہوں تمہیں۔“ واثق سرد لہجے میں بولا تو مثال کچھ کے بغیر اس کے ساتھ خاموشی سے
 باہر نکل گئی۔



دونوں رات کے پھلتے اندھیرے میں یونہی گاڑی میں سفر کرتے جا رہے تھے دونوں کے چہروں پر گہری سوچ اور
 فکر مندی سی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔
 ”اگر میں واثق سے پوچھوں کہ وہ پری کے ساتھ گاڑی میں کہاں سے آ رہا تھا تو یہ مجھ پر برسے لگے گا۔“
 مثال نے کن اکھیوں سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے واثق کو دیکھتے ہوئے سوچا مگر کچھ بول ہی نہیں سکی۔
 اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہونٹ آپس میں سل گئے ہوں وہ اب کبھی ایک لفظ بھی بول نہیں پائے گا۔

اور یہ کمینہ سیفی۔۔۔ یہ کیوں آگیا اور جو یہ بکواس کر رہا تھا۔ مائی گاڈ اگر کوئی سن لیتا اس پری نے اگر کچھ سن لیا ہوا۔۔۔ واثق کے کان میں کچھ پڑ جاتا۔

واثق کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پریشان سی ہوئی۔

سیفی کی نظریں اس کا انداز جس طرح وہ مثال کو دیکھ رہا تھا اس میں بہت کچھ تھا۔

”لیکن اگر میں مثال سے کچھ پوچھوں گا تو یہ انکار کر دے گی۔ الٹا مجھے جھٹلا دے گی نہیں مجھے مثال سے کچھ نہیں پوچھنا کوئی بات نہیں کرنی۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اگر یہ مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے تو مجھے پتا کیسے چلے گا کہ ان کے دل میں کیا چل رہا ہے۔“ مثال کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ ایک مسلسل سفر۔ ایک سڑک کے بعد دوسری سڑک۔۔۔ نہ ختم ہونے والے راستوں پر سفر نے جیسے اسے اکتا دیا۔ بہت دیر بعد بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”کیس نہیں۔“ واثق بو جھل آواز میں بولا۔ جیسے وہ بھی اس بے مقصد مسافت سے تھک گیا ہو۔ اس نے ایک دم سے ایک طرف کر کے گاڑی روک دی تھی۔ مثال نے کچھ پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

”یہاں کیوں رکے؟“ وہ رستے کی بورانی سے خائف ہو کر بولی۔

”پتا نہیں۔“ واثق کو باہر کی بورانی سے زیادہ اندر کے شور نے ڈسٹرب کر رکھا تھا۔

”گھر کیوں نہیں جا رہے؟“ وہ کچھ دیر بعد اسے احساس دلاتے ہوئے بولی۔

”کیا تمہیں مجھ سے کچھ نہیں کہنا۔“ واثق جتانے والے لہجے میں بولا۔ مثال ہاتھ مل کر رہ گئی۔

”تو وہ لہجہ آن پہنچا اگر واثق نے واقعی سیفی کی کچھ بکواس سن لی ہے تو؟“ وہ کانپ کر رہ گئی۔

”میں تو سمجھی شاید آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے اس لیے اتنی دیر سے ہم یوں ہی چلے جا رہے ہیں۔“ وہ کچھ ہمت کر کے بولی۔

”مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

”کیا مطلب۔ کیا لگ رہا ہے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ہم دونوں بس یوں ہی چلے جا رہے ہیں۔“ وہ کچھ افسردگی اور بے بسی سے بولا۔

مثال اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”کیا۔ کیا جانتی تھیں تم؟“ واثق بے قراری سے بولا۔

مثال اسے دیکھنے لگی۔

”ابھی سفر شروع ہی ہو گا ہم کچھ ہی دیر ساتھ چلیں گے کہ آپ کو سفر کی رائیگانی کا احساس ستانے لگے گا۔“ وہ بو جھل سی آواز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ واثق قطعاً نہیں سمجھا۔

”ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“ آٹنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ وہ کچھ دیر بعد باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر بولی۔

”تمہیں مجھ سے کچھ کہنا؟“ وہ کچھ مایوس ہوا تھا۔

”الفاظ سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے واثق! اگر واقعی آپ

چاہتے ہیں کہ آپ کو یہ سفر بے مقصد نہ لگے تو وہ جانے کیا سمجھانا چاہ رہی تھی۔

واثق اسے دیکھتا رہا پھر ایک تھکے سے گاڑی دوڑا لے گیا۔

READING
Section



وہ بے یقین نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتا جا رہا تھا۔
سامنے بیڈ پر بڑے وجود پر اس کی نظریں ٹھک گئیں۔
ابھی کچھ ہی لمحے پہلے تو اس نے زیر کو بتایا کہ وہ اس کی امانت عاصمہ تک پہنچا آیا ہے۔ اسے لگا زبیر کی آنکھوں
میں چمک آئی تھی۔ ہونٹوں پر معذوم کی مسکراہٹ مگر سرے ہی لمحے سب کچھ جیسے بجھ سا گیا تھا۔
سینے میں رک رک کر چلتی سانسیں تھم سی گئی تھیں۔ آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی۔
”پاپا آپ ٹھیک ہیں نا۔۔۔ خوش ہیں نا۔۔۔ میں وہ دے آیا ہوں عاصمہ آنٹی کو۔“ وہ پھر سے اس کا سینے پر رکھا ہاتھ
ہولے سے ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
ہاتھ بے جان ہو کر پھر سے سینے پر گر گیا۔

اسی وقت ڈاکٹر اور نرس اندر آئے۔ اسے ہٹا کر ڈاکٹر زبیر کا معائنہ کرنے لگا تھا۔
”یہ اب حیات نہیں ہیں مجھے افسوس ہے۔“ ڈاکٹر نے مختصر معائنے کے بعد ہی مدھم آواز میں گویا اعلان کیا
تھا۔
شہزاد کے کان جیسے سننے سے قاصر تھے۔ وہ نا سمجھی سے ڈاکٹر کو دیکھتا جا رہا تھا۔



عدیل گاڑی گھر کی طرف موڑتے ہوئے بے اختیار ٹھٹھا تھا۔ وہ سیفی ہی تھا۔ عدیل اسے پہچانتا تھا۔
کچھ عرصہ پہلے وہ اسے دیکھ چکا تھا جب بشری سب۔۔۔ دو ایک بار بار ہر شاپنگ مالز میں ہونٹلو میں اپنے شوہر
اور دو سری بیٹی کے ساتھ نظر آتی تھی تو یہ لڑکا بھی ساتھ ہوتا تھا۔
مثال کو بشری! جس طرح یہاں چھوڑ کر گئی تھی اور جس خوف کا اظہار وہ الفاظ میں نہیں کر سکی تھی وہ اس کی
آنکھوں اس کے لمحے سے عیاں تھا۔
”وہ چاہتے ہوئے بھی عدیل کو نہیں بتا سکی تھی۔ مگر ایک مرد ہونے کے ناتے وہ یہ ساری پچویشن سمجھ چکا تھا مگر
بیٹی کا باپ ہونے کی وجہ سے اس نے اس واہے کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں دفن کر دیا تھا۔
اگر عفت کو تا چل جاتا تو وہ رائی کا پہاڑ بنا ڈالتی اس کی معصوم بیٹی کے کیا قصے کیا واقعات بنتے۔۔۔ عدیل نے اس
گہرے راز کو دل کی گہرائیوں میں چھپا لیا تھا۔
لیکن آج یہ پھر یہاں کیوں آگیا؟

اور عدیل کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ عدیل کے گھر سے نکل کر آیا تھا۔
اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ گھر میں عفت نہیں تھی۔ پری بظاہر ہٹی وی کے چمنلز گھمانے میں مصروف تھی مگر
اس کی یہ مصروفیت ایک بہانہ نظر آرہی تھی۔

”دانی کہاں ہے؟“ عدیل کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے یہی نکل سکا۔
”پاپا! وہ گھر پر نہیں ہے۔“ پری باپ کو دیکھ کر کچھ مؤدب ضرور ہوئی تھی۔
”نہی تو پوچھ رہا ہوں وہ کہاں ہے۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولا۔
”مجھے نہیں معلوم پاپا!“ وہ کچھ ڈر کر بولی۔

”ابھی کون آیا تھا یہاں؟“ محتاط لمحے میں اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

”کوئی نہیں۔۔۔ ہاں وہ مثال آپنی آپنی تھیں مطلب پہلے ہی سے آئی ہوئی تھیں پھر واقع بھائی کے ساتھ چلی

گئیں۔ ”وہ رک رک کر بولی۔
”مثال آئی تھی؟“ وہ کچھ حیران سا ہوا ”اور جلی کیوں گئی۔“

پری نے کچھ کوفت سے کندھے اچکائے۔
عدیل سیفی کے بارے میں پوچھتے ہوئے رک گیا اور اندر چلا گیا پری پھر سے ٹی وی میں مصروف ہو گئی۔



”یہ کیا کہہ رہی ہو تم مثال!“ بشری کے لیے یہ خبر کسی بم بلاسٹ سے کم نہیں تھی۔
اسے تو لمحہ بھر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اگرچہ سیفی کے پاکستان جانے کی خبر نے اس کا دل ضرور دھڑکایا تھا
لیکن اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ مثال سے ملنے چلا جائے گا۔
”ماما! آپ نہیں جانتیں یہ سب کچھ میرے لیے کتنا شاکنگ تھا اور اس کو دیکھ کر میں کتنا ڈر گئی تھی۔ وہ کیا کچھ
بولے جا رہا تھا۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنے وفاق میں کچھ نہیں بول پا رہی تھی۔“ وہ سخت
پریشان اور ہراساں تھی۔

بشری بھی پریشان ہو گئی۔
”یہی تمہاری غلطی ہے۔ تم بلا وجہ ڈر سے کانپنے لگتی ہو۔ تم نے اس کا منہ کیوں نہیں توڑا اسے دھکے دے کر
نکال دینا چاہیے تھا تمہیں فوراً۔“ بشری کو مثال کی بزدلی پر اور بھی غصہ آ گیا۔
”اور میں تو یہ شکر کر رہی ہوں وہ ذلیل تمہارے سسرال نہیں پہنچا۔ عدیل کے گھر میں تھیں نا تم۔ واثق کو اگر
معلوم ہو جاتا تو بات بہت فکروالی تھی۔“ بشری جیسے خو کو تسلی دے رہی تھی۔
”ماما! واثق بھی اس کی موجودگی میں وہاں آگئے تھے اور۔“ وہ کچھ دیر بعد رک کر بولی تو بشری کا دل دھک سے رہ
گیا۔

”اومائی گاڈ ایہ کیا کہہ رہی ہو تم مثال؟“ مثال لب کاٹ کر رہ گئی۔
”واثق کو کچھ اندازہ تو نہیں ہوا اس کی کیننگی کا؟“ وہ بڑی بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔
”مجھے نہیں بتا چلا۔“ وہ کچھ بے بسی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔
”کیا مطلب؟ کیا پتا نہیں چلا؟“ بشری نا سمجھی میں بولی۔
”واثق کا لہجہ ان کا انداز۔ بہت عجیب سا ہو رہا ہے اس کے بعد۔ انہوں نے مجھ سے بعد میں ٹھیک طرح سے
بات بھی نہیں کی۔“ وہ غم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
”یہ تم کیا کہہ رہی ہو مثال! کیا واثق کو کچھ شک ہو گیا ہے سیفی کے آنے سے؟“ بشری کی پریشانی بڑھ گئی۔
”معلوم نہیں ماما! ان کے دل میں کیا چل رہا ہے۔ ہمارے درمیان پہلے ہی۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا عین
کس ابجھن کے بارے میں آپ کو بتاؤں اور کس کے بارے میں نہیں۔“
وہ تھک کر رہ گئی تھی اب اسے یہ بوجھ کسی نہ کسی سے تو شیر کرنا ہی تھا۔

”مائی گاڈ مثال! تم نے مجھے سخت پریشان کر دیا ہے بنو، میری بات غور سے۔ یہاں بھی حالات کچھ اتنے اچھے
نہیں چل رہے کہ میں جلدی جلدی تم سے کانٹیکٹ کر سکوں۔ احسن کی طبیعت کچھ اتنی اچھی نہیں پھر آئینہ کی
شادی کا مسئلہ احسن کے بزنس کے معاملات۔ گھر کا مسئلہ۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن میں صرف تمہاری
طرف سے مطمئن تھی کہ آخر کار اللہ نے میری بیٹی کی سن لی۔ اسے محبت کرنے والا شوہر اور قدر کرنے والا
سسرال ملے گا۔ لیکن جو کچھ تم اب مجھے سنارہی ہو مثال! مجھے یوں لگ رہا ہے۔ میرے قدموں کے نیچے سے زمین

سرک رہی ہے۔ ”بشری کی پریشانی دوچند ہو چکی تھی۔
 ”ماما! میں آپ سے یہ سب نہیں کہنا چاہتی تھی لیکن آج اس سیفی کی آمد نے مجھے بہت خوف زدہ کر دیا ہے۔“
 وہ بے بسی سے بولی۔

”سنو تم اب میرڈ ہو۔ تمہارے ساتھ تمہارا شوہر ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری قدر کرتا ہے۔ تم پر بھروسہ کرتا ہے۔ تمہیں اس سیفی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اب اگر وہ تمہارے راستے میں آئے تم سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا منہ توڑ دو۔ سختی سے منع کرو بلکہ مناسب موقع دیکھ کر واثق کو بھی بتا دو لیکن وہ واقعہ ہرگز نہیں۔“ وہ تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔

”تم سمجھ رہی ہونا۔ میں کیا بات کر رہی ہوں۔ مثال اب معاملہ صرف تمہاری ذات کا نہیں۔ میری بیٹی تمہاری پوری ازدواجی زندگی اور تمہارے گھر کا بھی ہے۔ تمہیں ہر حال میں خود کو مضبوط رکھنا ہے۔ سیفی جیسا گھٹیا انسان اگر تم تھوڑی بھی مضبوطی دکھاؤ گی تو زیادہ وقت تمہارے سامنے کھڑا نہیں رہ سکے گا۔“ وہ اسے آہستہ آہستہ سمجھا رہی تھی۔

”مگر ماما! واثق کے دل میں کیا ہے؟ میں سمجھ نہیں پا رہی اور وہ پری۔ وہ بہت عجیب ہے اور واثق کے ساتھ۔“
 اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندہ سا لگا۔

اتنی گری ہوئی بات وہ کیسے اپنی ماں سے بھی شیر کر سکتی ہے وہ بھی اپنے شوہر کے بارے میں۔ ”وہ بولتے بولتے رک گئی تھی۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھ نہیں۔ پری کا یہاں کیا ذکر آگیا؟ بشری ایک دم سے چونکی تھی۔
 ”نہیں۔ وہ بھی وہاں آگئی تھی جب وہ سیفی آیا تھا تو اسی نے واثق سے سیفی کا تعارف بہت عجیب انداز میں کرایا تھا جس کی وجہ سے۔“ وہ رک رک کر بات کو پلٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

”مثال! میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تم اب پیچیدہ ہو واثق سے تو محبت کرتی ہونا؟“
 ”ماما! اسے بشری سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔“

”بیٹا! وہ شوہر ہے تمہارا اور خدا کے لیے اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرو۔ اس سے دور نہیں رہو نہ اسے خود سے دور ہونے دو۔ تم سمجھ رہی ہونا؟“

”ہوں!“ مثال بے وہیان سی تھی۔

واثق کھانے کے بعد کمرے میں نہیں آیا تھا۔

اس نے بہت دیر تک انتظار کیا تھا۔ ایک بار بار بھی گئی تھی مگر وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھا۔

وہ بیٹھی اپنے نوٹس بنا رہی تھی۔ اسے اتنی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی واپس آگئی۔
 اور اب کافی رات ہو گئی تھی۔

”کیا آج واثق کمرے میں نہیں آئے گا۔“ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

”تمہارے پاس اس کی کال تو نہیں آئی؟“ بشری پوچھ رہی تھی۔

”نہیں ماما! میرا نمبر پیسج ہو چکا ہے۔ میرا نہیں خیال اس کے پاس ہو گا وہ نمبر۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”ٹھیک ہے پھر بھی تم بہت احتیاط کرنا اور پلیز واثق کے ساتھ رہو خواہ مخواہ کی الجھن جو بھی ہے اسے تمہیں

ی ختم کرنا ہے میں پھر کال کروں گی تمہیں۔“

بشری نے کہہ کر فون بند کر دیا مثال یونہی بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔



”عاصمہ بہن!“

مجھے آپ کو بہن کہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ بلکہ مجھے آپ سے بات کرنے کا کوئی بھی رعایت لینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ جو کہتے ہیں جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں اور میری زندگی کی کشتی پر لوگنا ہوں گے اتنے بوجھ ہیں میں چاہوں بھی تو اپنی گردن ان کے عذاب سے آزاد نہیں کر سکتا۔ اگرچہ آپ کو دھوکا دینے کے بعد سے میں مسلسل گرفتار عذاب ہوں ایک لمحہ بھی میری زندگی میں ایسا نہیں آیا جب مجھے سکون خوشی یا راحت ملی ہو ایک کرب مسلسل۔ ایک عذاب مسلسل!

پہلے بیوی اور بچوں کی ناگہانی ہلاکت! پھر سارا بزنس جو بڑی محنتوں اور دھوکے سے اپنے پیروں پر کھڑا کیا تھا کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔

میں لوگوں کے لیے ایک عبرت کی تصویر بن گیا تھا! جیتی جاگتی زندہ لاش! کئی مہینے ہوش و خرد سے بے گانہ رہا لیکن ایک احساس ہمہ وقت دامن سے لپٹا تھا کہ کس طرح سے آپ کا ہاتھ معلوم کر کے آپ کے قدموں میں گر کر آپ کے یتیم بچوں کا دامن پکڑ کر معافی مانگ لوں لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔

جب تک میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آیا آپ کہیں اور شفٹ ہو چکی تھیں۔

پھر لاکھ کوششوں اور تلاش کے باوجود آپ کو تلاش نہیں کر سکا تھا۔

گناہ اور بچھتاوے میرے پورے وجود کو دن رات زہریلے سانپوں کی طرح ڈستے اور میں شرمندگی اور ندامت کی ایسی دلدل میں دھنس چکا تھا کہ میرے ہاتھ نہ دعا کے لیے اٹھتے تھے نہ توبہ کے لیے! سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ پھر مجھے شہزاد مل گیا۔

دور کے رشتے داروں کا ایک لاوارث یتیم بچہ شاید یہ میرے گناہوں کو دھو سکے ان کا دواوا بن سکے ایک موہوم سی آس۔ ایک ٹوٹی ہوئی امید کا سراپکڑ کر پھر سے زندگی کے میدان میں قدم رکھ دیا۔

آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا۔ نہیں ٹھیک ہو سکا تو میرا دل، میری روح! سب زخم زخم تھے اور مرہم کہیں بھی نہیں تھا۔

اتنے سال جو کمایا، لگتا تھا یتیموں کا حق کھا رہا ہوں، نوالے میرے حلق میں اٹکتے تھے۔ کبھی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہو سکا اس کے بعد اندر سے بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا۔

”میں ٹھیک نہیں ہونا چاہتا تھا اپنا علاج بھی نہیں کروانا چاہتا تھا۔ لیکن آپ کو تلاش کرنا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنا اور آپ کا قرض۔ زندگی کا مقصد تھا جس کے لیے میں اللہ سے مہلت مانگ رہا تھا۔

لیکن اب لگتا ہے یہ مہلت ختم ہونے کے قریب ہے۔ میرے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ اس خط کے ساتھ جو فائل ہے اس میں کچھ پراپرٹی کے پیپر ہیں جو میں نے آپ کے بچوں کے نام وقف کی ہے۔

اصل میں توبہ ان کی ہی ہے۔ میں تو بس۔

اب اور دم نہیں لکھنے کا۔ دم جیسے گھٹا جا رہا ہے

ایک مرتبہ ہوا شخص جسے اپنے آگے صرف اندھیرے اور عذاب نظر آ رہے ہوں۔ وہ آپ سے صرف اپنے گناہوں کی معافی ہی مانگ سکتا ہے۔

اگر ہو سکے۔ اگرچہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن پھر بھی ایک آس ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو شاید اللہ بھی مجھے معاف کر دے۔ اللہ کے بندوں کو ناراض و ناخوش کر کے اللہ کے گھر سے کچھ بھی نہیں ملتا! اپنے بچوں کا

READING
Section

صدقہ سمجھ کر مجھ گناہوں سے لتھڑے شخص کو معاف کر دیں۔

گناہ گار زیر

واثق نے ہاتھ میں پکڑا خط رکھ دیا۔ عاصمہ تاریک چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی اس کے آگے فائل پڑی تھی۔
واثق فائل اٹھا کر کھول کر دیکھنے لگا۔

اس میں واقعی جس پر اپنی کے ڈاکو منٹس تھے وہ اتنے تھے کہ اس نقصان کا کئی گنا ازالہ ہو سکتا تھا جو زیر نے انہیں کئی سال پہلے پہنچایا تھا۔

لیکن کچھ نقصان ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔ وہ ماں کے چہرے کو دیکھ کر سر جھکا کر رہ گیا۔ اس نے بے دلی سے فائل بند کر دی۔

”آپ کو شہزاد کو یہ سب کچھ واپس کر دینا چاہیے تھا، مطلب لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ہمیں یہ سب نہیں چاہیے تھا۔“ وہ کچھ سختی سے بولا۔

”میں نے اسے منع کر دیا تھا صاف وہ خود ہی یہاں رکھ کر چلا گیا۔ یہ سب کچھ میری برداشت سے بہت برہم کر ہے واثق۔ تم کسی بھی طرح یہ سب ان لوگوں کو واپس کر کے آؤ میں۔ اس بارے میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“

وہ درد سے کراہ کر بولی۔

”واثق! میں نے دعا کی تھی اللہ سے کہ یہ شخص مجھے دوبارہ زندگی میں کبھی نہیں ملے، کبھی نظر نہیں آئے۔ میں اس کے بارے میں کبھی کسی سے کچھ نہیں سنوں لیکن۔“

وہ رخ پھیرے ہو جھل لہجے میں رک رک کر کہہ رہی تھی۔

”ایسا تو خیر مانا ہوتا ہی تھا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ نشان عبرت بھی بننا اور آپ کے اس کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں ہوتا۔“ واثق افسردگی سے بولا۔

”تم بس یہ سب واپس کر کے آؤ۔ میں۔“ وہ زور سے سر جھٹک کر بولی جب ہی واثق کا فون بجنا۔
شہزاد کی کال تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر گہرا سانس لیتے ہوئے عاصمہ سے نظریں جڑا کر کال ریسیو کی دوسرے لمحے اس کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔

”اوہ اللہ دانا الیہ راجعون!“ وہ ہولے سے بولا۔ عاصمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”شہزاد کے والد۔۔۔ زبیر صاحب کے انتقال ہو گیا ہے اس کا فون تھا۔“ دونوں گم صمم سے تھیں۔

”مجھے نہیں معلوم میں اسے گھر پر چھوڑ کر گئی تھی بلکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے لیکن وہ رک کر یہیں انتظار کرنا چاہتی تھی تو میں اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی کہ وہ یہاں نہیں رکے پھلی جائے۔“

عفت پوچھنے پر ناراض لہجے میں کہتی چلی گئی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پھر وہ آپ سے ملے بغیر چلی بھی گئی، مجھے پری نے بتایا کہ اسے واثق لینے کے لیے آیا تھا اور وہ لڑکا اس کا یہاں کیا کام تھا بھلا ہم لوگ تو اسے جانتے بھی نہیں۔ یہ قصہ کیا ہے؟“

وہ متحس لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم سردرد سے پھٹ رہا ہے میرا پہلے ہی۔“ وہ عفت سے یہ سب پوچھ کر پچھتا یا اب عفت کو

READING
Section

49 مئی 2016

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بولنے سے کون روک سکتا تھا۔

”عدیل! کہیں ایسا تو نہیں کہ بشری بھی واپس آچکی ہے جس کی وجہ سے یہ لڑکا بھی آگیا ہو۔“ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

عدیل اسے چونک کر دیکھنے لگا یہ بات تو اس نے سوچی ہی نہیں تھی۔



سیفی بستر پر چپ لیٹا چہرے پر گہری مسکراہٹ سجائے کچھ سوچ رہا تھا۔

اس کے دماغ میں وہ منظر آتا جب مثال اور واثق کے جانے کے بعد پری اسے دیکھتی رہی تھی۔

”ایسے کیا دیکھتی جا رہی ہو۔“ اس کی نظروں سے خائف ہو کر اسے کہنا پڑا۔

”مجھے لگ رہا ہے آپ کو مثال آپ کی شادی کا کچھ زیادہ ہی شاک لگا ہے ویسے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو

اس شادی کے بارے میں پتا نہیں چلا ہو جبکہ ان کی ماما تو ہریل ان ٹیچ تھیں۔“ پری جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔

”میں لندن سے آ رہا ہوں۔“ وہ کچھ کوفت سے بولا۔

”لندن سے مثال آپ کے لیے؟“ پری کے بے ساختہ کہنے پر سیفی نے بھی اسے چونک کر دیکھا تھا فوری طور پر

وہ کچھ بول نہیں پایا۔

”میں سمجھ گئی سب کچھ۔“ وہ جوش بھرے انداز میں چٹکی بجا کر بولی۔ ”تو وہ آپ تھے۔ مثال آپ کی اداسیوں

کی وجہ۔“ وہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے بولی۔

سیفی نے چونک کر اسے دیکھا۔

فوری طور پر وہ تردید یا تائید نہیں کر سکا تھا۔ پری کو دیکھتا رہا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔ آپ مثال آپ کو پسند کرتے ہیں نا۔ مطلب محبت کرتے تھے اور اب یہ نیوز

آپ کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہے۔ میں نے صحیح کہا نا۔“ وہ اپنے ٹھیک ٹھیک اندازے لگانے پر بہت

خوش تھی۔

”لیکن اب ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔“ وہ مایوس سا ہو کر بولا اور جانے کے لیے مڑا۔

”ایک بات تو یہ بھی ہے کہ مثال آپ بھی اس شادی سے کچھ زیادہ خوش نہیں۔“ پری پیچھے سے بولی تھی ”اس

وقت کوئی اور آپشن بھی تو نہیں تھا۔“ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں پری اس سے کیا کہنا چاہتی ہے۔

”مطلب تو آپ کو خود مثال آپ سے پوچھنا چاہیے۔ کیا معلوم وہ دل میں آپ کے آنے سے خوش ہی ہوں۔“

وہ معنی خیزی سے بولی تو سیفی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پری کا آئیڈیا کچھ ایسا فضول بھی نہیں تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“ وہ کچھ الجھ کر پوچھ بیٹھا۔

”میرے کہنے کا مطلب ہے اگر اتنی دور سے مثال کی چاہت میں دوڑے آئے ہیں تو ایک بار کھل کر ان سے

بات تو کر لیں مل کر۔“ وہ اسے اکساتے ہوئے بولی۔

”مل کر؟“ وہ کچھ چونکا۔ ”میرے پاس نمبر بھی تو نہیں ہے اس کا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”خیر اتنا سا کام تو میں بھی آپ کا گراہی سکتی ہوں۔“ وہ معنی خیزی سے ہنستے ہوئے سیفی کو مثال کا نمبر لکھوانے

READING
Section

”یہ نمبر میرے بہت کام آسکتا ہے۔“ وہ سیل میں مثال کے نمبر کو دیکھتے ہوئے خود سے بولا۔
 اور پری نے کچھ غلط بھی نہیں کہا جب اتنی دور آہی گیا ہوں تو مجھے یوں ناکام ہو کر تو نہیں لوٹنا چاہیے۔
 وہ سر ہلا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ ایک نمبر ملا کر سیل فون کان سے لگا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

”پری! میں سیفی بات کر رہا ہوں، کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں؟“ پری کے جواب پر وہ تھینکس۔ ”کہہ کر آہستہ آہستہ اس سے کچھ بات کرنے لگا۔



دانی نے کچھ مایوسی سے لا کر میں موجود لفافے میں پڑی رقم کو گنا۔
 ”صرف ڈھائی لاکھ اس سے کیا ہو گا۔ وہ لوگ چھ لاکھ سے کم پر نہیں مانیں گے۔“ وہ مایوس سا تھا۔
 پھر وہ لا کر میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔
 ایک جیولری باکس میں سے عفت کی کچھ جیولری ملی ہے تو اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔
 ”اس سے تو میرا کافی کام نکل جائے گا بلکہ میں ان لوگوں کو صرف دو لاکھ۔۔۔ نہیں ڈیڑھ لاکھ اور جیولری ہی دوں گا کہ میں بس یہی اریج کر سکا ہوں۔“ وہ دل میں پلان کرنے لگا۔
 اپنے گولڈن فیوچر کے بارے میں اس نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اسے لگ رہا تھا سب کچھ اس کی مٹھی میں آگیا ہے۔
 اس نے بہت محتاط انداز میں سب چیزیں ایک پاؤچ میں ڈالیں اور چابی اسی جگہ پر رکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔



آئینہ کی شادی کی ڈیسٹے ہو گئی تھی۔
 بشری عجیب سے اکیلے پن کا شکار ہو رہی تھی۔ ایک نئی جگہ عیا ملک نئے لوگ۔۔۔ ولید کی فیملی بیس سال سے آسٹریلیا میں تھی ان کے لیے کچھ بھی عجیب نہیں تھا شاید۔ لیکن بشری کو اپنی بیٹی ایک ایسی جگہ بیاہنا جس سے وہ خود بھی ابھی مانوس نہیں ہو سکی تھی بہت مشکل لگ رہا تھا۔
 اور مشکل تو یہ بھی تھا کہ احسن کی حالت دون بدن ایسی ہوتی جا رہی تھی کہ بشری اس سے کوئی بھی اپنی بات شیر نہیں کر سکتی تھی۔ سیفی کی خود سری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا بزنس جم نہیں سکا تھا۔
 آئینہ کی شادی کے بعد ان کا پاکستان واپس چلے جانے کا پلان تھا۔ احسن وہاں بھی کچھ لوگوں سے رابطے میں تھا، گھر اور بزنس کے معاملات کے لیے۔۔۔
 اور بشری خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ بہت سارے دن وہ مثال کو فون ہی نہیں کر سکی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ سیفی کیسے مثال کی زندگی برباد کرنے چلا ہے۔
 (آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ)

نہروں کے قصا ہا

”سہان ماموں آرہے ہیں۔“ فصیح نے اعلان کیا۔

میں دادی اماں کے کہنے پر حلوہ تیار کر رہی تھی۔ صبح سے انہوں نے مجھے حتی الامکان مصروف رکھنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ تین ماہ بعد میری شادی تھی۔ امی سے زیادہ دادی کو فکر لاحق تھی۔ مجھے سکھ دینا ان کے لیے جو انہوں نے فہرست تیار کر رکھی تھی۔ اس میں ٹاپ لسٹ کام چٹنیاں کو ہندی میں کوئی ہیں۔ نو گرینڈر مشین۔ کپڑوں کے مختلف چھوٹے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر کس طرح سے نئی کار آمد چادر بنانی ہے۔ مختلف مسالوں کو کس طرح سے علیحدہ علیحدہ کر کے صاف کرنا ہے۔ دھوپ میں کیسے سکھانا ہے۔ مسالوں کی ڈبیوں میں موجود دادی کے ٹونکوں نے۔ زبیدہ آپا کو بھی مات دے دی۔ ابو۔ عمر اور ابو بکر کے کپڑوں پر کلف کا نشان نہ ہو بس کلف لگا ہوا محسوس ہو۔ دادی کاموں کی مائیکرو اسکوپ اسٹڈی کر رہی تھیں۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر گھر آئے ابھی دوسرا مہینہ تھا۔ میں آٹھ آٹھ آنسو روئے پر مجبور ہو گئی۔

مالکھو لریالوجی میں ایم۔ اے۔ سی ہونے کا اعزاز ان شاء اللہ میرے شاندار زریٹ کے نکلنے کے بعد حاصل ہو جانا تھا۔ پر اس گھریلو تعلیم نے طبیعت صاف کر دی تھی۔

کتنے سارے خواب سچائے ہوئے تھے۔ گھر جاؤں گی اماں کی گود میں سر رکھے فرمائشوں کی لسٹ جاری کروں گی۔ دادی کے ہاتھ کی مزے مزے کی چیزیں کھاؤں گی۔ آخر اکلونی جو ہوں۔ عمر اور ابو بکر کے بازوؤں کے چکر لگوا لگوا کر کپڑوں کی ڈیزائننگ۔

کرواؤں گی۔ حق ہوا سارے ارمان ہی ختم ہو گئے۔ کفگیر کو حلوے کی کڑا ہی میں گھماتے میں انتہائی دکھیااری کی ہو رہی تھی۔ نہ میٹ پر چیٹنگ نہ دوستوں سے کہیں۔ نہ ڈراموں کی فہرست۔ افواہی تو انتظار میں ہی بیٹھی تھیں کہ کب حوریہ آئے اور اگر کاموں میں جُست جائے۔ امی کو بھی آج کل کمر کا درد۔ سر کا درد۔ گھٹنوں کا درد لاحق رہنے لگا تھا۔

”حوریہ! دوپہر کی ہنڈیا تم بناؤ۔ میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔“

”حوریہ چائے بناؤ۔ سر میں درد سا ہو رہا ہے۔ سبزی بھی کاٹ لیتا۔“

”ہائے ہائے آج تو ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ تمہارے ابا بھائی آنے والے ہوں گے۔ حوریہ بیٹی! دوپہر کے لیے ہانڈی چڑھاؤ۔“

اب یہ مائیں۔ بیٹیوں کے جوان ہونے کی دیر ہوتی ہے کہ ان کے اگلے پچھلے سارے درد جاگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اتنے سالوں کی ذمہ داریاں بیٹیوں کے سر پر ڈال کر خود بری الذمہ اور بیٹیاں تو ماؤں کی ذرا سی چوں چراں پر بھی پریشان و ہراساں۔ پھر دل بھی نہیں کرتا ماؤں سے کام کروانے کو۔ البتہ میری دادی دنیا کی سب سے نرالی دادی ہیں۔ وہ نہ خود سکون سے بیٹھتی ہیں اور نہ ہی اگلے بندے کو سکون لینے دیتی ہیں۔ کام والی نے کپڑے اچھے نہیں دھوئے۔ دادی سارے درد بھلائے کپڑے دھونے بیٹھی ہیں۔ اگر اسی دوران ابا جی مسجد سے نماز پڑھ کر گھر تشریف لے آئیں۔ تو یقیناً ”توپوں کا رخ پہلے امی کی طرف ہو گا پھر سات سلامیاں مجھے بھی پیش کی جائیں گی۔“

”بوڑھی دادی کا ذرا جو تم لوگوں کو خیال ہو۔“ ابا بس اسی فقرے سے شروع ہوں گے۔

اور اگر بھائی عمر اور ابو بکر جیسے ہوں تو وہ اپنی بہن حوریہ کی درگت بنوانے کے لیے ضرور جلتی پرتیل کا کام کریں گے۔ دادی کو کبھی گملوں کی فکر ہو جاتی۔ دل چاہتا تھا ساتھ والی کالونی میں سارے کلمے پھسکوا دوں۔

دیا ہے۔ ابا جی کی فضول پڑیوں سی کوئی آرام نہیں
آ رہا۔ کوئی سرور کی گولی ہے تو دے دو۔“
وہ اکثر اپنے سرال والوں سے چھپ کر کچھ مانگ
لیتیں یا منگوا لیا کرتی تھیں۔ میں نے عمر سے کہا کہ سرور
کی گولی ملاوے۔

”عائشہ باجی! آجائیں، چائے بنا رہی ہوں۔“
اتنی پڑھی لکھی لڑکی کی یہ درگت سننے دیکھ کر
میں۔ امی اور دادی اکثر افسردہ ہو جاتے۔ پھر کسی نہ کسی
طرح ان کی مدد کرتے رہتے۔



بھی جو کمروں کے نقص پڑوں کے نقص دور ہوتے تو
پھر کچن کی باری آتی اور میری شامت تو خیر سے آج کل
آتی ہی ہوتی تھی۔

”عائشہ باجی بلا رہی ہیں۔“ فصیح جس نے مایوں
کے آنے کی اطلاع ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دی تھی۔
اب عائشہ کا پیغام دینے چلا آیا۔

میں حلوے کی اجزائے ترکیبی کو دوبارہ تولنے لگی
مبادا کوئی کمی بیشی ہوگئی تو حلوہ کھانی دادی نے

پھوہوں کے گوش گزار بھی کر دینی تھی۔
پھوہوں میں سے ایک پھپی کے گھرویسے بھی میرا
بیہ ہونا تھا۔ اور دادی نے انہیں بتانے سے بھی نہیں
چوکننا تھا۔ غلطیاں ہمیشہ وہاں غلطیاں ہوتی ہیں جہاں
غلطیوں کو سدھارنے والے ہوں اشتہار لگانے والے
نہ ہوں۔

”عائشہ باجی سے کہو میں آرہی ہوں۔“ میں نے
عمر سے کہا۔ حلوہ مکمل تیاری کے مراحل میں داخل
ہو چکا تھا۔ پانچ سات منٹ ہی مزید چھجھانا پڑا۔ حلوہ تیار
ہو گیا۔ میں نے چوہا بند کیا اور عائشہ باجی کی بات سننے
باہر چلی آئی۔ وہ انتہائی پریشان تھیں۔ اور ہفتے کے پانچ
دن تو وہ پریشان ہی نظر آئیں۔ بعض لوگوں پر پریشانیاں
روئی کے گالوں کی طرح اترتی ہیں اور پھر کئی طرح
چھپتی ہیں۔ وہ انتہائی پڑھی لکھی لڑکی تھیں۔ اب تو خیر
خاتون بن گئی تھیں۔ فیملی سے باہر رشتہ ہوا ہمارے
ہمسائے ہیں جو جاہلوں کا کڑھ تھا۔ وہاں بلا ضرورت
لڑائی۔ تو تو میں میں۔ جاہلانہ حرکتیں ہوتی رہتیں۔
عائشہ باجی کے شوہر منزل بھائی کسی حد تک اچھے بھی
تھے۔ برماں بہن اور باپ کے پیچھے لگ ہی جایا کرتے۔
باپ نیم حکیم تھے۔ روزنت نئے ٹونکے۔ ان کے گھر
سے اکثر فضول ادویات پکنے کی بدبو آتی رہتی۔ ادھر
میری نفیس دادی بریدرانا شروع ہو جاتیں۔



”دون میں سر کے درد نے میرا برا حال کر کے رکھ

READING
Section

”نہیں حوریہ! تمہیں پتا ہی ہے ابھی عذرا باجی یا کوئی اور میرے پیچھے تفتیشی ٹیم لے کر آجائے گا۔“

”ابھی مسکراتے ہوئے بولیں، عائشہ باجی کے چہرے پر کم ہی مسکراہٹ آیا کرتی تھی۔ جہاں تفکرات کے سامنے پھیلے ہوں وہاں مسکراہٹوں کے در کبھی کبھی واہوا کرتے ہیں۔“

”اسی لمحہ میں خود ہی گولی دے جاؤں گی۔“ میرے کہنے پر لشکر آمیز آنکھوں سے انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں اس افسوس ہی کر سکتی تھی۔ لوگوں کے پاس دوسروں کو تنگ کرنے کا کتنا وقت ہوتا ہے۔ نہ خود سکون سے رہو نہ کسی دوسرے کو رہنے دو۔

”ارے حوریہ کدھر ہے؟“ دادی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں بھاگتی ہوئی گئی۔

”یہ دیکھو۔“ دادی نے مجھے شیشوں، موتیوں والے بہت سارے پراندے دکھائے۔

”میں! یہ کہاں سے نکلے۔“ میں حیرت کی انتہا پر تھی کہ دادی نے یہ پراندے کون سی صندوقچی سے نکال لیے۔

”یہ میں نے کوثر سے منگوائے ہیں۔“ وہ کام والی کا نام بتاتے ہوئے بولیں۔

دادی کے چار بال دیکھ کر میں پریشان ہی ہو گئی کہ وہ بالوں میں لگائیں گی کیسے؟ کہاں۔

”دادی! سارے لوگ باتیں بتائیں گے۔“

”کیسی باتیں؟“ دادی نے میرا چہرہ یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

”اس عمر میں پراندے۔ دادی سب آپ کا مذاق اڑائیں گے۔“ میں دادی کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

”میرا کیوں مذاق اڑائیں گے۔ عجیب باتیں کر رہی ہو۔ یہ تمہارے لیے ہیں۔“

بس غش کھا کر گرنے کی تہہ گئی تھی۔ میں اور پراندے۔ میرے اسٹمپ میں کٹے بال۔

”اف دادی! میں یہ نہیں ڈالوں گی۔“ میں نے بدکتے ہوئے کہا۔

”کیسے نہیں ڈالو گی۔ دیکھو تو کتنے خوب صورت

ہیں۔“ وہ پراندے میرے سامنے لہرا کر بولیں۔

”آپ میرے بال تو دیکھیں ایک ہزار نہیں لگا کر کوئی پراندہ نکلے گا۔ مجھے کیا ضرورت ہے اتنی مصیبت میں پڑنے کی۔ آپ میرے لیے ایسی چیزیں نہ ہی منگایا کریں۔“

میں احتجاجاً واک آؤٹ کر گئی۔ دادی بیچاری پراندوں کی طرف دیکھ کر اور میری طرف دیکھ کر افسردہ سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ امی، ہمیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

”شرم کرو۔ قسمت والوں کو ملتے ہیں ایسے بزرگ۔ اگر انہوں نے محبت سے تمہارے لیے یہ بنوا بھی لیے ہیں۔ تو کیا تکلیف تھی۔ انہیں نہیں پتا آج کل کے فیشن کا۔ کتنے دن سے وہ کوثر کے پیچھے لگی

تھیں۔ مجھ سے زیادہ وہ تمہاری فکر کرتی ہیں۔ خدوار! آج کے بعد ان کا دل خراب کیل۔ ٹانگیں توڑ دوں گی۔

میں تمہاری۔ وہ تمہاری دادی بعد میں اور میری ماں پہلے ہیں۔“

امی نے آکر مجھے کمرے میں اچھا خاصا لتاڑا۔

”واہ مائے وام۔ جی خوش ہو گیا۔“ ابو بکرنہ جانے کب آیا۔ امی کی جذباتی دھواں دار ڈانٹ سن کر پھولے نہیں سارا ہاتھ۔ ”آپ تو ہماری گریٹ ماں

ہیں۔“ وہ امی کے گرد اپنے بازو کا حلقہ بنا کر کھڑا ہو گیا۔

”ساس سے اتنی محبت۔ ماں جی۔ اخلاق کی اعلا قسم۔“ وہ امی کو گھمسانے لگا۔

”رفع ہو، پیچھے ہٹو۔ ساری اولاد ڈرا رہے کرتی ہے۔ چلو تم باہر آؤ۔ اور آکر امی جی سے معافی مانگو۔“ امی نے ابو بکر کو مصنوعی خفگی سے پیچھے کیا۔ اور مجھے حکم سنا کر چل دیں۔

”کتنی اچھی بات کی ہے امی نے۔ کتنی پیاری دادی ہیں۔ بد اخلاق لڑکی۔“ وہ مجھ پر چڑھ رہا تھا۔

”تم تو منہ بند ہی رکھو۔ میں بد اخلاق نہیں۔ بل نہیں ہیں میرے۔ دادی نے اتنے بھاری پراندے بنا ڈالے۔ اور میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے پہنا کر چھوڑیں گی۔“ میں منہ بسورنے لگی۔

”تو کیا ہوا تم ان کی خوشی کی خاطر پن نہیں

54

2016

شعاع

READING
Section

سکتیں۔ اس زندگی میں کسی کو ذرا سی بھی خوشی سے
توازا نہ بہت بڑا صدقہ ہے۔ ڈیر سسٹر۔“
ابو بکر اکثر کوئی نہ کوئی اچھی بات میرے اور عمر کے
مکوش گزارتا رہتا۔

میں جھٹ داوی سے سوری کرنے بھاگی۔ اتنے
میں عمر مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ وہ ہنس رہا تھا۔
میں۔ ای اور داوی اس کی شکل دیکھ رہے تھے کہ اس کو
کیا ہوا ہے؟

”قسم سے داوی! آپ نے آج تک اتنا پارا دم
نہیں دیکھا ہو گا۔“ وہ سوڑھا گھسیٹ کر داوی کا گھٹنا
پکڑے ہنستے ہوئے بولا۔

”کون سا دم۔ کیوں ہوا کیا؟“ امی! میں عائشہ باجی کے
گھر گیا سرور کی گولی دینے کو پھر کچھ یاد کر کے زور زور
سے ہنسنے لگا۔

”اللہ ہی خیر کرے۔ ان کے گھر تو ہر کوئی ڈرامہ
ہے۔ پتا نہیں اب یہ کیا دیکھ آیا ہے۔“ امی نے تبصرہ
کیا۔

”اب بتا بھی چکو۔“ مجھے سننے کی جلدی تھی۔
”امی! انکل حفیظ عائشہ باجی کے سر پر دم کر رہے
تھے۔ نہ آیت الکرسی۔ نہ سورۃ فاتحہ۔ پتلا ہے وہ کیا
کہہ رہے تھے۔“

عمر پھر ہنسنے لگا۔ انکل حفیظ کے ذکر نے داوی کے منہ
کے زاویے بگاڑے۔ ان کی اور داوی کی بنتی نہ تھی۔ وہ
عائشہ باجی کے سر تھے۔

”اس نیم حکیم نے اب کوئی اور شوشا چھوڑا
ہو گا۔“ داوی نے برا سامنہ بنایا۔

”داوی! وہ عائشہ باجی کے ماتھے کو پکڑ کر بتاؤں کیا
کہہ رہے تھے۔“

”بجل پیڑے، جل جتھو آئی او تھے امی چل (چلو)
درو چلو جہاں سے آئے ہو وہاں ہی چلو۔“

عمر کے بتائے دم نے میری بھی نان اشاپ ہنسی
شروع کروادی۔

”لا حول ولا قوۃ داوی نے نور سے پڑھا۔“ یہ تو باؤلا
ہو گیا ہے۔“

”سچ پاگلوں کا مبر (خاندان) ہے۔ پتا نہیں ماں
باپ نے کہاں بیٹی رول دی؟“ امی نے تبصرہ کیا۔
”پلو حوریہ اب تمہیں بھی درد ہوا میں بھی یہ پڑھ
کر تم پر پھونکیں ماروں گا۔“ عمر ہنستے ہوئے مجھے
چھیڑنے لگا۔

”ہاں تم ایسا ہی دم سیکھ کر آسکتے ہو۔ تمہیں میں
نے کہا تھا کہ شام کے وقت قاری مجید کے پاس جایا
کرو۔ تم نے قرآن یاد رکھا ہے کہ نہیں۔“ امی عمر کا
کان کھینچتے ہوئے بولیں۔

اس نے میٹرک کے بعد حفظ کیا تھا۔ اس لیے امی
ابو اس کے پیچھے پڑے رہتے کہ وہ بھول نہ جائے۔
دہرائی کے لیے اسے بھیجتے اور امی کو اس کا ایک دن بھی
نافہ کرنا پسند نہ تھا۔ عمر صاحب کبھی کبھی ڈنڈی مار
جاتے۔

”عمر! عائشہ باجی نے یہ دم کروایا کیسے۔“ میں نے
سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

”بیچاری کی شکل دیکھنے والی تھی۔ وہ رو دینے کو
تھیں۔ اور مجھے دیکھ کر تو اور شرمندہ ہوئیں۔“ اس کی
بات پر میں بھی افسردہ سی ہو گئی۔



”یہ ہوا میں زلفوں میں میری گم ہو جائیں۔“
گنگنائے ہوئے میں یار پر کپڑے ڈال رہی تھی۔
صبح سے مشین لگا رکھی تھی۔ اور قسمت یا نصیب۔
آج ہی موسم نے بھی اپنی کارکردگی دکھا دی۔ بادلوں
نے جھٹ سے آسمان پر بسیرا کر لیا۔ میرا دل مچلنے لگا۔

کہ سارے کپڑے چھوڑ چھاڑ کر جلدی سے چائے
بناؤں اور موسم کی کاستیوں کو انجوائے کروں۔ پرای
کا حکم آگیا۔

”موسم خراب ہے تب تو کپڑے دھونے ہیں۔
ڈرائر میں خشک کرتی جاؤ۔ اگر بارش ہو بھی گئی تو
کمرے میں پھیلاؤ بنا۔ خشک ہو جائیں گے گرمیاں
تو ہیں۔“ میں نے غصے سے ڈرائر کو گھورا۔ نہ یہ

مصیبت آج ہوتی نہ مجھے کپڑے دھونے پڑتے۔
سائنسی ترقی مصیبت اور وبال ہی تو ہے۔ اب کتنے
افسوس کی بات ہے۔ اتنا پیارا موسم میں موبائل پکڑ کر
Happy Weather کا اسٹیٹس بھی اپ لوڈ
نہیں کر سکتی۔ چائے بنا کر چیکے چیکے بارش کی بوندوں
سے باتیں بھی نہیں کر سکتی۔ نہ کسی نئے گانے پر اپنی
سہیلیوں سے تبصرے کر سکتی۔ موسم آوارہ تو دل
رنگیں۔ ابھی تو ہوا چل رہی ہے۔ کچھ کپڑے اوپر ہی
ڈال آئی ہوں۔ میں نے نوکری اٹھائی اور جھست پر۔ ہوا
کی سرسراہٹیں عروج پر تھیں۔ اکیلے مزہ نہیں آرہا
تھا ————— سینچے جھانکا۔ عائشہ باجی کو ہی بلا لیتی
ہوں۔ یہ وہ صحن میں نظر نہیں آئیں۔ گیٹ کے
قریب عمر نظر آگیا۔

چھپاؤں۔
 ”ہواؤں کو محم کرنے کے لیے بہت ساری زلفیں
 چاہئیں۔ فی الحال تو آپ کے ہاں اس گز بھر کے
 پراندے کو ہی نہیں برداشت کر سکے۔“ وہ مسکراتے
 ہوئے بولے۔

طریقے سے حال چال پوچھا کرو۔ منہ میں گھنگھنیاں ہی ڈال کر بیٹھ جاتی ہو۔“

پتا نہیں ساری عمر شرم و حیا سکھانے والے والدین اس لمحے کیوں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ کچے دھاگے۔ نازک رشتے۔ مصلحت پسندی تجانے کون کون سی لفظوں کی دنیا صدیوں کی تربیت پر لپیٹ دی جاتی ہیں۔ میں نے اسٹینٹس اپ لوڈ کر دیا۔

”آئی ہیٹ افکے جمنٹ (مجھے منگنی کے رشتے سے نفرت ہے) منگنی کوئی یاسدار رشتہ تھوڑی ہے۔ بس ایسا ٹائم پریڈ جہاں ذہن نیگیا بھی ہو سکتے ہیں اور بکھر بھی سکتے ہیں۔“

میں نے کپڑے دھو کر امی کے ساتھ مل کر کھانا بنایا۔ ابو بکر اور ابو بھی آگئے۔ سب نے عیبو کو بروٹو کول دیا۔ بڑے اچھے خوش گوار موڈ میں کھانا کھایا گیا۔

میں نے پلیٹ میں بریانی ڈالی اور عائشہ باجی کو دینے چل دی۔ وہ حنظلہ کو نہلا رہی تھیں۔ میں کچن سے پلیٹیں پکڑ کر خود ہی بریانی ان میں منتقل کر آئی۔ گھر آئی تو موصوف جا چکے تھے۔ دادی اون سلائیوں پر نجانے کون سا ڈیزائن سکھانے کے لیے بے تاب تھیں۔ پر میری ہمت نہ تھی۔ میں نے امداد طلب نظروں سے اسی کی طرف دیکھا۔

”چلو تم جا کر لیٹ جاؤ۔ تھک گئی ہوگی۔“ امی نے جان بوجھ کر ذرا زور سے کہا۔ دادی نے گھور کر معائنہ کیا۔ پھر مسکرا کر بولیں۔

”ہاں ہاں آرام کرلو۔ کل تمہیں ڈیزائن ڈالنا سکھاؤں گی۔“

میری شکل دیکھ کر امی نے مسکراہٹ دیانی۔ میں اگر کمرے میں لیٹ گئی۔

ہمارے بس میں اگر اپنے فصلے ہوتے تو ہم کبھی کے گھروں کو پلٹ گئے ہوتے قریب وہ کر سلگنے سے تو کتنا بہتر تھا کسی مقام پر ہم تم چھڑ گئے ہوتے کبھی رست کو ہم مٹیوں میں بھر لیتے

کبھی ہواؤں سے اپنے مکالے ہوتے ہمارے نام پر کوئی چراغ تو جلتا کسی زہن پر ہمارے بھی تذکرے ہوتے ہم اپنا کوئی الگ راستہ بنا لیتے ہمارے دل نے اگر حوصلے کیے ہوتے عائشہ باجی نے نوشی گیلانی کی لظہ مجھے ایس ایم ایس کی۔ آخری مصرع نے میری آنکھیں میلی کر دیں۔ اتنی پیاری بیٹیاں والدین ایسی جگہوں پر کیوں بیاہ دیتے ہیں۔ کیا سارے مقدروں کے کھیل ہیں۔ اسی اوجیٹر بن میں آنکھ لگ گئی۔ پھر کہیں شام کی اذانوں کے وقت کھلی۔ امی نے سالن پکالیا تھا اور روٹیاں بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

”تمہارے ماموں آج رات کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔ فصیح اور ابو بکر کو میں نے انہیں لانے کے لیے کہا ہے۔ تم میرے ساتھ لگو۔ میں نے قورمہ بنالیا ہے۔ کباب بنا کر فریز کر دیے ہیں۔ تم بیٹھے میں کچھ بنا لو۔“

”عمر تو گھر پر ہی ہے نا۔“ میں نے امی کے کہنے پر ہانڈی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ قورمہ کی خوشبو نے بھوک برپا کر دی۔

”ہاں۔۔۔ میں نے عمر کو گھر پر ہی رہنے دیا ہے، کبھی کوئی چیز منگوانی پڑ جائے۔ فصیح کو اسی لیے ساتھ بھیجا ہے۔“ وہ خالہ زیب کا بیٹا تھا اور خالہ دو گلیاں چھوڑ کر قریب ہی رہتی تھیں۔

”مجھے عمر سے باسٹا منگوانا ہے۔ ماموں کو بہت پسند ہے۔ میں نے امی کو مطلع کر دیا۔“

”پلنگ کی چادر کے نیچے پیسے پڑے ہیں۔ اٹھا لو جا کر۔ اور جو منگوانا ہے۔ عمر سے کہہ دو۔“

رحمان ماموں ہم سب کے چہیتے تھے۔ امی اور ماہ زیب خالہ کے اکلوتے بھائی۔ ماموں کے آنے پر امی نے میری ڈیٹ فکس کرنی تھی۔ ماموں تقریباً پونے دو سال کے بعد آرہے تھے۔

”عمر! پاستا لا کر دو۔“ وہ ریلنگ دیکھنے میں مصروف تھا۔

”ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ بس دو منٹ۔“

رہسلو نے دوسرے کو بچ کر نیچے مارا اور عمر صاحب
تالیاں بجانے لگے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مار دھاڑ والے
کھیل میں تم لڑکوں کو کیا مزہ آتا ہے۔“
”آئی! آپ رہنے دیں۔ طاقت کی دنیا ہے۔
طاقت کی۔“ وہ اپنے سلکی بالوں کو ماتھے پر سے ہٹاتے
ہوئے بولا۔

”ہاں جی طاقت کی دنیا میں چاہے ٹانگیں۔ ہاتھ
پاؤں سب ٹوٹ جائیں۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔
”اتنی دیر میں عمر نے پھر عہد لگایا۔“

”یا ہوس۔“ دوسرے والے رہسلو نے اب پہلے
والے کو بچھاڑ دیا تھا۔

”چلو اٹھو بس کرو مجھے پاستالا کرو۔“ میں نے
اس کا کٹن موڑا۔

”اف۔ آئی۔“ وہ زور سے چیخا۔ ”یہ طاقت کی
دنیا ہے۔“ کٹن۔ اچھی طرح سرخ کر کے میں نے
منگراتے ہوئے کہا۔ عمر نے غصے سے کھوری ڈالی۔

”آپ آئی ہیں۔ حد ادب۔ ورنہ میں نے بھی
رہسلو کی طرح آپ کو اٹھا کر نیچے گرا دینا تھا۔“ میں نے
عمر کو غور سے دیکھا۔ ماشاء اللہ فرسٹ ایئر میں ہی قد
کاٹھ نکالے کھڑا تھا۔ اوپر سے بھرا بھرا جسم مجھے ایک
دم عمر بڑا سا لگنے لگا۔ ایک سرشاری کے احساس نے
مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جوان بھائی ہمیشہ تحفظ کا
احساس دلاتے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ میں
نے جیسے دل میں دعا کی۔

”چھا چلو منہ بند کرو۔ خبردار۔ مجھے ایسے کہا۔
جا کر پاستالا کرو۔“

میں نے بیٹوں والا رعب جمایا اور واپس کچن میں
آئی۔ اسی بے چاری پسینے میں نہا چکی تھیں۔ ”اب
آپ ریسٹ کر لیں۔ میں باقی کا کام کرتی ہوں۔“ انہیں
کندھوں سے تمام کمر میں پیار سے بولی۔ اسی نے نہال
ہوتی نظروں سے دیکھا۔

”میری پیاری بیٹی۔ بس چند دنوں کی مہمان۔۔۔“
وہ آتش دیدہ سی ہو گئیں۔ ماؤں کو جتنی جلدی بیٹیوں کی

شادیوں کرنے کی پڑی رہتی ہے۔ اتنی ہی جلدی ان
کے چلے جانے کا احساس انہیں بے چین کر دیتا
ہے۔ میں نے بھی آنکھوں میں آئی کی کو چھپانے کے
لیے چوہے کا رخ کیا۔

رہسلو ماموں رات کو آئے، کھانا وغیرہ کھا کر آرام
کرنے لگے۔ معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر میں
عائشہ باجی کی طرف چلی آئی۔ ان کی ساس ان کے سر
سے جھکڑا کر رہی تھیں۔ گالیوں کا طوفان۔ عائشہ باجی
بے چاری بے زار سی شکل بنائے بیٹھی تھیں۔ میں خود
کو کوٹنے لگی۔ مجھے کیا ضرورت تھی ابھی آنے کی۔
دونوں میاں بیوی کسی کا لحاظ کیے بغیر اب تو یوں کا رخ
عائشہ باجی کی طرف کر چکے تھے۔ ان کے ابا۔
بھائی۔ امی۔ سب کو گالیوں سے نوازا گیا۔ وہ بے
چاری رونے لگی۔ مجھے تو خیر انہیں کچھ کہنے کی ہمت ہی
نہ تھی۔ میں دل گرفتہ سی ہو کر واپس آنے لگی۔

”تم تو بیٹھو۔ تم کدھر جا رہی ہو۔“ ساس صاحبہ کو
میری موجودگی کا خیال آئی گیا۔

”نہیں میں چلتی ہوں۔ کام کرنا ہے گھر جا کر
ابھی۔“ ان کے سر غصے سے باہر جا چکے تھے۔

”تمہارے ماموں آگئے ہیں۔ اب خیر سے شادی کی
تیا ریاں شروع ہو گئیں۔“ دو منٹ پہلے کی لڑائی بھلا کر
یوں چسکے لے لے کر۔۔۔ پوچھنے لگیں جیسے کچھ
ہوا ہی نہ ہو۔

”جی۔“ میں نے مختصراً جواب دیا۔

”چلو اچھا ہے اپنوں میں جاؤ گی۔ ساس سر کا
احساس تو کرو گی۔“ وہ عائشہ باجی کو سناتے کے لیے کہنے
لگیں۔ ابھی وہ احساس نہیں کرتی تھیں۔ سارا دن
کو لہو کے تیل کی طرح جتی رہتی اور ہم لوگ ہمسایہ
میں رہ کر بھلا ان کی خصلتوں کو نہیں سمجھتے تھے؟
ہمسایہ آئینے کی طرح ہوتا ہے جو آپ کے کردار و
اخلاق کا سچا گواہ ہوتا ہے۔

عائشہ باجی سر جھکائے کدو چھیلی رہیں۔ ان کی
ساس وہاں سے اٹھ کر گئیں۔ تو میں نے ان سے
پوچھا۔

”ہوا کیا تھا۔“

”موریہ! بتانے کی ضرورت ہے ابھی۔“ وہ بے چارگی سے بولیں۔
بات تو واقعی ٹھیک تھی۔ بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی۔

”میرتا میں تو سہی۔ آج کیا نیا ڈرامہ ہوا ہے۔“
”میرے سر کہہ رہے تھے کہ آلو گوشت بناؤ۔“
سہا نے کہا۔ کدو گوشت۔ میں نے سوچا دونوں ہنڈیاں بنا دیتی ہوں۔ اسی بحث میں دونوں کی تو تو میں میں ہو رہی تھی اور پھر توپوں کا رخ میری طرف اس لیے مڑ گیا تھا کہ میں دو ہنڈیاں بنا کر ان کا بجٹ خراب کرنے لگی ہوں۔“

”وہ مطلب یہ کہ نہ زندہ رہنے دینا نہ مرنے دینا۔“

میں آزرہ سی ہو گئی۔ ایم ایس سائیکالوجی تھیں عائشہ باجی اور سچ میں پاگلوں کے چنگل میں آکر پھنس گئی تھیں۔ اب ہنڈیاں پر کپڑوں پر جو توں پر لڑائی کی تک تو نہ بنتی تھی۔ بر زندگی میں چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر الجھنے والے لوگ کبھی بڑی سوچ نہیں رکھ سکتے۔ کبھی بڑے کام نہیں کر سکتے۔ کبھی اعلا طرف نہیں ہو سکتے۔ یہ کم ہمت اور احساس کمتری میں جلنے والے لوگ ہوتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ کر زندگی جیسی حسین چیز کو داغ دار کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں نے عائشہ باجی کا دل پہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

”موریہ! شاوی وہاں کرنا جہاں آپ کو سمجھنے والے ہوں۔“ وہ اچانک سے بولیں۔

”عائشہ باجی! مقدر وہ ان دیکھی دیوار ہے جو چھوٹے پر بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ اس سے اتنے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ جتنے بے خبر آپ اپنی موت کے متعلق ہوتے ہیں۔“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں کا عکس ڈھونڈنے کے لیے آسمان میں اڑتی لال۔ پیلی۔ رنگ بھر گئی۔ پتنگوں کو دیکھیں گئیں۔

رحمان ماموں کیا آئے گھر میں میلہ سالگ گیا۔ رونق کا سماں تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر بات۔ فرمائشی کھانے۔ ادھر سے فصیح اور فریحہ لوگ بھی آجاتے۔ ماموں ہر دل عزیز تھے۔ آج پچھو کو تاریخ لینے آنا تھا۔ میں جدھر سے کڑوں۔ ماموں۔ فصیح۔ فریحہ اور عمر دغیو کی پھیڑ چھاڑ عروج پر ہوتی۔ کبھی مسکرا پڑتی۔ کبھی شرما جاتی۔ زندگی کے یہ دن بھی اپنا ہی حسن رکھتے ہیں۔ ای، دادی کام والی کے ساتھ گھر بستہ۔ فریحہ کو بھی محفل سے اٹھا کر کاموں پر لگایا گیا۔ وہ منہ بسورتی ای کے ساتھ کچن میں لگ گئی۔ ماہ زیب خالہ مجھے نزدیکی پار لے گئیں پتھر بڈنگ وغیرہ کروائی گئی۔

خیر سے پچھو لوگ چھ بجے آئے۔ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ فاسٹل کر دی گئی۔ شگن کے طور پر کچھ پیسے بھی میری پھیلی پر رکھے گئے۔ امی۔ خالہ آب دیدہ بھی ہوئیں۔ عمر نے تان لگا لگا کر (دھیاں رانیاں۔ کنا حمالا) کنناں لیے جانیاں (ہیٹیاں۔ رانیاں کن لوگوں نے پیدا کی اور کن لوگوں نے لے جلی۔ گایا۔ خالص زنانہ آواز میں۔ عمر کے گانے پر دادی تو رو بنے ہی بیٹھ گئیں جب کہ فریحہ فصیح ہنسنے لگی۔ ماحول یونہی روتے ہنستے لمحات کا بتا رہا۔

تھک ہار کر میں رات گزار بچے بستر پر آئی۔ دل پر نئی زندگی کی سرشاری۔ انگلیں۔ اندیشے۔ خواب سب براجمان تھے۔

”کیا تم فارغ ہو؟“ ابو بکر نے میرے کمرے میں جھانکا۔

”ہاں کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”عبید بھائی کی کال ہے تمہارے لیے۔ تم بات کر لو۔“

”کیسی ہو تم؟“ میرے ہیلو کہنے پر پوچھا۔

”میں ٹھیک آپ کیسے ہیں؟“ گفتگو میں مختصر

دورانہ آیا۔ خاموشی سی چھا گئی۔
 ”مجھے لگتا ہے کہ ہم خوش نہیں رہ سکیں گے۔ کوئی عجیب سا احساس۔ کوئی عجیب سی بات مجھے محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرح کا سمجھوتا ہی ہے۔“ عبید کی بات نے میری بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔
 ”نکس۔ کیا پچھلے تین سالوں میں اب اگر آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے؟“ میں نے ہکلاتی آواز کو مضبوط کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔

”ہاں مجھے لگتا ہے کہ ہم خوش نہیں رہ سکتے۔“
 میں یک دم چپ سی ہو گئی اور فون بند کر دیا۔ زندگی عجیب ہے یا عجیب ہونے جا رہی ہے۔ میں نے برف ہوتے وجود کو لا کر بیڈ پر پٹھا اور پھر ہچکیوں سے رو پڑی۔ ساری رات اذیت کے کالے ناگ ڈستے رہے۔ آج پتا چلا آنکھوں میں راتیں کاٹنا کسے کہتے ہیں۔ دلوں میں برہادی اترنا اور رنگوں کو بکھرتے دیکھنا کیسا لگتا ہے۔ وہ آپ کے وجود پر اترتے ہیں اور تیز شعاعوں کی مانند روح کے اندر سرایت کر جاتے ہیں۔

پتا نہیں صبح کا سورج کیسا طلوع ہوا۔ فجر کی نماز ادا کر کے میں بھاری سر کو تھامے باہر آئی۔ یہ خبر گھر والوں کے لیے بھی یقیناً ”اذیت ناک“ تھی مگر وجود میں اترتے سنائے مجھ اکیلی کو سہا رہے تھے۔ میں آج کے دور کی لڑکی تھی۔ وہ زمانہ گیا جب چھپ چھپ کر دکھ سے کر لڑکیاں باہل کے دیس چھلی جاتیں۔ ان چاہی زندگی۔ ان چاہا احساس۔ مجھے عائشہ باجی نہیں بننا تھا۔ بندہ پڑھائی بھول کے پانچلوں میں پاگل ہو جائے۔ میں نے ساری بات ای۔ ای۔ ای۔ ماموں کے سامنے جا کر رکھ دی۔ سب کارنگ فٹ۔ فوراً ”پھپھو کو فون کھڑکایا گیا۔ آنا“ فانا“ سب بڑے اکٹھے ہو گئے۔ اوھر سے ماہ زیب خالہ بھی آگئیں۔ بڑوں کے فیصلے تھے ہمیں اکیلی کیوں اذیت کا شکار ہولی۔

پھپھو نے غائبانہ عبید کو صلواتیں سنائیں۔ سب حیران تھے کہ تین سال تک تو سب ٹھیک تھا یہ اچانک اسے کیا ہو گیا۔ موصوف سے پوچھا گیا تو یہ بہانہ کیا کہ میں ابھی اسٹیبلس نہیں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا

ابھی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میں کچھ دباؤ کر رہا ہوں۔ خیر معلانی تلافی ہوئی بڑے ایک دوسرے سے جدائی کے خوف سے دو چار تھے۔ لوگوں کی خود پراٹھائی جانے والی انگلیوں کا خوف، معاشرے کا ڈر۔ یہ ڈر ہمیشہ زندگیوں نکل لیتے ہیں۔ یا تو ڈر کو نکل کر پھینک دینا چاہیے یا پھر ساری عمر رقص پر جونک کی طرح چمٹا کر آزادانہ اسے خون پینے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ پھپھاجی نے سیدھی سیدھی سنائیں کہ اگر عبید نے اوھر شادی نہ کی تو گھر سے نکال دیا جائے گا۔ پھپھو اوھر اوھر کی دہائیاں دیتی رہیں۔ ہیں تو وہ اسی کی ماں۔ چاہے میری پھپھی سہی مجھے اکیلے میں بلا کر کہا کہ ”تمہیں کیا ضرورت تھی سب کو بتانے کی؟ تو ایسے ہی بکو اس کر رہا ہو گا۔“ میں ان کی شکل دیکھ کر ہی رہ گئی۔ یہ تو وہ لوگ تھے جو گلا بھی کھونٹتے اور اوپر سے یہ بھی ڈر ڈالتے کہ چیخا نہیں۔

خیر تاریخ جون کی توں رہنے دی گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں اطراف میں پر میرا دل جیسے مرسا گیا ہو۔ امی۔ دادی۔ لاکھ مجھے کاموں میں یا اوھر اوھر الجھاتیں پر دل عجیب سا ہو گیا۔ عائشہ باجی کو ساری بات بتائی تو انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا۔

”مہوریہ! یہاں شادی نہ کرنا بس یہ سوچ لو کہ لوگ کیا سوچیں گے۔ تین سالہ منگنی۔ فلاں فلاں۔ یہ اذیت بڑی ہے یا پوری عمر کسی کے وجود پر بوجھ بن کر رہنا وقت سے پہلے خود کے لیے اپنے ہم سفر سے ناپسندیدگی کی سند مل جانا۔ زیادہ تکلیف دہ ہے۔“
 ”عائشہ باجی! عمر بھی تو گزرتی جا رہی ہے پورے چھبیس کی ہو گئی ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟ لوگ پینتیس پینتیس سال کی عمر میں شادی کرتے ہیں۔ بندہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سوچے کہ دو تین سال آگے پیچھے ہو بھی گئے تو کیا زندگی تکلیف دہ نہ ہو۔“ وہ آنکھوں میں آبی نمی چھپاتے ہوئے بولیں۔

”مہوریہ! عزت، ذلت، زندگی، موت سب اللہ کے

ہاتھ میں ہے۔ ساری دنیا بھی تمہاری عزت خراب کرنا چاہے اور مل کر زور لگالیں۔ اگر اللہ نہ چاہے تو کبھی بھی خراب نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اگر ساری دنیا بھی تمہیں عزت دینا چاہے اور اگر اللہ نہ چاہے تو تمہیں عزت نہیں دلا سکتی۔ اس وقت سب سے بہتر مشورہ اللہ کا ہے۔ حدیث پر عمل کرو۔ شاباش۔ میری گڑیا۔“ وہ کبھی کبھی پیار سے مجھے میری گڑیا کہتی تھیں۔

”جاؤ اور اللہ سے مدد مانگو۔ اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھنے والا۔ والدین کے بعض فیصلے اولاد کو ساری عمر بھگتنے پڑتے ہیں۔ پھر ہم ان فیصلوں پر بجائے نظر ثانی کرنے کے مقدر کی سیاہی کا نام دے دیتے ہیں۔“ میں ان کے گلے لگ کر بے تحاشہ روئی۔ دل کی بھڑاس نکل گئی تھی۔ پھر رات میں ماموں کے سامنے بات کی۔

”مخوریہ! ہو سکتا ہے وہ بعد میں ٹھیک ہو جائے۔“

”ماموں! امکان ہی ہے نا۔ اگر نہ ہوا تو۔۔۔“ میں نے روئی روئی آنکھوں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”یقیناً“ اس کا دماغ کسی اور وجہ سے خراب ہوا ہے۔ پچھلے تین سال تو ٹھیک ٹھاک گزرے۔“

”ماموں! اگر اللہ نے پہلے ہمیں خبردار کر دیا ہے تو آپ لوگ کیوں جان بوجھ کے مجھے تکلیف دہ زندگی کا حصہ بنانا چاہ رہے ہیں۔“

”مخوریہ! میں اس سے اکیلے میں ایک دفعہ بات کر لوں پھر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔“ ماموں نے مجھے تسلی دی۔

پھر میں نے رب کے حضور مقدمہ رکھ دیا اور رب کے حضور پیش کئے گئے مقدموں میں انسان ہمیشہ سرخرو ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اللہ کے سامنے رو رو کر التجا کی۔ دنیا میں جنت کا ملنا نیک مرد کو نیک عورت اور نیک عورت کو نیک مرد کا ساتھ ملنا ہے اور دنیا میں آزمائش کا ملنا ایسا ہے کہ نیک عورت کو برے مرد کا مل جانا اور نیک مرد کو بری عورت کا مل جانا۔

”پتا نہیں اللہ پاک۔ میں کتنی خطا کار گناہ گار

ہوں۔ بس۔ تو رحم کر۔ فضل کر۔ مجھے ”آنائش“ والی زندگی نہ دے۔ مجھے آسان زندگی دے۔ تیری سزاؤں کو سہنے کی ہمت بھی نہیں رکھتی میرے گناہ معاف کر کے مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور ایک اچھا شخص میری قسمت میں لکھ دے جو زندگی کو پرسکون بنا دے۔“ میں نے صبح شام اللہ پاک سے دعائیں کیں۔ جیسے بچے ماں سے ضد کر کر کے مانگتے ہیں۔ میں نے اپنے رب سے رو رو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مانگا کہ وہ ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرنے والا ہے۔ پتا نہیں ماموں نے عیبو سے کیا بات کی۔ انہوں نے گھر آ کر امی ابو کے سامنے یہ عذر دے دیا کہ وہ اس رشتے کے لیے مناسب نہیں۔ تین دن گھر میں بیٹوں کی میٹنگ چلتی رہی۔ عمر اور ابو بکر بھی ماموں کے ہمنوا ہو گئے۔

”وہ مردوں جیسا مرد ہی نہیں۔ کبھی کبھار کہتا ہے تو کبھی کبھار۔ کبھی کہتا ہے کہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کبھی کہتا ہے دو سال بعد کروں گا۔ عجیب ٹل مٹل کرنے والا انداز۔ ایسا شخص نہ خود خوش رہ سکتا نہ دوسروں کو رکھ سکتا ہے۔“

خیر تین دن بعد امی اور ابو نے پھپھو کو جواب دے دیا۔ پھپھو باقاعدہ لڑنے آگئیں۔ دادی البتہ پھپھو کی ہمنوا نہ بنیں۔ شاید اللہ سے مانگی دعا کا نتیجہ تھا کہ میری عزت پر کوئی حملہ نہ ہوا۔ سارے عیبو کو ہی صلواتیں سناتے رہے۔ پھپھو، امی اور دادی البتہ رو میں بہت۔ روئی تو میں بھی رہی۔ تین سال اس شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ سنا تھا۔ خیر رب کی مرضی اور اس کی مہربانی۔ پورا خاندان خبر سن کر افسوس کرنے آیا۔ خاندان کا پہلا واقعہ۔ خاندان میں ہی ممکن ٹوٹی۔ چی چی۔ افسوس۔ اور کچھ خواتین نے سوے بھی بھلسے۔ عائشہ باجی کی ساس نے بھی اگر اپنی فطرت کے مطابق خوب لگا لگا کر سنا میں۔ میں خاموش سنتی گئی۔ بس دعا کو میں نے اپنا ہتھیار بنائے رکھا۔ گھر کی فضا سو گوار سی رہتی۔ اور ایسے ہی پورا مہینہ گزر گیا۔

وہ خزاں کی ایک شام تھی۔ میں نماز مغرب سے فارغ ہو کر جائے نماز تہ کر رہی تھی جب عائشہ باجی اپنی امی کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں اور ساتھ خوشی کا پیام بھی لائیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بھائی زین العابدین کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ لڑکا انجینئر تھا اور ابو ظہبی میں اچھی پوسٹ پر بھی تھا۔ عائشہ باجی کی امی نے بہت محبت اور اپنائیت سے ہاتھ مانگا۔

”مجھے عائشہ نے سب بتایا ہے بہن۔ میں خود جاہلوں کے ہاں بیٹی بیاہ کر عمر بھر کی اذیت سہ رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ نہ اپنے اچھے ہوتے ہیں نہ پرانے۔ اچھا ہونا نہ ہونا انسانی فطرت پر منحصر ہے۔ اپنوں میں بھی برے مل جاتے ہیں اور بعض دفعہ غیروں سے بھی اپنے پن کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں آج سے پہلے کہیں بھی رشتہ مانگنے نہیں گئی۔ پہلی دفعہ بیٹے کے لیے گھر سے نکلی ہوں۔ مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔“ امی پر تو شاوی مرگ کی کیفیت تھی۔ داوی البتہ خاموش خاموش تھیں۔ عائشہ باجی جاتے ہوئے زین العابدین کی تصویر بھی مجھے دکھا گئیں۔ لمبا اونچا۔ خوش شکل لڑکا تھا۔ میں خود کم صم سی تھی۔ بڑوں کی مینٹنگ بیٹھی۔ پندرہ تاریخ آنے میں تین دن باقی تھے۔ سبحان ماموں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ داوی نے شور ڈالا۔

”طرح کے کا پہلے پتا کرواؤ۔“ امی نے عائشہ باجی سے بات کی۔ انہوں نے محل کا مظاہرہ کیا اور جھٹ ان کا ہتا لکھ دیا۔ خیر ماموں نے پتا کروایا ہر طرف سے اوکے ملا۔ پندرہ تاریخ بروز جمعہ میرا نکاح زین العابدین سے ہو گیا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد رخصتی۔ زندگی حیرت انگیز طور پر بدلی تھی۔ اللہ نے میری بے شمار التجائیں سن لیں۔ مجھے دنیا میں نیک مرو کا ساتھ ملا۔ اب میں نے ان کی نیک بیوی بن کر رہنا تھا۔ ہمارے میں اتنی محبت اتنی اندر اسٹینڈنگ ہو گئی کہ لوگ پوچھتے آپ دونوں کی لومینج ہے۔ زین العابدین نے مجھے بے تحاشا چاہا۔

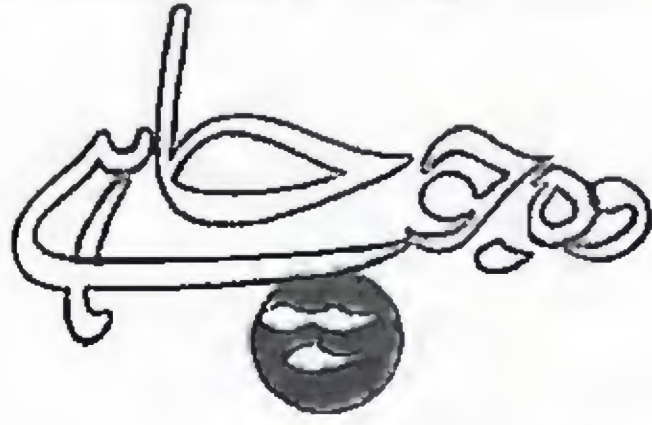
عزت دی۔ اور میں نے بھی اتنا ہی ان کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کیا۔ عائشہ باجی کی امی۔ مطلب

ساس کو ماؤں سے برہ کرمان دیا۔ ایک سال میں میری گود میں حمنہ بھی آگئی۔ جب خوش باش چہرہ لے کر گھر آئی تو امی۔ ابا اور داوی کھل سے جاتے۔ میرے بھائی اکلوتی بہن کو پر سکون دیکھ کر سکون میں آجاتے۔ ایک سال پہلے کا دکھ جیسے منوں مٹی تلے دب گیا۔ اس دوران عبیر کی دو اور منگیاں ہو کر ٹوٹ گئیں۔ لوگوں سے رسوائی کس کے حصے میں آئی۔ عائشہ باجی کی بات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد تھی کہ اگر اللہ نہ رسوا کرنا چاہے تو ساری دنیا بھی مل کر زور لگائے، نہیں رسوا کر سکتی۔ انہوں نے اس وقت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کر کے میرے دل کو ایک نئی زندگی دی تھی۔ اگر لوگوں کا ڈر۔ خاندان کی مظنی۔ بڑوں کی عزت۔ کا خوف ایک غلط فیصلہ مجھ پر مسلط کر دیتا۔ تو پھر والدین نے اس پر قسمت کی مہر لگا دینی تھی، کبھی کبھی مقدر کی سیاہی کا کچھ حصہ ہمارے غلط فیصلوں کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ میں حمنہ کو دیکھتی تو بے تحاشا پیار کرتی۔ میں نے کبھی نہیں کہا کہ ماں باپ بیٹیوں کے پیدا ہونے سے نہیں گھبراتے بلکہ ان کے نصیبوں سے ڈرتے ہیں۔ میں تو بس یہ ہی کہتی ہوں کہ ماں باپ کبھی بیٹیوں کے نصیبوں سے مت ڈریں۔ یہ ڈر اپنے دلوں سے نکل پھینکیں۔ بیٹیاں تحفے کی طرح رب سے وصول کریں۔ ایک ذمہ داری کی طرح انہیں پالیں۔ بیٹیوں کو اپنا نصیب مانگنا سکھائیں۔ رب پر توکل کرنا خود سیکھیں۔ نصیب دعاؤں کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ دعا میں نصیبوں کے بند قفل کھول دیتی ہیں۔ اللہ کی قدرت ہاتھ اٹھانے پر زار و قطار رونے پر زور و شور سے مانگنے پر ضرور جوش میں آتی ہے جس نے نصیب لکھنا ہے بس اس کو بندہ پکار لے۔ لوگوں کے سامنے جھولیاں پھیلا کر کبھی خود کو رسوا نہ ہونے دیں۔

حمنہ کو کارن للہ کس کھلاتے ہوئے میں نے طمانیت سے زین العابدین کا چہرہ دیکھا۔ جہاں میرے لیے صرف محبت ہی محبت تھی۔



قرۃ العین رائے



واپسی پر اس کی شکل پر بارہ بجتے دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ پھر غیر حاضر دعا کی کے ساتھ کام کرنے پر باس سے ڈانٹ کھائی ہے۔ اس نے کچھ نہیں پوچھا، وہ اس کی عادت سے واقف تھی۔ لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں کا جملہ ہی ادا کرنا تھا اور پھر بے حد کام میں مصروف وہ اچانک ہی بولتی چلی جاتی تب اسے خاموش سامع کا کردار ادا کرنا پڑتا۔ نصیحت اور مشورہ دونوں پر

آج وہ بہت چپ چاپ اور تھکی تھکی سی لگی تھی اسے وہ اس کی تمام پریشانیوں سے واقف تھی اس لیے فارغ وقت کی منتظر تھی جب وہ اپنے دل کا بوجھ اس سے کہہ کر ہلکا کرے گی۔
”مس راحیلہ“ آپ کو سربلار ہے ہیں۔ ”چڑا سی نے ان کے کہن کے پاس آکر دونوں کو ہی ان کے خیالات سے چونکا دیا۔

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

ہی وہ کبھی کان نہیں دھرتی تھی۔ اس لیے اب اس نے انہیں ضائع کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”جم کیسا جا رہا ہے؟“ لچ بریک پر اس کی خاموشی کو توڑنے کے لیے یونہی پوچھا۔

”ہوں۔۔۔! ہاں! اچھا جا رہا ہے لیکن تھک جاتی ہوں۔ آفس چھٹی پر سیدھا جم جاتی ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ مشینوں پر ورزش کر کے وجود اور تھکن کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالکل دل نہیں چاہتا یہ سب کرنے کو۔“ اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

”ہوں! ویسے تمہیں ضرورت تو نہیں جم جانے کی؟ اسمارٹ سی تو ہو۔“ کئی بار کی کئی گئی بات پھر اس کے ہوں سے ادا ہوئی۔

”ہونہ! آپ کو ایسا لگتا ہے لیکن وہ کتا ہے کہ جم جاؤ۔ خود کو اور اسمارٹ کرو، جتنی پتلی ہوگی اتنی عمر سے چھوٹی نظر آو گی ورنہ اماں نے تمہیں دیکھتے ہی یہ کہہ کر صاف انکار کر دیتا ہے کہ اتنی بڑی عمر کی بہو میں نہیں لانے والی ہیں اسی وجہ سے یہ سب کرنا پڑ رہا ہے۔“ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ گویا ہوئی۔

وہ اس موضوع پر اسے کافی سمجھا چکی تھی لیکن

نتیجہ صفر۔ اس لیے خاموش ہی رہی۔

”آپ آج لچ مین کیا لالی ہیں؟ مجھے تو بس یہ پتہ ہی کھانے ہوتے ہیں۔ اتنے دنوں سے کچھ ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا۔ صبح صرف ایک براؤن بریڈ، چینی کے بغیر چائے اور انڈا اور اب یہ پتہ اور رات کو کچھ بھی نہیں کچھ فرق پڑا ہے مجھ میں؟“ اپنے سلاو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

تھکن سے ماند پڑی جلد، آنکھوں کے گرد حلقے اور پیچھے سے کال، یہ فرق بڑا تھا اسے۔ وہ بس اسے بغور دیکھ کر دل میں سوچ کر رہ گئی۔

”ہاں کافی فرق ہے اب۔ اسے کہوں نا وہ اپنی ماں کو تمہارے گھر بھیجے اس کی ڈیمانڈز ہی پوری کرنی رہو گی کیا؟ اس نے کہا جاب کر لو اس نے کہا جم جوائن کرو“

اس نے یہ کہا اس نے وہ کہا اور تم بس اس کے اشارے پر ناچتی پھرو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے مشورہ دینے بنا رہ نہ پالی۔

ان دو تین ماہ میں ان کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ ویسے بھی کافی نرم دل کی مالک تھی اس لیے راحیلہ کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔

”ہائے زارا جی کیا کروں؟ آپ کو ایسے کوئی مسئلہ نہیں شادی شدہ ہیں بچے ہیں گھر ہے۔ صحیح وقت اور صحیح عمر میں سب کچھ ہے آپ کے پاس والدین کے آگے پیچھے فوت ہونے کے بعد میری زندگی بھائیوں اور بھائیوں کے رحم و کرم پر آگئی۔ رشتے آتے رہے اور وہ لوگ مین میخ نکالتے رہے۔ کسی نے سوچا ہی نہیں کہ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ رشتوں کے انتظار میں گھر کی چوکھٹ دھول اڑانے لگے گی۔ دل بہلانے سے زیادہ اپنا خرچا اٹھانے کے لیے ایک آفس میں جاب شروع کی۔ کام زیادہ نہیں تھا سکون تھا اور وہیں امجد سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے اس آفس میں جاب کرنے کو کہا۔ یہاں کام بہت زیادہ ہے۔ سیکریٹ میں چند سو کے اضافے کے لیے مجھے کافی دیر کام کرنا پڑتا ہے اور پھر اب جم بھی اور جب تھکی پاری گھر پہنچتی ہوں تو تین بھابیوں میں سے کسی نہ کسی بھابی کا کوئی کام حاضر ہوتا ہے۔“

”اور ڈائننگ کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کر رہی ہو۔“ زارا نے لقمہ دیا اور پھر خاموشی سے دونوں چچ کرنے لگیں۔



”راحیلہ تم ٹھیک ہو؟“ راحیلہ کو اچانک دوبارہ کرسی پر بیٹھتے دیکھ کر زارا تیزی سے اس کی جانب آئی۔

”ہاں بس چکر سا آگیا تھا۔“ سر کو تھامے راحیلہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

”چکر تو آئے گا اپنی جان سے زیادہ بوجھ ڈال رکھا ہے تم نے خودیر۔ اوپر سے اتنی زیادہ ڈائننگ تمہیں

پتا ہے یہ کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ سارا دن بھوک پیاسی رہتی امجد کی ڈیمانڈ پوری کرتے کرتے تم نے ختم ہو جانا ہے۔ یہ لو جو سو فریٹش ہے۔ چینی کے بغیر تمہارے لیے گھر سے لے کر آئی ہوں۔“ زارا نے راحیلہ کو لتاڑتے ہوئے جو س کا گلاس اس کی جانب بڑھایا جو اس نے ساتھ لائی بوتل سے نکالا تھا۔ راحیلہ کی پیلی پڑتی رنگت نے اسے تاؤ ہی ولا دیا تھا۔

”زارا جی، آپ نہیں سمجھیں گی۔۔۔“

”کیوں نہیں سمجھوں گی، پراہلمز تو ہر کسی کے ساتھ ہیں۔ بقول تمہارے، میری وقت پر شاوی ہو گئی۔ شوہر ہے بچے ہیں تو زندگی کا بھی اینڈ ہو گیا کیا؟ زندگی جب تک ہے پراہلمز بھی تب تک ہیں۔ میں یہ جاب خوشی سے نہیں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانے کے لیے کر رہی ہوں، آفس، گھر، بچے۔ سسرال بہت سارے۔ جھنجھٹوں میں میری اکیلی جان پھنسی ہوئی ہے اور اس بات کا احساس میرے شوہر کو ہے اور میں دلائے بھی رکھتی ہوں۔“

کسی ایک شخص کے نام زندگی کرنے کا مطلب اس کے ہاتھوں کھٹیلی بننا نہیں ہے۔ راحیلہ! امجد نے کہا ہے کہ تم جم جاؤ، ڈانٹنگ کرو تاکہ بالکل تلی ہو کر اپنی عمر سے چھوٹی نظر آسکو اور اس کی ماں تمہیں بہو کی بطور

پر قبول کر لے اور تمہاری بڑھتی عمر اس رشتے میں رکاوٹ نہ بنے حالانکہ تم بوٹی نہیں ہو۔ بس بھرے جسم کی مالک ہو اور اس میں تم اچھی لگتی بقیں۔ امجد اگر واقعی تم سے مخلص ہے تو اسے اپنے گھر والوں کو تمہارے لیے منانا چاہیے، تمہاری پراہلمز کو سمجھنا چاہیے نہ کہ تمہیں اپنی انگلیوں پر بلا وجہ کی ڈیمانڈز بتا کر نچا تا پھرے۔“ زارا نے ایک بار پھر پیلی رنگت کی ماری راحیلہ کو سمجھانا چاہا مگر اس کی مہرہ لب کیفیت نے اسے باور کرا دیا کہ زارا کی باتیں راحیلہ کے دماغ پر دستک دے رہی ہیں اور نہ دل پر۔

راحیلہ کے لیے امجد اس کی آنے والی خوشحال زندگی کا آخری سہارا بن چکا تھا۔ اول تو رشتے آتے

نہیں تھے اور جو اکا دکا آتے وہ رنڈوے یا طلاق شدہ مردوں کے ہوتے جو اس سے عمر میں بھی دگنے تھے اور انہیں بیوی سے زیادہ آیا کی ضرورت تھی۔ اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے وہ اب امجد کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔



سامنے کا منظر دیکھ کر زارا سے حیرت سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ ایک بار تو اسے راحیلہ کی دماغی حالت پر شک گزرا۔ اس نے اپنی آنکھیں دو تین بار جھپکیں، کہیں لے سیو ہم تو نہیں لیکن آنکھوں کے ساتھ ساتھ جو خوشبو اسے آرہی تھی وہ اس کا ہرگز وہم نہیں تھی اتنے مہینوں کی محنت کو راحیلہ اتنے اطمینان سے بریاد کر رہی تھی۔ ابھی پچھلے ہفتے جب وہ ڈانٹنگ کی وجہ سے چکرا کر گرنے لگی تھی لیکن ایک نوالہ منہ میں جانا نہیں دیا تھا اور اب۔؟

”راحیلہ! یہ سب کیا ہے؟“ لنچ بریک میں زارا نے اپنا لنچ بکس راحیلہ کی ٹیبل پر رکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ اتنا ہیوی کھانا اور وہ بھی راحیلہ!

”دسی مرغا ہے۔ دسی گھی میں پکا ہوا اور اس کے بعد مجھے آدھا درجن کیلے بھی کھانے ہیں اور تھوڑی دیر بعد پھر کچھ اور۔ آج آپ کی میری طرف دعوت

ہے۔ میں آپ کے لیے بھی بنا کر لائی ہوں۔“ مرغی کی ٹانگ کو مزے سے کھاتے ہوئے راحیلہ نے مزے سے جواب دیا۔

”کیا فائدہ جم جا کر ایک دو گھنٹے مشقت کرنے کا اگر تم اتنی ہیوی ڈائنٹ لو گی۔“ زارا نے کرسی ٹیبل کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”جم سے چھٹی اب مجھے بالکل ورزش نہیں کرنی، کھانا ہے اور بس کھانا۔“ راحیلہ جھٹ بولی۔

”خیریت! یہ انقلاب کیسے آگیا؟“ زارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”پرسوں ہفتے کو امجد کی والدہ آئی تھیں ہمارے گھر،

اس دن تو بس مل کر چلی گئیں پھر امجد نے فون پر بتایا کہ وہ اس کے منانے پر رشتہ ڈالنے تو چلی آئیں لیکن انہیں میں کمزور سی پسند نہیں آئی۔ میرا مطلب باقی تو سب ٹھیک ہے امجد کی ضد کے آگے انہوں نے ہار مان لی ہے لیکن ان کی ایک شرط ہے کہ میں اپنا وزن بڑھالوں۔ دیہاتی سی خاتون ہیں انہیں بھاری بھر کم وجود کی لڑکیاں پسند ہیں۔ کمزور اور لاغر نہیں اور انہوں نے مجھے ایک ہفتہ دیا ہے لہذا اب ڈانٹنگ وائٹنگ بند اور آج سے کھانا اور بس کھانا۔ ”راحیلہ نے زارا کی خیرت دور کرتے ہوئے ساری بات بتائی۔

ساتھ وہ مسلسل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ ”قسم سے کھانا کھانے کی بالکل عادت نہیں رہی۔ سینے میں جلن شروع ہو جاتی ہے۔ معدہ میں تیزابیت سی ہے۔ لیکن میرے پاس دن تھوڑے ہیں۔ اس لیے ہر بات کو نظر انداز کیے اپنی ساری تنخواہ اب کھانا کھانے پر خرچ کر رہی ہوں۔“ راحیلہ نے بے چارگی سے کہا۔

”لیس ناں آپ بھی لیس۔“

”اور امجد کو تو اس مارٹ لڑکیاں پسند ہیں۔ شادی کے بعد کیا کروں گی۔“ زارا نے چھوٹا سا پیس اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”پھر ڈانٹنگ اور جم جاؤں گی اور کیا کر سکتی ہوں۔“ راحیلہ نے ترنت جواب دیا۔

”بس جو وہ چاہے وہی ہو ڈالی بات ہے۔“ راحیلہ

نے قدرے وقفے بعد دل گرفتگی سے کہہ کر خود کو کھانا کھانے میں مشغول کر لیا۔

”ایسا نہیں ہے کہ جو امجد چاہے گا راحیلہ کو ویسا ہی کرنا ہو گا۔ یہ تو تمہاری سوچ نے خود کو اس کے تابع کر لیا ہے خواہ مخواہ۔ بے شک عمر بڑھ رہی ہے شادی کی عمر نکل رہی ہے اچھے رشتوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے مگر ہے تو سہی ابھی پچھلے دنوں میرے شوہر نے اپنے ایک کو ایک کا ذکر کیا تھا۔ میں بھی مل چکی ہوں بہت اچھی نفیس شخصیت کے مالک ہیں تم سے ذکر کیا تو تم نے اتنی بڑی عمر کا مرد کہہ کر رشتہ ٹھکرا دیا لیکن اصل وجہ یہ

نہیں تھی۔ اصل وجہ تو تمہاری یہ اندھی محبت ہے۔ ایسی محبت جس میں تم نے اپنی شخصیت اپنی سوچ امجد کے ہاتھ گردی رکھ دی ہے۔ اپنی شناخت اس کے حوالے کر دی ہے تو بس پھر جو وہ چاہے کہے اور کرائے۔ کاش ہم لوگ اللہ پر توکل کرنے والے بن سکیں۔ جب ہمارا ایمان ہمارا یقین اللہ پر کمزور ہوتا ہے تو اپنی زندگی اپنی تقدیر سنوارنے کے چکر میں بگاڑتے چلے جاتے ہیں اگر ہم یہ کامل یقین رکھیں کہ جو اللہ ہمارے لیے چاہے گا وہ بہترین ہو گا تو پھر یوں اپنی زندگی کسی دوسرے انسان کے ہاتھ کھلوانا نہ پڑی۔“

زارا دل میں صم ”کم“ کی تفسیر بنی راحیلہ سے مخاطب ہوئی اپنے یسین کی جانب چلی آئی۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔

”اللہ ہم سب کو ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھے، آمین۔“ زارا کے بلند آواز میں ادا کیے گئے اس جملے پر راحیلہ نے نا سمجھی سے اس کی جانب دیکھا اور سر جھٹک کر کولڈ ڈرنک کی بوتل غماغت چڑھا گئی۔

”یہ زارا جی بھی نا کبھی کبھی عجیب سی بات کرتی ہیں۔ بھلا اس وقت اس دعا کی کیا تک ہے۔“ راحیلہ نے ہلکی سی طنز مسکراہٹ سے سوچا۔

ہائے بالکل دل نہیں چاہ رہا اب کھانے کو اور کولڈ ڈرنک پینے کو ڈانٹنگ کے دوران اس کے اتنے سائیڈ ایفیکٹ پڑھے تھے کہ توبہ دل اچاٹ ہو گیا تھا لیکن یہی سب چیزیں مجھے جلد از جلد موٹا کر سکتی ہیں بس اللہ

میاں جی اتنا موٹا کر دے کہ میں امجد کی ماں کو پسند آ جاؤں (آمین)۔“ راحیلہ نے جھٹ سے دعا مانگی اور نیبل سے لیمون سسٹن لگی۔

لیچ ٹائم ختم ہو چکا تھا اور اب اسے شام تک بس فائلوں میں سرکھپانا تھا اپنے مستقبل کے امجد کے سنگ سہانے خواب دیکھتے ہوئے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جن خوابوں میں دل کا سکون شامل نہ ہو وہ پورے ہو کر بھی آپ کو بے چین کیے رکھتے ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی

میں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اس سنسنی کو مس کیا تھا جس کا شکار ہر وہ لڑکی ہوتی ہے جو اپنے منگیتر کے بارے میں بات کرتی ہے۔

سنسنی مثبت معنی میں نہ کہ میری طرح منفی میں کہ جبک کا خیال آتے ہی میرا سراپے چکرانے لگتا ہے جیسے بہت ساری جیگاڈریں میرے سر میں گھس کر

ناؤلیٹ



آپس میں پکڑم پکڑائی کھیل رہی ہوں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ ایک منگیتر میں آخر ایسا کیا ہوتا ہے کہ اتنے اہتمام سے اس کے بارے میں بات کی جائے جیسے اسکول میں کالج میں لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ اس کے لک کی اس کے سحر کی اس کے اشاکل کی اس کی مسکراہٹ کی حتیٰ کہ اس کے سناٹے لطیفوں کی بھی۔ جن کی منگنی نہیں ہوتی انہیں فکر لاحق رہتی ہے کہ ان کا ”وہ“ کیسے ان کی محبت میں مبتلا ہو گا یا دراصل اسے کیسا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے وہ باقاعدہ فلموں کے سین ذہن میں رکھ کر ان میں سے چھانٹی کرے لگتی ہیں کہ کون سا ”ہیٹسٹ فالنگ ان لو سین“ ہے۔ انہیں یہ سوچیں بھی گھبرے رکھتی ہیں کہ اس خاص انسان کو انہیں پروپوز کیسے کرنا ہو گا، فون پر باتیں کیسے کرنی ہوں گی، سا لگرہ پر کہاں ڈنر کے لیے لے کر جانا ہو گا اور گفت کو کس خاص انداز سے ان کے دربار میں پیش کرنا ہو گا۔ مجھے حیرت ہوتی کہ ایک منگیتر کو لے کر اتنا کچھ کسے سوچا جاسکتا ہے۔ منگیتر کیا کوئی اور ہی مخلوق ہوتی ہے جو آپ کی زندگی کو غباروں، پھولوں، کینڈل، المٹ ڈنر اور گفٹس سے بھر دے یا وہ آپ سے ایسی بات کہے جو کسی نے کبھی نہ کی ہو۔ یعنی کون سی ایسی بات ہے جو کسی نے کبھی نہ ہو؟ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی یا اس پاس کی لڑکیاں مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتیں اور پھر اگر کسی دوست سے پوچھ ہی لیتی تو وہ ہنس کر کہہ دیتی۔

”یر آراے آنٹ“ (تم پاگل ہو)

میری انگلش اچھی ہے لیکن پھر بھی میں نٹ کو

READING
Section



تم اخروٹ کی طرح ہو۔ سخت اور تھوڑی سی نمکین، زیادہ کھالینے پر کچھ کچھ کڑوی بھی۔ ایسی لڑکی جسے زیادہ نہ کھلایا جاسکتا ہے روزانہ اور یہ بھی کہ تم اخروٹ کے خول میں بند ہو۔ مجھے گھٹن ہونے لگتی ہے کہ کیا میں اخروٹ کے خول میں بند لڑکی ہوں؟ اتنے خنے منے سے اخروٹ کے خول میں بند۔ انس۔ لیکن کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ میں ایک نارمل منگیترانہ لائف نہیں گزار رہی۔ میں یہ معلوم نہیں کر پائی کہ منگیتر کیسے ہوا جاتا ہے یا منگیتر کو کیسے رکھا جاتا ہے۔ یعنی منگیتر کا مصروف کیا ہے؟ جہاں تک غباروں، پھولوں اور ڈنر کی بات ہے تو میں اب تک ان معاملات میں ”تباہ شدہ“ نہیں بلکہ آفت زدہ“ ہوں۔ جہاں تک، گفتگو دینے اور لینے کی بات ہے تو اس میں دونوں طرف سے دھاندلی کی جاتی ہے اور ہر مار کی جاتی ہے۔ فون کرنے کی بات تو ایسی ہی ہے جیسے چاند پر جا کر ٹانگا کرنے کی۔ ہم دونوں کے والدین نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ ہم کم سے کم فون پر ہی بات کر لیا کریں لیکن ہم دونوں نے اپنی پوری سی کوشش کی کہ ”بھاڑ میں جائے یہ“ مجھے کوئی ضرورت نہیں اس کے منہ لگنے کی۔ جو سامنے سے اچھا نہیں لگتا وہ فون پر کیا اچھے لگے گا۔ ہم دونوں نے ابھی سیدھے منہ ایک دوسرے سے بات نہیں کی پھر بھی ہم ”منگیتر“ کے عہدے پر فائز ہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے جان چھڑانے کا کوئی ایک بھی موقع جانے نہیں دیا پھر بھی ہم ”منگنی شدگان“ ہیں۔ بلاشبہ یہ کھلا تضاد ہے۔ اسی لیے بچپن سے اب تک کے تلخ تجربات سے اس نے منگیترانہ فیز میں ”میں نے تو یہی جانا ہے کہ منگیتر ازاے آئیں۔“

READING Section

میری تاریخ کافی لمبی ہو گئی ہے نا۔ جبکہ میری تاریخ میں ہے ہی کیا؟ میں پیدا ہوئی، اتفاق سے خوب صورت بھی تھی اور اس سے بڑے بلکہ برے اتفاق سے ان ہی دنوں میرے کینیڈا والے انکل ہمارے گھر قیام پذیر تھے اور ان کا چار سالہ لمبوا یعنی تنبو اور جمبو۔۔۔ افسوس۔۔۔ ہاں وہی جیک بھی ان کے ساتھ تھا بلکہ آج تک ان کے ساتھ ہی ہے۔ ہمت ہے ان کی جو اسے اپنے ساتھ رکھا ہے شاید اسی لیے والدین کا رتبہ اتنا عظیم ہے کہ وہ ایسی آفات کو بھی جھیل جاتے ہیں۔

وہیے مجھے ابھی بھی یقین نہیں آتا کہ انکل ایسے
پینڈو بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر انکل کو ایسا ہی ویسی ٹائپ
ہونا تھا تو وہ اتنے ماڈرن ملک کینیڈا گئے ہی کیوں؟ یہ
ویسی لوگ ذرا نہیں بدلتے۔ اپنے بیٹے کا تک نیم کسی
انگریزی فلم کے ہیرو پر جیک رکھ دیا اور اس انگریزی
ہیرو کے لیے پنجاب کی لڑکی ”معروہ“ کا ہاتھ مانگ لیا۔
جبکہ ابھی اس بے چاری کو گلا پھاڑ کر پونے سے
فرست نہیں تھی۔ دودھ کو پی کر الٹ دیتی تھی اور کوئی
نیم غذا اس کے پیٹ میں زیادہ دیر تک ٹھہرتی نہیں
تھی۔ ایسی نو مولودگی کے ٹریک سے ہٹی ہوئی لڑکی کو
انہوں نے اپنی ”بہو“ کے طور پر پسند کر لیا۔ دفع کرتے
پھر کینیڈا کو یہاں پنجاب میں ”دیہاتوں“ کی کمی تھی
کیا۔ یہیں رہتے اور کرتے بچپن کی مستغنیات بلکہ نکاح
بھی کر دیتے۔ ویسے دس سال کی عمر میں میرے ذہن
میں یہ پلان پرورش پانے لگا تھا کہ اگر میرا نکاح کرنے
کی کوشش کی گئی تو میں پولیس بلا لوں گی۔ مجھے بہت
شوق تھا کہ اخباروں میں میری خبر آتی کہ ”دس سالہ بچی
کا نکاح“ مولوی اور ساس سر کو روئے اسمیت حوالات

”جو لوگ باہر چلے جاتے ہیں ان میں حسب الوطنی ختم ہو جاتی ہے۔“ میں نے غصے کو اور ہوا دینی چاہی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔“ پایا نے میری تائید کی اور فون اٹھا کر انکل کو حسب الوطنی یاد دلانی۔ انکل کو حسب الوطنی یاد آ بھی گئی اور وہ آنٹی کے ساتھ حسب الوطنی نبھانے پاکستان آگئے۔ میچ دیکھا، شہر گھوما، شاپنگ کی اور چلے گئے۔ آنٹی مجھے تصویریں دے گئی تھیں، اس ٹیڈی بیر کی۔ شرم کے مارے میں نے کچھ کو تو فوراً ”جلا ہی دیا۔ یہ کیا طریقہ ہے ریچھ کی کھال پہن کر پوز بنانا اور خرگوش بنی لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا۔ ویسے پتا نہیں ایسی زرگوشتیاں کس جنگل میں پائی جاتی ہیں جو ایسی چھوٹی چھوٹی فراکیں پہنتی ہیں۔ میری خالہ کی چار سال کی بیٹی بھی اس سے بڑی فراکیں پہنتی ہوگی جو اس کی خرگوشنیوں نے پہنی تھیں۔ کبھی منی فراکیوں سے بچی خرگوشنیوں کو میں اسکول لے کے گئی، میرا مطلب ایک تصویر کو اور پھر قریباً ”پورے دو ہفتے تک ہم توبہ توبہ کرتے رہے تھے۔ میری کلاس میں وہ تصویر خوب گھومی۔ اب جو لڑکیوں نے ان لڑکیوں کی فراکوں پر جنم کے دروازے کھولے کہ میں بھی دو ہفتے خوف سے سو نہیں پائی۔ بعد میں ہم دوستوں نے مل کر مار کر کلرز سے ان بے چاریوں کو پورے کپڑے پہنائے، انہیں لباس یافتہ کیا۔

اگلی بار جو تصویریں آئیں وہ پہلے سے زیادہ شرمناک تھیں۔ کوئی میچ تھا اس کا۔ جیک کافی شوخا ہو رہا تھا اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ۔ وہ اب ایک دو سرے کو کھینچ رہے تھے، ایک دو سرے پر گر رہے تھے۔ چلا رہے تھے، اچھل رہے تھے، بڑے بڑے منہ کھول کر ہنس رہے تھے، بلکہ ہنستے ہنستے مر رہے تھے۔ ایک تو عین اس کے سینے پر گرتے ہوئے مر رہی تھی۔ مٹی کو دکھایا تو ہنسنے لگیں۔

”بیٹا یہ دیکھو وہ گر گیا ہے۔ مہجڑ میں ایسا ہی ہوتا ہے وہ میچ جیت گیا ہے تو۔“

”تو جیتنے والے پر لڑکیاں پھدکتی ہیں؟“

میں بند کر دیا گیا۔ ”میں سرخ کھونٹھ میں ایک عرصہ اپنی تہہ و براخبا میں رہی۔“ میں نے پولیس کا نمبر بھی یاد کر لیا تھا لیکن انکل آئے ہی نہیں کینڈا سے اپنی کینڈی اور جیکی میرا مطلب ”مسٹر جیک“ کو نکاح کے لیے لے کر۔

آواز کے بعد میری اس سے پہلی ملاقات ویڈیو کے ذریعے ہوئی تھی، جب میں نے اسے چلتے پھرتے، کودتے پھاندتے دیکھا۔ پایا کینڈا گئے تھے اور کینڈی کی والی بال کھیلتے ہوئے کی ویڈیو بھی بنا کر لائے تھے۔ کیا چھوٹی سی نیکر پہنی ہوئی تھی اس نے۔

”اتنے چھوٹے کپڑے پہنتے ہیں یہ لوگ۔“ میں جتنا بنا سکتی تھی اتنا منہ بنا کر کہا۔

”وہ لڑکا ہے لڑکی نہیں۔ والی بال پیئرز کا یہی ڈریس ہوتا ہے۔“ پایا بھی جتنا بنا سکتے تھے اتنا ہی منہ بنا کر کہا۔

میں وہیں چپ ہو گئی، میں نے تو بس ایک ذرا سی کوشش کی تھی انہیں اس کینڈی سے متنفر کرنے کی لیکن وہ مجھ سے ہی متنفر ہو رہے تھے۔ بہت لاڈلا تھا وہ پایا کا۔ مٹی کا بھی کم لاڈلا نہیں تھا۔ اگلی بار پایا گئے تو اس کی فل ٹریک سوٹ میں سونمنگ کرتے ہوئے ویڈیو بنا کر لائے۔

”اب ٹھیک ہے؟“ پایا نے مجھ سے پوچھا۔ جواب میں اس بار میں نے منہ بنا بھی لیا اور سو جا بھی لیا۔

پایا نے میری ویڈیو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن میں مافی ہی نہیں۔ جسے ملنا ہے وہ گھر آجائے۔ آئے دن میں سنتی رہتی تھی کہ فلاں ملک گھومنے گئے، فلاں ملک فلاں میچ دیکھنے گئے۔ ایک ہمارے ہی ملک نہیں آ رہے تھے وہ ویسے پایا نے ایک بار انہیں کرکٹ میچ کے لیے بلایا تھا۔ وہ کینڈی آ بھی رہا تھا لیکن پھر اس کا کوئی اسکول کا میچ آگیا اور وہ ہمارے یہاں کا میچ دیکھنے آ نہیں سکا۔

”کہاں ہمارا پاکستان ٹوانڈیا ہوم گراؤنڈ میچ اور کہاں اس کا اسکول والی بال میچ“ اتنی انسٹلٹ۔ ”میں نے کھانا کھاتے کہا۔ پایا کو بھی غصہ آیا۔“

می ہنسیں۔۔۔ ”وہ پھدک نہیں رہی، عروہ وہ گرنے سے بچنے کے لیے۔۔۔“

”گرنے سے بچنے کے لیے وہ پھر سے اسی پر گر رہی ہے۔“

”یہ تصویریں مجھے دے۔ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ بھول جاؤ جیک کو۔“

”یعنی منگنی ٹوٹ گئی۔“ مجھے وہ یاد ہی کب تھا جو اسے بھولتی۔

”یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”آپ نے ہی کہا بھول جاؤ جیک کو۔۔۔“

”بھول جاؤ مطلب اس کے بارے میں نہ سوچا کرو۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے جنہی لوگوں کے بارے میں سوچنے کی۔“

”بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو۔“ می نے خاص طاقت صرف کی مجھے گھورنے میں۔

مجھے یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ مجھے کب معلوم ہوا تھا کہ وہ میرا منگیتر ہے۔ ہاں لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ یہ منگیتر مجھے کب زہر لگنا شروع ہوا تھا۔ تب جب اس نے فون پر میری پونمز سنی شروع کی تھیں۔ اسی وقت سے میں نے اسے سخت ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھی

کچھ بھی کہتی رہیں لیکن ایک بات تو صاف ہے کہ۔۔۔

”وہ میرا منگیتر نہیں ہے۔۔۔ بس۔۔۔“

کچھ بھی کہیں لیکن انسان چاہ کر بھی اپنا بچپن تفصیل کے ساتھ یاد نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اسے یہ یاد نہیں آسکتا کہ فلاں وقت پر اس کے ساتھ فلاں

زیادتی کیوں کی گئی تھی۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ جس چھوٹی سی لڑکی کے مسلسل رویے سے تنگ آکر

میں نے کھینچ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا تھا بد لے

میں وہ پوری کی پوری ہی میرے منہ آگے گی۔

ہونہ۔۔۔ پہلے پتا ہوتا تو شاید میں اس کا گلا دبا دیتا۔

وہ بچے بھی ایک چار سال کے بچے کو دنیا کی کوئی عدالت

سزا نہیں دے سکتی۔ اپنا سارا بچپن میں اس کی تصویریں دیکھتا رہا کیونکہ مجھے مجبور کیا جاتا تھا کہ میں اسے دیکھوں۔ کبھی کبھی ماما میری اس سے فون پر بات کروانے کی بھی کوشش کرتیں۔ وہ مجھ سے کہتیں۔

”سنو، عروہ کتنی کیوٹ پونمز سنارہی ہے۔“

”پونمز؟ ریکی مامی۔“ میرا منہ خود بخود بگڑ جاتا، کیونکہ پونمز تو مجھے کبھی سنائی نہیں دی، البتہ پھس

پھس کی آوازیں بہت آتی تھیں۔ ماما تو مسلسل ہنس رہی ہوتیں اور میں اپنے تھننے پھلارہا ہوتا تھا کہ کیا مصیبت ہے کہ مجھے اس کی پھس پھس سننے پر مجبور کیا

جا رہا ہے۔ اسی پھس پھس کی وجہ سے میرا ناک کافی پھول گئی تھی اور میرے اسکول کے لڑکوں نے مجھے عجیب و غریب ناموں سے بلانا شروع کر دیا تھا اور وہ بھی

کہ باز ہی نہیں آ رہی تھی۔ آئے دن اس نے کسی نہ کسی کوئے، ہاتھی، چڑیا، طوطے کی نظم سیکھی ہوئی

تھی۔

”ماما کیا یہ پورے جنگل کی پونمز مجھے سنائے گی؟“

”اتنی ہی پیاری بچی ہے تو پھس پھس کیوں کرتی ہے؟“

”شٹ اپ! کتنے بد ذوق ہو تم؟“

”شٹ اپ ٹوٹی۔ بہت بد ذوق ہوں میں۔ پلیز مجھے دوبارہ فون مت پکڑا دے گا۔“ میں نے ماما سے کہا

جو ظاہر ہے ماما نے نہیں سنا اور اگلی بار پھر سے مجھے فون پکڑا دیا۔ اس بار وہ ٹرین پر پونمز سنارہی تھی۔ اگلی پونمز

یقیناً ”ٹرین کے مسافروں پر آنے والی تھی“ اس سے اگلی ٹرین اسٹیشن پر اور اس سے اگلی ٹرین ڈرائیور پر اور

پھر اور پھر۔۔۔ پھر شاید یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

”آئی! کیسی گلی آپ کو میری پونمز؟“ شاید وہ سمجھی کہ ماما سن رہی ہیں۔ ”بہت بری، انتہائی بکواس اور

تمہارے منہ کی بدبو یہاں کیفیڈا تک آرہی ہے، کون سراپیسٹ یوز کر لی ہو تم؟“

”پتا نہیں! ممی برش پر لگا کر دیتی ہیں۔“ اس کی رندھی ہوئی آواز آئی۔ اب کیوٹ لگ رہی تھی وہ۔

”برش پر کیا شپالش لگاتی ہو۔۔۔ ڈفر۔۔۔“

”نہیں! ٹوٹھ پالش۔“ اس دن میری معلومات میں اضافہ ہوا کہ ٹوٹھ پیسٹ کو ٹوٹھ پالش بھی کہا جاسکتا ہے۔ آخر یہ بات مجھے کیوں نہیں سوچھی۔ اس سے سوسائٹی میں تھوڑا چینیج بھی آجاتا اور ڈکسٹری کو ایک نیا لفظ بھی مل جاتا۔

”جب تم پالش لگاتی ہو تو کیا دانتوں کو ٹاول سے ڈرائے کرتی ہو؟“

”نہیں! می تو کہتی ہیں دانت خود بخود ڈرائے ہو جاتے ہیں۔“

”خود بخود ڈرائے نہیں ہوتے۔ اچھا تمہاری ماما کے پاس ہیرڈرائر ہے؟“

”ہاں ہے!“

”ابھی جاؤ دانت پالش کرو اور پلگ لگاؤ اور ڈرائر بٹن آن کرو۔ پورا منہ کھول کر ٹھیک سے ڈرائے کرنا“ پھر پونم سنانا مجھے۔

پتا نہیں اس دن اس کے دانت ٹھیک سے ڈرائے ہوئے یا نہیں لیکن پھر دوبارہ ماما نے مجھے فون پکڑا کر یہ نہیں کہا کہ ”سنو سنو! کتنی کیوٹ لگ رہی ہے۔“ مجھے لڑکیاں صرف اس وقت ہی بار کیوٹ لگتی ہے۔ جب وہ حلق پھاڑ کر روتی ہیں۔ اور کیوں روتی ہیں کیونکہ ہم لڑکے گھونسنے مار کر ان کا بھر کس نکال دیتے ہیں۔

ہم دو دوستوں نے مل کر اپنے کئی گھونسنے ان ”پیاز ڈولز“ کو اس وقت تک مارے جب تک مجھے ایک سفتے کے لیے کمرے میں بند نہیں کر دیا گیا۔ میرے مام ڈیڈ کو میرا یہ مشغلہ پسند نہیں آیا تھا۔ مجھے اعتراض تھا کہ مجھے ان کی پسند ناپسند کی پروا نہیں لیکن ایشو صرف ایک تھا میں ابھی تک ان ہی کے گھر سے کھاتا تھا اور اتفاق سے میرا کمرہ بھی ان ہی کے گھر میں تھا اور بد قسمتی سے میرے سارے کپڑے جو تے ڈیڈ کے پیسوں سے آتے تھے اگر یہ بد قسمتی — ہم بچوں کے نصیب میں نہ لکھی ہوتی تو ہم ان ”پیاز ڈولز“ کا صفایا کر کے دنیا کو جنت بنا دیں۔

فون پر ننگم کے ساتھ ساتھ اس کی تصویریں بھی گائے لگائے لہراتی رہتی تھیں۔ کیسی عجیب بچی تھی

جیسے روبوٹ‘ بھی درخت کے پاس کھڑی ہے‘ بھی کرسی پر بیٹھی ہے‘ کبھی گڑیا ہاتھ میں لیے اپنے بیڈ پر نیم دراز ہے‘ زیادہ ہوا تو سائیکل چلا رہی ہے۔

”ماما ازشتی الما میو؟“

”تو تمہیں یہ مرہ لگتی ہے؟“

”اس کی ہر تصویر کسی مجسمے کی طرح ہے۔ پوری پچاس تصویریں اس درخت کے پاس دیکھ چکا ہوں۔ آخر کیا خاص ہے۔ اس درخت میں کہاں پایا جاتا ہے یہ درخت؟“

”وہ لڑکی ہے‘ تمہاری طرح اچھل کود کر تصویر نہیں بنوا سکتی۔ یہ دیکھو کتنی کیوٹ لگ رہی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ آہ۔۔۔“ میں کتنی دیر تک ماما کو دیکھتا رہا کہ کیا میری ماما کے دماغ کے ساتھ کوئی مسئلہ شروع ہو چکا ہے۔

”اے اور کسے؟“ ماما نے ہاتھ میں پکڑی تصویر کو میرے سامنے لہرایا۔ اس تصویر میں وہ سرخ روپٹا اوڑھے اپنی ماما کی بڑی سی جیولری پہنے ہوئے تھی۔ سرخ لپ اسٹک سے اس نے اپنے ہونٹوں — کو کانوں تک شفٹ کر لیا تھا اور آنکھوں کو قلو پطرہ کی طرح کھینچ کر لمبا کر لیا تھا۔

”ماما یہ کیوٹ نہیں بھوت ہے۔“ ٹھیک ہے کہ میرا کمرہ ماما پایا کے گھر میں ہے لیکن میں اتنا بڑا سچ چھپا نہیں سکا۔

ماما نے ایک زوردار پنچ میری کمر پر پسند کیا۔ یہ پنچ میں نے ہی انہیں سکھایا تھا کہ اگر ان کا سامنا کسی چور آچکے سے ہو جائے تو انہیں کیا کرنا چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم تھا ماما نے میری دی ہوئی ٹریننگ اتنی سنجیدگی سے سیکھی ہے اور اس کے بروقت استعمال سے بھی واقف ہیں۔ اس کیوٹ تصویر کو میں اسکول لے گیا اور رائن کو دکھائی۔

”یہ لو دیکھو! دنیا کے قدیم قبیلوں میں سے ایک قبیلے کے باشندے کا تصویری نمونہ۔ ناور نہیں بھی ہے تو۔۔۔“ ”نایاب“ ضرور ہے۔

”کہاں سے ملی تمہیں یہ؟“

”یاما کو ٹریول کا بہت شوق ہے، ناسا افریقہ گئے تو لے لی ہوگی نہیں سے۔“

”تمہارے پیلا کو دیکھ بھال کر ٹریول کرنا چاہیے۔ ایسے علاقوں سے نہیں گزرنا چاہیے جہاں ایسے لوگ رہتے ہوں۔“ اس نے آنکھ مار کر کہا۔

رائن کی بات میں مجھے پوائنٹ نظر آیا اور میں نے سوچا کہ مجھے پیلا کو بٹھا کر سنجیدگی سے سمجھانا چاہیے کہ انہیں ایسے علاقے کا سفر نہیں کرنا چاہیے جہاں ”وہ“ رہتی ہے۔ لیکن مجھ سے پہلے ماما یاما نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ یہ ایک خطرناک علامت تھی۔ وہ دو موقعوں پر مجھے خاص ایسے اپنے پاس بٹھاتے جب اسکول سے میری کوئی شکایت آتی ہوئی یا انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں ان کی کار میں اپنے دوستوں کو ٹھنسا کر اسے دوڑاتا رہا ہوں۔ ساتھ ہی مجھے رائن یاد آیا جو مجھے بتا چکا تھا کہ

کچھ دن پہلے اس کے والدین نے بھی اسے ایسے ہی اپنے پاس بٹھایا تھا اور انہوں نے تفصیل سے اس سے پوچھا کہ وہ ڈرگ میں دلچسپی تو نہیں لے رہا۔ پھر وہ باتوں باتوں میں اس سے پوچھنے لگے کہ اسے انسانی خون کو پینے کی پیاس تو محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے مام ڈیڈ تو ویرا سیریز کے دیوانے تھے۔ اس لیے وہ یہ پوچھ سکتے تھے لیکن میرے والدین تو اینجل پلانٹ کے شوقین تھے تو کیا میرا سوال سیکشن جانوروں کے متعلق ہوگا۔

”تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔“ یاما نے کہا۔

”مجھ میں رینگنے کی صلاحیت نہیں ہے، نہ ہی میں برفانی طوفان میں بھوسے میں چھپ کر چوہا کھانا چاہتا ہوں، آئی ایم نارمل پیلا۔“

”تم اپنے دوستوں کی سنائی کہانیوں سے باہر آ جاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔“ یاما کا وزنی گھونسا میری کمر پر پڑا۔ میں نے کراہ کر ماما کو دیکھا کہ انہوں نے پیلا کو بھی سکھا دیا۔ بس یہی نقصان ہوتا ہے گھر والوں کو ٹریننگ دینے کا۔ یہ فری ٹیوشن مجھے فوری بند کرنی ہوگی۔

”ریلیکس۔“ ماما نے پیلا سے کہا۔ میں نے کمر سے فارغ ہو کر گردن جھما کر دونوں کو باری باری دیکھا کہ یہ

ہو کیا رہا ہے۔ ”تمہارے چچا کی بیٹی عروہ۔“ کہتے ہوئے پیلانے

اپنا کان کھجنا شروع کر دیا، آخری مرتبہ یہ کان ان کے باس کے مرنے پر کھجایا گیا تھا۔

”اوہ! شی واز کیوٹ۔“ مرنے والوں کو کیوٹ کہہ دینے میں کوئی گناہ نہیں۔ اب مجھے سمجھ میں آیا ماما پیلا اتنے سنجیدہ کیوں ہیں۔ وہ ہاتھی گھوڑے کی لعنہ سنانے والی گزر گئی ہے۔

”واز؟“ یاما ایک دم سے اچھلے۔ ”آپ مجھے یہی نہیں بتانے والے تھے کہ وہ مر گئی ہے؟“ ماما نے فوراً اپنا ہاتھ پیلا کے ہاتھ پر رکھا اور پرسکون رہو، پرسکون رہو کے انداز میں ہاتھ تھپکنا شروع کر دیا۔

”تمہیں یہی کیوں لگا کہ وہ مر گئی ہے۔“ مجھے نظر آ رہا تھا کہ اب پہلے سے زیادہ ہیوی ”پچ جیٹ“ میری کمر کے رن وے پر اترنے ہی والا ہے۔ پر کیوں؟ میں نے ایسا کیا کہہ دیا آخر؟

”آپ مجھے میرے روم سے اٹھا کر لائے ہیں۔ اینجل پلانٹ اس وقت لی وی پر بند ہے جسے میں نے اپنی اب تک کی لائف میں کم ہی بند دیکھا ہے۔ مام نے کھانا جلدی بنالیا ہے، جو کہ وہ نہیں بناتیں، جب تک آپ پانچ سو بار چلا کر یہ نہ کہہ دیں کہ مجھے بھوک لگی ہے، خدا کے لیے کھانا لگا دو۔“ اور آپ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھے ہیں اور آپ اپنا کان بھی تو کھجا رہے ہیں۔ آپ کو یہ لگتا ہے کہ شاید وہ میرے بچپن کی دوست ہے، اس لیے مجھے اتنے اہتمام سے بتا رہے ہیں۔ لیکن میں کلیئر کروں کہ ایسا نہیں ہے، اس کی آواز اچھی ہو سکتی تھی اگر وہ زیادہ تر چپ رہا کرتی۔ اس کی تصویریں بھی اچھی ہو سکتی تھیں جن میں وہ کیوٹ لگ سکتی تھی لیکن اپنی وے سے پیلانے ہاتھ برہا کر رہی موٹ لیا اور اینجل پلانٹ آن کر لیا۔

”رفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ وہ پوری قوت سے چلائے۔

”اوہ۔ لیکن آخر ایسا کیا ہوا ہے؟“

READING
Section

74 2016 فروری

”کیا میں نے اس منگنی کی تقریب میں شرکت کی تھی؟“

”ہاں۔۔۔ ظاہر ہے۔۔۔“

”واؤ۔۔۔ گڈ نیہ کوئی رسم ہے وہاں۔“

”وہاں؟ پاکستان میں؟ ہاں رسم ہی سمجھ لو۔“

”آئی لائیک اس۔۔۔ جب میں شادی کروں گا تو آپ عروہ کو بھی بلائیے گا۔ میں اپنی دلہن کو دکھانا چاہوں گا کہ میری منگنی کی رسم اس کے ساتھ ہوئی تھی۔“

”جس سے منگنی ہوتی ہے اسی سے شادی ہوتی ہے۔“

”لیکن منگنی تو چار سال کی عمر میں ہوتی تھی اب میں چار سال کا نہیں ہوں اب شادی کیسے ہو سکتی ہے؟“

”جب تم چوبیس سال کے ہو جاؤ گے یا اٹھائیس کے یا بتیس کے۔“

”مجھے تین شادیاں کرنی ہوں گی۔ چوبیس، اٹھائیس، بتیس۔۔۔“

”بند کرو یہ مذاق۔۔۔“

”یہ مذاق میں نے تو شروع نہیں کیا پایا۔۔۔“

”معروہ تمہاری منگنیتر ہے تمہاری شادی اسی سے ہوگی بس بات ختم۔“

”اوکے۔۔۔ بات ختم۔“ وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ اسی لیے سال میں دوبار اس کی تصویروں کا البم آتا تھا اور اسی لیے وہ سارے جنگل کی نظمیں مجھے سناتی تھیں اور ماما مجھے اس کی ہر چھوٹی بڑی بات بتایا کرتی تھیں۔ اسی لیے انکل آگر میری ویڈیو بنا کر لے جاتے تھے اور اسی لیے پاپا مجھے ہر بار اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی وے پاپا خود ہی بات ختم کر چکے ہیں۔ اب کے پروا ہے۔

”نئی ازناٹ مائی فینالسی۔“

وہ پہلی بار پاکستان آیا تھا۔ اس کا آنا اچانک ہوا تھا۔

دو دن پہلے ممی کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے تعلیمی ٹور پر جن ملکوں پر نکلے ہیں ان میں سے ایک پاکستان بھی ہے۔ اس کے۔۔۔ کچھ دوست بھی ساتھ تھے۔ ممی

”تم جاؤ اپنے کمرے میں۔“ ماما نے مجھے میرے کمرے میں بھیج دیا۔ ان دونوں نے مجھ سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ کون سی بات؟ میں نے تھوڑی دیر تک سوچا پھر اس بات کو ”دفع“ کر کے میں پنچنگ بیگ پر بیٹھ مارنے لگا لیکن کچھ ہی عرصے بعد مجھے یہ پنچ اپنے منہ پر مارنے پڑے اس بار ماما پاپا میرے کمرے میں آئے۔ دونوں ایک ساتھ، ماما مسکرا رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اچھی لگتی ہیں، ظاہر ہے وہ میری ماں ہیں، اس لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایسے تب مسکراتی ہیں جب انہوں نے پاپا سے کوئی بھاری رقم نکلوانی ہو لیکن میرے پاس ایسا کیا ہے جسے نکلوانے کے لیے وہ ایسے مسکرا رہی ہیں اور پاپا وہ پھر سے بار بار اپنا کان کھج رہے ہیں۔ اب آخری بار یہ کان تب کھجایا گیا تھا جب برف کا طوفان آیا تھا اور اتفاق سے ہم تینوں روڈ پر کار میں بند طوفان کے گزر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ پاپا نے پوچھا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی سیاسی مہلبولی ہوں اور کسی ”آفت شدگان“ کے اسپتال بیڈ پر جا کر پوچھ رہے ہوں اور کیا ہو رہا ہے؟ کیسے ہو؟ اوہ ایک ٹانگ کٹ گئی؟ اوہ! دوسری بھی کٹنے والی ہے اپنی وے گیٹ ویل سون۔“

”میں کہہ چکا ہوں میں ڈر گز نہیں لیتا۔ مجھے میری کار لے وں میں آپ کی کار پوز نہیں کروں گا۔“

”ریلیکس۔۔۔“ ماما نے کہا، ”کے کہا یہ معلوم کرنا تھا“ کیونکہ ماما اکثر خطرناک باتوں سے پہلے ریلیکس کہتی ہیں۔ میرے دماغ کے اندر چھوٹا سا الارم بج رہا تھا۔

”تمہارے چچا کی بیٹی عروہ سے ہم تمہارے منگنی کر چکے ہیں۔“ پاپا نے فوراً کہا جیسے ایک بالٹی پانی غٹا غٹ پی گئے۔ معلوم ہو گیا وہ ریلیکس مجھے کہا گیا تھا۔

”منگنی؟“ میں نے بیگ کو اتنی زور سے پنچ مارا کہ وہ پاپا کے خارش زدہ کان کو چھو کر واپس آیا۔

”جب تم چار سال کے تھے تب سے۔“

کافی پر جوش تھیں اس کی آمد کا سن کر مجھے کافی لمبی جوڑی ہدایات دی گئی تھیں جنہیں میں نے سنا تو تھا لیکن یاد نہیں رکھا۔ اس دن میری فرینڈ رائٹا میرے ساتھ تھی۔ اسے شام تک میرے ساتھ رہنا تھا۔ ہمیں ٹیسٹ کے لیے مل کر اسٹڈی کرنی تھی۔ پاپا اسے لینے اور بورٹ گئے تھے۔ ویسے وہ چار افراد تھے۔ چار لڑکے، لیکن وہ ایک گاڑی میں پورے نہیں آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک اتنا موٹا تھا کہ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بمشکل بیٹھا تھا اس لیے ان میں سے دو کو آگے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا تھا۔

”یہ ہے تمہارا کزن؟“ جیسے جیسے وہ کار سے نکلتے جا رہے تھے رائٹا بوجھتی جا رہی تھی۔

”بتا نہیں!“ مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا دلا دی ہے۔ میں نے اس کزن کے اپنے منگیترا ہونے کی بات ابھی تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بھلا یہ کوئی بات تھی بتانے والی۔

”مجھے یہ کچھ کچھ پاکستانی لگ رہا ہے۔“ رائٹا نے کار میں سے نکلنے والے آخری لڑکے کو دیکھ کر کہا جو موٹے کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور کافی پچکا ہوا لگ رہا تھا۔ رائٹا منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ کیوں ہنسنے لگی کیونکہ اس کچھ کچھ پاکستانی کے بال پورے پورے پاکستانی لڑکیوں کی طرح کافی لمبے تھے گھنے تھے سیاہ تھے اور ہیر بینڈ میں قید پیچھے پونی صورت جھول رہے تھے۔ وہ ماما بوائے لگ رہا تھا نہ پاپا ڈیوڈ وہ گرلی فیوز میرا مطلب ”گرلی کنفیوز“ لگ رہا تھا۔ میں اس کی تصویریں دیکھتی رہی تھی پھر بھی مجھے کچھ وقت لگا اسے پہچاننے میں۔ ہاں یہ وہی تھی یعنی تھا۔ جیک۔

”ایسے لڑکوں کی بہنوں کے بہت مزے ہوتے ہیں۔ ان کی ڈریسنگ ٹیبل سے ان کی بہنیں بھی استفادہ کر سکتی ہیں۔“ رائٹا کھی کھی کرنے لگی۔

”تم بھی تو اس کی بہن ہی لگیں نہ۔ ایسا کرو اسے رہنے کے لیے اپنا کمرہ دے دو کیا یاد کرے گا بے چارا کیسا پونی ٹھلا اور ہیر بینڈ سے بھرا ہوا ڈریسنگ ٹیبل ملا تھا مہربانوں کے گھر ہو سکتا ہے یہ میک اپ بھی کرتا

ہو تم اپنا میک اپ بھی جا کر رکھ دینا۔“ اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے مجھے نیچے جانا پڑا اس سے ملنے کے لیے۔

”ہائے عروہ! آتم سر پر اتار ڈال۔ تم تو کیونٹ نکلیں۔“ اس نے رائٹا کی طرف مسکرا کر کہا۔

”میں رائٹا ہوں۔“ رائٹا ہنسنے لگی جس نے اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں بھی دریافت کر لی تھیں۔

”میں عروہ ہوں۔“ میرا منہ بن گیا اور اس کا بھی بنارہے میری بلا سے۔

”یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔“ اگلے دن وہ میرے کمرے میں آیا اور ایک ڈبہ میرے آگے کیا۔

”شکریہ!“ میں نے ڈبے کو لاپرواہی سے ٹیبل پر اچھال دیا۔

”اسے کھولو دیکھو اور مجھے بتاؤ تمہیں کیسا لگا؟“ اس نے ایسی آواز میں کہا جو میں سننے کی عادی نہیں تھی۔ وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا اور اس کے لمبے گھنے بالوں کی لٹوں سے پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔

”تمہیں ڈرائیر چاہیے؟“ میں نے اس کے گیلے بالوں پر طنز کیا۔

”میرے پاس ڈرائیر ہے۔ میں زیادہ یوز نہیں کرتا بال خراب ہو جاتے ہیں۔“

”اوہ! تمہیں تو کافی کچھ معلوم ہے۔ دیکھو ذرا تم نے تو اپنی شریٹ کے ساتھ میچنگ ہیر بینڈ لگایا ہے۔ اچھا ہوتا اگر تم بالوں کے دو حصے کر کے ان پر ہنیں بھی لگا لیتے۔ فیشن میں ان ہے۔“

وہ چلتا ہوا میری ڈریسنگ ٹیبل تک گیا اور میرا ہیر برش پکڑ کر بالوں کے درمیان میں سے دو حصے کیے اور میری گلابی پٹو فلائی ہنیں جن کے پر ہمہ وقت ”اڑان“ بھرنے لگتے تھے کو اٹھا کر دونوں طرف سامنے لگا لیا۔

”اب ٹھیک ہے؟“ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وارڈرو ب کھول کر اسے اپنا دوپٹا بھی دے دوں بلکہ دے کیا دوں اس کے سر پر اوڑھادوں۔ پھر پاپا کے پاس لے کر جاؤں کہ یہ لیس یہ آگئی آپ کی بہو۔ اس کا

76

فروری 2016

شعلع

www.paksociety.com

online library for Pakistan

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گھونگھٹ اٹھائیں اور دیں اسے سلامی۔
”کھولو اسے۔۔۔“ ہٹو فلائز اس کے کیلے بالوں میں
کھڑی کھڑی اڑ رہی تھیں۔

میں نے اسے کھولا۔ وہ ایک تصویروں کا البم تھا۔
بلک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں۔ تصویریں سب ہی
اچھی تھیں لیکن ان میں کچھ عجیب تھا۔ کیا عجیب تھا
مجھے غور کرنے پر بھی نظر نہیں آیا۔

”یہ ایک نایاب البم کی کاپی ہے جو میں تمہارے
لیے لایا ہوں۔ تم بھی مجھے اپنی نایاب تصویریں بھیجتی
تھیں نا۔ تمہاری تصویروں کے مقابلے میں تو یہ
تصویریں کچھ بھی نہیں ہیں، لیکن پھر بھی تھوڑا بہت
مقابلہ کر رہی ہیں تمہاری تصویروں کے ساتھ۔“ وہ
میری تعریف کر رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی لیکن پھر بھی
بات کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک
تصویر دیکھنے کے بعد میرے احساسات عجیب ہوتے
گئے۔ ایک بوڑھے کی تابوت میں لیٹے ہوئے کی تصویر
نے تو میرے ہاتھ کپکپا دیے، بوڑھا خوف ناک حد تک
موت کے قریب لگ رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“

”ہاؤڈ فریو آؤٹ۔ یہ مرد لوگوں کا زندہ لوگوں کے ساتھ
فوٹو سیشن ہے۔“ البم میرے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ
میرے لیے ایک ایسا البم لایا تھا اور اس نے میری
تصویروں کو ”مردہ“ سے تشبیہ دی تھی۔ اس نے جھک
کر البم اٹھایا تو اس کے لمبے بال فرش کو چھونے لگے۔
”تم ایسی نایاب چیز کے لائق ہی نہیں ہو۔“

”ایسا کیا نایاب ہے اس میں؟“

”جس لڑکی نے اپنا سارا بچپن ایک درخت کے
نیچے گزار دیا ہو وہ یہ کبھی نہیں جان سکتی کہ کیا نایاب
ہے اس میں۔“

”درخت کے نیچے بچپن گزارنا کم سے کم چھوٹے
کپڑے پہننے والوں کے ساتھ گزارنے سے بہتر
ہے۔“

”کس نے پہنے چھوٹے کپڑے؟“ اگر وہ ذہن میں
سوچ رہا تھا تو بلند آواز سے سوچ رہا تھا اور اگر وہ بول رہا

تھا تو اپنا پول آپ کھول رہا تھا۔
”تمہاری فرینڈز نے۔۔۔“ وہ چونکا کہ میں نے اس کا
ذہن کیسے پڑھ لیا۔ جبکہ اپنے ذہن کو وہ خود ہی بلند آواز
سے پڑھ رہا تھا۔

”ریلیکس جیک۔“ اس نے خود کے لیے خود کے
کانوں میں سرگوشی کی جو کے سن لی گئی۔

”ہو نہ۔۔۔ جیک۔۔۔ جبکی کہو خود کو۔۔۔ آئی کو تمہارا
نام ہیرو پر نہیں ہیروئن پر رکھنا چاہیے۔“ وہ بغور میری
شکل دیکھنے لگا، ایسے ہی بغور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے چہرے
کو میرے چہرے کی طرف جھکا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی
انگلی اٹھائی اور میری ناک تک لایا اور اسے ناک کے
قریب رکھ دیا، پھر یک دم اس ایک انگلی کے ساتھ اس
کی باقی چاروں انگلیاں بھی آملیں اور وہ پانچوں انگلیاں
متحد ہو کر میرے ناک پر پڑیں اور میں وہیں فرش پر ڈھیر
ہو گئی۔

”یہ میری اس کے ساتھ آخری ملاقات ہے۔
بس میں نے کہہ دیا ہے۔“

”کیا عمر ہے تمہاری؟“

”عمر؟“

”ہاں عمر؟ آج؟ کتنے سال کی ہو تم؟“

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس کی بھنویں آسمان
سے باتیں کرنے کی تیاری کرنے لگیں۔ ”کیونکہ
تمہیں دیکھ کر یہ تو لگتا ہے کہ تم بچی نہیں ہو لیکن یہ
یقین نہیں ہوتا کہ بڑی بھی ہو رہی ہو۔“

”تمہیں بھی دیکھ کر یہ تو لگتا ہے کہ تم بڑے
ہو رہے ہو لیکن یہ یقین نہیں ہوتا کہ بڑے ہو رہے ہو
یا بڑی ہو رہی ہو۔“ بے اختیار میرے ہونٹ سکڑ
گئے۔ اوہ یہ کیا۔۔۔ میں تو اپنا کان کھجا رہا تھا۔ کیا
مصیبت ہے یہ موروثی بیماریاں بھی نا۔

”کانوں میں بالی ہاتھوں میں کنکرن، ماتھے پر جھومر
کب پہنو گے؟“ اس نے سر کو ترچھا کر کے پوچھا۔
افس۔۔۔ مجھے اپنا کان کاٹ ڈالنا چاہیے۔۔۔ نہیں اس کی

زبان۔۔۔

”مہی کی کی کی۔۔۔“ وہ پھر زور سے چلائی، ”مجبورا“ مجھے اس کے منہ پر تکیہ رکھنا پڑا۔ میں نے تو مذاق میں تکیہ رکھا تھا، میرا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اتفاق سے مرجاتی تو الگ بات تھی بلکہ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی تھی لیکن اس نے مذاق کے بغیر میرے بال پکڑ لیے۔ دونوں مٹھیوں میں۔۔۔ مجھے واپس جا کر اسٹیج پر لے میں حصہ لینا تھا اور اس کے لیے لمبے بال چاہیے تھے تو بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے بال نہیں۔

”ریلیکس۔۔۔“ میں بڑبڑایا اور اس سے پہلے کہ میں انگلی کو اس کی ناک تک لے جاتا اور باقی انگلیوں کو متحد کرتا، میرا دوست مجھے ڈھونڈتا ہوا کمرے میں آگیا اور ریلنگ کا ایسا شاندار مظاہرہ دیکھ کر جہاں کھڑا تھا وہیں جامد ہو گیا۔

”ڈبلیو ڈبلیو جیک۔۔۔ واہ۔۔۔“ رائن جوش سے چلایا۔ رائن کے جوش نے اس میں اور جوش بھر دیا اور اس نے میرے بالوں کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور آسمان سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر میری آنکھوں کے آگے آکر کودنے پھانسنے لگے۔ میں نے چیخ ماری، رائن نے کمرے کی طرف دوڑ لگائی اور واپسی میں وہ اپنے ساتھ کیمرا لیتا آیا اور ڈبلیو ڈبلیو جیک کی فلم بندی کرنے لگا۔

”بند کرو کیمرا رائن۔۔۔“ جیسے ہی میں چلایا عروہ نے اور شدت سے میرے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

”تم مووی بناؤ رائن۔۔۔“ وہ بھی چلائی اور اس کی میرے بال کھینچنے کے انداز میں شدت آگئی۔ جیسے ماما اکثر بایا کی کسی بہت ہی گندی شرٹ کو غصے میں ہاتھ سے مل کر دھوتی ہیں، ایسے ہی وہ میرے سر کو بالوں سے پکڑ کر مل کر رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔

”آئی۔۔۔“ اب مجھے چلانا پڑا۔ ”آئی ی ی ی ی۔۔۔“ تکیہ اس کے منہ پر رہا اور میرے بال اس کے ہاتھ میں۔ بعد میں تکیہ فرش پر پڑا اور اس کے ہاتھوں سے میرے سر کے جنگل کی کٹائی ہوتی رہی۔

”یہ کیا کیا تم نے عروہ۔۔۔“ آئی نے میرے بالوں کو جڑوں سمیت عروہ کی مٹھیوں سے برآمد کیا۔ میں اپنا سر

یہ میری اس سے پہلی ملاقات، پہلی بات چیت تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہو سکتی تھی، اگر اس کی زبان اتنی نہ چلتی۔ میں بھی اس سے اچھی طرح پیش آسکتا تھا، اگر وہ مجھے ”جیکسی یا کینڈی“ نہ کہتی۔ ویسے میں نے کوئی کوشش نہیں کی کہ وہ مجھے اچھی لگے۔ میں نے یہ کوشش بھی نہیں کی کہ میں اسے اچھا لگوں۔ مجھے وہ بوجھ لگتی تھی جسے اس کے پیدا ہوتے ہی میرے سر پر لا دیا گیا۔ بچپن کی منگنی کم سے کم میرے لیے تو کسی مہیست سے کم نہیں ہے۔ خیر۔۔۔ تو جب میری انگلیاں اتحادی بن کر عین اس کی ناک پر حملہ آور ہوئیں تو وہ فوراً ”سے پہلے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اچھی اداکارہ تھی وہ لیکن غلط جگہ پر اپنی پرفارمنس دے رہی تھی، کیونکہ نہ اس کا کمرہ اسٹیج تھا اور نہ میں تماشائی جو اس کے لیے تالیاں بجاتا، حتیٰ کہ اس کے گھر والوں نے بھی اس کے ناک آؤٹ ہونے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، کیونکہ بچے تو آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں، اس لیے میرا بچہ کوئی اتنا بڑا ایٹو نہیں بنا۔ ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ صرف ایک بچہ کھا کر دو دن بستر پر ڈھیر رہی۔ وہ اتنی بیمار تھی کہ بستر سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔ اچھا ہوتا اگر وہ ایک دن بیمار رہتی اور دوسرے دن فوت ہو جاتی۔ لیکن اس کا فوت ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مجھے اس کے روم میں جانا پڑا۔ البم میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کی ہم عمر ایک لڑکی کی تصویر اسے دکھائی جو مرچکی تھی اور اپنی زندہ سیلیوں کے ساتھ ایسے کھڑی تھی جیسے وہ خود بھی زندہ ہو۔

”تم اپنی فرینڈز کو بلا کر ایسی ہی ایک تصویر لے لو۔ اس سے پہلے کہ تم مرجاؤ اور ہمیں یہ کہنا پڑے۔ زندہ ہوتے تو تم نے کوئی یادگار تصویر لی نہیں، کم سے کم تمہارے بستر مرگ کی تصویر یادگار ہونی چاہیے۔“

”مہی۔۔۔“ وہ زور سے چلائی۔

”چلاؤ مت۔۔۔ ورنہ تمہاری شکل اس قابل بھی نہیں رہے گی کہ مرنے کے بعد ہی تمہاری تصویر لی جاسکے۔“

READING
Section

پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا اور ایسے کراہنے لگا جیسے مشین گن کے سارے راؤنڈ میرے سر پر خالی کر دیے گئے ہوں۔
 ”اوہ جیک۔۔۔ ادھر آؤ بیٹا۔۔۔ معاف کر دو عروہ کو۔۔۔ یہ ایسے ہی پاگل ہو جاتی ہے غصے میں۔۔۔“ اس نے تکیہ میرے منہ پر رکھ دیا تھا یہ مجھے مار رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر عروہ بھی کراہنے لگی بلکہ باقاعدہ رونے لگی۔
 ”آئی بدستور میرا سر سہلاتی رہیں۔“

”تم نے اسے مار ہی کیوں نہیں دیا بیٹا۔“ آئی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ ”پتا نہیں آئی آخر کر رہی تھیں کہ افسوس۔۔۔“ لیکن مجھے افسوس ہوا۔ اچھا بھلا اسے قتل کرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ مقتول ہوئی تھی یا نہیں لیکن میں ضرور ذلیل ہونے والا تھا۔ ”ڈبلیو ڈبلیو جیک“ مووی کے ہاتھوں۔ اب مجھے اس کیمرے کی فکر تھی جو رائن نے جلدی سے بھاگ کر سوٹ کیس میں لاک کر دیا تھا۔ سوٹ کیس کا وہ لاک کینڈا جا کر کھلا۔ نارتھ کیرو لینا کے اگلے ٹرپ کی شرط پر جو مجھے افورڈ کرنا تھا اور ہاں مجھے یہ افورڈ کرنا ہی تھا، ورنہ پھر مجھے دوستوں کے ہاتھوں ہونے والی ”ڈالٹ“ کو تا عمر افورڈ کرتے رہنا تھا۔ یہ میری اس کے ساتھ آخری ملاقات تھی۔ یہ میرا خیال تھا۔



اگر ٹی وی پر اداکاری کرنے کا موقع سب کو مل جایا کرے تو دنیا بھر کے اماں ابا اس موقع سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ایسی جان توڑ اداکاری کرتے ہیں کہ اولاد جیوری بنی انہیں ایوارڈ دیتے دیتے تھک جاتی ہے۔ مجھے پایا کو ابھی ایک ایوارڈ دینا پڑا۔ کیوں۔۔۔ کیونکہ ان کی کار کا ایکسپلنڈ ہو گیا، کار ساری کی ساری تباہ ہو گئی تھی۔ یہاں تک تو سب حقیقت ہے۔ ایوارڈ تب آیا جب پایا نے اس کار کی تصویر تو بھیج دی کینڈا کہ میرا ایکسپلنڈ ہو گیا، کار تباہ ہو گئی ہے لیکن اپنی سلامتی کی نہیں بھیجی کہ میں زندہ سلامت ٹھیک ٹھاک ہوں اور پھر فون پر انکل سے ایسے بات کی

کہ میں عین سامنے صوفے پر بیٹھی ان فریڈکچرز کو ڈھونڈنے لگی جو ان کے جسم پر تو تھے لیکن کسی انسانی آنکھ کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

”خوف زدہ ہو گیا ہوں۔۔۔ شاید اب کبھی کار کا سفر نہ کر سکوں۔۔۔ دل بہت سہا ہوا ہے۔“ پایا کہہ رہے تھے جبکہ ابھی ابھی وہ می کے ساتھ ڈنر کر کے آئے تھے۔ کار میں۔۔۔

”چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر جاتا ہوں۔ ہاں شاید اعصابی کمزوری ہو گئی ہے۔ دماغ میں بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ جی۔۔۔ میں آپ کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ دماغ کے ٹیسٹ کا کہا ہے ڈاکٹر نے۔ نہیں نہیں میں ٹھیک ہوں۔ دل کے ٹیسٹ بھی کروانے ہیں۔ ارے نہیں بھائی جان ایسے کیوں گھبرا رہے ہیں آپ۔ اچھا۔۔۔ کب۔۔۔“
 ”یہ لیں پایا۔“ میں نے اسکول میں جیتی اپنی ٹرائی لاکر پایا کو دی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ مسکرانے لگے۔ اس لیے نہیں کہ ٹرائی ملی اس لیے کہ انکل آرہے تھے۔

”آپ نے اتنی اچھی اداکاری کی، ایوارڈ تو بننا ہے۔“ ممی میری پشت پر آئیں اور میرے بال کھینچے۔ اگر ہماری اس دنیا میں ایسی ممیاں نہ ہوا کریں تو ایشیائی لڑکیوں کے بال بھی اتنے لمبے نہ ہوا کریں۔ کچھ چیزیں صرف روایت سے ہی ملتی ہیں، نہ تیل ہے، نہ شیمپو ہے، صرف ”بال“ کھینچنے کی روایت ہے۔

”بھائی ہیں ان کے بلا سکتے ہیں بہانے سے۔ بہن، بھائیوں میں یہی لاڈ پیار، مذاق کا رشتہ تو ہوتا ہے۔“
 ”مجھے کیا پتا بہن، بھائیوں میں کیسا رشتہ ہوتا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی تو یا سوتا رہتا ہے یا کرکٹ کھیلتا رہتا ہے۔ اسے تو اکثر یاد کروانا پڑتا ہے۔ میں تمہاری بہن ہوں۔ میرا نام عروہ ہے۔ یاد آیا کچھ؟“

”تم میری بہن ہو، تمہارا نام عروہ ہے۔ دفع کرو ایسی یادداشت کو۔“ یہ میرے بھائی کا حال ہے۔ ویسے پایا کی ایسی جان دار اداکاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ انکل اور آئی اور مس جیکی ہفتے کے اندر اندر ہمارے گھر میں

”دیکھا بھی ہے اور اس کے بال بھی نوچے ہیں‘
جڑوں سمیت۔“ اس کی ہنسی یک دم گھم گئی اور اس
نے دانت پر دانت جمائے۔ یقیناً ”اسے اپنے سر کی
تکلیف پھر سے یاد آگئی تھی۔“

”انی وسم۔ تم نے وہ درخت کیوں کٹوا دیا؟ انکل
بتا رہے تھے کہ تم نے بہت ضد کی تھی اسے کٹوانے
کی؟ ایسا کیوں کیا تم نے؟“

میں غور سے اس کی شکل دیکھنے لگی، پھر میں نے
اپنے منہ کو ذرا قریب کیا اور زیادہ غور سے دیکھنا شروع
کیا۔ انگلی کو اٹھا کر اس کی ناک کے قریب کیا اور
قریب کیا۔ وہ چوکنا تھا، وہ جانتا تھا کہ میں بچ ماروں گی
جسے وہ ڈنچ کر دے گا۔ لیکن میں نے بچ نہیں مارا
بلکہ دو انگلیوں سے میں نے اس کی ناک پکڑ کر مبروڑ
دی۔ لڑکے ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ لڑکیاں گھولے
بارتی ہیں، نہ کلک کرتی ہیں۔ وہ چٹکی بھرتی ہیں اور بال
کھینچتی ہیں اور یہ گھولے اور لالتوں سے زیادہ کارگر
ہتھیار ہے، زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ زود اثر ررر۔“
اس کی ناک سے خون نکلنے لگا۔ ”کیا تم ویسا رہو؟“ وہ
چلایا۔

”تھی نہیں، لیکن ہو گئی ہوں۔“ اس کی بہتی ناک
کو دیکھ کر میں نے اطمینان سے کہا۔

”تو لو پھر یہ میرا خون پی لو۔“ اس نے اپنی ناک کا
خون جو اس کے ہاتھ میں لگ چکا تھا میرے آگے کیا۔
ناک پر اس نے اتنی بڑی بینڈیج کروالی تھی کہ مٹی
پایا مجھے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکالنے تک کے لیے تیار
ہو گئے تھے۔ انہیں ایسی ویسا زاولاد گھر میں نہیں
رکھنی تھی جو گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک
کرتی تھی۔ مجھے اس کے کمرے میں جا کر سوری کہنا
پڑا۔ پھر کہیں مجھے گھر میں اور رات کا ڈنر کرنے کی
اجازت دی گئی۔ ساتھ ساتھ مٹی مجھے مخصوص انداز
سے گھورتی رہیں۔ اس گھوری کے کئی مطلب تھے
بلکہ ان میں چھپی کئی دھمکیاں تھیں۔ جیسے کہ
”مہمانوں کو جالینے دو، پھر تم سے پوچھتی ہوں۔“ اب
لے کر دکھانا مجھ سے اپنی پاکٹ منی ”شاپنگ پر میرے

موجود تھے۔ اس بار پھر سے مجھے مس جیکی کو پہچاننے
میں وقت لگا۔ اب وہ گنجا ہو چکا تھا۔ عام گنجا نہیں ہوا تھا
وہ۔ جیسے کھیتوں میں ہلا چلاتے ہیں تو زمین ہو جاتی ہے
ایسی ہی اس کے سر کی زمین تھی۔ مجھے خیال آیا کہ
پچھلی بار میں نے جو اس کے بالوں کو جڑوں سمیت
اکھاڑا تھا کہیں یہ ہل اس وجہ سے تو اس نے اپنے
کھیت میں نہیں چلوا یا؟ اگر ایسا ہے بھی تو کسے پروا
ہے۔ میری ناک بھی ہر سال سردیوں میں سرخ ہو کر
سوج جاتی ہے اور مجھے سانس لینے میں مسئلہ درپیش
رہتا ہے۔

اس بار میرا ارادہ دو قدم آگے رہنے کا تھا۔ جن میں
’بانکنگ‘، ’رانٹنگ‘، ’سولمنگ‘ کر رہی تھی۔ کچھ
دوستوں کے ساتھ پکنک کی تصویریں بھی تھیں۔
درخت کے پاس کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ کچھ بکس
بھی تھیں جو میں نے جلدی سے لا کر اپنے روم میں سجا
دی تھیں۔ ایک بک کو کھول کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا
تھا۔ گیمز کی سی ڈیز کو نمایاں جگہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ پہلے اس
نے سرسری نظروں سے لاؤنج میں لگی میری تصویروں
کو دیکھا۔ پھر وہ چونک گیا تھا۔ ہونہ۔ جھلس ہو گیا
ہو گا۔ پھر وہ باقی تصویروں کو ذرا اور قریب جا کر دیکھنے
لگا۔ پھر وہ میرے کمرے میں آگیا اور وال پر لگی میری
تصویروں کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ زیادہ ہی غور سے
معائنہ کر رہا تھا۔ پھر وہ اتنے غور سے دیکھنے لگا کہ مجھے
گھبراہٹ ہونے لگی۔

”تصویریں بہت اچھی ہیں سی۔ کون ہے؟“ اس
نے کسی چہرے پر انگلی نہیں رکھی تھی۔
”کون؟ یہ رانا ہے میری دوست‘ سولمنگ
چیمپئن۔“

”اچھا۔ لیکن میں تو اس فوٹو شاپ والے کا پوچھ رہا
ہوں۔ بہت ماہر ہے وہ اپنے کام میں۔ کبھی گھوڑے کو
قریب سے جا کر بھی دیکھا ہے یا نہیں؟ ہا ہا۔ وہ نور
نور سے ہنسنے لگا اور اس کے سر کی کھیتی میں سے گندم
کے خوشے پھوٹنے لگے اور زیادہ نور سے ہنستا تو
”خربوزے“ کی نیل بھی پھوٹ نکلتی۔

نولس پر یہ سب بکس اٹھا کر اسٹور سے لائی تھی۔ گوگل سے میں نے ان سب کی سری پڑھ لی تھی۔
”اچھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہت اچھی ہے۔“ میں نے کہا اور یاد کرنے لگی کہ اس کے کرداروں کی کہانی کیا تھی۔ ایک نقصان جو ہمیشہ ہر شوخی مارنے والے کو بھگتنا پڑتا ہے وہ یہ کہ وہ کہیں نہ کہیں غلطی کر جاتا ہے۔ میں نے آٹھ دس کتابوں کی سری پڑھ لی تھی اور اب وہ سریاں ایک دوسرے میں مکس ہو رہی تھیں، بس یہی گڑبڑ ہو رہی تھی۔

”مجھے یہ کتاب اچھی لگ رہی ہے لیکن میں ہر کتاب نہیں پڑھتا۔ ویسے یہ جوبلی ہے۔ یہ کیا ہے اس میں؟ اس نے ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔
”جوبلی۔“ ساری سریاں جو میرے ذہن میں گنڈ ہو رہی تھیں ان میں میں جوبلی کو ڈھونڈنے لگی۔
”مل جا جوبلی۔ مل جا۔“

”اوہ۔ کیوٹ۔“ وہ بڑبڑایا جو میں نے سن لیا اور فوراً بولی۔

”یس کیوٹ کیٹ۔“ مجھے یاد آگیا تھا۔ جوبلی ایک بلی کا نام ہے اور جوبلی ہو ہی کیا سکتی ہے۔
”کیٹ؟ جوبلی بلی ہے؟“ اس نے ناک سے کھلی کتاب پر غور کیا، پھر اپنی ناک کو صفحے پر رکھا اور پھر سر اٹھا کر اپنی ناک سے مجھے تاڑا۔
”تم خود پڑھ لو۔“ یہ کہنا زیادہ محفوظ تھا، اس لیے میں نے کہہ دیا۔

اس نے ساری کتابوں کو ریک سے نکالا اور ان سب کے پہلے صفحے میرے سامنے کیے۔

”یہ سب کتابیں ایک ہی دن خریدی گئی ہیں، یہ دیکھو اسٹیپ۔ اسٹور کا نام اور تاریخ۔ ہمارے آنے سے ٹھیک ایک دن پہلے۔ تم نے دو دن میں پوری بیس کتابیں پڑھ لیں۔ تم نے گنیز بک ریکارڈ کوٹری کیا۔ تمہیں ضرور اپنی انٹری وہاں بھیجنی چاہیے۔“

”انٹری بھیجنے کے لیے مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ساتھ جاسکتی ہو لیکن بیچنا اٹھانے کے لیے۔ خبردار جو تم نے کسی کپڑے، جوتے، بیگ، جیواری کی طرف انگلی کی تو۔ انگلی کاٹ دی جائے گی۔“ گھر میں جو پکے گا وہ کھانا پڑے گا۔ اور گھر میں ان دنوں پھر ٹنڈے اور بیگن ہی بنیں گے اور ان سب میں سب سے خطرناک دھمکی یہ تھی کہ میری کوئی بھی دوست مجھ سے ملنے گھر آئے گی تو اسے میری بدتمیزی کی ساری کہانی بسح مبالغہ سنائی جائے گی۔ ظاہر ہے میری وہ اچھی دوست یہ کہانی باقی اچھی دوستوں کو سنائے گی اور پھر سب اچھا اچھا ہوتا ہی چلا جائے گا اور میری شہرت کو چار اچھے اچھے چاند لگتے چلے جائیں گے۔

وہ اگلے دن پھر میرے کمرے میں آیا۔ ظاہر ہے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میری می کے ہاتھوں کافی عزت ہو چکی ہے اور اب وہ ”اس عزت“ کو اور عزت دینے آیا تھا۔

”تمہارے کمرے میں بہت بکس ہیں، سوچا ان کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔“ اس نے ناک پر انگلی رکھ کر اپنا رخ کتابوں کے ریک کی طرف موڑا۔ یعنی وہ کتابوں کا جائزہ آنکھوں سے نہیں ”ناک“ سے لینے والا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا اس کی ناک کو کھینچ کر ہاتھ کی ناک بنا دوں، پر می کی زبانہ ماضی کی گھوری نے مجھے روک لیا۔ وہ بکس کے ریک کے پاس گیا اور اس کے ٹائٹل پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ایک کتاب کو نکالا اور اسے سونگھا، پھر اس نے اگلی کو سونگھا۔

”کمبچ لاؤں ان پر ڈال کر کھا بھی لو۔“ مجھے اس کا سونگھنا برا لگا۔

”نئی کتابوں کی خوشبو بہت اچھی ہوتی ہے۔ ویسے تم اتنی بکس پڑھتی ہو۔“ اس نے بکس کے ریک پر انگلی رکھی اور اسے دور تک گھسیٹا ہی چلا گیا۔

”ہاں! ان سب کو تو میں کب کا پڑھ چکی ہوں۔“ میں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”اچھا۔ مثلاً یہ بک کیسی ہے؟“ اس نے ”ٹریٹ اٹ اسنو۔“ کو آگے کیا۔

مجھے پتا تھا وہ یہ سوال کر سکتا ہے۔ میں شارٹ

”مشورے تو عقل والے لیتے ہیں جو تمہارے پاس ہے نہیں۔ ویسے تم نے یہ سب کیوں کیا۔ جوہلی۔؟“ اس نے اپنی ناک پر لگی — بینڈج کو ہٹانے سے اتار دیا اور ناک سمیت مسکرا نے لگا۔ میں اپنی ایکس ریز آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی اس کی ناک تو بالکل ٹھیک تھی۔ مجھے متاثر کرنے کے لیے؟ وہ اپنی چیک شرٹ کے بازو فولڈ کرنے لگا اور میرا دل چاہا کہ میں ایک بار پھر سے اس کی ناک کو فولڈ کر دوں۔“

”میں تم سے متاثر ضرور ہو جاتا۔ مس جوہلی۔ اگر مجھے کتابی کیڑے اچھے لگتے۔“ اب وہ اپنے سر کے کھیت میں ہل میرا مطلب ہاتھ چلانے لگا تھا۔

”تمہیں متاثر کرنا مافی فٹ ہے؟“

”تو پھر یہ بکس کیوں رکھی ہیں یہاں؟“

”یہ سب میں پڑھنے کے لیے لائی تھی۔ میں اتنی ہی بکس پڑھتی ہوں۔ ہر ہفتے۔“

”تم نے کہا تم یہ سب پڑھ چکی ہو۔“

”میں نے کب کہا یہ؟ میں نے کہا مجھے یہ بکس پڑھنی ہیں۔“

”اوہ۔! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ تم جھوٹ بھی بول سکتی ہو۔ اگر جوہلی کو معلوم ہوا کہ اسے ملی بنا دیا گیا ہے تو وہ یقیناً ناراض ہوگی، کیونکہ وہ ایک لڑکی ہے اچھا چھوٹا منہ کھولو اپنا دانت دکھاؤ، ٹاول سے ڈرائے کرتی ہو یا ڈرائے سے؟“ اور یہ وہ سب سے خراب بات تھی جو اس نے کی تھی۔ تازہ تازہ برش کیے ٹھنڈے دانتوں پر گرم ڈرائے کیا کام کرتا ہے، یہ وہی جانتا ہے جس نے یہ کیا ہو۔ میرے دانت تو ویسے بھی حساس تھے۔

”کھولو منہ دکھاؤ دانت۔ ٹو تھ پالش ٹھیک سے یوز کرتی ہونا؟“

”بکو اس بند کرو اپنی۔“ میں چلائی۔ وہ بھی چلایا لیکن قہقہہ لگا کر اور اپنی ناک پر بینڈج ٹھونک کر چلا گیا۔

”میں مرجاؤں گی اس سے شادی نہیں کروں۔“



پاپا۔ انکل کو اپنے ساتھ کینڈا لے آئے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ ایسے وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ جبکہ مجھے انکل کہیں سے بھی بیمار نہیں لگتے تھے۔ جب وہ بیمار تھے ہی نہیں تو ٹھیک کیسے ہوں گے۔ بعد میں انکل بجن کا کہنا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو بہت مس کر رہے ہیں انہوں نے اسے بھی بلالیا۔

”تم یہاں ساری زندگی کے لیے رہنے آئی ہو؟“

میں نے اس کے سامان کو دیکھ کر کہا۔

”مافی فٹ یہاں رہنا۔ میں صرف اپنے پاپا کے لیے آئی ہوں۔“

”اتنا سامان لے کر؟“

”ہمارے کپڑے بڑے بڑے ہوتے ہیں نا۔ چھوٹے چھوٹے نہیں ہوتے۔ تو بڑے بڑے کپڑے بڑا سامان ہی لگتے ہیں۔ چنے منے ہوں تو ایک چھوٹے سے بیگ میں آ جاتیں۔“

”او آئی سی۔ لیکن اس سامان کو رکھنے کے لیے ہمارے پاس بڑے بڑے کمرے نہیں ہیں۔“

”جب تم اس مولو کو لے کر ہمارے گھر آئے تھے تو ہم نے تو نہیں کہنا تھا کہ اس سائڈ کو لے کر نکل جاؤ ہمارے گھر سے۔ پورے مہینے کا راشن وہ ایک ہفتے میں کھا گیا تھا۔“ میں نے اس کی زبان کی رفتار کو دیکھا۔ وہ بہت زیادہ زبان دراز تھی۔ ایک تو یہ وجہ تھی کہ مجھے وہ بہت ہی زیادہ بری لگتی تھی۔ اتنی بری کہ میں اسے اپنے گھر سے دو کلو میٹر دور واقع ٹھنڈے پانی کی جمی ہوئی جھیل میں پھینکنے کے لیے تیار تھا اور جھیل پر پیرا دینے کے لیے بھی تیار تھا کہ وہ کہیں خود سے ہی باہر نکل کر اپنی جان نہ بچالے۔ وہ نکلے تو میں لمبے پھر سے دھکا دے دوں۔ اس کا ٹکنا میرا دھکا میرا دھکا اس کا ٹکنا کہ جوہلی کی طرح جان بچا کر نکل ہی نہ آئے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ جب وہ غصے میں تیز آواز میں بولتی تھی تو اس کی آنکھیں ٹیڑھی ہو جاتی تھیں اور مجھے اس سے تھوڑا سا خوف محسوس ہونے لگتا تھا کہ

کبھی وہ کوئی ویسا تو نہیں۔

”میں اپنے انکل کے گھر رہنے آئی ہوں تمہارے نہیں۔“

”تمہارے انکل میرے پیپا ہیں۔“

”لیکن تم ان کے صرف بیٹے نہیں ہو۔ کبھی بیٹی، کبھی بیٹا، کبھی جیک، کبھی جیکی ویسے آج کل تم کیا ہو؟“

”اوہ! وہ میرے ناموں پر طنز کر رہی تھی جو ماما مجھے بہت پیار سے دیتی ہیں، آئی لونائی ماما۔“

”آج کل میں جیکی چن۔“ میں نے جیکی چن کی طرح کراٹے کا ایک وار اس کی گرون پر کیا۔ بس اتنا ہی اور اس نے نیک کالر پہن لیا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا اور ان سے اس کی ”گرون کے حالات“ ڈسکس کیے۔

”نیک کالر کی تو بالکل کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے کالر کیوں پہنا ہے؟“ ڈاکٹر بوجھ رہے تھے۔

”ناکہ میری گرون ٹھیک نہ رہے۔“ میں نے اپنی گرون کو مسلا۔

”میں ڈاکٹر سے پوچھ آیا ہوں۔ تم یہ ڈرامہ بند کرو۔ اتارو یہ نیک کالر۔“ میں گھر آیا اور سیدھا اس کے پاس گیا۔

اس نے نیک کالر تو نہیں اتارا لیکن اپنے حلق سے ایک دل دوزخ اپنے منہ کے راستے سارے گھر میں اتار دی۔ ماما بھاگی ہوئی لاؤنج میں آئیں۔ ابھی میری نظر ماما کی شکل پر پڑی ہی تھی اور ماما کی نظروں کے تعاقب میں وہاں اس طرف آئی تھی جس طرف وہ ابھی۔ ہاں بالکل ابھی کھڑی تھی۔ لیکن اب وہ وہاں کھڑی نہیں تھی۔ وہ فرش پر پڑی تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ مجھے چھ دن گھر سے باہر رہنا پڑا۔ میں ساری زندگی گھر سے باہر نہ سکتا تھا، اگر وہ میرے ماما، پیپا، میرا کمرہ گھر میں سے نکال کر میرے منہ پر دے مارتے۔ فریج سے کچھ پھل اور اپنے والٹ سے کچھ پیسے بھی۔ تیز بارش میں، میں گھر سے باہر کھڑا رہا اور

کھڑکیاں بجاتا رہا لیکن کچھ دیر بعد جب دروازہ کھلا تو باہر کیا آیا؟ میرا رین کوٹ۔ وہ بھی وہ پرانا والا جس میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ کہاں جاتا، کیا کرتا۔ میں نے تو صرف سچ بولنا چاہا تھا کہ اسے نیک کالر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا سچ بولنے کی اتنی بڑی سزا ملتی ہے؟ ٹھیک ہے، میں اس سزا کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے سوراخ زدہ رین کوٹ پہن لیا اور ایسی دکھیااری رات میں اپنے دوستوں کے دروازوں کو بجاتا رہا۔

”کیوں نامووی دیکھی جائے۔“ میں مائیکل کے گھر کے باہر کھڑا کانپ رہا تھا۔

”ایسی بارش میں، ایسے پھٹے ہوئے رین کوٹ کو پہنے تقریباً“ سارا ابھیکے ہوئے میں تم سے مووی دیکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں چشمہ۔“

”تمہارا پہلے تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔“ اس نے اپنے چشمے کو اتار کر غور سے مجھے دیکھا، صرف مائیکل ہی یہ کر سکتا تھا۔ ”چشمے کو اتار کر دیکھنا۔“

”تم نے پہلے تو کبھی اتنے سوال نہیں کیے؟“ اسے دھکا دے کر میں خود ہی اس کے گھر کے اندر گھس گیا اور کچن کی طرف لپکا۔

”تم پہلے کبھی ایسی سوالیہ شکل کے ساتھ میرے دروازے پر بھی نہیں آئے۔“ کچن ٹیبل پر رکھے اوہ کھائے سینڈویچ کو جا کر اس نے بمشکل میری پہنچ سے بچایا۔

”منسو مووی ریڈی کرو۔ میں کچھ کھا کر آ رہا ہوں۔“

”تم ڈنر کر کے نہیں آئے گھر سے۔“

”اپنا منہ بند کرو اور جا کر مووی ریڈی کرو۔“

یہ تھی میری۔ ”منسووی ٹائٹ ٹریپ۔“ کی پہلی ٹائٹ۔ میں مووی ٹائٹ کا بہانہ کر کے اپنے دوستوں کے گھر رات کو مووی دیکھتا اور پھر وہیں سو مانا جاتا۔

ساتویں دن مجھے رائن نے جس کے گھر میں میری یہ تیسری مووی ٹائٹ تھی، ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔

”اگر تم آج بھی یہاں رہے تو مجھے بھی تمہاری طرح مووی ٹائٹس پر ایک پورا ہفتہ گزارنا ہوگا۔“

READING
Section

83 فروری 2016

افسوس مجھے کسی اور کے بیڈ پر نیند نہیں آتی اور صوفے پر میں پورا نہیں آتا۔“

”کیسے دوست ہو تم؟ صرف تین دنوں میں ہی تمہیں یہ سب یاد آگیا۔“

”میں تو تمہارا دوست ہوں لیکن میرے مام ڈیڈ تمہارے دوست نہیں ہیں۔“

”لیکن تم انہیں قائل کر سکتے ہو۔“

”انہوں نے مجھے قائل کر لیا ہے کہ یا تم یہاں رہو گے یا مجھے بھی جانا ہو گا۔“

”تم ان کی اولاد نہیں ہو کیا؟ ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ تمہارے ساتھ۔ تمہارے دوست کے ساتھ۔“

”جیسے تمہارے مام ڈیڈ نے تمہارے ساتھ کیا۔ تم ان کی اولاد نہیں ہو کیا؟“

”وہ تو میری ایک کزن آئی ہوئی ہے، مجھے اس کی شکل نہیں دیکھنی اس لیے۔“

”یا اس کی شکل کو ماسک پہنا دیا خود کالا چشمہ لگا لو لیکن اب چلے جاؤ۔ میری مام نے تو وارڈروب لاکڈ کر دی ہے۔ میں ایک ہی ڈریس میں ایک ہفتہ کیسے گزاروں گا؟ تمہیں تو رین کوٹ مل گیا، مجھے ٹین پیپر بھی نہیں ملے گا۔“

”ڈینس ٹھیک کہتا ہے، تم کسی کام کے نہیں ہو۔“

”ڈینس مجھے بھی ٹھیک کہہ گیا ہے کہ اسے لگ مار کر باہر کرو۔“

اس سے پہلے کہ میں رائن موٹو کی ”ڈائنو سار سائز لک۔“ کھاتا، مجھے گھر واپس آنا پڑا۔ وہ کچن ٹیبل پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی اور مجھے دیکھ کر ایسے مسکرا رہی تھی جیسے اسے دنیا میں کوئی غم نہیں۔ اسے کوئی غم ہو بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ سارے غم اس نے میری طرف منتقل کر دیے تھے۔ اسے سوری کہا۔ پھر کہیں جا کر اس کا نیک کا لرا اتر۔

پاپا کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ ہر روز صبح میرے کمرے میں آتے مجھے مخصوص انداز سے گھورتے۔

READING
Section

کیونکہ ابھی حال ہی میں۔ میں ”ممووی ٹائٹل ٹرپ“ سے واپس آیا تھا، اس لیے میں اس گھوری سے ڈر جاتا۔ میں انکل کے کمرے میں جاتا ان کا حال پوچھتا۔ ان سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا۔ اکثر انہیں اپنے ساتھ چل قدمی کے لیے لے جاتا اور ”اس“ سے دور ہی رہتا جیسا کہ ماما نے کہا تھا۔ ”عروہ سے دور رہنا، ورنہ ہم سے بھی دور ہو جانا۔“ ماما۔ پاپا سے دور ہونے کا مطلب تھا، صبح کے ناشتے، رات کے کھانے، اپنے روم، اس روم کے ساتھ روم اور پاپا کے والٹ میں موجود پیسوں سے دور رہنا۔ اتنی ساری چیزوں سے دور رہنے سے بہتر تھا کہ میں ”اس“ سے دور رہ لیتا۔

اکثر وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی گردن مسبلنے لگتی۔ یہ ڈنر ٹیبل پر ہوتا۔ اس کی گردن میں درد ہونے لگتا۔ وہ ماما سے کسی بام کا بوجھنے لگتی۔ پھر وہ کراہ کر ایک ایک نوالہ کھاتی۔ پاپا مجھے گھورتے۔ مجھے افسوس ہوتا۔ بہت افسوس ہوتا، مجھے ایک کاری دار کرنا چاہتے تھے کہ اس کی گردن ہی ٹوٹ جاتی نہ ہوتی گردن نہ نکلتی آہ۔ کراہت۔ اب وقت گزر چکا تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے جو کام وقت پہ نہ ہو سکے، پھر وہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی گردن توڑنے والا کام بھی پھر کبھی نہیں ہوا۔

لیکن۔۔۔

گھر میں ایک موٹا ہو تو، تو دو تین اور موٹو نکل ہی آتے ہیں۔ جو ساند اس کے گھر سے سارا راشن کھا آیا تھا، اسی ساند کی ایک چھوٹی بارہ سال کی موٹی بہن بھی تھی جو جب ہمارے گھر آئی ماما کو بیلایا کروا دیتی تھی۔ ”آئی میں یہاں سے گزر رہی تھی کہ پیکنگ کی خوشبو نے مجھے روک لیا۔“ می کا گلابی رنگ پیلا پڑ جاتا۔

”ہال۔۔۔ بیٹا میں آج کیک اور کوکیز بیک کر رہی ہوں۔“

ماما جانتی تھیں وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ ماما ہفتے میں ایک دن کیک، کوکیز اور بریڈ بیک کرتیں۔ وہ ٹھیک اسی دن گھر آتی۔ ماما نے دن بدل کر بھی دیکھے پر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیسے ٹام اینڈ جیری میں جیری چیز کا

خوشبو پر سوتا ہوا بھی چیز کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی وہ شہر کے کسی بھی حصے میں ہوتی وہ ٹھیک اسی جگہ پہنچ جاتی جہاں کچھ پک رہا ہوتا اور جہاں سے پکا ہوا اسے مل بھی جاتا۔

”کیا تم ماما کو بتا کر آئی ہو؟“ ماما ہر بار یہ کمزور سا جواز تلاش کرتی کہ شاید اسے گھر جانے کی جلدی ہوگی۔ ”میں نے سائیکل شیڈ میں پارک کر دی ہے۔ ماما کو میں فون کر دیتی ہوں۔ ویسے بھی ماما کو میری کوئی پروا نہیں ہے۔ ان کے خیال میں جب میں کمزور ہو جاؤں گی تو ہی اچھی بچی بنوں گی میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ وزنی لوگ بھی اچھے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں میں شروع سے باغی رہی ہوں۔ اگر دنیا میں اسی فیصد تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ”فٹ“ ہیں تو مجھے ان اسی فیصد کا حصہ نہیں بننا۔ میری ایک الگ پہچان ہونی چاہیے“ آپ کیا کہتی ہیں آنٹی؟“

”تمہاری طرح اور بھی بہت لوگ موٹے ہیں۔ یہ تمہاری الگ پہچان تو نہیں ہوئی نا۔“

”میں ہزاروں بھیڑیوں میں ہونے کی نسبت۔ دس بھیڑیوں میں ہونا پسند کروں گی۔“

”لیکن بھیڑیوں کو پسند کیا جاتا ہے مشعل۔“

”میں ناپسند کیے جانے کے لیے تیار ہوں۔“

گوشت کا گولہ اپنے بازوؤں کو لہرا کر کہتا۔

ماما کو ناچار اس کے آگے سب رکھنا پڑتا۔ ویسے بھی

ماما اور ہم سب جان گئے تھے کہ ”موٹا“ اپنے موٹا

ہونے کے کئی جواز تلاش کر لیتا ہے۔ وہ ”کھانے کے

کار خیر“ پر ایسی ایسی ولیلین دیتا ہے کہ ”اسی فیصد فٹ

عوام“ ان دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

سولیٹ موٹاز مور موٹا۔

اب جب اس نے ہمارا نمک کھا ہی لیا تھا تو اسے

حلال بھی کروانا چاہیے تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ

اسٹور لے گیا اور جو جو اس نے کہا ”اسے کھانے کے

لیے لے کر دیا۔ بدلے میں اس نے بس اتنا کیا کہ وہ عروہ

کو اپنے ساتھ چہل قدمی کے لیے لے گئی اور واپسی

میں عروہ کو ماما بمشکل اٹھا کر اپنے ساتھ گھر لا میں ”پتہ“

سے ڈاکٹر کے پاس۔ چھوٹی موٹو لڑکھڑا کر گری تھی اور ٹھیک عروہ کے اوپر گری بھی جو گراؤنڈ پر ہاتھ سر کے نیچے رکھے پر سکون انداز میں آسمان کا نظارہ کر رہی تھی۔

”ہو گیا نظارہ۔ چلو اب اپنے گھر واپس۔ میں تمہیں اپنے اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔“



مجھے ایسا لگا جیسے میرے اوپر کوئی پہاڑ آگرا۔ میری آنتیں اگر باہر نہیں آئی تھیں تو اس کا مطلب صاف تھا وہ اندر ہی ٹوٹ کر گر گئی تھیں اور اب کسی اور راستے سے باہر آنے والی تھیں پورے دو منٹ تک میں پیٹ کے بل اپنا درد قابو میں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مشعل بھاگ کر گئی اور گھر سے آنٹی کو بلا لائی۔ ایک — ہفتے تک میں نے جو کھایا وہ کھاتے ہی باہر آیا۔ درد جس چیز کا نام ہے وہ میں نے چڑیوں کے جھنڈ سے جانا۔ مجھے کئی دن تک بیڈ ریسٹ کرنا پڑا اور ظاہر ہے کہ بارہ سال کی بچی یہ سب برداشت نہیں کر سکتی اور اس نے احساس جرم کے اثر کو زائل کرنے کے لیے بہت زیادہ کھانا شروع کر دیا، ساتھ ہی اگلنا بھی شروع کر دیا۔

”جیک نے کہا تھا مجھ سے یہ کرنے کے لیے۔“ اس نے اگل دیا۔

”ہاؤ کیوش۔“ میں نے مشعل کے گال پر پیار کیا۔ دل تو کر رہا تھا دانت سے گال کاٹ یوں لیکن بچی تھی اور پھر میں اس بچی کے دیس میں تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

”تم نے اسے منع کیا تھا؟“

”نہیں میں منع نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے اسٹور میں

لے گیا اور جس جس چیز پر میں نے ہاتھ رکھا اس نے وہ

مجھے لے دی۔ پھر سب ہنگو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس

نے کہا۔ ایک ہاتھ لو ایک ہاتھ دو۔“ میں نے اپنا لینے

والا ہاتھ بڑھا دیا اور اس نے میرا سینے والا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اگر میں مرجاتی تو؟“

علامہ؟ باڈی ہسٹنگ سسٹم نا؟ اس کے گرم کپڑے، مہنگے نفیس کوٹ، برفانی طوفان میں ٹھنڈے بچانے والے ہڈ رنگ برنگے سویٹر، مختلف شیڈز کی لیڈر جیکٹس۔ کمینڈا جیسے ٹھنڈے برفانی ملک میں سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ کیا ہوگا؟ یہی سب نا؟

بس میں اس اثاثے کا ایک ایک بازو کاٹ دلائی۔ ہر شرٹ کا، ہر کوٹ کا، ہر سویٹر کا، ہر ہڈ کا۔ اتفاق سے سویٹروں کو دوزی ٹھیک نہیں کرتے اور کوٹ کمپنیوں کے پاس واپس نہیں جاتے کہ جی، ہم سے اس کا ایک بازو کٹ گیا ہے، اب یہ لے لیں اور دونوں بازوؤں والا دے دیں اور اتفاق سے سویٹر، شرٹس، کوٹ بنانے والی کمپنیاں ”ایکسٹرا کپڑا“ بھی کسٹمر کو نہیں دیتی کہ اگر کوئی آستین کاٹ کر لے جائے تو اسے جوڑ بیچے گا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں نے اس کا کافی نقصان کیا ہاں لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ میں نے اس کا ”ٹھیک“ نقصان کیا۔

میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنے ”ملے“ پر بیٹھا چلا چلا کر رہا ہے کہ یہ میں نے کیا ہے لیکن اس کی بات کا یقین کون کرتا؟ آنٹی اور انکل یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ سب اس نے کیا ہے اور وہ نام ”بے چاری عروہ“ کا لگا رہا ہے۔

میرے چند قریبی دوستوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں منگنی شدہ ہوں۔ اب یہ منگنی کیسی چل رہی ہے یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ منگنی لولی لنگڑی تھی اور یہ میرے اور جیک کی طرف سے وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ یہ صرف ہم دونوں کے ماں باپ کے لیے تھی۔ مجھے وہ قطعاً ”پسند نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سے شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر ہو بھی جاتی تو بہت جلد طلاق تک نوبت آ جاتی۔ ایسی شادی کا فائدہ جس کے فوری بعد عدالتوں کے چکر لگانے پڑیں۔ مجھے یونیورسٹی جانا تھا اور پھر مجھے یہ اعلان کرنا تھا کہ مجھے کسی بھی صورت اس جیک سے شادی نہیں کرنی۔ جو یہ طے ہی نہیں کر پارہا کہ اسے کیا بنے رہنا ہے۔ وہ خود بھی اسی انتظار میں لگتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم سے فارغ ہو اور

”میں گاؤ سے معافی مانگ لیتی گاؤ بہت اچھے ہیں وہ معاف کر دیتے ہیں اور جیک نے کہا تھا، موٹے لوگوں کے نیچے اگر کوئی نہیں مرتا۔“

”تم گاؤ سے معافی تو مانگ لیتیں، لیکن میری جان تو واپس نہ آتی نا۔“ میری جان کے زیاں پر اس کے کتنے نادر خیالات تھے۔ راز اگلنے کے انعام کے طور پر میں نے اسے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ دیا جسے لے کر وہ میری شکل دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا، تم یہ چاکلیٹ نہیں کھاتیں؟“

”میں نے آپ کی جان بچائی ہے۔ اگر میں مزید اور دو منٹ تک آپ پر گری رہتی تو آپ اس وقت بیڈ پر نہیں تابوت میں لیٹی ہوتیں۔ اب آپ بدلے میں مجھے یہ ننھا منا پیکٹ دے رہی ہیں۔ یہ تو میں اسکول بس میں بیٹھے بیٹھے کھا جاتی ہوں۔“ ابھی کچھ دیر پہلے وہ شرمندہ ہو رہی تھی اور اب وہ مجھے شرمندہ کر رہی تھی۔ ان موٹے لوگوں کا کوئی دین ایمان ہے یا نہیں؟

”فی الحال تو میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے کہ تمہیں کھانے کے لیے دوں۔ البتہ تم کبھی لگا کر مجھے کھا سکتی ہو۔“ میں نے آہ بھر کر کہا۔

اس نے منہ بنا لیا۔ ”میں صرف اچھے کھانے کھانے کی شوقین ہوں۔“

توبہ توبہ! یہ موٹے لوگ تو منہ پھٹ بھی ہوتے ہیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ مجھے گھر بھی جانا تھا۔ پاپا پہلے ہی جا چکے تھے۔ جس دن میری فلائٹ تھی اس دن میں نے کچھ وقت جیک کے کمرے میں گزارا۔ جیک کالج جا چکا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن کمرے میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ وارڈرو ب۔ وارڈرو ب میں کپڑے۔ کپڑوں میں مہنگے کپڑے اور مہنگے کپڑوں میں ”اس کے پسندیدہ کپڑے۔“

ایک یورپین کنٹری میں رہنے والے کے پاس گھر کے بعد سب سے زیادہ قیمتی کیا ہوتا ہے؟ ایک ایسا ملک جہاں سرویوں میں درجہ حرارت منفی ہو جاتا ہے۔ وہاں قیمت سے قیمتی کیا ہوگا؟ گھر کے ہسٹنگ سسٹم کے

جنتی کو توڑنے کا اعلان کرے اور اس نے یہ اعلان کر دیا۔ پاپا اور انکل کے فرسٹ کزن کی اکلوتی بیٹی کا نکاح تھا اور وہ سب اس میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

”السلام علیکم محترمہ عروہ۔“ یہ اس کا ابتدائی انداز تھا مجھ سے بات کرنے کا جو کئی مہذب تھا۔ مئی، بابا انہیں لینے ایئر پورٹ گئے تھے۔ صرف میں اور رخشیاں ہی گھر میں تھے۔ وہ کار سے باہر نکل کر سب سے پہلے چلتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔

”وعلیکم السلام محترم جیک۔“

”میں جیک نہیں ہوں، مجھے عمار کہا جائے۔“

تو وہ اپنے پیدائشی نام کو استعمال کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس بار وہ کافی انسانی حلیے میں ملبوس آیا تھا۔ نہ بالوں میں کوئی ہل پھرا ہوا تھا، نہ کوئی کرینٹ وہ ڈایا گیا تھا لیکن اس نے جونی شرٹ پہن رکھی تھی وہ کافی انقلابی سی تھی۔ اس کی ایک آستین کسی اور ہی فیبوک کی تھی۔ وہ آستین اس شرٹ کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ وہ کسی اسٹیریو فیشن کو فالو کر رہا ہے یا وہ کسی اسٹیریو فیشن کو سیٹ کر رہا ہے۔ اس کی شکل جتنی سنجیدہ ہو رہی تھی اس کی شرٹ اتنی ہی اس کے خلاف جارہی تھی۔ وہ ان ہی شرٹوں میں سے ایک تھی جس پر میں نے قینچی چلائی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کی شرٹ کو دیکھ کر اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

”اچھا ہے نا یہ نیا فیشن۔ میرے دوستوں میں کافی مقبول رہا ہے۔“

”مقبول اور یہ۔؟“ میں نے خود کو کھل کر ہنسنے کی اجازت دی اور شرٹ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”ہاں۔“ اس نے خود کو اپنی ہنسی غائب کرنے کی تنبیہ کی اور دانت پیس کر کہا۔ دانت کو دانت پر ایسے جماتے ہوئے وہ کچھ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے دانتوں پر اہلپی چکاوی گئی ہو اور اب وہ اس اہلپی سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ہٹلانے لگا ہو۔

”ایک عرصہ ہوا مجھے ایسے مقبول ہوئے۔“

”تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مس جیکی۔“

”میں ضرور تمہارا شکر ادا کر کے جاؤں گا مس ہائی جیک۔“ انکل اسے گھورتے ہوئے قریب سے گزر گئے۔ شاید وہ اس سے خائف تھے۔ آئی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”یہاں آنے سے پہلے جو لیکچر تمہیں مل چکے ہیں انہیں یاد رکھنا۔“ گو آئی نے سرگوشی کی تھی لیکن آئی کو کسی نے بتایا نہیں تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح ”بلند آواز“ میں سرگوشی کرتی ہیں۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی قابو میں کی۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب لڑکوں کو لڑکیوں کے سامنے ڈانٹ پڑتی ہے۔ انہیں پھٹکارا جاتا ہے۔ انہیں ”الو گدھا“ کہا جاتا ہے۔ آہ۔ اب وہ لڑکا اپنے اسکول کے تھیٹر کا جانی ڈیپ ہو یا ریلنگ رنگ کا ”ہو گن“ لڑکیوں کے سامنے وہ پھنس پھسا کر زبرد ہو جاتا ہے۔

”مجھے تو تمہاری حیثیت وہی پرانی کی پرانی لگ رہی ہے۔“ میرا اشارہ آئی کی سرگوشی کی طرف تھا جس میں وہ چپکے سے اسے پھٹکار گئی تھیں۔

”لیکن تمہاری شکل مجھے نئی نئی لگ رہی ہے۔ کیا کرتی رہتی ہو تم اپنی شکل کے ساتھ۔ پہلے اچھی خاصی لومڑی جیسی لگتی تھی اب ایک دم سے چھپکلی سی ہو گئی ہو۔ دیواروں پر رنگ رنگ کر تمہارے ہاتھ بھی خراب ہو گئے ہیں۔ اگر تمہیں جانوروں میں دلچسپی ہے تو کوئی اچھا جانور بنو، جیسے چمگادڑ۔ یا۔۔“

”شٹ اپ!“ مجھے اپنے جسم کا سارا خون ابلتا ہوا محسوس ہوا۔ ”پنی شکل دیکھی ہے تم نے؟ پچکی ہوئی رگبی بال۔“

”اوہ!“ وہ محفوظ ہوا۔ ”کبھی رگبی بال ہاتھ میں پکڑ کر بھی دیکھی ہے؟ یا بس ٹی وی سے رگبی کا نام ہی سیکھا ہے؟ تم جیسی لڑکیاں دو سروں کو متاثر کرنے کے لیے گوگل سے فلموں، کھلاڑیوں، شہروں، ہوٹلوں، کھانوں، آرٹ کے نمونوں کے نام دیکھ کر یاد کر لیتی ہیں۔ پھر

ایسے ظاہر کرتی ہیں جیسے ہم سے زیادہ تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ رنگی کے ایک آدھ کھلاڑی کا نام بھی تم نے یاد کیا ہو گا۔ دس بارہ فٹ بال کے کھلاڑیوں کے نام، کچھ سائنس دانوں کے نام، چند کلاسک فلموں اور کتابوں کے نام۔ ہو گئی امپریسولسٹ تیار۔ ویسے اس بار تم نے ”کتنی کتابیں“ لا کر اپنے کمرے میں رکھی ہیں؟

”اس بار ڈریکولا ان پاک لینڈ رکھی ہے۔“ میں چلا اٹھی۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے اور میرا خون ابل ابل کر اب سوکھنے لگا تھا۔ اس سے پہلے میں اپنا سارا خون خشک کر دیتی میں اس سے دور ہو گئی۔



مجھے زندگی میں دو بڑے صدمات سے گزرنا پڑا۔ ایک بچپن کی منگنی کا، ایک میری وارڈروب کے ”معدور“ ہو جانے کا۔ دونوں صدمات جان لیوا تھے۔ دونوں صدمات کے واقع ہونے کے دن، میری زندگی کے بلیک ڈے تھے۔ کمرے میں بند ہو کر میں نے ”آدھے گھنٹے“ کی خاموشی اختیار کی اور موم بتیاں جلا کر وارڈروب کے سامنے رکھ دیں اور خود ان کے پاس چوڑی مار کر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ماما کمرے میں آئیں۔

”تعزیتی تقریب۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ پھر تمہاری الماری میں چوہا گھس گیا اور تمہارا کوئی نیلا پیلا ماسک کھا گیا۔

”ماما! ایک تو اب میں ماسک نہیں پہنتا دو سرا چوہا آئی تھی چوہا نہیں۔ وہ کتر کر نہیں گئی کٹ کر گئی ہے۔“

”اوہ! ویسے مجھے کتنے منٹ کی خاموشی اختیار کرنی ہوگی؟“

”آپ کو میرے یونیورسٹی جانے تک خاموشی اختیار کرنی ہوگی۔“ میرا مطلب عروہ سے تھا کہ اب کوئی اس کا نام بھی میرے سامنے نہ لے۔

”اپنی تقریب جاری رکھو۔“ وہ ہنسنے لگیں۔

کتنی بے فکری سے ماما ہنس رہی تھیں۔ کیا وہ دیکھ

نہیں رہیں تھیں کہ میں نے وارڈروب کے سامنے ایک نہیں دو نہیں پوری تین درجن کینڈلز جلا رکھی ہیں۔ کیا انہیں نظر نہیں آ رہا کہ میں نے غم میں لینچ بھی نہیں کیا اور میں کوئی ایک ہزار بار اپنے کپڑے نکال کر دیکھ چکا ہوں کہ شاید کسی کا کچھ ہو سکے۔ جن کا اب یہی ہو سکتا تھا کہ یا میں خود ”ٹیلر“ بن جاؤں اور ان سب کو کسی نہ کسی طرح سے پہننے کے قابل کروں یا پھر پارٹ ٹائم جاب کروں اور اپنے لیے نئے کپڑے خرید لوں۔

”میں ٹیلر بھی بنا اور مجھے پارٹ ٹائم جاب بھی کرنی پڑی پھر بھی نقصان وہیں کا وہیں رہا۔“

رائن کی مام اکثر رائن کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہیں۔ ”کچھ عذاب اتنے وزنی ہوتے ہیں کہ انہیں چھوٹی موٹی دعائیں ٹال ہی نہیں سکتیں۔“ ٹھیک کہتی ہیں وہ۔ کچھ عذاب اتنے وزنی ہوتے ہیں کہ انہیں چھوٹی موٹی تدبیریں ٹال ہی نہیں سکتیں۔ مجھے بھی اب کوئی بڑی ہی تدبیر آزمانی ہوگی اور یہ رہی وہ تدبیر۔

میں کشف کے نکاح میں شرکت کرنے کے لیے آیا ہوں۔ ابھی فنکشن شروع نہیں ہوا۔ کسی مقامی سنگر کو گلے کے لیے بلایا گیا ہے لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں۔ ہم سب اپنی اپنی آوازیں نکال کر ساؤنڈ سسٹم کو چیک کر رہے ہیں۔ شایان، میرے کزن کے کسی انکل نے اپنے بیٹے کے میڈیکل میں انٹری ٹیسٹ میں پاس ہونے کی خوشی میں اگلے ہفتے اپنے گھر دعوت کا اعلان مائیک پر آکر کیا اور سب کو شرکت کی دعوت دی۔

”تمہیں کوئی اعلان نہیں کرنا؟ شایان مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ اس کا اشارہ شاید میری شادی کی طرف ہے۔“

”ہاں! کیوں نہیں۔ جلد ہی میں تمہیں اپنی منگنی میں انوائسٹ کروں گا۔“

”منگنی کرنے کی کیا ضرورت ہے نکاح کرنا یا شادی۔ ویسے ہی تمہاری منگنی کا دورانیہ کافی لمبا ہو گیا ہے۔“

”کس منگنی کا دورانیہ لمبا ہوا ہے؟ منگنی تو ابھی میری ہولی ہے۔“

”میں عروہ سے تمہاری منگنی کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”کون عروہ؟ میں کسی عروہ کو نہیں جانتا۔“
 ”تم مذاق کر رہے ہو؟“ وہ حیران ہوا۔

”مجھے مذاق کی عادت نہیں ہے۔ اس سے منگنی کا اعلان کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی خودکشی کا اعلان کر دوں۔ اگر میری کوئی منگنی ہوئی بھی ہے تو میں اسے توڑتا ہوں۔“

میرا پلان کچھ اور تھا لیکن ہو کچھ اور گیا۔ جو ہو گیا وہ بھی کچھ ایسا برا نہیں تھا۔ کافی مہمان آچکے تھے، لیکن ابھی لڑکے والے نہیں آئے تھے۔ مائیک پر شایان کا دس بارہ سالہ کزن کھڑا نیم مزاحیہ انداز میں وہاں موجود اپنے رشتے داروں کی آوازوں کی نقل اتار کر سنارہا تھا اور سب محفوظ بھی ہو رہے تھے۔ میرے اور شایان کے درمیان جو مکالمہ چل رہا تھا وہ اس کے کان سے گزر رہا تھا۔ اس نے گردن میری طرف موڑ کر شرارت سے پوچھا۔

”یہ والا اعلان بھی کر دوں مائیک پر۔“ میں نے بچے کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گردن کو ہاں میں ہلا دیا۔

”عروہ سے منگنی کا اعلان کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی خودکشی کا اعلان کر دوں۔ اگر میری کوئی منگنی ہوئی بھی ہے تو میں اسے توڑتا ہوں۔“ لڑکے کی یادداشت بھی اچھی تھی اور اس نے میرے انداز کی نقل بھی ٹھیک ٹھیک اتاری تھی۔ اس کا اندازہ مجھے ہال میں یک دم پھیل جانے والے سانے سے ہوا۔ خوش قسمتی سے خاندان میں ایک ہی عروہ تھی اور اس سے بھی زیادہ خوش قسمتی سے بہت سے لوگ یہ پیش گوئی پہلے ہی کر چکے تھے کہ ”ہم دونوں کی منگنی“ شادی تک نہیں پہنچے گی۔ اعلان بھی ہو گیا ان کی پیش گوئی بھی سچ ہو گئی۔ شایان نے برہ کر اس لڑکے کے ہاتھ سے مائیک لیا۔

”بچہ ہے مذاق کر رہا ہے۔“ شایان نے مائیک میں کہا۔

”نہیں یہ سچ ہے۔“ میں نے مائیک کے آگے منہ

کر کے کہہ دیا۔

اتنی سی ہمت کی بات تھی اور بس بات ختم۔ پاپا کی جیب میں اس وقت اگر کوئی پسل ہوتی تو میری لاش مائیک کے پاس پڑی ہوتی۔ اگر پسل نہیں بھی تھی تو بھی وہ دونوں ہاتھوں کے حملوں سے مجھے لاش بنانے آرہے تھے لیکن انکل نے میری جان بچالی۔ انہوں نے پاپا اور ماما دونوں سے کہہ دیا کہ فیصلہ دونوں بچے ہی کریں گے، ہمیں انہیں مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت بات کو برہانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میں واپس کینیڈا آ گیا۔ میں اب خوش تھا اور مطمئن بھی۔ اس سب سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ ”تھوڑی سی ہمت آپ کو بڑی مصیبت سے بچا سکتی ہے۔“ اور ہاں میں بتانا بھول گیا۔ وہ میرے چچا کی بیٹی عروہ ہے نا اس کے کمرے میں مجھے کچھ دیر رہنا پڑا۔ کمرے میں ایک میں تھا، ایک وارڈروب تھی اور میرے ہاتھ میں ایک بلیک آئل پینٹ باکس تھا۔ میں نے اس کے کپڑوں کو ہیڈ پر پھیلایا، باکس میں برش بھگوایا اور کود کود کر گیلے برش کے وارن قیمتی ملبوسات رکھے جو اس کے کہنے کے مطابق بڑے برانڈ اور مہنگے مہنگے تھے۔ ”اب وہ کپڑے دنیا کے کسی بھی لائڈری ہاؤس میں جاتے وہاں سے ویسے ہی واپس آتے جیسے گئے تھے۔“



میں اس وقت رسٹ روم میں تھی۔ لڑکے والے آنے ہی والے تھے، ہم سب لڑکیاں اپنے اپنے میک اپ کو آخری ٹیچ دے رہی تھیں کہ انکل نیاز کا چھوٹا بیٹا بھاگتا ہوا اندر آیا۔

”نمار بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرجائیں گے، عروہ آپ سے شادی نہیں کریں گے، انہوں نے مائیک پر کہا ہے یہ۔“ لڑکیوں کے میک اپ کرتے ہاتھ رک گئے اور وہ میرا منہ دیکھنے لگیں۔

”وہ مذاق کر رہا ہو گا۔“ میری ایک کزن نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا۔

”لیکن انہوں نے کہا وہ سچ بول رہے ہیں۔“

میں جان گئی کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ ”مجھے کون سا اس گدھے سے شادی کرنی ہے۔“ میں نے غصے سے چلا کر کہا۔

میری کزنز استہزیائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں ’میں باگل تھی جو عمار کو گدھا کہہ رہی تھی۔ ان سب کے نزدیک کینیڈا میں رہنے والا انکل کا اکلوتا ڈشنگ بیٹا گدھا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی گدھا ہو سکتا تھا تو وہ میں تھی۔ اٹا مجھے گدھا بنا کر ایک دم سے ہی ساری لڑکیوں کا میک اپ ہو گیا۔ ایک دم سے ہی انہیں جلدی سے باہر جانا تھا۔ ایک دم سے ہی انہیں یہ بھول گیا کہ انہیں مجھے بھی ساتھ لے کر باہر جانا تھا اور ایک دم سے ہی سارا ریٹ روم خالی ہو گیا اور میں اکیلی کھڑی رہ گئی اور میرا خالی دماغ جیسا کہ ممی کو لگتا ہے وہ عمار کے لیے شدید غصے سے بھر گیا۔ تقریب کے بعد جس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سووی دیکھ رہا تھا اور ساتھ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا میں وہاں جا دھمکی۔

”تم اس غلط فہمی میں کیوں تھے کہ میں تمہیں اپنا منگیتر سمجھتی ہوں۔“ میں نے ہاتھوں کو اس کی گردن سے دور رکھنے کی باقاعدہ تنگ و دو کی۔

”یہ غلط فہمی ہمارے والدین کو تھی۔“ وہ دیکھ سکتا تھا کہ میں کیسے اپنے ہاتھوں کو سنبھال رہی ہوں اور وہ محفوظ ہو رہا تھا۔

”تو تمہیں یہ غلط فہمی مائیک پر ہی دور کرنی تھی؟“

”یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ دراصل اس کا اعلان مجھے اس سے بھی بڑی جگہ پر کرنا چاہیے تھا۔“ وہ ابھی بھی ڈھیٹ ہی بنا ہوا تھا۔

”میں تم سے اپنی متکنی بہت پہلے توڑ چکی ہوں۔“

”لیکن تم نے اس کا اعلان تمہیں کیا تھا۔ اعلان میں نے کیا ہے۔“

”تو تم اب یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں اپنے چچا کے گھر موجود اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ ویسے تم اتنے غصے میں کیوں

ہو؟ تمہیں تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ میں نے خود کو تو مصیبت سے بچایا ہی ہے تمہیں کتنی بچالیا۔“

”تو تم مان رہے ہو کہ تم مصیبت ہو جس سے میں بچ گئی؟“

”میں تمہیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں میں مان رہا ہوں کہ تم نے مجھے متاثر نہیں کیا اس لیے مجھے تمہارے لیے مصیبت بننا پڑا۔“

”اوہ!“ میرے گال غصے سے سرخ ہو گئے اور ہونٹ نیلے۔ کاش میں سانپ ہوتی اور اسے ڈس لیتی اور اسے نیلا کر دیتی لیکن کیونکہ میں سانپ نہیں ہوں اور اسے نیلا نہیں کر سکتی اس لیے میں اپنے کان غصے سے سرخ کر رہی ہوں۔

”مجھے تمہیں متاثر کرنا بھی نہیں تھا، کشف کے نکاح میں تمہیں کافی لڑکیوں نے امپریس کیا تھا۔“

”تم ان لڑکیوں سے جھلس ہو؟“

”میں ہر لڑکی سے جھلس ہوا کرتی تھی کہ وہ کیوں اتنی خوش قسمت ہیں کہ تم جیسا لڑکا ان کا منگیتر نہیں ہے لیکن اب ہر لڑکی مجھ سے جھلس ہوا کرے گی۔“

میں کہہ کر جانے لگی۔

”تمہیں یہ دکھ تو ہو گا کہ مجھ جیسے ہینڈ سم لڑکے نے تمہیں چھوڑ دیا۔“

”دکھ؟ ہاں بہت دکھ تھا لیکن پہلے کہ تم جیسے اینارمل لڑکے سے میرے ماں باپ نے میرا رشتہ طے کر دیا۔“

”تو تم خود کو نارمل سمجھتی ہو۔“

”تمہیں تو کافی دکھ ہو رہا ہے اپنے اینارمل ہونے کے بارے میں سن کر۔ ان فیکٹ تمہیں یہ برا لگ رہا ہے کہ میں نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی۔“

”گھاس چرنے سے تو تمہیں ہی فرصت نہیں تھی۔ اب جاؤ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ ورنہ تمہیں سزا دینے کے لیے میں اس رشتے کے لیے ہاں بھی کہہ سکتا ہوں لیکن یہ سزا ساتھ مجھے بھی بھگتنی ہوگی۔“

”ہاں! یہ سزا تمہیں ہی بھگتنی ہوگی۔“ یہ وہ خیال تھا جو میرے ذہن میں آیا اور پھر بھی ذہن سے نکلا ہی

نہیں۔



مجھے ڈر تھا کہ جیسے ہی ہم لوگ کینڈا واپس آئیں گے ماما پاپا دونوں مجھ پر حملہ کر دیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دونوں کا رویہ بہت اچھا رہا، بلکہ ایک دن تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”تم ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا لیکن پہلے اچھی طرح سے سوچ لیتا۔“ گو میں اپنے فیصلے سے وہاں سب کو آگاہ کر چکا تھا اور بہت ہلکا بھلکا تھا پلس مجھے مزید سوچنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر سے ایک دم سے جیسے مجھ پر بہت وزنی بوجھ آگرا۔ یعنی ابھی مجھے پھر سے سوچنا ہے۔ ٹھیک ہے میں سوچ لیتا ہوں۔ کل رات سوچوں گا، کل میں فری ہوں۔ کل کی رات آئی تو میں نے سوچا کہ آج کل میرے ایگز مزیل رہے ہیں، مجھے ایگز مزیل کے بعد سوچنا چاہیے۔ ایگز مزیل کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ میرے انجوائے منٹ کے دن ہیں، مجھے ہر چیز بھلا کر صرف انجوائے کرنا چاہیے۔ انجوائے منٹ کے دن ختم ہوئے تو پھر سے کلاسز شروع ہو گئیں اور میں اسٹڈی میں بڑی ہو گیا۔ پھر سے ایگز امز آگئے اور یونیورسٹی کے آخری سال کی ٹف اسٹڈی شروع ہو گئی۔ اتفاق سے اگر مجھے کچھ وقت فری ملتا بھی تو میں کوئی نہ کوئی مووی دیکھ لیتا۔ کچھ نہ کچھ پکا کر کھانے لگتا یا رائن کے ساتھ گھومنے نکل جاتا۔ پھر میری جاب بھی بہت ٹف تھی۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میں ”سوچتا“ ڈز ٹیمبل پر جیسے ہی پاپا مجھے غور سے دیکھتے میں جلدی سے کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں آ جاتا۔ کیوں؟ کیا میں ڈر رہا ہوں کہ وہ مجھ سے میرے فیصلے کے بارے میں نہ پوچھ لیں، جس کے بارے میں میں ابھی تک سوچا ہی نہیں؟ اس فیصلے کے بارے میں جس پر میں بہت کلیئر ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ڈر نہیں سکتا۔ یہ بھی پاپا کی کوئی ٹرک ہے۔ وہ مجھے الجھتا رہے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر میرے ذہن پر بوجھ ڈال رہے ہیں۔ جو بھی ہے فیصلہ تو ہو چکا ہے، بس ایک بار

پھر سے اس پر سوچ کر انہیں آگاہ کرنا ہے۔ چھوٹا سا معمولی سا کام لیکن بس مجھے وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ ”تمہیں وقت کی کیا ضرورت ہے، بس جھٹ جا کر کہہ دو کہ تمہیں نہیں کرنی عروہ سے شادی۔“ میرے اندر سے آواز آئی۔

یہ چمٹنگ ہوگی۔ پاپا نے کہا ہے ایک بار اچھی طرح سے سوچ لو۔

پاپا کو کس نے بتانا ہے کہ تم نے چمٹنگ کی ہے۔ کہہ دینا اچھی طرح سے سوچ لیا ہے۔

میں گلٹ کا شکار رہوں گا۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔

وہ اصل تم عروہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ ہاں تم یہ چاہتے ہو۔ اب جب واقعی اسے چھوڑنے کا وقت آیا ہے تو تمہارے دل پر بوجھ ہے۔

ایسا نہیں ہے، زہر لگتی ہے مجھے۔

اسی زہر کے لیے تم نے دو سال لیے ہیں سوچنے کے لیے۔ اگر ایسی ہی زہر ہے وہ تو جاؤ، جا کر انکار کر دو ابھی۔

ابھی میں جاب کے لیے اپنے انٹرویو کی تیاری کر رہا ہوں۔

”دیکھا۔! پھر تم کووے، تم انٹرویو دینے جا رہے ہو، پھر تم کووے، تم اپنی نئی جاب میں بڑی رہتے ہو۔ پھر یہ وہ پھر وہ۔ تم ابھی جاؤ، ابھی کو۔“

”ٹھیک ہے میں ابھی جا رہا ہوں۔ ابھی ابھی۔“

میں پاپا کے روم میں آیا۔ وہاں ماما بھی تھیں۔ دونوں میری طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے میں بوری میں بند وہ بونا تھا جو اسٹور روم میں قید تھا اور اب وہ بونا ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ سوالیہ بونے کو دیکھ رہے ہیں کہ ”بول اسے بونے! تجھے کیا چاہیے؟ تو اپنی بوری سے باہر کیوں آیا؟“

”پاپا مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ بونا اس لیے بوری سے باہر آیا۔

”ہاں بولو۔“

”وہ میں۔۔۔ وہ مجھے آپ کی گاڑی چاہیے۔۔۔ کل میرا انٹرویو ہے۔“

”کیا میں تمہیں ڈراپ کروں؟“
 ”میں خود چلا جاؤں گا۔“ اپنی بات کہہ دینے کے
 بعد بھی جب میں وہاں سے نہیں گیا تو پیانے پوچھا۔
 ”اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟“
 ”نہیں۔۔۔ آپ کو ایسا کیوں لگا؟“
 ”تمہاری شکل پر لکھا ہے کہ تمہیں کچھ کہنا
 ہے۔“

”نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا۔“ میں اپنے کمرے میں
 آگیا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا ”یہ میں نے کیا کیا۔“
 سامنے لیٹنے میں میرا عکس مجھ پر قہقہے لگا رہا تھا۔ ”میں
 نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ ضرور میرے
 دماغ کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔“ میں نے اپنے کان بند
 کیے اور انٹرویو کے لیے اپنی فائل تیار کرنے لگا جو تیار
 ہی تھی لیکن اسے پھر سے تیار کرنے میں کیا مسئلہ تھا۔
 کہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا تو پھر مسئلہ تھا کہاں؟ میرا
 انٹرویو ہو گیا۔ مجھے جاب مل گئی۔ پیانے اب روز میری
 شکل کی طرف دیکھتے ہیں۔

”آپ ایسے مجھے کیوں دیکھتے ہیں؟“
 ”کیا تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے؟“

”آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔ مجھے یہی کہنا ہے۔“ اتنا
 کہہ کر میں کھسک گیا اور کیوں کھسک گیا یہ بھی معلوم
 نہیں کر سکا۔ اب جب میں پیانے کو اور پیانے مجھے دیکھتے
 ہیں مجھے یہی لگتا ہے کہ ابھی وہ مجھ سے نہیں گے۔
 ”تمہیں کچھ کہنا ہے؟ ہے نا؟ کہہ دو۔“

لیکن تم ڈر کس بات سے رہے ہو؟ میں نے خود
 سے پوچھا۔

”تمہارے انکل عروہ کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ پیانے
 کمرے میں آئے اور فوراً ”سے کہہ دیا۔

”اوہ!“ تو وہ بات یہ تھی جس سے میں ڈر رہا تھا۔
 عروہ کی شادی سے۔۔۔ یعنی مجھ سے اس کی شادی نہ
 ہونے سے پس کسی اور سے ہو جانے سے۔۔۔ ان
 دونوں باتوں سے میں ڈر رہا تھا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا،
 کبھی نہیں وہ تو مجھے ”نٹ“ لگتی ہے۔

”تم اپنا فیصلہ بتاؤ۔ تم اس سے شادی کرنا چاہتے

ہو یا نہیں، تاکہ وہ کہیں اور کر سکیں۔“
 ”انکل نے عروہ سے پوچھ لیا؟“ پتا نہیں کیسے میری
 زبان سے یہ نکل گیا۔ اف میری زبان۔۔۔ کیسے سلیپ
 ہو جاتی ہے نا۔
 ”تم عروہ کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو۔“
 ”میری بات۔۔۔“

”ہاں تمہاری بات۔۔۔ کیا تم دوبار سننے لگے ہو۔۔۔
 بہرے ہو گئے ہو تم کیا۔۔۔“ پیانے نہیں کیا کیا کہہ رہے
 ہیں۔ مجھے تو کچھ سنا ہی نہیں دے رہا۔
 ”سن رہے ہو مجھے؟“ پیانے میری آنکھوں کے
 سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔

”میری بات یہ ہے کہ جو عروہ کا فیصلہ ہو گا وہ مجھے
 منظور ہو گا۔“ مجھے اپنی زبان کو کھٹ ڈالنا چاہیے۔ ایسی
 سلہنگ تنک کو رکھ کر کیا کرنا ہے۔
 ”اچھا۔۔۔“ پیانے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر وہ
 مسکرانے لگے۔

یہ پیانے آخر کیوں مسکرا رہے ہیں۔ ارے میں بھی
 مسکرا رہا ہوں لیکن کیوں؟ اوہ میرے خدایا! یہ میں نے
 کیا کر دیا۔



اپنے ڈریسز کا غم کیسے میں نے کم کیا یہ میں ہی
 جانتی ہوں۔ میرا خیال تھا اب وہ بڑا ہو گیا ہو گا لیکن
 کشف کے نکاح میں جو اس نے کیا اس نے اس کی
 ساری تیز بد تمیزی میں بدل دی۔ یہاں تک بھی سب
 ٹھیک تھا، اچھا ہی ہوا کہ اس نے منگنی توڑ دی۔ اس
 میں منگیتربنے رہنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ تھا کیا
 اس میں؟ میں بہت مطمئن ہوں۔ ممی میرے روم میں
 آئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا۔

”تمہیں عمار پسند نہیں ہے؟“

”نہیں!“ میں نے فوراً ”کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم یونیورسٹی جاؤ۔ اپنی اسٹڈی
 مکمل کرو، پھر ہمیں سوچ کر بتا دینا۔“
 ”لیکن میں بتا چکی ہوں۔“

”ابھی نہیں۔ ابھی تم چھوٹی ہو۔“

”اس سے زیادہ چھوٹی تھی جب آپ نے میری منگنی کر دی تھی۔ اب تو کافی بڑی ہو چکی ہوں اب منگنی ختم کر دیں۔“

”ہو گا وہی جو تم چاہو گی۔ کوئی زبردستی نہیں ہو گی۔ ہم نے اپنی طرف سے اچھا فیصلہ کیا تھا لیکن خیر تم وقت لے لو۔“

”وقت لینے سے کیا ہو گا؟“

”وقت اور تجربے سے بہت سی باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں اور بہت سے لوگ اچھے لگنے لگتے ہیں۔“

”اچھا اور وہسہ ہو نہسہ۔“ میں نے دل میں سوچا۔ میں نے راسخا کو بتا دیا کہ میری منگنی ٹوٹنے ہی والی ہے بس۔

”گٹھ۔ مبارک ہو۔“ اس نے دانت نکالے جو مجھے بہت برے لگے۔

”کسی کی منگنی ٹوٹ رہی ہے اور تم مبارک باد دے رہی ہو؟“

”تو اور کیا کہیں؟“ تمہیں وہ پسند نہیں۔ تم اس سے نفرت کرتی ہو۔ ایسے انسان سے جان چھوٹنے پر تمہیں مبارک باد نہ دوں؟

”نہ دوس۔ ہمارے یہاں یہ روایت نہیں ہے کہ منگنی ٹوٹنے پر مبارک باد دی جائے۔“ مجھ پر ابھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ ہمارے یہاں یہ روایت نہیں۔

”روایت۔“ وہ بڑبڑانے لگی اور اس کا منہ بن گیا۔ بنا رہے منہ کم سے کم اسے بات کرنے کی تمیز ہونی چاہیے۔ چند دن گزرے تو یہی راسخا اپنے ایک کزن کے بارے میں مجھے بتانے لگی۔ میں جانتی تھی اس کے کزن کو مل بھی چکی تھی کئی بار۔

”یہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔“ ساری بات بتا کر اس نے اپنی طرف سے بہت سربراہی دینے والے انداز میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

اس کا کزن بھی اچھا تھا اور یہ بھی اچھا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتا تھا لیکن مجھے یہ سب جان کر اچھا کیوں نہیں لگا۔ حیرت انگیز طور پر میں نے فوراً ”راسخا کے کزن کو

مسترد کر دیا۔

”تم عمار کو پسند کرتی ہونا؟“

”نہیں مجھے نفرت ہے اس سے؟“

”پھر میرے کزن کے لیے انکار کیوں کر رہی ہو؟“

”کیونکہ تمہارا کزن مجھے پسند نہیں۔“

”میرے کزن میں ایسی کیا خالی ہے؟“

”خالی کا مجھے نہیں معلوم بس وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔“

”بغیر خالی کے کوئی کیسے بُرا لگ سکتا ہے۔“

”لگ سکتا ہے۔ جیسے مجھے تمہارا کزن۔“

”تم اپنی منگنی توڑنا ہی نہیں چاہتیں۔“

”میری منگنی ٹوٹ چکی ہے اب بس اس کا یا قاعدہ اعلان ہونا ہے۔ مانا نے کہا ہے کہ میں اسٹڈی مکمل کر لوں پھر اعلان ہو گا۔“

”مانا نے اعلان کرنے کے لیے تمہیں اتنا وقت نہیں دیا۔ تمہارا دل عمار کی طرف پھر جائے اس لیے وقت دیا ہے اور وہ پھر چکا ہے۔“

”میرا دل کیا پھر کی ہے؟“

”سب کا دل ہی پھر کی ہوتا ہے۔ مجھے سائنس دان بننا تھا لیکن اب میں آرٹس پڑھ رہی ہوں دیکھا میرا دل پھر کی۔“

”دل پھر کی۔ دل پھر کی۔“ اف کانوں میں یہ فقرہ گونجتا رہا لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ خاندان سے میرے لیے چند پروپوزل بھی آئے ظاہر ہے سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ عمار نے کشف کے نکاح کی تقریب میں کیا کہا ہے۔ می نے انہیں فی الحال ٹال دیا کہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جب وہ پروپوزل والی فیملی آئی تو میں اپنے کمرے میں خوف سے چھپ گئی۔

کیسا خوف؟ مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔ ”میں ڈر کیوں رہی ہوں؟“ میں خود سے پوچھنے لگی۔

”تم ایک دم سے کیسے بیمار ہو گئیں ضرور تم نے اپنی اسٹڈی کی ٹینشن لی ہے۔“ می میرے ایک دم سے بیمار ہو جانے پر حواس باختہ سی ہو گئیں۔ میں خود

بہی حواس باختہ ہی تھی کہ میں ایک دم سے بیمار صرف اس لیے ہو گئی کہ میرا خاندان سے ایک رشتہ آیا ہے لیکن آخر کیوں میں خوف زدہ ہوں؟ کیوں؟ اس سے زیادہ خوف زدہ میں اس وقت ہو گئی تھی جب میرا آخری پیر تھا۔

”لوگ ایگز مزی سے فارغ ہوتے ہیں تو مزے کرتے ہیں، تمہیں ڈرپ پر ڈرپ لگ رہی ہے۔“ میری فریڈ ز مجھے تنگ کر رہی تھیں۔

میں مزے کیوں نہیں کر رہی؟ کیا وجہ ہے آخر؟ ”بیٹا تمہارے انکل پوچھ رہے ہیں کہ عروہ کا کیا فیصلہ ہے؟ ممی ایک دن میرے پاس آئیں اور نرمی سے پوچھنے لگیں۔ اوہ تو یہ وجہ تھی لیکن یہی وجہ کیوں تھی؟ میرے ہاتھ میں ایک فوٹو البم تھا جسے میں دیکھ رہی تھی۔ ”مرد وہ لوگوں کا فوٹو سیشن۔“

”کیسا فیصلہ؟“ میں جانتی تھی کہ وہ کیا پوچھ رہی ہیں لیکن پھر بھی میں نے پوچھا۔

”عمار تمہیں پسند ہے یا نہیں؟“

”نہیں وہ مجھے نہیں پسند۔“

ماما نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ اچھی طرح سوچ لیا ہے نا؟

”اچھی طرح تو نہیں سوچا لیکن۔۔۔“



ہم پاکستان آچکے ہیں۔ بارات لے کر جا رہے ہیں۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میں نے اس شادی سے انکار کیوں نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں خوش ہوں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ مجھے خوش ہونا بھی ہے یا نہیں۔ میں خوش کیوں ہوں، کیونکہ میری شادی ہو رہی ہے یا اس لیے خوش ہوں کہ عروہ نے شادی سے انکار نہیں کیا۔ ویسے اس نے شادی سے انکار کیوں نہیں کیا۔ یہ بات مجھے خوف زدہ کر رہی ہے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں، کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ وہ عین نکاح کے وقت انکار کر دے گی۔ جیسے میں نے مائیک پر جا کر منگانی کے ٹوٹے کا اعلان کیا تھا۔

ایسے ہی وہ کرے گی لیکن نہیں اس نے نکاح کے وقت انکار نہیں کیا، بلکہ اب تو وہ میرے ساتھ آکر بیٹھ چکی ہے۔

”تو اب یہ ضرور رخصتی کے وقت بھاگ جائے گی۔ ہاں یہ ہی کرے گی۔“ میں نے اسے دیکھا، وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی ہے۔ اس کا چہرہ بھی میری طرح پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خوف ہے۔ وہ بھی ڈری سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

”تم ایسے مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ میں نے اپنا خوف دبا کر پوچھا۔

”تم ابھی بھاگ جاؤ گے نا؟“ اس کی آواز کانپ رہی ہے۔

”نہیں! لیکن تم ایسا ضرور کرو گی۔“ میری بھی آواز کانپ رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ پٹ پٹ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں بھی پٹ پٹ اسے دیکھ رہا ہوں۔

”تم نے شادی سے انکار کیوں نہیں کیا؟“ میں نے الٹا اس سے پوچھا۔

”نہیں بیوی بن کر ساری زندگی تمہیں سزا دینا چاہتی تھی۔“ اس کی آنکھوں سے سارا خوف، دسو سے رخصت ہو گئے اور اس نے دلیری سے کہا۔

”اب تم بتاؤ۔۔۔“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ساری کی ساری سمٹ کر مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

”میں شوہر بن کر ساری سزا میں بھگتنا چاہتا تھا۔“ میں نے بھی اسی کی طرح دلیری سے کہا اور اپنی آنکھوں کو اس پر سمیٹ کر مرتکز کر دیا۔ میں کوئی اس سے ڈرتا تھا جیسے وہ مجھ سے نہیں ڈرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے، ہم دونوں ایک دوسرے سے نہیں ہارتے۔ ہم دونوں بچپن سے اب تک ایک تعلق میں بندھے رہے ہیں۔ ہم دونوں کو اب بڑھاپے تک بھی ساتھ رہنا چاہیے۔ ہے نا؟



Downloaded From
Paksociety.com

آئینہ ملک

ہزاروں حکایتیں

ہوا اور ہمیں کیا ملا، صلاحیت کالالی پاپ سوہ بھی پیپر ز سے عین دو دن پہلے اور افسانہ بھجوانے کے ٹھیک دو ماہ بعد۔ اب بندہ کیا پوچھے اور کیا بتائے۔ یہ قصہ زیادہ نہیں بس دو چار سال پرانا ہے درمیان میں وقفہ ہماری پڑھالی اور کچھ ہماری معصوم سی خود ساختہ ناراضی کی

”آپ کا افسانہ پڑھ لیا ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ آپ مزید کچھ اور لکھیں۔ یہ افسانہ تو شائع نہیں ہو گا۔“ اللہ جھوٹ نہ لکھوائے تو ہم نے اس مہسج کو پہلی بار پڑھتے ہی ڈیلیٹ کر دیا۔
!!! حد ہو گئی یعنی کہ یہ افسانہ بھی روی کی نوکری کا رزق

ماہنامہ شعاع فروری 2016 95

READING
Section

وجہ سے آیا مگر اب ہم بھی ڈھیٹ ہو چکے ہیں۔ ہر دفعہ ناراض ہونے کے بعد پھر سے کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔



پہلی بار ہم نے خط لکھا۔ ہمارا خط سراہا گیا۔ ہمیں عقلمند قارئین میں عقل مند ترین کا خطاب ملا۔ پھر یہ ہوا کہ کہانیوں کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرتے کرتے ہمیں لگنے لگا کہ فلاں کا اینڈ ایسے ہونا چاہیے تھا اور فلاں کا ویسے اور کبھی کوئی ٹاؤٹ پڑھ کے لگتا یہ خیال تو ہمارے ذہن سے بھی گزرا تھا۔ پھر افسانے پڑھتے پڑھتے گمان ہونے لگتا۔ ارے یہ تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں۔ پھر کیا تھا کتنے ہی پلاٹ سوچے جاتے اور ریجمنٹ کے جاتے کاغذ قلم تک نوبت نہ آتی۔



نویں جماعت میں تھے کہ پہلا افسانہ لکھ ہی ڈالا اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو وہ ڈائجسٹ کی تاریخ کا سب سے مختصر مگر جامع افسانہ ہوتا اگر جو شائع ہوتا۔ ان دو صفحوں میں ہیرو اور ہیروئن کے ملنے سے پکھڑنے اور نئے ہیرو کی انٹری سے اس کے ساتھ ہیروئن کی ہستی بستی زندگی۔ سب ہی کچھ تھا لکھ کر تنقیدی جائزہ لیا کچھ زیادہ ہی ”کم“ لگا۔ خیر افسانہ تو ہوتا ہی جھوٹا ہے۔ نسلی وی اور افسانہ بھیج دیا۔ پھر کئی مہینے اس کے شائع ہونے کا انتظار کرنے کے

بعد انا اللہ پڑھ کے ایک طرف ہو گئے۔ اگلے تین سال تک بندہ بن کر پڑھائی کی (رسالوں کی) اور پھر میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہونے کی خوشی میں ایک اور افسانہ لکھا۔ وہ تھا تو افسانے جیسا پر اس کے اینڈ میں جب ہمیں کوئی محبوب نہ ملا تو ”جنت کے پتے“ کو محبوب بنا دیا۔ اس بار جواب آیا کہ ”اس طرح کے افسانے شائع نہیں ہو سکتے۔“

اکلی دفعہ نئے جوش و ولولے کے ساتھ یونی میں ایڈمیشن لیتے ہی نیا افسانہ لکھ ڈالا۔ جواب ملا۔

READING
Section

”اس میں صیحت زیادہ ہے۔ آپ کی عمر کم ہے۔ آپ کوئی ہلکی پھلکی تحریر لکھ کر بھیجیں۔“ گل ہی ملک گئی اور ساتھ ہی لالی پاپ کہ آپ میں صلاحیت ہے آپ کسی اور موضوع پر لکھیں۔

اب بندہ کیا پوچھے اور کیا بتائے۔ خیر ہم نے بتایا کہ ”ہم نے جو کچھ شعاع سے سیکھا وہی لکھا ہے۔“ جواب ندادرو۔

پھر پوچھا ”شعاع کا دفتر کراچی میں کیوں ہے؟“ فٹ جواب آیا ”کیونکہ شعاع شائع کرنے والے کراچی میں رہتے ہیں۔“

ہم نے بتایا ”ہم کراچی آگئے ہیں۔ کبھی تو آپ کے دفتر ضرور آئیں گے (اور آپ کی ردی کی ٹوکری چرالا میں گے) جس میں ہمارے اور ہمارے جیسی بہت سی قاری بہنوں کے اوہورے ارمان (مصنفانہ بن سکنے کے) موجود ہوتے ہیں۔ ہم سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہے۔ ان کا ٹھکانا ٹھک ”موسٹ ویلکم“ آیا۔



اس دن ہم بہت خوش خوش گھر لوٹے جی بھر کر رسالے پڑھے۔ پھر سوچا اب تو ہم محبت پر لکھیں گے۔ پر کیا کرتے ہم نے تو آج تک صرف محبت کو پڑھا ہی پڑھا تھا اور جو پڑھ کر لکھا تھا وہ تو ناقابل اشاعت ٹھہرا تھا پھر سوچا۔

تجھ سے بننے والے اے آسمان نہیں ہم ہم بھی محبت کے بارے میں لکھیں گے۔ ضرور شائع ہو گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کس کی محبت کے بارے میں کس سے محبت کے بارے میں؟

سب سے پہلے اپنی بہترین مصنفین کو ذہن میں لائے۔ جی! نمرہ احمد اور عمیدہ احمد ان کے سارے ٹاؤٹ گھول کر پی لینے کے باوجود نہ تو ہم ان جیسا ہیرو اپنے تخیل میں لا سکے نہ ہیروئن اور الفاظ تو ویسے بھی ہمیں اپنے لکھنے تھے ہم کوئی نقال تھوڑی ہیں۔ عینہ سید، آسیہ رزاقی، راحت جبین، بشری سعید اور دیگر معزز مصنفین کے جیسا بھی ہمیں پتا تھا ہم نہیں لکھ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سکتے۔

آج کل کی مصنفین سمیرا حمید، سمیرا افضل، مصباح، ایدل رضا، جیسا لکھنا بھی ہمارے اختیار سے باہر پھر بھی سوچا لکھنا تو ہے۔ کسی کو پسند آنے جو گانہ سہی ڈائجسٹ میں شائع ہونے جو گانہ۔

خیال آیا اپنے ارد گرد سے کسی کی محبت کو قیامت کی نگاہ سے ٹاڑتے اور اپنے لفظوں کا لباس پہنا کر کاغذ کی زینت بنا دیتے ہیں۔ بس اتنی سی بات تھی ہم ایویں ہی پریشان ہو رہے تھے۔



سب سے پہلے اپنی بہن کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا آخر ان کا ایک عدد جائز منگیتر ہے۔ یہ کیا ان کی سوچ تو ان کی بکس سے لے کر بکس پر ختم ہوتی نظر آتی۔ ویسے بھی ان دنوں وہ بورڈ کے ایگزامز میں مصروف تھیں۔

پھر بھیا کی محبت کا جائزہ لیا۔ ہاں بھئی! یہ ٹھیک ہے۔ پھر ان کی منگیتر کو دیکھا۔ ان کی منگنی کے حالات یاد کیے کہ کس طرح انہوں نے اماں کو اور اماں نے ابا کو واسطے دے کر منگنی کے واسطے راضی کیا تھا۔ واہ جی واہ! مل گیا افسانہ۔ لکھا، بھیجا اور پھر وہی بے تحاشا انتظار، خان لیوا انتظار۔



اب ہم نے باقاعدہ دھمکایا کہ اگر شعاع کا دفتر ملتان میں ہوتا تو ہم وہاں آ کر فرش گھسا دیتے، جواب ندارد۔

خیر سب کو مار جن دینا ہمارا مشغلہ ٹھہرا۔ ہم صبر سے انتظار کرتے رہے، پھر ہماری چھٹی جس نے ہمیں خبردار کرنا شروع کیا ہونہ ہو ردی کی ٹوکری اس دفعہ بھی ہمارا حق غصہ کر گئی۔ خیر غلطی بھی ہماری تھی۔ ہم نے نہ برتانا سمجھا اٹھا کر لکھ دیا۔

”محبت کیا دیتی ہے؟ بے خودی، بے پروائی، بے نیازی اور کبھی کبھی بے عزتی بھی یعنی ہر وہ چیز جو بے تحاشے شروع ہو۔ بے جو نفی کی علامت ہے۔ کیا محبت

واقعتاً ہر چیز کی نفی کر دیتی ہے۔“

حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم نے تو اردو سیکھی ہی ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے تھی اور پھلے ہماری عمر کم ہو۔ ہم نے شعاع اور خواتین تو بہت زیادہ پڑھے ہیں۔ پھر بھی لوگ ہماری ذہنی پختگی پر اعتبار نہ کریں، ہک ہا۔ ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے (بس اپنے الفاظ یاد کر کے ذرا جذباتی ہو گئے تھے)۔



ہماری چھٹی جس کا کہا درست نکلا۔ صبح صبح شعاع کا جو پیغام موصول ہوا وہ تو ہم آپ کو پڑھوا ہی چکے ہیں۔ اب ہم اپنے الفاظ کو بریں چکے۔ اس جذبے کو جسے سب محبت کہتے ہیں محسوس کریں گے اور پھر افسانہ لکھیں گے۔ ہم نے تصور میں ردی کی ٹوکری کو لاتے ہوئے سوچا۔ اور اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں۔ سب سے پہلے خاندان پر، بھئی ”اول خویش بعد درویش“ پر نہ جی، اول تو ہم سے بہت بڑے یا چھوٹے لڑکے موجود تھے اور اگر کوئی برابر کا تھا بھی تو انکی جگہ

ہیوشی وکمن کا تیار کردہ

Herbal

سوناہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



اس کے استعمال سے چند دنوں میں منگنی ختم ہو کر تے ہوئے ہوں گے اور وکنا ہے کہ ہوں گے کو منہ اور پتلا رہتا ہے کہ

قیمت - 200/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور منی آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں - 250/- روپے، تین بوتلیں - 350/- روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکل چارج شامل ہیں۔

بزرگ پتلا اک سے منگوانے کا ہے

ہائی بکس 53، اورنگزیب روڈ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔

بہن خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر 32216361

سیرے اور باقی سب کو اگلے دن جب میم کنزی حاضری لینے لگیں تو رول نمبر 12 یہ تو اتنا سڑا ہوا ہے۔ ہاں بلایا ہاں رول نمبر 16 یہ تو اتنا لمبا ہے اب بندہ میٹر می لگائے کیا؟ رول نمبر 18 یہ تو مغرور ہی اتنا ہے جیسے پورا ڈیڑھ ٹنٹ اس کے کندھے پر کھڑا ہے۔ غرض اسی طرح ہم نے ہر بندہ رہجھکٹ لگیا۔

جو چار پانچ لوگ سورا معقول لگے تو ان میں سے ایک کو تو لڑکیوں سے بات کرنے کی ہی تمیز نہ تھی تو تڑاک کر کے بولتا۔ دوسرے کا نام میرے بھیا جیسا لگتا جیسے کلاس میں بھی بھائی موجود تیسرا کلاس کا ہینڈ سم ترین لڑکا اور سنگر خیر اس پر تو ہر لڑکی کا کرش تھا۔ ہم کیونکر ایسے مقبول ترین لڑکے کے لیے خوار ہوں اور پھر کلاس فیلوز اب جتنے بھی اچھے بن چکے ہوں۔ گروڈ، ویل ڈریسٹہ ان کا پہلے دن والا اجڈ پن بھلا کر ان کے مارکس سے حیرت ہوئے ان کی معلومات سے متاثر تو ہوا جاسکتا ہے۔ ان سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے ہم کلاس کے جتنے لڑکوں سے متاثر تھے انہیں بھی اس فہرست سے نکال دیا۔ اب کیا بچا؟ میرا مطلب ہے کون بچا؟



یوں ہمارا آخری آپشن بھی ختم ہوا۔ اب ہم کیسے اور کب کسی کی محبت میں مبتلا ہوں گے؟ یا پھر کب اس مفروضے (محبت، مصنف، بننے کی لازمی شرط ہے) کو کالعدم قرار دیں گے۔ ہم نہیں جانتے۔ مگر جب بھی ایسا ہوا۔ ہم ایک اور افسانہ لکھیں گے۔ جس میں ہم ردی کی نوکری کی شراٹگیز یوں کی تفصیل لکھیں گے۔ اور اس کا نام ہو گا۔ ردی کی نوکری یا پھر ناکام مصنف۔



پھر محلے پر نظر دوڑائی۔ سامنے والے گھروں میں تو سارے انکلیز اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے ساتھ والا۔ ہم عمر تو ہو گا پر کلاس میں پیچھے تھا اور پیچھے والے انتہائی پچھورے۔ بہت سوچنے کے بعد ہم نے دو گلیاں چھوڑ کر رہنے والی اپنی سہیلی کے بھائی کے متعلق سوچا۔

چند دن بعد اس سے ملے، باتوں باتوں میں بھائی کا تذکرہ ہوا۔ کہنے لگی ”وہ اپنی کلاس فیلو میں انٹر سٹڈ ہے اور اماں جان اپنی بھانجی میں ”مصد افسوس“ ہم اور کیا کہتے۔ ہمیں تو اپنا افسوس تھا۔

پھر ہم نے اپنی ڈھارس بندھائی کہ ہم کون سا بچہ اس کی ہیروئن بننے والے ہیں صرف یہی تو محسوس کرنا ہے کہ جب محبت ہوتی ہے تو اندر کا خوش گوار موسم باہر کے جنس کو کس حد تک کم کرتا ہے۔ ایسے میں اے سی چلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ حرکت پھر بھی معیوب لگی سو ہم نے سہیلی کے بھائی کو بھی اس فہرست سے نکال باہر کیا۔ بھئی کسی کی محبت میں مبتلا ہونے کی کوشش نا معقول تو ہے ہی مگر کسی اور کی محبت سے محبت تو معیوب بھی ہے۔



اب صرف ایک option (آپشن) ہی رہ گیا تھا جو ہم نے ناگزیر حالات میں استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ آپ سمجھ گئے، نہیں! چلو ہم بتاتے ہیں۔ ہمارے کلاس فیلوز۔ ویسے تو ہم ان کے بارے میں سوچنے کے مکمل طور پر خلاف ہیں۔ کیونکہ ہیرو کبھی بھی ہیروئن کا ہم عمر نہیں ہونا چاہیے (ذاتی خیال) پر بتایا نا، ہم ہیروئن نہیں، مصنفہ بننا چاہتے تھے وہ بھی محبت کی۔

تو بس، روزین! ہاں یاریہ ٹھیک ہے۔ ہنستا بھی تو کتنا ہے۔ پر یاریہ تو شکل سے ہی معصوم سا بچہ لگتا ہے۔ اور یہ موٹو اس کے لو کال پہ چسکی بھرے ”بندہ“ یلو جی یہ دو لوگ تو ہم نے خیالوں میں ہی رہجھکٹ کر

آسمیہ زاتی

سحر مری ہو

خالہ بی اس وقت ہاتھ روم میں تھیں۔ اور
دروازے پر دستک کسی بے قرار رنج کا اشارہ کر رہی
تھی۔ گھنٹی بھی ساتھ ساتھ میوزک کا کام دے رہی
تھی۔ ویسے تو گھنٹی کی آواز ہاتھ روم میں بھی سنی جاسکتی
تھی آسانی سے۔ لیکن۔ اگر خاموشی ہو تو خالہ بی
جب کسی سے گفتگو کر رہی ہوں تو باہر کی آواز سننے
سے قاصر اور دروازہ بدرجہ مجبوری۔ اسی کو کھولنا
پڑا۔ یہ بھی خیال کہ دستک دینے والا نہ جانے کتنا

زندگی سے اندازہ ہی نہ تھا اتنی مشکل ہوگی۔ ہر لمحہ
امتحان سے سابقہ ہوگا۔ اور پتا چلتا ہی نہیں کہ اس کا
رزلٹ کب آئے گا۔ انتظار بھی حوصلہ شکن ہے۔
رزلٹ کے انتظار میں کہیں سارے جذبے ہی نہ
سو جائیں۔ کم سنی میں ہی اتنے تجربات ہوئے۔ یقین
ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ بھی
امتحان ہے۔ تو اس کا رزلٹ۔ کیسا ہوگا؟ یا پھر۔
سب بے نتیجہ۔

مکمل ناول

Downloaded From
Paksociety.com





Downloaded From
paksociety.com

READING
Section

ضروری پیغام لایا ہو۔ پھر خالہ بی کی ڈانٹ اسے ہی سنی پڑے گی۔ دروازے پر شناسا صورت نظر آئی۔
 ”اوہیلو۔ آہا۔ تم کیسے؟ آجاؤں؟“ مختصر سوال۔
 ”ہاں۔ آجاؤ۔“ بدرجہ مجبوری اجازت دی ورنہ خالہ بی کی ڈانٹ کون سنتا کہ گھر آئے مہمان کو بھگا دیا۔ برکت سے منہ موڑ لیا۔ رحمت کو دھتکار دیا۔
 ”تمہارے ہاں سلام کا رواج نہیں؟“ تسخراڑا رہا تھا۔ اس کی شکل کا جو بارہ بج رہی تھی۔ وہ بھی رات کے بارہ۔

”سلام۔ اب خوش؟“ وہ کب خوش تھی۔
 (ارے لڑکے کو بلا کر بٹھا لیا۔ اکیلا لڑکا۔ شرم و حیا تو گھول کر پی لی۔ میں آجاتی۔ کھول دیتی دروازہ اور اگر کوئی ڈاکو ہوتا۔ صبر نہیں ہے آج کل کی لڑکیوں میں۔ ارشادات خالی ملی)

”تمہارے گھر میں خاطر تواضع کا بھی دستور نہیں ہے۔ اتنی گرمی میں آیا ہوں۔“ اسے یوں ہی استہانہ دیکھ کر حیران ہوا۔

”اچھا۔“ کہہ کر اندر گئی۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس پکڑ لیا۔

”یہ۔ آواز کس کی آرہی ہے۔ کوئی مہمان آیا ہوا ہے کیا؟“

”نہیں۔ خالہ بی ہیں۔“
 ”پتا ہے۔ تم اکیلی ہو تیں تو بھلا دروازہ کھولتیں؟ کس سے باتیں کر رہی ہیں؟“

وہ چپ رہی۔ گلاس خالی ہونے کا انتظار تھا۔
 ”بتاؤ نا۔ کون آیا ہوا ہے؟ تمہارے سسرال والے؟ یا بتانا نہیں چاہتیں۔“

وہ ہاتھ برہائے کھڑی تھی گلاس لینے کے لیے۔ ہاتھ گرا کر سامنے کرسی پر ڈٹ گئی۔
 ”ابھی آتی ہیں۔ خود پوچھ لینا۔“

”تم بتا دو گی تو قیامت آجائے گی؟“ انگارے چبارہا تھا۔ (ہاں شاید۔ آج بھی سکتی ہے۔ بتا دوں تو کیا سمجھے گا اور خالہ بی کو پھرتائے گا۔)

”تم چاہتے ہو کہ آجائے۔؟“

قیامت نہیں۔ خود خالہ بی آگئیں۔ بولتی باتیں کرتی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا۔

”آئیں؟ اچھا؟ تم کب آئے؟“ وعلیکم السلام۔ کتنی دیر سے بیٹھے ہو؟“ ترچھی نظر بھانجی پر بھی ڈالی۔ مطلب (نہیں مانا تم نے۔ کھول دیا دروازہ۔ کتنی دفعہ کہا ہے۔ یہ وہ)

”ابھی دو منٹ پہلے۔ گرمی بہت ہے باہر۔ اس لیے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ وہ کھل گیا کھٹ سے۔ آپ کو آواز دی تو تھی۔“ جھوٹ کے طومار باندھ رہا تھا۔

”آ۔ رے۔ ہاں۔ کبخت کی چٹخنی ڈھیلی ہو گئی ہے۔ زور زیادہ لگایا ہو گا۔“

”مگر خالہ بی۔ خطرناک بات ہے۔ کوئی بھی زور لگا کر آجائے۔ ٹھیک کروالیں۔“

”میرے پاس کون بیٹھا ہے جو ٹھیک کروالے والے کو بلواؤں اور کس کی مجال ہے کہ میرے دروازے کے پاس آکر بھٹکے بھی۔ جان نہ نکال لوں اس کی۔ ٹیڑھنی نظر بھی کسی نے دروازے پر ڈالی۔ سمجھو۔ اپنی

شامت کو آواز دی۔ اچھا خیر۔ تم بتاؤ۔ کیسے آنا ہوا۔ رفیعہ کیسی ہے اور وہ کیا نام تمہاری شیخوپورے والی بہن۔“

”سب ٹھیک ہیں۔ امی نے آپ کی خیریت پوچھنے بھیجا ہے اور یہ۔“ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لمبا سالفافہ نکالا۔

”یہ کیا ہے؟“ ناک چڑھالی۔ ہاتھ نہ برہایا۔
 ”یہ۔ مراد بھائی امریکہ سے آئے ہیں۔“

”اے مراد وہی نا۔ تمہارا چچا زاد جو اپنی گلاس فیلو کو پسند کرتا تھا۔ اس کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ نا مراد امریکہ چلا گیا۔“

”جی! تو ضرار بھائی نے آپ کے لیے خط بھیجا ہے۔ خط اور ڈالر بھی ہیں۔“

خالہ بی تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ”اچھا۔ کیا سمجھا ہے

ہیں۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہم دیکھا کرتے تھے۔ آپ چیونٹوں سے خوب باتیں کیا کرتی تھیں۔ مینڈک بھی آپ کے آس پاس گھوما کرتے تھے۔ ”اعزاز کو بچپن کی باتیں یاد ہیں؟“

”ہٹ شریر۔ برسات میں کیڑے مکوڑوں کا راج ہوتا ہے اور کیچوے تو برسات میں ہی نکلتے ہیں مگر یہ جو ہاتھ روم کی ٹالی ہے یہاں بارہ مہینے برسات رہتی ہے۔ اس لیے۔“

شریوت آگیا۔ خوب ٹھنڈا میٹھا۔ لذیذ۔
”اچھا خالہ بی! چلتا ہوں۔ ثریا کی شادی پر ضرور آئے گا۔“

”اچھا۔ کہاں ہو رہی ہے۔ اللہ نصیب والی کرے۔“

”کارڈ چھپ جائیں تو بھیجیں گی امی! چلتا ہوں خالہ۔ السلام علیکم۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ خالہ بی غالباً ”کیچوے کی اچھل کود سے خاصی تھک گئی تھیں۔ بیٹھی رہیں۔ صبح سے کہا۔“

”جانبیٹا۔ دروازہ اچھی طرح بند کر کے آنا۔“
یعنی۔ اسے دروازے تک جانے کی اجازت۔

مجھے میں فقیر ہوں محتاج ہوں جو خیرات لیتی پھوں۔
لے جاؤ لفافہ اور کہنا مراد سے۔ ابھی میں اتنی محتاج نہیں ہوئی۔ شکر ہے پروردگار کا۔ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ میری تمام ضرورتیں حاجتیں وہی پوری کر دیتا ہے۔ اسے لے جاؤ۔ لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

”خالہ بی! خط تو پڑھ لیں۔ شاید کوئی ضروری بات۔“

”خط کیوں پڑھوں؟ جب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو اس لفافے کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں۔ جابیٹا۔ گھر جا اور اس سوغات کو بھی ساتھ لے جا۔“

”اچھا۔ اچھا۔ جاتا ہوں۔ چھوڑیں لفافے کو۔ گرمی بہت ہے۔ کوئی ٹھنڈا شریوت مل سکتا ہے۔“

”ہاں ہاں۔ اے کیوں نہیں۔“ خالہ بی کے چہرے کے تاثرات یکدم تبدیل ہوئے۔

”صبح۔ اے یہ نہ ہوا سچے کو شریوت ہی پلا دیتی۔ گرمی اس بلا کی ہے۔ انار کا شریوت برف ڈال کر لے آ۔ شاہش۔“ اب ظاہر ہے اٹھنا پڑا۔ کتاب میز پر رکھی۔ خالی گلاس اٹھایا اور باہر چل دی۔

”آپ ابھی میں آیا تو کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔“ افوہ تجسس۔

”اے۔ ہاں۔ وہ ہاتھ روم میں ایک کیچوا گھس آیا۔ اس کو ہی کہہ رہی تھی کہ بھٹی۔ بھاگ جانا لی کے رستے۔ جدھر سے آیا ہے۔ مگر ڈھیٹ ایسا۔ اے ایسی اچھل کود بچائی۔“

”اچھا تو پھر کیا کہتا تھا۔ جائے گا کہ نہیں؟“
”لو۔ وہ کیا بولے گا۔ میں ہی بول رہی تھی۔ ہرگز نہیں گیا۔ کونے میں سکڑا پڑا ہے۔ اب میرے گانگوڑا۔ جب ہاتھ روم میں کوئی کیچوا آجائے۔ سمجھ لو اس کی موت لے آئی ہے یہاں۔ جسم کے ذرا ذرا سے ٹکڑے نامراد جدھر سے گزرتا ہے گراتا جاتا ہے۔ پس۔ پھر اگلے دن دیکھو مرا پڑا ہے۔“

”اے خالہ بی! آپ کیڑے مکوڑوں پر اتھارٹی

بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناولوں پر

40% رعایت

یہ رعایت صرف ہماری دکان

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی پر دستیاب ہے

دروازے کے پاس پہنچ کر اعزاز نے جیب سے وہی لفافہ برآمد کیا۔

”لو۔ یہ رکھو۔ اس میں خط بھی ہے بڑھ لینا۔ شاید کوئی کام کی خبر ہو۔“ اصباح اچکچا کر لفافہ پکڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں کیوں پڑھوں۔ اپنی اماں کو لکھا ہو گا۔“

”اچھا تو وہیں کہیں رکھ دینا۔ بڑھ ہی لیں گی اور تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو؟ حالت دیکھو اپنی۔ سسرال والے دیکھیں گے تو سمجھیں گے۔ خالہ بی فافے کرائی ہیں۔“

”وہ۔ اصل میں امتحان کی تیاری کے لیے جاگنا پڑتا ہے۔ اس لیے۔“

”بھئی، ہم تو امتحان کے زمانے میں خوب ڈٹ کر کھاتے تھے اور جی بھر کر سوتے تھے۔“

”اچھا!“ حیران ہو گئی۔

”ہاں اور کیا، جب بھی رات کو پڑھنے بیٹھتا۔ امی دودھ کا گلاس رکھ دیتیں وہ پیا اور وہیں میز پر سر رکھ کر۔“

”کیسا جاگنا۔ کہاں کا پڑھنا۔“

وہ منتظر تھی کہ وہ باہر جائے تو دروازہ بند کرے، مگر اعزاز ایک باتولی۔ واپس آئی تو خالہ بی نے سر اٹھا کر کہا۔

”اتنی دیر کیوں لگی۔ باتیں کرنی تھیں تو یہیں کر لیتیں۔ بتاؤ۔ کیا کہہ رہا تھا۔“ تحقیقات ضروری۔ اس نے جھٹ لفافہ سامنے کیا۔ ”یہ۔ یہ دے رہے تھے۔ میں نہیں لے رہی تھی۔“

سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ سرد آہ بھری۔ ”رکھو اپنے پاس۔ صبح بینک میں لا کر میں رکھ آتا۔ ایک نہیں دو ڈالو۔ سو سو کے چینیج کرالینا۔“

”یہ۔ خط۔“

”پھاڑ دو۔“ آرڈر۔ اور فوری عمل کرنا لازمی۔ ان کے سامنے اس نے پھاڑ کر ڈسٹ بین میں ڈال دیا۔ لمبا سا کاغذ نہ جانے اس میں کیا کچھ لکھا ہو گا۔ معافی تلانی۔ حال چال یا گزارش۔ خط پھاڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ کتاب سامنے تھی۔ بیٹے سے نالاں۔ فون اسی لیے

کنوا دیا کہ اس کی آواز سننے کی خواہش نہ تھی ایک شخص کی خاطر اتنی اہم ضرورت سے پیچھا چھڑالیا۔ اب صوفے پر آڑی سیڑھی لیٹی چھت گھور رہی تھیں۔ ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔ کوئی بات۔ کوئی یاد۔ پتا نہیں کیسی ماں تھیں اور کیا سوچا کرتی تھیں۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ بولنے پر آتیں تو وقفہ نہ آنے پاتا۔

اعزاز نے پرانے محلے میں جہاں اصباح کے والد کا گھر تھا۔ پڑوس میں رہتا تھا۔ اعزاز کی امی سے اصباح کی امی مصباح کی قریبی رشتہ داری تھی۔ وہ لوگ تو اب بھی اپنے اسی گھر میں رہتے تھے ہاں اصباح اب وہاں نہ تھی۔ وہاں کیا نہ تھی بلکہ کہیں نہ تھی۔

اسے تو لگتا تھا۔ اس کا کوئی گھر ہے نہ ٹھکانہ۔

سارے ٹھکانے عارضی ہیں اور خالہ بی بھی تو کہتی ہیں دنیا تو عارضی ٹھکانہ ہے اصل ٹھکانے پر پہنچنے اور خود کو اس اعلام مقام کا جائز وارث ثابت کرنے میں بھی تو اپنا ٹھکانہ ہونا چاہیے۔ یہ تو خالہ بی کی محبت اور اخلاص تھا کہ وہ اسے لے آئی تھیں۔ ورنہ کہاں جاتی۔ اعمال کی درستی کی کوشش بھی کرتی تھی۔ خالہ بی کی ہدایت کے مطابق۔ جتنا اس کی سمجھ میں آتا تھا۔

لڑکوں سے بالکل بات نہیں کرنی۔ لڑکوں کو نظر انداز کر دینا۔ لڑکیوں کا زیادہ بولنا چچ کر بات کرنا برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ گھر میں بھی خاموش رہتی۔ کہیں جاتی چپ کا روزہ رکھ کر۔ کوئی مہمان آتا اس کے سامنے بت بن جاتی۔ گونگی کا کردار بہت اچھے طریقے سے ادا کرتی۔ کوئی اعتراض کرے تو خالہ بی اس کے سامنے ڈھال بن جاتیں۔ یہ تو کبھی نہیں جانتیں کہ ان ہی کے فرمودات پر عمل کر کے وہ گونگی بنی ہے۔ فوراً کہتیں۔

”اے بھئی، اچھا ہے۔ خاموشی بہت بہتر ہے۔ بندہ گناہوں سے بچا رہتا ہے اور لڑکیوں کو باتیں بنانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ گھر میں بڑے ہیں وہ ہی بولنے کے لیے کافی ہیں۔“

”بڑے کون؟“ خالی بی۔ اکیلی خالہ بی سب کو ہرا

سکتی تھیں۔ چپ رہ کر نہیں۔ بول بول کر اور خالہ بی بھی زبردستی یا مجبوراً "یا ضرورتاً" اس کی ذمہ داری بن گئی تھیں۔ وہ بہت کم کسی سے ملتی تھیں۔ رشتے داروں سے ملنا جلنا ان کے میاں کو پسند نہ تھا، مگر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ تو جب اصباح پر افتاب۔ ایسی دیکھی۔

ابا کے گزرتے ہی وہ اس اذیت رساں زمانے، تکلیف دہ دنوں کو یاد کرنا چاہتی تھی نہ یاد رکھنا۔ خاموشی میں پناہ لے لی تھی اس نے۔ خالہ بی اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ کبھی کبھی خالہ بی کی کوئی نند بھول بھٹک کر ان کے پاس آتیں ان سے ہمدردی کے اظہار میں، لیکن موقع ملتے ہی تنہائی میں اصباح سے سوالات بھی ضرور کرتی تھیں۔

"تم سے برتاؤ کیسا ہے؟ سختی تو نہیں کرتیں؟" وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھتی۔

شکر کرو بھئی۔ ظالم جلا د عورت ہیں۔"

وہ حیران ہو جاتی۔ "میری خالہ ہیں۔ مجھ سے برا

برتاؤ کیوں کریں گی؟"

ان کی آنکھوں کے زاویے بدل جاتے۔ بھنویں چڑھا کر۔ "نہ پوچھو۔ کب کسی سے بنا کر رکھی ہے انہوں نے۔ میاں کیوں چھوڑ بھاگے۔ بتاؤ۔ بیٹا کیوں بدل گیا ہے۔ کوئی وجہ؟ تمہیں تو مجبوری میں رکھا ہوا ہے۔ اکیلی جو رہ گئیں چلو۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ نہ تم اجڑ میں نہ یہ بیٹیں۔"

ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہتی، لیکن یہ پہلے کی بات تھی۔ اب وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔

"ان لوگوں کی نظریں میرے گھر پر ہیں۔" خالہ بی

نے ایک دن بتایا تھا۔

"کیوں؟ اس پر ان کا کیا حق ہے۔ یہ تو نانا کا گھر

ہے۔"

"انہیں اس سے کیا غرض۔ اوھر میں میری اوھر یہ

قبضہ کرنے آئیں۔ بھئی تاک میں ہیں۔ حق سے کیا۔

قبضہ کیا۔ دعوا جھوٹا۔ یہ ہے ان کا مقصد۔"

گھر نانا کا تھا۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث یہ گھر انہوں نے دونوں بیٹیوں کے نام کر دیا، لیکن ہوا یہ کہ خالہ بی کی شوہر سے بنی نہیں۔ وہ عیاش طبع تھے لڑائی ہوتی رہتی۔ ایک بیٹا تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ خالہ بی کو علم ہو گیا۔ شوہر کی دوسری بیوی بھی ہے۔ خالہ بی کا زیور وہ بہانے بہانے سے لے کر ٹھکانے لگا چکے تھے یا اس کلموہی کے حوالے کر چکے تھے۔ اب گھر فردخت کرنے کی بات کرنے لگے تو بات آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد۔ وہ سنا کہ کینیڈا چلے گئے۔ جہاں دوسری بیوی کے بھائی تھے۔ بیوی بھی چلی گئی۔

بیٹا بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ خالہ بی کے حالات خراب ہوتے گئے تو اصباح کے ابا کے مشورے پر مصباح گھر سے دست بردار ہو گئیں۔ پورا گھر خالہ بی کو مل گیا۔ بہت عرصہ ہوا، مگر بے چارے ابا کو کیا علم کہ وہ اپنے گھر سے بھی بے دخل ہونے والے ہیں۔ وہ تو خیر پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی پہلی بیوی کے بیٹوں نے عرصہ دراز سے اپنے حصے کا دعوا کر رکھا تھا۔ باپ سے لڑائی کرتے اور بحث مباحثہ۔ اسی وجہ سے ان کا دل کمزور ہوتا گیا۔ خالہ بی نے اپنی سہولت کے لیے گھر کے ایک حصے کو کرائے پر چڑھا دیا۔ درمیان میں دیوار بنوا دی۔ کچھ دن کرائے دار نے کرایہ دیا۔ اب نہ گھر خالی کرتے نہ کرایہ دیتے۔ خالہ بی پر اس کا بہت برا اثر ہوا مگر وہ محاذ پر ڈلی رہیں۔ مقدمے کی نوبت آگئی۔ اصباح کو لگتا۔ ایک اس کے ہی خاندان کو شامتوں نے کھیر رکھا ہے۔

دائیں جانب کے پڑوسی کے بیٹے کو ساتھ لے کر اصباح صبح ہی ڈالر چینیج کروالائی۔ "شاید کو روک لیتی۔ چائے وائے پلاویتی۔ بے چارہ اتنا کام کر دیتا ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھی کہ وہ شاید ہے، مگر وہ زاہد تھا۔ وہ چائے نہیں پیتا۔ اس نے خود بتایا کہ میں زاہد ہوں۔ پھر میں نے اسے سو روپے دے دیے کہ جا کر بوتل پی لو۔"

"اے ہاں۔ یہ شمنہ کے جڑواں بیٹے۔ کوئی گل ضرور کھلا میں گے۔ دیکھنا پتا ہی نہیں چلتا۔ کون زاہد۔"

طرف سے کبھی مایوس نہ ہونا اور اپنی خالہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ دنیا مطلبی اور خود غرض لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ بھابھی نے تمہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ بھابھی بہت مضبوط اور کھری خاتون ہیں۔ اللہ نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا سارا بننے کا موقع دیا ہے۔ دنیا میں اتنے بڑے کی پہچان اسی طرح ہوتی ہے۔“

وہ سر ہلاتی رہی۔ کہہ نہ پائی۔ ”آپ کی بہنیں تو کہتی ہیں کہ اپنی تنہائی سے تنگ آکر بھانجی کو بلا کر رکھا۔ اپنے مطلب کے لیے جب گھر اپنے نام کروایا تھا۔ تب نہ بہن یاد آئی نہ بھانجی۔“

انہوں نے پھر اپنے اوپر گزرنے والی واردات سنائی۔ برسوں پہلے سعودی عرب گئے تھے۔ وہاں سے امریکا کو شش کی تو انہیں وہاں کی شہرت مل گئی بیوی بھی مل گئی۔ مطلب شادی کر لی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ پیدل کہیں جا رہے تھے تو ایک گاڑی بے قابو ہو کر ان پر چڑھ گئی۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے گاڑی کے بمبر ذہن نشین کر لیے ذرا صحت مند ہونے کے بعد پولیس کو ایکسپلڈنٹ کی رپورٹ کی۔ بارے انہیں وہاں کے قانون کے مطابق جرمانہ ادا کر دیا گاڑی والے نے جرمانہ اتنا تھا کہ وہ اسے تائید غیبی سمجھ کر واپس پاکستان آ گئے۔ گو کہ اس میں بھی چند وجوہات۔ یا رکائوں کی وجہ سے کئی سال لگے۔

یہاں آکر وہ ایک ٹرسٹ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب سعودی عرب گئے تھے تو بھائی کینیڈا جا رہے تھے بعد میں نتیجے کی روانگی کی خبر سے اذہد افسوس ہوا۔

سعودی عرب جانے کے لیے ایجنٹ کو دینے والی رقم انہوں نے بھائی سے قرض مانگی تھی۔ انہوں نے بھابھی کے زیور ہتھیا کر فروخت کیے اور چھوٹے بھائی کو ممنون احسان کر دیا۔ وہ قرض انہیں ادا کرنے کا اب خیال آیا۔ بھابھی کی حالت پر افسوس ہوا۔ وہ ان کے حالات سے بے خبر تھے ایکسپلڈنٹ۔ اس سے ملنے والی رقم شاید اللہ نے انہیں اس قرض کی ادائیگی اس

کون شاید۔“

”خالہ بی۔ شاید کی کنپٹی پر تل ہے۔ ٹینہ آئی اسی سے پہچانتی ہیں۔“

”سب کو اس بات کی خبر کہاں ہے۔ ویسے بھی ٹوپی منڈھ لیتا ہے تل چھپانے کے لیے۔“

”تل چھپانے کے لیے؟“ اصباح حیرت سے خالہ بی کی تحقیق پر انہیں دیکھنے لگی۔

”ہاں شرارت کر کے زاہد پر تھوپ دیتا ہے۔ خود معصوم بن جاتا ہے۔ زاہد شریف بچہ ہے۔“

”تو لوگ ٹوپی سے پہچان نہیں لیتے؟“

”پہچانیں تو تب۔ جب انہیں اس چالاکی کی خبر ہو۔ خیر بھی۔ اللہ انہیں زندگی اور ہدایت دے۔ بیٹے ہیں مگر آج کل کا زمانہ۔ بیٹوں پر بھروسہ کرنے کا نہیں ہے۔ جسے دیکھو ماں باپ کو شرمندہ کر رہا ہے۔ نالائق۔ ناخلف اولاد۔“ انہیں شاید اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا۔

”خالہ بی۔ پھر لوگ لڑکوں کی دعائیوں کرتے ہیں۔ ان پر فخر کیوں کرتے ہیں؟“

”پاگل پن اور کیا۔ جانتے نہیں کہ۔۔۔ اولاد فتنہ ہوتی ہے۔ اور یہ لڑکے توبہ!!“

”تو لڑکیاں۔ اچھی ہوتی ہیں۔“ خوش ہو گئی۔

”ہاں۔ مگر کوئی ان کے لیے دعا نہیں کرتا۔ بس اللہ کی مہربانی سے رحمت برس جاتی ہے۔“



آج کل وہ چپ رہنے لگی تھیں۔ ذریعہ آمدنی کچھ رہا نہیں۔ بیٹے کے پاس سے جو ڈالر کبھی کبھار آتے تھے سخت ضرورت پر ان میں سے ایک دو سو کے نوٹ لے کر سب لا کر کی نذر۔ ڈالروں کو خود ہاتھ نہیں لگاتی تھیں۔ ہاں جب وہ پاکستانی کرنسی کے روپ میں آجاتے۔ تو۔۔۔ مجبوری۔ پھر اللہ کی کرنی ان کے ایک دیور آ گئے۔ گو کہ خالہ بی ان سے کچھ کچھ سی تھیں مگر وہ بے حد اخلاق اور محبت سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اصباح کے سر پر ہاتھ پھیرا نصیحت کی۔

”دیکھو بیٹا! اچھا برا وقت سب پر آتا ہے مگر اللہ کی

طرح کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ٹریسٹ سے ہونے والی آمدنی بھی وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے اور اب قرض بھی اسی طرح ادا ہو گا۔ بھابھی کی عنایتوں کا قرض۔

خالہ بی پہلے تو سختی سے انکار کرتی رہیں، مگر انہوں نے اس قدر دلیلیں دیں کہ مجبور ہو گئیں۔ ان کے ان دنوں کے زیورات۔ کی قیمت اب دس گنا سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

”میں آپ کی محبت، خلوص کی قیمت تو ادا نہیں کر سکتا۔ جو آپ نے میرے ساتھ سلوک کیا وہ کوئی بہن نہیں کر سکتی، لیکن شاید آپ کی تکلیفوں کا تھوڑا سا ازالہ ہو جائے۔“

انہوں نے کرائے دار سے بات کرنے اور مقدمے سے نیٹے کا بھی وعدہ کیا۔ بھتیجے کو سمجھانے اور واپس آنے کی تلقین کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ دراصل پہلے وہ خالہ بی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

ان صاحب کی باتوں سے خالہ بی کو تو جو بھی یاد آیا، مگر اصباح کو اپنی افتاد یاد آگئی۔ اس کے زخموں کے کھرنڈ پھیل گئے اور خون رسنے لگا۔ جب وہ سراسیمہ۔ جو اس باختہ، اکیلی تین تنہا۔ گھر کے لان میں کھڑی اپنا گھر لٹا دیکھ رہی تھی۔ پولیس۔ عدالت کے لوگ۔ کمروں میں گھس کر سامان نکال رہے تھے۔ تب ایک لیڈی پولیس انسپکٹر نے اس کا بازو ہلایا۔

”تم اپنا سامان لے سکتی ہو۔ باقی سامان نیلام ہو گا۔ یہ گھر اب فروخت کر دیا گیا ہے۔“

اس کے اوپر جو پہاڑ اُگرا تھا۔ اس کے بوجھ سے وہ گرنے لگی۔ پڑوس میں رہنے والی رفیعہ خالہ ہی گھبرائی ہوئی آئی تھیں۔ انہوں نے ہی عدالت کے پمفلٹ سے مذاکرات کیے۔ سر تھام کر اس کے پاس آئیں۔

”بچی! یہ گھر تو کیا۔ تمہارے بھائیوں نے پورا گھر اپنے نام کر دیا ہے اور اب اس پر تمہارا یا مصباح کا حق نہیں۔ ستم ہے۔ ایسا ظلم خون سفید ہو گئے۔“

انہوں نے خود اس کے کمرے سے الماری سے ... ان کا سامان نکالا۔ کپڑے، جوتے، کتابیں، کھلونے،

چادر میں باندھ کر رکھ دیا۔ وہ تو برف کی مانند جمی کھڑی تھی۔ منجمد چٹان۔ وہ ظالموں کو کوستی بھی جاری تھیں۔ جن کی وجہ سے مصباح اسپتال پہنچ گئی اور بچی بے سائبان۔

جب افراز اور اعزاز اس کا سامان اٹھا کر لے گئے۔ تب بھی وہ وہیں کھڑی رہی۔ رفیعہ خالہ پولیس والوں سے لڑ رہی تھیں۔ سوتیلے بیٹوں نے ماں بیٹی کو بے سہارا کر دیا۔ ماں تو گھر کے بنکنے کی خبر سن کر ہی اسپتال جا پہنچی اور یہ بچی۔ ارے اسی کا خیال کر لیتے باپ تو ایک ہی تھا۔ دیکھنا۔ دنیا میں ہی انہیں کیسی سزا ملے گی۔ اللہ کو ایسا ظلم پسند نہیں۔ یتیم بچی کا سر چھپانے کا ٹھکانہ چھین لیا۔ آدھے گھر کی حصہ دار ہیں ماں بیٹی۔ اور تم لوگوں کو بھی اس ظلم کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تم بھی شریک ہو۔“

وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کی ڈیوٹی تھی۔ مصباح کے کمرے سے بھی کچھ اٹھانے نہیں دیا۔ تصویریں البتہ انہوں نے دے دیں۔ مہربانی۔

”یہ کیسا قانون ہے بھئی۔ اس بچی کی ماں اسپتال سے آکر کیا کپڑے نہیں پہنے گی۔ تمہارے کس کام کے ہیں یہ۔“ بمشکل حجت کر کے انہوں نے الماری سے کپڑے نکالے۔

قانون اندھا ہی نہیں۔ گونگا بھی ہے۔ سہرا بھی۔ ظالم تو ہے ہی۔ بدون وہ رفیعہ خالہ کے گھر رہی۔ عجیب مدہوشی کی بے یقینی کی سی کیفیت رہی۔

رفیعہ خالہ صبح شام اسپتال جاتی تھیں۔ افراز وہیں روتا تھا پھر نہ جانے کس نے مصباح کو گھر کے بارے میں خبر پہنچائی۔ افراز تو برابر سب ٹھیک ہے کی خبر انہیں دے رہا تھا اور پھر۔ ایسوی لینس پر وہ رفیعہ خالہ کے گھر ہی آگئیں۔ اصباح تو ہوتی بنی۔ برآمدے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ رفیعہ خالہ نہ جانے کس انتظام میں لگی ہوئی تھیں۔ ثریا بھی مصروف۔ دریاں چاندنیاں کرسیاں۔ افراز پانی بھر کر بڑے پیالے میں لے جا رہا تھا۔ اعزاز فون کیے جا رہا تھا۔ پھر ایسوی لینس آئی۔ ساتھ ہی خالہ بی۔ آتے ہی اصباح کو لپٹا کر بیٹھ گئیں۔

یہ ایک صحن۔ عورتوں سے بھر گیا۔ رشتے دار۔
پڑوسی۔ سعیدہ مومانی سیدھی ادھر آئیں۔ اصباح کو لپٹا
گر پیار کرنے اور خالہ بی سے سوالات کرنے لگیں۔ وہ
یہ حوا سی کے عالم میں صحن میں ہوتی کارروائی دیکھ رہی
تھی۔

”بھئی۔ مجھے تو خبر نہ تھی۔ رفیعہ نے فون کیا میں
اسپتال چلی گئی اور پھر۔۔۔ لے آئی اسے۔ رفیعہ آتی ہے
تو اس سے پوچھتا۔“ خالہ بی سب کو یہی جواب دے
رہی تھیں۔

محله والیاں صبر کی تلقین کر کے اسے گلے لگاتیں۔
ہاں جب صحن میں ایک پلنگ لا کر رکھا گیا اور اس پر
سفید لباس سفید چادر نظر آئی۔ اس کے دل کو کچھ
ہوا۔ جھلانگ لگا کر پلنگ کے پاس پہنچی۔ ہاں۔ اس کی
پیاری یاں۔ سفید چہرے۔ بند آنکھوں کے ساتھ۔
سوچکی تھیں۔

صبح اس نے رفیعہ خالہ سے کہا تھا۔ وہ اسپتال جائے
گی، مگر۔۔۔ نہ جانے کیوں۔ کسی نے اس کی بات نہیں
مانی افراز بھائی سے کہا انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ
پھیرا اور چلے گئے۔ اب۔۔۔ وہ حیران کھڑی تھی۔ دائیں
بائیں خالہ بی اور رفیعہ خالہ۔ اس نے کسی کی سسکیوں
کی آواز سنی۔ منہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا پھر رفیعہ خالہ
سے کہا۔

”کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے آنسو بھری آنکھیں
آنچل سے رگڑ لیں۔

”مل لوماں سے آخری بار۔“ کہہ کر خود ہی بلکنے
لگیں۔ خالہ بی نے اسے زور سے لپٹا لیا۔ پھر۔۔۔ کوئی
عورت بلبلاتی۔

”ارے حتم ہو گئی مصباح۔ ہائے ظالموں نے جان
لے لی۔“

وہ لڑکھڑا کر مری مگر۔ پھر۔ ایک دم بہت سے مرد
آگے اور وہ پلنگ اٹھا کر لے گئے۔

وہ چیخی۔ ”کہاں لے جا رہے ہیں ای کو۔ آپ ابھی
تو آئی تھیں اسپتال سے۔ پلیز مجھے بات تو کرنے
دیں۔“ مگر اس کی آواز کلمہ شہادت کی صدا کے

درمیان کھو گئی۔ وہ سب جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ لمحہ
بہر میں پلنگ غائب اور جگہ خالی۔ وہ اس کے بعد گونگی
ہو گئی۔ سعیدہ مومانی ان کی بیٹیاں اسے پیار کرتی
رہیں۔

اور پھر۔ خالہ بی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے
آئیں۔ اس گھر میں ڈونا کا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں
حفصہ اور مصباح کو دے دیا تھا۔
کئی دن سب آتے رہے۔ رفیعہ خالہ ان کی بیٹیاں
بیٹے پھر سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا۔



وقت گزر رہا تھا وہ اسکول سے کالج پہنچ گئی۔ خالہ بی
امت والی تھیں۔ اکیلی رہ گئی تھیں۔ گھر کے دو حصے
کر کے کرائے پر اسی لیے دیے تھے کہ آمدنی قائم
ہو جائے۔ اور۔۔۔

”کم بخت مستندوں کی وجہ سے مجھے تسلی رہے کہ
گھر میں مرد موجود ہیں۔ میں اکیلی نہیں۔“
درمیان میں جو دیوار بنوائی تھی اس میں کھڑکی لگوائی
تھی کہ ادھر سے ادھر آنے جانے میں آسانی رہے مگر
وہ تو کب سے بند پڑی تھی۔ خالہ بی نے سب جگہ
کرائے داروں کو خوب بدنام کیا تھا۔ وہ لوگ صفائی
دیتے رہتے۔

”اجی ہمارے حالات ذرا خراب ہو گئے تھے تو ہم
نے کہا جوں ہی کچھ معاملات درست ہوئے۔ آپ کا
کرایہ باقاعدگی سے دیں گے۔ بس ہمارا بھروسہ
کر لیں۔ اور کچھ دن انتظار مگر انہوں نے ہماری بجلی
کٹوا دی۔ تل کٹوا دیے۔ پانی بند کر دیا تو ہمیں بھی ضد
ہو گئی۔ اوپر سے سب جگہ ہمیں بدنام کرتی ہیں۔“

اب افضل معاملہ کیا تھا۔ یہ ظاہر نہ ہوا۔ خالہ بی
سے کسی نے پوچھا کہ کیا حالات خراب ہوئے۔ تو بگڑ
گئیں۔

”بھئی ان ہی سے پوچھو۔ کرائے دار منحوس ٹرک
تلے آگیا ہوگا۔ بیٹا چوری کرتے جیل جا پہنچا۔ اللہ
معاف کرے۔ مجھے کچھ خبر نہیں، مگر ہوا یہی ہوگا۔

نہیں تو جوان بیٹے کے ہوتے کیا حالات خراب ہوں گے اور کیا پتا۔ خیر اللہ معافی۔“

اپنے بیٹے کا بھی خیال آتا ہوگا۔ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ان کے بھی تو حالات خراب ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھار ڈالر بھیجتا۔ تو۔ ”میں تو ہاتھ بھی نہ لگاؤں منحوس کے روئے کو۔“ مگر پاکستانی نوٹ کی صورت میں آتے ہی قبضہ کر لیتیں۔ انہیں اپنے دیور کی طرف سے بہر حال معقول رقم مل جایا کرتی تھی۔

آج کل وہ اصباح کی طرف سے پریشان تھیں۔ اس کا کالج میں آخری سال تھا۔ اب اسے سرال جانا چاہیے۔ کب تک کرس انتظار۔ ہتھیلی کا چھالا بنا کر بالاب دنیا کی ہر برائی سے گرد و غبار سے بچا کر۔ ہر طرح کی تمیز، سلیقہ سکھا دیا۔ سارے خاندان کو معلوم تھا وہ ایک اچھے کالج میں پڑھ رہی ہے۔ جاہل نہیں ہے۔ اللہ نے حسن بھی دیا ہے۔ گو کہ وہ اپنی اس اضافی خوبی سے لاعلم ہی تھی۔

خالہ تھالی میں وال ڈالے انگلی سے ادھر ادھر ٹھلا رہی تھیں۔

”لگتا ہے۔ سعیدہ تو جیسے۔“ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ اصباح کا رواں بے تاب تھا۔ اگلی بات سننے کے لیے۔

”خیر بھئی۔ اب۔۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔“ پھر چیپ۔

”کیا ہوا خالہ بی؟“ وہ ڈر گئی۔

”ہوا تو نہیں، مگر ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سعیدہ کا کہہ رہی تھی۔ کچھ بدل گئی ہے۔ پہلے جیسی نہیں رہی۔ دو برس سے تو ادھر آئی بھی نہیں۔ ہاں بھئی! اب غریب رشتے داروں سے ملنے میں ہتک محسوس ہوتی ہے۔ سنا ہے گھر میں روپے کی ریل چل ہو گئی ہے۔ بھالی کی نوکری بھی اور بیٹے جو کما کر گھر بھر رہے ہیں۔“

”خالہ بی! آپ کب ملی تھیں ان سے؟“

”آج۔ تمہارے کالج جانے کے بعد زردی کی طرف چل گئی تھی۔ اس کے بیٹے کی خیریت کو۔ ٹائم فائیڈ ہو گیا

ہے بے چارے بچے کو۔ وہاں وہ بھی آئی بیٹھی تھی۔ زردی کی اماں سے شیخی ہانک رہی تھی۔ دولت۔ شان۔ نیا گھر بھی خرید لیا ہے۔ مجھے وہیں جا کر پتا چلا۔ میں نے سلام کیا تو دو انگلی ماسھے پر لگا کر گردن ہلا دی من بھر کی۔ زبان نہ ہلائی۔ کیوں کہ زبان تو کوالے گیا تھا۔ شیخی خوری۔“ تھالی اٹھا کر چلی گئیں۔

”آپ سے۔۔ بات نہیں کی؟“ اس نے کچن میں جھانک کر پوچھا۔

”یہی بتا رہی ہوں۔ یوں ظاہر کیا جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں۔ بات کرنا تو درکنار۔“

وہ گم قسم ہو گئی۔ سعیدہ مومانی۔ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ خالہ بی بھی دم سادھ کر بیٹھ گئیں، مگر دل میں ان کے خلاف مواد جمع ہو چکا تھا۔

”یہ سعیدہ جو ہے۔۔ مجھ سے چھوٹی ہے۔ آیا کہتی تھی۔ بھالی واجد مجھ سے بڑے ہیں۔ ان کی بیگم کیا بی کہ خود کو بہت بڑا سمجھنے لگی۔ واہ۔ چلو جی ہم نے بھی بڑا مان لیا، لیکن اس کا یہ تو مطلب نہ ہوا کہ چھوٹوں کو اپنی سمجھنے لگو۔ بھئی۔ اب تمہارے پاس چار پیسے کیا آگئے کہ ریل پٹری سے اتر گئی۔ واہ بھئی واہ۔ خیر۔ تم دیکھنا۔ میں بھی ایسا بدلہ لوں گی کہ عقل ٹھکانے آجائے۔“

”بدلہ۔“ اصباح ہکا بکا رہ گئی۔ ”کس کا بدلہ؟ کیا بدلہ؟ کیسے اور کیوں لیں گی؟ صرف بات نہ کرنے کا۔ یہ جرم اتنا بڑا تو نہیں۔ اب پتا نہیں وہ کیوں ایسی ہو گئیں۔ خالہ بی کی کوئی بات ضرور بری لگ گئی ہوگی۔ ورنہ ایسی ہیں تو نہیں۔ دل بے چین ہو گیا۔



صبح ہی صبح ناجیہ آئی۔ شمینہ آنٹی کی بیٹی۔ زاہد شاہد کی بہن۔ ہونٹ چہرہ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی۔ حواس باختہ۔

”خالہ جی۔ خالہ جی۔ پتا ہے کیا۔ صبح نماز کے ٹائم۔ ابھی ابا اور دادا مسجد گئے تھے کہ امریکا سے بڑے بھالی آگئے۔ اور پتا ہے کیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم۔

گوری یی جھک۔ سفید ایک دم۔ مکی کے بھٹے جیسے بال۔ ہاتھ جیسے روئی گھائی یی۔
 ”اری اوداستان گولہ بتا۔ ثمنہ نے لگائے دو تھپڑ بیٹے کو کہ نہیں۔“ خالہ بی نے اس کی روانی میں خلل اندازی کی۔ وہ سر ہلا کر پھر شروع ہو گئی۔

”ناجی نا۔ خالہ جی! امی تو ایک دم خوش بہ خوش۔ بے حال۔ ایک تو مفت میں ہو آگئی۔ نہ زیور بنانا پڑا نہ کپڑے۔ نہ بارات کا ٹٹا۔ پیسہ لگانہ کوڑی۔ اور ہو بھی جیسے قازقستان کی پری۔ یہاں تو چراغ لے کر ڈھونڈیں تب بھی نہ ملے۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا کہ اسے گود میں اٹھا کر ناپیں۔ سچی۔“

”کوہ قاف کی پری کہ قازقستان کی۔“ اصباح نے اس کی اصلاح کی۔

”ہاں۔ وہی وہی۔“ گردن ہلائی۔ ”کل سب کی دعوت ہے گھر پر۔ ولیمہ تو بعد میں ہو ٹل میں کریں گے۔ بھائی نے بہت سارے نوٹ دیے ہیں امی کو اور ایک ڈائمنڈ کا چیم چم کر تاسیٹ۔ ابا کی جیکٹ۔ موبائل اور واداکا۔“

”اری برساتی نالے کی طرح بے جا رہی ہے۔ یہ تو بتا، تجھے کیا دیا۔“

خالہ بی کا حملہ اچانک ہوا تھا۔ اس کا منہ فق ہو گیا۔ ہونٹ سکینٹر لیے بچے کی طرح۔
 ”خاک دھول مٹی۔ مجھے؟ ہا۔ بس ایک سوکانوٹ باجی کو بھی ہوئی۔ شاید زائد کو ٹھینگا۔“

”وہ سوکانوٹ نہیں۔ ہزاروں کانوٹ ہے پگلی۔“
 ”اچھا! میں نے تو سمجھا۔ اوہ۔ امی نے کہا۔ جب گورے گورے بھتیجے بھتیجیاں گود میں کھلائے گی۔ تو سمجھو۔ دولت مل گئی۔ کسی کی ہو اتنی گوری نہیں ہے۔ اور انگریزی ایسی فر فر۔“

”چل بھاگ۔ بی بی سی کی رپورٹر۔“ خالہ بی نے اسے بھگا دیا۔

ثمنہ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ سب سے قریب ان کا گھر تھا۔ اور خالہ بی کہتی تھیں۔ ثمنہ میسرے ہر موقع پر موجود ہوتی ہے۔ یوں بھی رشتے دار

بعد میں آتے ہیں۔ پڑوسی ہی وقت پر کام آتے ہیں۔ پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے۔ ناجیہ کے جانے کے بعد ایک سرد آہ بھری۔
 ”اچھا۔ دیکھتے ہیں۔ کیسی گوری ہو ہے۔“ شاید بیٹا یاد آگیا۔

ثمنہ کا صحن آرائشی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ثمنہ کی بہو بھی مشرقی لباس میں چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ کھڑے ہو کر سب کا استقبال اور ”السلام علیکم“ بہت ہی عربی لہجہ کے ساتھ۔

”مسلمان ہو؟“ خالہ بی بھلا کیسے چپ رہتیں۔ اصباح سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
 ”او! یس۔ الحمد للہ۔“ گوری بہو نے جھک کر کہا۔ خالہ بی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”بیمیں رہو گی یا واپس امریکا جاؤ گی؟“ تحقیقات۔
 ”میں۔ ادھر ہی رہوں گی۔“ بہت خوش تھی۔ ایرو؟ واہ بھئی۔ سب نے اس گوری یی۔ بہو کی تعریف کی۔ کھانے کے بعد ایک گانے والی آگئی۔

”میو آئی زبان کا گانا ہے جی۔ غور سے سننا۔“ اس گانے گھر کے لینگے والی نے تاکید کی۔ ڈفلی بجا کر سماں پیدا کیا پھر اونچی پاٹ وار آواز میں گانا شروع کیا۔ لڑکی ماں سے پوچھتی ہے۔

”ماں بھیا کہاں بیا ہو۔ جابو کنا۔“
 ”ماں کہتی ہے۔“ بیٹی بیا ہولندن سر۔ جابو کنا۔
 ”ماں بھا بھو کیسی آئی۔ جابو کنا۔“ بیٹی آئی گھر کی شوہا۔ جابو کنا۔

”بیٹی ناک چناسی۔ منہ بڑا سا۔ نوچک چوندر روہبلا میں بھر لائی۔ جابو کنا۔“
 قہقہے لگے خوب۔ تشریح یہ تھی کہ ”نوچک چوندر“ یعنی چھچھوندر۔ یعنی کہ اولادیں۔

”بیٹی آئی گھر کی شوہا۔ جابو کنا۔“ اب یہ جابو کنا کیا تھا اس کی تشریح نہ ہوئی، مگر بہو کی تعریف پر جہاں مہمان بنس رہے تھے گوری بھی تالیاں بجا کر داد دے

فائدہ ہوا۔ میرا یہ فائدہ ہوا کہ گھر پڑے پڑے پوتوں کو ڈانٹ ڈپٹ۔ سو سے لڑتا تھا۔ جب بیٹے نے کہا۔ اباجی۔ آپ آئندہ کو بس تک پہنچا دیا کریں۔ ”برا تو بہت لگا کہ مجھے اپنی بیٹی کا چوکیدار بنا رہا ہے، مگر ہر نکلنا تو تازہ ہوانے اچھا اثر ڈالا۔ صحت بہتر ہوئی، مزاج بھی۔ صبح بھی ساتھ جاتا ہوں۔ پھر انہیں لینے کے لیے بھی۔ تفریح ہو جاتی ہے۔“

باباجی تقریر کے ماہر۔ خالہ بی سننے پر مجبور اور یہ حقیقت بھی کہ پہلے جو گھر میں سو کے ساتھ بد مزاجی کے جوہر دکھاتے تھے۔ بیٹے سے شکوے۔ پوتوں سے ناراضی۔ اب کافی خوش مزاج ہو گئے تھے۔ ٹینہ کو سکون ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار گھر کا سودا بھی لے آتے تھے۔ فارغ وقت میں شاید زاہد کو ارد گرد اور انگلش بھی پڑھاتے۔ ناجیہ کو شعروں کی تشریح سمجھاتے۔ اب تو دونوں گھروں کی ضرورت بن گئے تھے۔ خالہ بی یوں تو پورے محلے میں بہت مقبول تھیں۔ ان کی بہت قدر و منزلت تھی۔ خود وہ اپنے سب سے قریبی بڑوسی یعنی اپنے کرائے دار سے کسی بھی برائی کی توقع کر سکتی تھیں۔ بس وہی ایک گھر ان کے لیے تشویش کا باعث تھا۔

زیادہ فکر اصباح کی تھی کہ کہیں شرارتا اس کو راستے میں تنگ نہ کرے۔

کرائے دار کا ایک جوان بیٹا تھا۔ ہٹا کٹا۔ اسی سے خطرہ تھا۔ اسی لیے شروع میں اسے برقعہ پہنایا۔ پھر چادر بھی بے حد تاکید کے ساتھ۔ بھی کتنی بھی قریبی سی۔ بھی تو پرانی ذمہ داری۔ اور یہ سیدہ بیگم ہیں کہ منہ میں گھنٹھیاں ڈالے بیٹھی ہیں۔ بھائی واجد ہنکارا تک نہیں بھرتے۔ بابا اپنی امانت کی خود حفاظت کرو۔ میں کب تک اسے دنیا کی تپتی دھوپ سے بچاؤں گی۔ غلطی ہو گئی مصباح کے بعد۔ فوراً ان سے تقاضا کرنا چاہیے تھا کہ بھئی۔ اپنے ذمہ داری خود اٹھاؤ، لیکن اس زمانے میں بچی کا ذہن عجیب ہو رہا تھا۔ کھوٹی کھوٹی۔ ماں کی موت کے علاوہ گھر سے بے دخلی۔ بے سہارا ہونے کا احساس۔ بے یقینی کی

شروع میں جب خالہ بی اصباح کو اپنے ساتھ لائی تھیں۔ انہوں نے اسے برقعہ پہنایا۔ پھر اسے الجھن ہوئی تو چادر پر اکتفا کیا۔ ہدایات ساتھ میں۔ سر ڈھانکے رہنا۔ اور پھر اسے میں بالکل نہیں دیکھنا۔ اور کلی میں ہنستے کسی سے بات کرنے پر تو سخت پابندی۔

جب وہ کالج گئی تو دیکھا۔ ٹینہ آنٹی کی بیٹی بھی اسی کالج میں پڑھتی ہے۔ خالہ بی کو بہت اطمینان ہو گیا۔ کالج کے کیٹ سے ذرا آگے بس مل جاتی تھی۔ دونوں ساتھ آ جاتیں۔ مین روڈ پر ہنگلی کے سامنے بس اسٹاپ تھا۔ ایک دو دکانیں بھی۔ آئندہ کے دادا ایک دکان پر بیٹھے ہوتے۔ دونوں کو بس سے اترنا دیکھ کر خود بھی ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑتے۔ ایک لائٹھی ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ اسے زمین پر مارتے۔ ٹھک ٹھک۔ گویا ان کے چوکیدار ہوں۔ گھر کے دروازے پر رک جاتے۔ جب خالہ بی دروازہ کھولتیں۔ وہ اندر جاتی۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں گھومتے۔

خالہ بی نے ایک دن ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تو بولے۔

”بس! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ زحمت۔“

فائدہ بہت ہوا۔ گھر میں پلنگ توڑا کرتا تھا پڑے پڑے اب گھر سے نکلتا ہوں۔ دکان تک آتے آتے میری چلائی ہو جاتی ہے۔ دکان پر بیٹھتا ہوں سانس تیز چلتی ہے تو دکان دار بھلا مانس ٹھنڈا پانی پلاتا ہے۔ کوئی بسکٹ بھی دے دیتا ہے۔ لوگ وہاں آتے ہیں۔ بات چیت بھی کر لیتا ہوں۔ خبریں مل جاتی ہیں۔ بچیوں کے انتظار میں بیٹھا تلاوت کرتا رہتا ہوں۔ لوگوں کو نصیحت بھی کر لیتا ہوں۔ دکان دار بہت ہی شریف بندہ ہے۔ کہتا ہے باباجی۔ آپ نے جب سے میری دکان پر آنا شروع کیا ہے میری دکان بہت چلنے لگی ہے۔ یہ آپ کے تلاوت کرنے سے برکت ہوئی ہے۔ اب بتاؤ۔ اس کا

کیفیت۔ رفیعہ بھی یوں تو اسے رکھنے پر تیار تھی، مگر اس کے گھر دو جوان لڑکوں کی موجودگی۔ مناسب نہیں لگا۔ اپنی کم مائیگی کے باوجود اللہ کے بھروسے پر ساتھ لے آئیں۔ پھر کسی نے بتایا۔

”واجد بھائی کا بیٹا کینیڈا چلا گیا ہے۔ پڑھائی کرے گا۔ اور پھر کمائی کرے گا۔ ابھی رخصتی سے انکاری ہے۔“ چلو بھئی۔ اس کی کمائی کا انتظار کر لیتے ہیں، مگر کسی نے کہا۔ ”وہ بچپن کے رشتے کو مانتا نہیں۔ اسی لیے بھاگ گیا۔“

ارے۔ لگاتے چار چوٹ کی مار۔ پہلے قبول ہے قبول ہے کہتے ہوئے تو منہ پھسلا نہیں اب سی کر بیٹھ گیا بد ذات۔ منحوس اولاد۔ کہیں نظر آئے ایسی خبر لوں گی کہ بس۔“

”کہاں نظر آئے گا اب آیا! وہ کینیڈا جا چکا ہے۔“ رفیعہ نے کہا۔ ”ماں باپ کو اولاد کی مرضی نہیں دیکھنی پڑتی ہے۔“

”واہ۔ یہ کون سی منطق ہے۔ اولاد کی مرضی بدلتی جائے۔ تو ماں باپ بھی بدلتے رہیں۔ ارے بلا میں اسے۔ کریں ٹھکانی۔“

اصباح دیکھتی تھی۔ روز کیس چلی جاتی تھیں۔ نہ جانے کس کس سے مشورے کر رہی تھیں۔ نتیجہ تو ظاہر ہوتا نہ تھا۔ فکر مند نظر آتی تھیں۔

کبھی اصباح کے ابا کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتیں۔ جو

پہلے ہی بیٹوں کے حوصلے دیکھ کر رست ہو رہے تھے۔

جب واجد بھائی نے ان کی پریشانی دیکھی۔ اپنا بیٹا پیش

کر دیا کہ کم از کم بیٹی کے مستقبل کی طرف سے مطمئن

ہو جائیں۔ انہوں نے بھی فوراً ”مان لیا۔ ابھی چوہ

سال کی تھی اور نکاح کر دیا۔ لڑکا بیس برس کا تھا۔

مناسب جوڑ بھی تھا۔ اپنی صحت اور بیٹوں کی ریشہ

دوانیوں سے تنگ سڈرے ہوئے تھے۔

گھر کو تقسیم کر دیا۔ آدھا حصہ بیٹوں کے حصے میں۔

آدھا اصباح اور اس کی ماں کے لیے۔ اس تقسیم کو

بیٹوں نے ٹھوکر سے اڑا دیا۔ باپ پر مقدمہ کر دیا۔ کئی

رشتے داروں کو ہم خیال بنالیا۔ کئی نے باپ کا ساتھ دیا۔

مگر پھر۔ ابا گزر گئے۔ دباؤ برداشت نہ کر سکے۔ ابا کے جنازے پر بیٹے آئے۔ بہن کو دلاسا دیا۔ مصباح کے پاس آکر بھی چند الفاظ تسلی کے۔ جب ضرورت ہو۔ ہمیں بلا لینا۔ وغیرہ۔

اصباح کو بھائیوں کے سینے سے لگ کر بڑی تقویت ملی۔ وہ کم سن اور نا تجربے کار تھی۔ دو غلی بالیسی تو بڑے بیٹوں کی سمجھ سے بھی اوپر ہے۔ وہ سمجھتی تھی۔ دونوں

بھائی جو ابا سے ناراض ہو کر اپنے ننھیال میں رہنے لگے

تھے۔ ان کی تقویت کے لیے آجائیں گے، مگر انہیں

پر دانہ تھی۔ مصباح بہت ڈر گئی تھیں۔ یوں تو کوارٹر

میں ایک فیملی رہتی تھی۔ گھر باہر کے کاموں کے

لیے۔ اور جو کیداری بھی، لیکن خوف تو بڑھتا گیا۔

اور مقدمے کا فیصلہ جب بیٹوں کے حق میں ہو گیا تو

مصباح کا کمزور دل جواب دے گیا۔ علاج جاری تھا کہ

پھر۔ اسپتال کے بغیر چارہ نہ رہا۔ اور۔ جس دن

معلوم ہوا۔ گھر فروخت کر دیا گیا۔ بعد ازاں احکام کے

تحت خالی کرنے کا نوٹس آگیا۔ پھر کہیں انکی ہوئی

سائنس بھی واپس نہ آئی۔

اصباح کو اب بھی یقین نہیں آتا تھا۔ بھائی تو بہنوں

کے محافظ ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو اسے تپتی دھوپ

میں کھلے آسمان تلے کھڑا کر دیا تھا۔ خالہ بی تو اس کے ابا

سے بھی ناراض تھیں۔ اپنی زندگی میں گھر فروخت

کر کے سب کو جائز حصہ دے دیتے۔

انہیں اصباح کے دوھیال والے پسند نہ تھے۔

منافق۔ دو غلے باتیں بنانے میں اول نمبر۔ کام کے

معاملے میں صفر۔ اگر سب بڑے لڑکوں کو سمجھاتے۔

بہن کی یتیمی کا ہی احساس ولاستے۔ درمیان میں پڑ کر

مصباح کے لیے کوئی راستہ نکالتے مگر نہیں۔ یوں تو

بھتیجیوں کو مصباح کا قاتل، ظالم وغیرہ کہتے رہے۔

یقیناً ”بھتیجیوں کی خوشامد میں ان کی بیٹھ ٹھونکتے ہوں

گے۔

سب کو علم ہو گیا تھا کہ اصباح اپنی خالہ کے گھر

ہے۔ مگر کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھنے نہ آیا۔ ذمے

داری تو کون قبول کرتا سب مطلب پرست۔ اصباح

خالہ بی کے تجزیے سن کر شرمندہ ہو جاتی پتا نہیں مصباح بھی کیسا نصیب لے کر آئی تھی۔ ساری عمر شادی کے بعد کی۔ سوتیلے رشتوں سے ڈر کر گزاری۔ دیکھ لو پھر۔ ان ہی لوگوں نے قبر تک پہنچا دیا۔ بے چاری نے کوئی خوشی نہ دیکھی۔ اصباح کے نکاح سے کچھ سکون ملا بھی تو میاں جلتے بنے۔ وہ بھی بیٹوں کے شور شرابے سے ڈر گئے گو کہ انہوں نے مصباح کو بہت محبت سے رکھا۔ بہت قدر کی مگر نہ جانے ابا میاں نے کیا دیکھ کر مصباح کو دو بیٹوں کے باپ سے بیاہ دیا۔ کاہے کی جلدی تھی مگر جلدی تو تھی۔ تب ہی اپنی زندگی میں اسے گھریار کا کر کے آنکھیں بند کر قبر میں جاسوئے۔

رفیعہ کی بیٹی اجیہ نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

”خالہ بی! مصباح خالہ تو اتنی خوب صورت تھیں اور خالوایا۔ وہ تو مصباح خالہ کے ابا لگتے تھے۔ پھر ان کی شادی کیوں ہوئی ان سے۔ کسی نے منع بھی نہیں کیا کہ وگنی عمر کے آدمی سے کیوں کر رہے ہو۔“

”کون منع کرتا۔ اے بھئی ہمارے ابا میاں۔ توبہ!! اس قدر غصے کے۔ ہتھ چھٹ تھے۔ منع کرنے والے کے ہاتھ پیر توڑ دیتے یا جڑا۔ یا گالیاں دے کر کہتے۔ چل پھر لے آ، کوئی کم عمر لڑکا۔ سب ابا میاں سے ڈرتے تھے بھئی۔“

خالہ بی نے تفصیل بیان کی۔

”تو کیا۔ خاندان میں کوئی ان کے جوڑ کا نہ تھا۔“

”بس بیٹا۔ قسمت میں یہی تھا۔ ابا میاں کو یقین تھا۔ کوئی بھتیجا بھانجا ان کی بیٹی کا نصیب بنے گا۔ مگر۔ سب اپنی پسند کی یا ماں کی پسند کی کر لائے۔ یہاں بھی غموت حائل تھی۔ ابا میاں ہر کسی سے تو لڑ پڑتے تھے۔ مقدموں میں سارا پیسہ لٹا دیا۔ پھر برہائے کا خوف۔ جو رشتہ ملا۔ بھگتا دیا۔ میں تو شادی میں گئی تھی نہیں غصے کے مارے۔ اصباح کی پیدائش پر گئی تو دیکھا بہت خوش ہے۔ عیش آرام میاں کی چاہت حاصل ہے۔ مگر بیٹے خار کھاتے تھے۔ انجام بھی پھر۔ چلو خیر اب کیا شکوہ۔ اصباح کی فکر ہے اب۔“

”تو خالہ بی! اگر اصباح کے دوھیال والے برے ہیں تو ننھیال والوں نے کیا انعام دیا۔ نکاح کر کے بھول گئے۔ پوچھتے بھی نہیں۔“ اجیہ نے نازک مسئلے کو چھیڑ دیا۔

”ہاں خیر۔ دیکھتے ہیں۔ یہ سعیدہ بیگم آخر جائیں گی کہاں اور میں بھی بکری نہیں ہوں جو شیر سے ڈر جاؤں گی۔ ایسی خبر لوں گی اسیار گڑوں گی۔ بس دیکھنا۔“ نہ جانے وہ کیا رگڑنا چاہتی تھیں۔

”آپ ہمیشہ سعیدہ مومانی کو کیوں کہتی ہیں۔ واجد ماموں بھی تو ذمہ دار ہیں۔“

”ارے بچی۔ تم عورتوں کی سیاست نہیں سمجھ سکتیں۔ سعیدہ چاہے تو سب ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں پر دولت کی پٹی چڑھی ہوئی ہے۔ ہم اسے غریب غریب نظر آتے ہیں۔“

اصباح کو تو یقین نہ تھا کہ اب اس رشتے سے کوئی خیر کی خبر ملے گی۔ جو شخص رشتے سے منکر ہو گیا ہے۔ کسی گوری کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہو گا بس پھر قصہ ختم۔ آئندہ نے سمجھایا۔

”نہیں۔ ایسے قصہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ جو خاندان ہوتے ہیں۔ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہونے دیتے معاملہ۔ لبا چکر ہوتا ہے۔“

اصباح سوچنے لگی۔ خاندان؟ کون سا خاندان۔ وہ تو ایسے کسی خاندان سے واقف نہ تھی جو اس کے معاملے میں مددگار ہوتا۔ ننھیال ان ہی لوگوں کا ساتھ دے گی۔ دوھیال کو اس کی فکر ہی نہیں۔ خبر تک نہیں لیتا کوئی۔ پھر۔ خاندان کہاں سے آئے گا۔

خالہ بی اپنی تنگ و دو میں لگی ہوئی تھیں۔ بس خبریں۔ جو اس تک آئیں لڑکا کینڈا بھاگ گیا۔ اسے رخصتی نہیں کروانی۔ بچپن کی شادی۔ گڈے گڑیا کی شادی ہو گئی۔ ہائیں۔ بیس برس کا جوان مرد کیا بچہ تھا؟ ننھا دودھ پیتا۔ خالہ بی تو اسے ہر خبر سے بے خبر رکھنا چاہتی تھیں مگر اسے کچھ نہ کچھ علم ہو ہی جاتا تھا۔ ثریا کی شادی کا کارڈ آگیا۔ مہندی میں بھی بہ اصرار بلایا تھا۔ خالہ بی نے اسے اچھی طرح تیار ہونے کا حکم دیا۔

”وہ پیلا جوڑا پس لینا جس پر اووی نیل لگی ہے۔“
 ”وہ تو بہت بھاری ہے۔ افراز بھائی کہہ رہے تھے
 بہت سادگی سے گھر میں مہندی ہوگی۔ خاندان کے ہی
 لوگ آئیں گے اور کچھ پڑوسی۔ دولہا والے نہیں
 آئیں گے۔“

”نہ آئیں۔ ہمیں تو خاندان والوں کو بھی دکھانا
 ہے۔“

مجبوری۔ ان ہی کی پسند کے کپڑے پہننے پڑے۔
 انہوں نے موتیوں کی لمبی لڑیوں والے بندے تجھی پہنا
 دیے۔ بلکہ آئندہ کو بلا کر اس کا میک اپ کرایا۔ اصباح
 کو بڑی شرم آئی۔ کبھی میک اپ کیا نہ تھا اس کے انکار
 پر آئندہ نے ڈانٹا۔

”چپ رہو۔ تم شادی شدہ ہو۔ میک اپ کا حق
 ہے۔“

”اچھا جی۔ مجھے کیا کیا حق ہے بتانا اور جو نہیں ہے۔
 وہ میں بتاتی ہوں۔“ اصباح کو غصہ آگیا۔ ”مجھے بولنے کا
 حق نہیں۔ پہننے کا حق نہیں۔ گلی میں یا کہیں بھی
 راستے میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کا حق نہیں۔
 چھت پر جانے کا حق نہیں۔“ آئندہ کو ہنسی آگئی۔

”ارے۔ حق اسے نہیں کہتے۔ اسے کہتے ہیں
 اجازت۔“ اصباح منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”اب تم میرے کیے کرائے پر پانی نہ پھیرو، منہ بنا
 کر۔ اتنی اچھی شکل بگاڑ رہی ہو۔“ اس نے آئینہ
 سامنے رکھا۔ آہا۔ اسے اپنی صورت کبھی اتنی پیاری
 نہیں لگی تھی۔

”ایک بات بتاؤ۔ اس میک اپ کا۔ اتنے اچھے
 کپڑے پہننے کا۔ اوپر سے یہ لمبے بندے مجھے کیا فائدہ
 ہوگا۔ آج یہ نیا فرمان جاری ہوا ہے۔ اس کا مقصد کیا
 ہے؟“

”تم تو ہو گھامڑ۔“ آئندہ پھر ہنسی۔ ”وہاں آئیں گی
 تمہاری ساس۔ انہیں تم آؤگی پسند۔ وہ بیٹے کو بتا میں
 گی کہ اصباح اتنی حسین، پری چہرہ ہے کہ کینیڈا کی
 بھوری بندریاں اس کے سامنے گھاس چرتی ہیں۔ پھر
 دیکھنا۔“

”وہ مجھے ہزار بار دیکھ چکی ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔
 ”اس طرح۔ اس حلیے میں کبھی نہیں دیکھا۔
 ہمیشہ روتی بسورتی دیکھا ہے اور ان کے سامنے ہنستی
 رہنا۔ یہ جتانے کے لیے کہ تمہیں ان کی پروا ہے نہ
 ان کے بیٹے کی۔“

”ہائیں! ایسے۔ یہ خالہ لی نے کہا ہے؟“
 ”یہ مابدولت کے ارشادات ہیں۔“ فخر سے سینہ
 تان کر بولی۔ اصباح مسکرا دی۔

ثریا زعفرانی کیڑوں میں ہلدی کی گانٹھ بنی بیٹھی
 تھی۔ بہت خوش ہو گئی۔ اپنے پاس بٹھا کر اس کے نئے
 روپ کی تعریف کی۔ کافی رشتے دار جمع تھے۔ اصباح
 سب سے ملی ”وہ“ مگر نظریہ آئیں۔

سب نے اصباح کی تعریف کی۔ ”کتنی پیاری ہو گئی
 ہے اصباح۔ ہائے۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ وغیرہ۔
 ”اپنی اٹریا پہ گڑیاں کھملن تھی۔ ساجن نے نیچے
 کنار ری۔

اے ری سکھی گڑیاں کھملن نہ پائی سیاں کے پنچے
 کنار ری۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مہوا۔ کہ ساون کی آئی پھوار
 رے۔“

لڑکیاں امیر خسرو کا کلام بے حد سراور لحن سے سوز
 کے ساتھ گارہی تھیں۔

اپنے باغیچے میں پھلوا چنت تھی ساجن نے بھیجے
 کنار ری۔

اے ری سکھی پھلوا بہن نہ پائی سیاں کے پنچے
 کنار ری۔

اپنے محلوا میں جھولا جھولت تھی ساجن نے بھیجے
 کنار ری۔

اے ری سکھی جھولا جھولن نہ پائی سیاں کے آئے
 کنار ری۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مہوا کہ ساون کی آئی پھوار
 رے۔“

”ارے یہ کیا ساون شروع ہو گیا۔ شادی مہندی
 کے گیت گاؤ۔“ کسی نے کہا۔

”خالہ! سسرال میں ایسے ہی دل مار کر رہنا پڑتا ہے لڑکیوں کو۔ اپنی مرضی کسب چلتی ہے۔“

”اور ساجن کم بخت کو دیکھو۔ ڈولا بھیجنے کی آفت پڑی تھی۔ نہ بچاری جھول سکی نہ پھول پہن سکی۔ ساون تو منانے دیتا۔ مگر بچاری لڑکیاں۔“

”وہ بھی بیگم کے ساتھ ساون منانا چاہتا ہوگا۔ بیگم کو دیکھو رستے میں ہی ڈولا رکھوا کے ساون کی پھوار کا لطف لینے لگیں۔ تب ہی سسرال والے بہو سے نالاں ہوتے ہیں۔ من موچی۔ بے کسے کی۔“

”توبہ ہے۔ اب سسرال سے ڈراؤ تو نہیں بچاریوں کو۔ چلو وہ گاؤں ماں میرے ابا کو بھیجوری۔“ لڑکیاں فوراً شروع۔

اماں میرے ابا کو بھیجوری کہ ساون آیا
 بیٹی تیرا ابا تو بڑھاری کہ ساون آیا
 اماں میرے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا
 بیٹی تیرا بھیا تو بالاری کہ ساون آیا
 اماں مرے چچا کو بھیجوری کہ ساون آیا
 بیٹی تیرا چچا تو بازکاری کہ ساون آیا۔

”لو دیکھا! میکے میں کون سی قدر ہے۔ ماں ہے کہ صاف انکار کر رہی ہے کہ بھی اب تم گھریار کی ہو۔ سسرال میں دل لگا کر رہو۔ ساون بھادوں کا زمانہ گیا“

”ہاں ماں بھی کتنی ظالم۔ بیٹی رہ سسرال۔ چاہے جتنی پابندیاں ہوں وہاں۔“

”فوفہ شہلا“ نہ دھلاؤ لڑکیوں کو۔ کل سب کو جانا ہوگا۔ اور ساون میکے میں کرنے کی اسے ضرورت کیا ہے۔ میکہ ہو کہ سسرال۔ ساون سب جگہ ایک جیسا کچر پلنی۔ سلن۔ جس۔“

”اور کیا۔ سسرال میں جھولا ڈال کر میکے کا مزالو۔ اتنا شوق ہے تو۔“

”وہاں جھولے جھولتی رہو۔ گھر کی فکر نہ کرو نہ بچے سنبھالو۔ نہ میاں کو دیکھو۔ بھئی عقل مند ماں یہی سمجھانا چاہ رہی ہے کہ بہت جھولے جھول لیے۔ ساون منالیا۔ اب گھر سنبھالو۔ دل لگاؤ سسرال میں۔“

”اماں ڈر رہی ہوگی کہ بیٹی کہیں میکے میں ہی نہ آنے لگے۔ ماں کے سینے پر مونگولے۔“

”یا اللہ یہ مہندی کی رسم بھی ہوگی کہ سب دل کے پھپھولے پھوڑنے آئی ہیں۔ چلو بچیوں۔ ثریا کو لے کر آؤ۔ یہ امیر خسرو بھی۔ عورتوں کے دل چیرنے والے گانے ہی بھلا کیوں بناتے تھے۔ چلو سب وہ گاؤں شادمانی ہو۔ شادمانی۔“

اب موسم اور ماحول بدل گیا۔ اب قمقمے تھے۔ چپھے تھے اور چھیڑ خانیاں۔

”ارے۔ رفیعہ! سعیدہ نہیں آئی۔“ خالہ بی نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔ ”بلایا تھا؟“ کان میں منہ ڈال کر کہا۔ شور بہت تھا۔ ہاؤ ہو۔

”بلایا تھا آیا! منہ چراتی ہیں سب سے۔ بتا ہے چار سال بعد بیٹا بھی آگیا ہے کینیڈا سے۔ بہت کما کر لایا ہے۔ شادی وادی کا تو پتا نہیں۔ لایا تو نہیں کسی کو۔“ خالہ بی کا بوجھ ہلکا ہوا۔

”حنا گوندھ لائی ہیں پریاں۔ تیرے لیے۔ بنو میری تیرے لیے۔“

”ماں تھے یہ ترے چمکیں ستاروں کی لڑیاں“ ترے لیے۔ بنو میری ترے لیے۔“

لڑکیوں نے نیا گانا شروع کر دیا۔ خالہ بی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سب سے الگ اصباح کوٹنے میں بیٹھی تھی۔ ہا۔ دل دکھ گیا۔ بچی کا دل کیسا مروہ ہو گیا ہے۔ نہ ہستی ہے نہ بولتی ہے۔ نصیبوں والی ہو۔ ابھی تو سب بادلوں میں گم ہے۔ خوشیاں بھی۔ مستقبل بھی۔ نصیب بھی۔

اچانک بادل آئے۔ پھوار شروع ہوئی۔ بڑی عمر کی خواتین اندر آگئیں۔ لڑکیاں صحن میں ہی چہلپھل کرنے لگیں۔ اصباح بھی ثریا کے ساتھ اندر آگئی۔

”اے بی! ثریا نے کیا پٹیلی چائی ہے۔ بے موسم برسات شروع ہو گئی۔“

”اللہ کی رحمت ہے۔ نیک شگون ہوتا ہے۔ مبارک ہو۔ بیٹی نصیبوں والی ہے۔“ کسی نے کہا۔ کھانا جلدی لگا دیا گیا۔ بارش کی وجہ سے سب

سمان بھی جانے لگے۔ افراز خالہ بی اور اصباح کو گھر چھوڑنے آیا۔ خالہ بی کو اس پر بہت پیار آیا۔ بہت ذمہ دار بچے ہیں رفیعہ کے۔ کیا رنگ نکالا ہے۔ مرنے والے بہنوئی پر غصہ آیا، پاس کے پاس۔ پڑوس میں رہنے والے لڑکے نظر نہ آئے۔ اتنی دور واجد بھائی مل گئے۔ ارے ذرا عقل کے گھوڑے دوڑاتے ساتھ ہی تو گھر تھا۔ ہم خود رفیعہ سے کہتے۔ مصباح سے رفیعہ کی دوستی بھی تھی۔ ہا ہا۔ کیسا اچھا موقع نکل گیا۔



شادی کے دن بھی اصباح کو بنا سنوار کر گلابی سوٹ پہنا کر لے گئیں۔ آج تو سعیدہ کے سینے پر سانپ لوٹیں گے ضرور۔ ایسی نرالی چھب ہے کہ نظر ہٹتی نہیں۔ جب وہ شادی ہال پہنچیں۔ تو وہاں سعیدہ نظر نہ آئیں۔ مردانے میں واجد بھائی بھی نہ تھے۔ اگر آج بھی نہ آئیں تو ان کی مجوزہ اسکیم ناکام ہو جائے گی۔

بارات آگئی۔ خواتین لائن سے گزرنے لگیں۔ لڑکیاں انہیں ہار پہنا رہی تھیں پھر ایک خاتون کے پیچھے سعیدہ نظر آئیں۔ رفیعہ نے ہنس کر کہا ”بھابھی! بارات کے ساتھ آئی ہو کیا؟“ وہ کھلکھلائیں۔ ”ارے بھئی باراتی ہوں تو نہیں۔ دیکھو تمہاری لڑکیوں نے ہار پہنا کر باراتی بنا دیا۔“ خالہ بی سکھ کا سانس لے کر سی پرڈٹ گئیں۔ نکاح ہو گیا۔ کھانا ہو گیا۔ اب تصویریں بن رہی تھیں۔

سعیدہ جو کم ہوئیں تو اب ملیں۔ خالہ بی فوراً لپکیں۔

”اے جی۔ اوھر تو آؤ۔ کہاں چھپی چھپی پھر رہی ہو۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”آئیے۔ اے۔ نا بابا۔ جو بات کرنی ہے۔ اپنے بھائی سے کرنا۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔“ صاف دامن بچا رہی تھیں۔ بوکھلائی ہوئی تھیں۔

”کیوں۔ سنھی چوڑہ ہو۔ ارے بھئی تم سے ہی جواب لینا ہے۔“

”جو بھی آپ سمجھیں۔ میں کچھ کہہ کر بری نہیں

ہوں گی۔ اپنے بھائی سے بات کریں۔“

”میں تمہیں برا کیوں بناؤں گی۔ بلاؤ اچھا بھائی کو۔“

”وہ نہیں آئے۔ انہیں شادی کے شور شرابے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ آگے بڑھ گئیں۔ گویا ان کے گھر جا کر ان ہی سے بات کرنی ہوگی۔ اگر لڑکا مل گیا تو اس کو تو۔۔۔

ثریا کی رخصتی کے بعد وہ رفیعہ کے اصرار پر ان ہی کے گھر آئیں۔ ٹینہ کو فون کر دیا کہ ان کے جڑواں بچے وہاں سو جائیں۔ گھر کی ایک چابی ٹینہ کے پاس ہوتی تھی۔ احتیاطاً۔۔۔

اصباح کو اجیہ نے ثریا کے دھلے ہوئے کپڑے رات کو سونے کے لیے دے دیے۔ باتیں کرتی رہی۔ مہمانوں پر تبصرے۔ دولہا کا ذکر۔ پھر ایک دم کچھ یاد آیا۔ ”رخصتی کے بعد میں جب دوسرے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے باہر کھڑی تھی۔ تو۔۔۔ میں نے وہاں واجد ناموں کے بیٹے کو دیکھا۔ وہی۔۔۔ تمہارا والا معین۔ گاڑی سے اتر کر اندر آ رہا تھا۔“ اصباح نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”نہیں۔ کوئی اور ہوگا۔ وہ یہاں کہاں؟“

”وہی تھا بھئی۔ لمبا گورا، گولڈن بال اور ہاں اسی وقت سعیدہ موہانی میرے پیچھے سے نکل کر آگے گئیں اور اسے دھکیلتی ہوئی گاڑی کی طرف لے گئیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسے اندر آنے سے روک رہی تھیں اور پھر دونوں ایک گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ہائے سچی۔ اگر وہ اندر آ جاتا۔ تمہیں دیکھ لیتا پھر تو۔۔۔ افوہ! آج تم اتنی حسین لگ رہی تھیں کہ بس۔ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ بھول جاتا گوری لڑکیوں کو۔“

”نہیں۔ دوسرا والا ہوگا۔ تم نے کیا ان کے تینوں بیٹوں کو دیکھا ہے۔ پہچانتی ہو؟“

اصباح بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گردن ہلائی۔ ”ہاں۔۔۔ پہچانتی ہوں۔ وہ جب کینیڈا سے آیا۔ زرو خالہ نے دعوت کی تھی۔ میں زرو خالہ سے کراس اسٹیج کی کاپی لینے گئی تھی۔ اس دن سب کو

دیکھا۔ زرو خالہ کی بیٹی نے بتایا کہ معیذ آگیا ہے۔ اس کی دعوت ہے۔“

اصباح گم صدم ہو گئی۔ یہ کم عمر لڑکی سوچ سکتی ہے کہ وہ اندر آتا تو مجھے دیکھ کر۔۔۔ تو۔۔۔ سعیدہ مومانی نے یہ کیوں نہیں سوچا۔ نہ جانے کب آیا اور۔۔۔ آج بہانے سے ہی آکر دیکھ لیتا۔ کیا سعیدہ مومانی واقعی مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں؟ آج وہ بہانے بہانے سے ان کے پاس سے گزری۔ مسکرا کر سلام بھی کیا۔ انہوں نے خشک لہجے میں جواب دے کر منہ موڑ لیا۔ نہ پہلے کی طرح گلے لگایا نہ پیار کیا۔ دوسری دفعہ پھر وہ ان کے پاس گئی۔ وہ کسی خاتون سے مخاطب تھیں۔ شاید اپنے دوسرے بیٹے کے لیے جو دبئی میں ہوتا ہے۔ کسی گوری حسین امیر گھر کی لڑکی بتانے کا کہہ رہی تھیں۔ دوسرا کیوں؟ پہلے کے لیے بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس وقت وہ یہی سمجھی کہ دوسرے بیٹے کا ذکر ہو گا۔

اجیہ تو سو گئی لیکن اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ تکیہ کب آنسوؤں سے تر ہوا۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ اپنی قسمت پر۔ کم مائیگی پر۔ تنہائی پر۔ نہ جانے کس کس پر آنسو بہتے رہے۔ ماں باپ بہت ضروری ہوتے ہیں۔ بغیر ماں باپ کے۔۔۔ زندگی بے کار کیوں ہوتی ہے؟ دنیا کے اتنے بہت سے لوگ۔ ان میں کوئی اس کے ماں باپ کیوں نہیں ہیں۔ وہ بھائی تھے۔ اگر ابا کے رشتے سے ہی اس کا خیال کر لیتے۔ وہ یوں ذلیل تو نہ ہوتی۔ اب اندازہ ہو گیا محسن، صورت، جوانی، سب بے کار۔ ماں باپ ہوں اور کچھ مضبوطی یعنی پیسہ۔ آج کل وہی کام آتا ہے جیسے مومانی دولت مند لڑکی کا کہہ رہی تھیں۔ رشتہ، خاندان، خوب صورتی، سب گئے بھاڑ میں۔



شادی کے لیے تین دن کی چھٹی لی تھی، مگر طبیعت کچھ اتنی سست ہوئی کہ چوتھے دن بھی نہ جاسکی۔ بستر سے اٹھا ہی نہ گیا۔ کیسی کمزوری تھی یا ادا سی۔ جسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نام کے سوا کچھ علم نہیں۔ واجد ماموں

ہمیشہ ٹرانسفر کے چکر میں دوسرے شہروں میں رہتے رہے۔ بیٹیوں کی شادیاں بھی کسی اور شہر میں کر دیں۔ لڑکے غالباً کراچی میں پڑھتے تھے۔ کسی خاندان کی شادی وغیرہ میں بھی نہیں دیکھا۔ وہ اگر۔۔۔ مجھے دیکھنا نہیں چاہتا۔ ملنا نہیں چاہتا تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ کہتے ہیں۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تو صرف میرا دل ہی اس کی طرف کیوں ہمکتا ہے۔ اس ایک نام پر دھڑکن برپا جاتی ہے۔ اسے کیوں میری طلب نہیں ہوتی۔

”تم نے یہ چار دن ضائع کر دیے۔“ آئمہ نے اس سے کہا۔ ”امتحان کے اتنے قریب ایک دن کا ناغہ بھی نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔“

وہ جانتی تھی مگر شادی بھی ضروری تھی۔ ”ہاں یہ آخری دن ضائع ہو گیا۔ زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔“ ایک دن گھر آتے ہوئے آئمہ نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں نے نوٹ کیا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک لڑکا ہمارا پیچھا کرتا ہے۔ کالج سے یہاں تک۔“ اصباح ڈر کر رک گئی۔

”افوہ۔ چلتی رہو۔ ورنہ دادا پوچھیں گے کیا ہوا۔“

”لیکن۔۔۔ وہ کون ہے؟“

”پتا نہیں۔ گلی کے پاس رک کر موٹر سائیکل پر جھک جاتا ہے جیسے خراب ہو گئی ہو۔ میرا خیال ہے۔ وہ دادا کی لائٹھی سے ڈر کر وہیں رہ جاتا ہے۔ پیچھے نہیں آتا۔“

”ہوں ہوں۔“ دادا نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ کیا کھسر پسر ہو رہی ہے۔“

”کچھ نہیں دادا ایسے ہی۔ بس۔“ لودھی اب دادا بھی پابندی لگا رہے ہیں۔

”ایسے ہی کیا۔ میں نے سنا تھا تم لاٹھی کا ذکر کر رہی تھیں۔“ بہرے تھے مگر اتنے بھی نہیں۔

”دادا! اصباح کہہ رہی تھی دادا کی لاٹھی بڑے مزے کی ہے۔ ٹھک ٹھک کرتی ہے۔ کسی کے سر پر لگ گئی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔“ آئمہ نے بات بنالی۔

دادا نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ ”تو کھائے گی؟ مزا لینا ہے۔“



”وہ کھسے کی اوٹ میں کھڑا ہے۔“ اگلے دن پھر آئمہ نے سرگوشی کی۔

”محلے کا ہے؟“ اس نے بھی زیر لب پوچھا۔

”نہیں۔ غیر ہے۔ ورنہ دادا تو پہچان لیتے۔“

”تمہارے لیے آتا ہوگا۔“ اصباح نے کہا۔

”لگتا تو نہیں وہاں کھڑے ہو کر۔ تمہاری طرف دیکھتا رہتا ہے۔“

”ہائے۔ نہیں بھی۔“ اصباح کا تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ لڑکھڑائی۔

”ہاں۔ میں بس سے اترتے ہی اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ اسے مجھ سے نہیں۔ تم سے وہ ہے۔“

”مجھے کیوں نظر نہیں آتا۔“ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”تم کو نظر آتا بھی ہے کچھ۔ منہ ڈھانک کر ناک کی سیدھ میں چلتی ہو۔“

”مجھے یوں اندازہ ہوا کہ تم جب شادی میں گئی تھیں۔ دادا نے پوچھا۔ تمہاری کسہیلی نے کتنے دن کی چھٹی لی ہے۔ میں نے کہا۔ دادا تین دن کی۔ وہ تین دن نہیں آیا۔ چوتھے دن آیا۔ بے چارا۔ تم نے اس دن بھی چھٹی کر لی تھی۔“ دادا کو سمجھانے کے لیے زور سے بولی تھی۔

”خالہ بی کو نہ بتانا۔ وہ میرا کالج جانا بند کر دیں گی۔“

”میرا خیال ہے انہیں بتا دو۔ وہ کوئی حل نکال لیں گی۔ بعد میں کوئی بات ہوئی تو خفا ہوں گی کہ مجھے کیوں نہیں بتایا۔“

مگر وہ خالہ بی سے کہہ کر اپنی شامت بلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ واقعی ادھر ادھر دیکھے بغیر بس سے اتر کر گلی میں گھس جاتی تھی۔ دادا اپنی لاشی ٹھک ٹھکاتے پیچھے ہوتے ہی تھے۔ اب یہ نئی آفت۔ دروازہ خالہ بی نے کھولا۔ سلام کیا۔ جواب دے کر اندر آتے ہوئے بغور

اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔“ (اسے اسے کہتے ہیں اڑتی چڑیا کے پر گنا۔)

”کچھ نہیں۔ وہ گلی میں پیر مڑ گیا تھا۔“ بیٹھ کر نخنہ سلانے لگی۔

”دونوں مڑ گئے تھے؟“ (اللہ جی۔ کدھر جاؤں۔ حماقتیں تو پھر چونکاتی ہیں۔)

”نہیں۔ اس میں تو۔۔۔ کھجلی ہو رہی ہے۔“ دوسرے نخنے سے ہاتھ ہٹایا۔

”اچھا بیٹھو، نہیں۔ منہ دھولو۔ مڑ بگھا دیے ہیں۔“ چاول بھیکے ہوئے ہیں۔ چولہا جلا کر پانی چڑھا، پک جائے تو چاول ڈال کر ڈھکن بند کر دینا۔ سارا مسالا میں نے ڈال دیا ہے۔ راستہ سلا دینے رکھے ہیں۔ میں ذرا یہ رضائی پوری کر لوں۔“

اب غور کیا۔ برآمدے میں پچھلی چادر پر رضائی پھیلی ہوئی تھی۔

”ہا۔ کتنی خوب صورت ہے۔ خالہ بی کس کی ہے؟“ رک کر دیکھنے لگی۔

”تمہیں اچھی لگی۔ لے لینا۔“ مسکرائیں۔

”میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ زعفرانی اور اودارنگ کتنا کھل رہا ہے۔“

”کپڑا رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ چلو رضائی سی لوں۔“

جینز میں رکھ دوں گی۔ ”وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔“ آپ ہی لے لیں۔ کیا ضرورت ہے جب کچھ ہونا ہونا نہیں۔“

”یا گل ہو۔ میں یہ شو خم شو خارنگ کی رضائی استعمال کروں گی اس عمر میں۔“

وہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ خالہ بی متفکر نہ جانے کچھ سن گن مل گئی ہے یا کیا۔ اس دن کے بعد سے تو وہ اور بھی محتاط ہو گئی۔ آئمہ نے ہنس کر بتایا۔

”اوہو۔ منہ ذرا سا کھول لو بھی۔ اس وقت دوپہر میں گلی خالی ہوتی ہے اور وہ تمہیں دیکھ چکا ہے۔“

”ہیں؟ کب؟ مجھے ڈراؤ تو نہیں۔“ اور دو تین دن تک بقول آئمہ کے وہ آیا نہیں تھا پھر کب دیکھا؟ آئمہ نے اصرار کے باوجود اس بات کا جواب

نہیں دیا۔

وہ چاہتی تھی۔ اس سے پوچھے۔ کون ہو۔ کہاں کے ہو۔ یہاں کس کی تلاش میں آتے ہو اور اگر آثمہ کے لیے آتے ہو تو۔۔۔ چلو پھر۔ لیکن میں۔۔۔ نکاح کے چند بولوں کی قیدی ہوں (بے شک اس نے مجھے اور میں نے اسے نہیں دیکھا)۔ لیکن۔۔۔ ہمت کہاں سے لاتی سڑہن بے سکون ہو گیا تھا اور امتحان کی سختی۔

”کتنے پیر رہ گئے ہیں اب تمہارے۔“ خالہ بی نے پوچھ لیا۔

”ف۔۔۔ شکر ہے۔“ اس نے نیند سے مغلوب آنکھیں کھولیں۔ جمالی لی۔

”اس طرح جمالی نہیں لیتے۔ یہ شیطان کی کارستانی ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے بندہ سو جائے اور نماز سے غافل ہو جائے۔“

اصباح شرمندہ ہو گئی۔ وہ بھی نماز ٹال کر سونے کی فکر میں تھی۔ خیر۔ شکر کہ پیر اچھے ہو گئے۔



خالہ بی، ثمنہ آنٹی کے گھر کسی کو فون کرنے گئی تھیں۔ منہ لٹکائے واپس آئیں۔ متفکر اور مشتعل۔

اگلے دن آثمہ نے فون کا عقدہ کھولا۔ ”تمہارے واجد ماموں کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہم اسے بہت سمجھا رہے ہیں۔ سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ اسے یعنی ان کے بیٹے کو بچپن کے رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے چھ سات سال جو کینیڈا، امریکا وغیرہ میں گزارے ہیں تو اس کا آج کل کی لڑکیوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہاں سے اسی لیے آگیا کہ کسی لڑکی کا کیریئر صحیح نہیں لگا۔ اب یہاں۔۔۔ اگر شادی کرے گا تو دیکھ سمجھ کر۔ کیوں کہ یہاں بھی اسے بہت آزادی نظر آرہی ہے۔“

واجد ماموں کی بات خالہ بی نے ثمنہ آنٹی کو۔ انہوں نے آثمہ کو ”آثمہ نے اس کو سنائی۔“

”پھر خالہ بی نے ان کو دھمکیاں اور طعنے دیے۔ یہی کہ تم لوگوں کی آنکھوں پر چربی جڑھ گئی ہے۔ غریب

سمجھ کر یتیم بچی سے نظر چرا رہے ہو۔ اس کی زندگی تباہ کر کے پھر تمہارا بیٹا بھی آباد نہیں ہو گا۔ وغیرہ۔“

اصباح اداسی کے طوفان سے گزر رہی تھی۔ نہ جانے وہ اسے دیکھنے پر کھنے آکیوں نہیں گیا مہراناو، شہر بانو ہی اسے لے آئیں۔ سعیدہ مومانی۔ شاید وہ ہی نہیں چاہتیں۔

امتحان کا آخری دن آگیا۔ دروازے کی بیل بجائی مگر دروازہ ہنوز بند۔ دستک دی۔ ہائے اللہ۔ خالہ بی دروازہ کیوں نہیں کھول رہیں۔ انہیں کچھ ہونہ گیا ہو۔ کہتی رہتی تھیں۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ آدمی بلبلا سے پانی کا۔ ایک ہچکی اور زندگی تمام۔ گھبرا کر گھنٹی پر انگلی زور سے دبا لی۔ دادا پیچھے کھڑے لاشی سے ٹھک ٹھک کر رہے تھے۔

”آرہی ہوں۔ آرہی ہوں۔ صبر کرو۔“ آف ان کی آواز سول ٹھکانے آگیا۔

”چلو۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔“ کہتی ہوئی دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئیں۔ ”میں نکلنے ہی والی تھی۔ چلو تم کو ثمنہ کے گھر چھوڑ دوں۔ ایک جگہ جانا ہے۔“

”نہیں۔ وہ آثمہ تو جاتے ہی سو جائے گی۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ آپ کتنی دیر میں آئیں گی۔“

”گھنٹہ تو لگ جائے گا یا کچھ زیادہ۔ کہہ نہیں سکتی۔ اکیلے میں ڈرو گی تو نہیں۔“

”سو جاؤں گی تو ہوش کہاں رہے گا۔ جاگ جاگ کر۔ برا حال ہے آپ آئیں تو گھنٹی زور سے بجادیں۔ ہاں میں دروازہ اچھی طرح بند کروں گی۔ بغیر معلوم کیے کھولوں گی نہیں۔“

خالہ بی اصل میں کرائے داروں سے کسی بھی برائی کی توقع کر سکتی تھیں۔ گو کہ آج تک ان بے چاروں نے کوئی نازیبا حرکت کی تو نہیں تھی، مگر دشمنی۔ مخالفت میں کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

”اچھا۔ پھر بھی احتیاطاً اطمینان کر لینا۔ فوراً نہ کھول دینا کنڈی۔“ بڑی تیار شیار نظر آرہی تھیں۔ چکن کا سوٹ پہنے سفید برس۔ سفید سینڈل واہ۔ میچنگ۔ اس نے اندر کھس کر دروازہ بند کیا۔ وہ وہیں

پھونکے بغیر ہی یہ خالہ بی آگئی تھیں۔ اور ان کی آواز
صور سے کم نہ تھی۔

”ارے۔ ارے۔ اے بھیا۔ تم ہو کون۔ کیسے
میرے گھر میں گھسے چلے آئے۔ قبضہ کرنا ہے؟ اور
مطلب کیا ہے۔ ہٹو۔ نکلو۔ بلواتی ہوں پولیس کو۔ ابھی
میری ایک آواز پر محلہ دوڑا آئے گا اور یہ لڑکی کدھر
ہے۔ اس نے دروازہ کھولا کیسے۔ جب میں منع کر کے
گئی تھی۔ دفع ہوا اپنے بیک شیٹ لے کر۔ ارے۔
ارے کہاں چڑھا چلا جا رہا ہے منحوس۔“ وقفے کے بغیر
ایک سانس میں بولتی گئیں۔

”اماں میری اماں پیاری اماں۔“ اصباح نے
کھڑے ہو کر بند دروازے کی جھری سے جھانکا
برآمدے میں سوٹ کیس بے ترتیبی سے رکھے تھے۔
ایک نومند نوجوان خالہ بی سے لپٹنے کو تھا۔

”دو موئے۔ خبردار۔ ہٹ پرے۔ میں نہیں جانتی
تو ہے کون۔ مردود نہ ہو تو۔“

سرخ آنکھیں آگ اگلتی آواز۔ اور وہ لڑکا ان سے
لپٹے جا رہا تھا۔ ”اماں معاف کر دو۔ میری اماں۔ میں
ضرار ہوں۔ آپ کا اپنا بیٹا۔ صبح پہنچا ہوں امریکا سے۔
سامان نکلو انے میں دیر ہو گئی۔“

”جو بھی ہو۔ کالے چور کی اولاد۔ میری اجازت کے
بغیر میرے گھر میں گھسا کیوں؟ غضب خدا کا۔ دن
دیہاڑے ڈاکا ڈاکو آگئے۔“

”اچھا۔“ نوی یار! شکریہ۔ تم جاؤ۔ میں اماں کو
منالوں گا۔“ دو سرائی کا گردن ہلاتا باہر کی سمت میڑ گیا۔
ضرار ماں کے جملوں کے بیچ میں بولے جا رہا تھی اور
ایاں کمر پر ہاتھ رکھے خونی نظروں سے اسے گھور رہی
تھیں۔

”وہ۔ آپ کی نوکرانی۔ دروازہ کب کھول رہی
تھی۔ پھر میں نے اسے دھمکایا۔ تو۔ آپ نے بہت
ٹائٹ رکھا ہوا ہے اسے۔“ پھر آگے بڑھا۔ اماں پیچھے
ہٹیں۔ بدک کر۔

”ارے ہٹ منحوس۔ پاس نہ آنا۔ یہی بہت سمجھ
کہ زندہ سلامت کھڑا ہے۔ یہ وہ ڈنڈا دیکھ رہا ہے؟

کھڑی رہیں باہر سے زور لگاتی رہیں بار بار کہ کھل تو نہ
جائے گا دروازہ۔

جب وہ مطمئن ہو گئیں۔ تو اصباح دونوں چٹنیاں
چڑھا کر اندر آئی۔ کپڑے بدلے۔ پگن سے ایک سیب
اٹھا کر کھایا اور کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اب صرف
فراغت کا احساس تھا۔ نہ کوئی سعیدہ موالی۔ نہ کوئی
منکوح۔ نہ گلی میں کھڑا لڑکا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی نیند
کے جھولے جھولنے لگی۔ آہ۔ آزادی گھنٹی کی کرخت
آواز۔ اوف۔ کس نے ایجاد کی ہے یہ خوف ناک
آواز والی چیز اور جب صور پھونکا جائے گا۔ میرے
اللہ۔ تو یہ۔ زبردستی آنکھیں کھول کر لڑکھڑاتی۔ ڈگمگاتی
پہنچی پھر گھنٹی۔ پھر صور پھونکا گیا۔
”کیا ہے۔ کون ہے بھئی؟“

آواز آئی۔ ”میں ہوں۔ ضرار محی الدین۔“

”کون؟ میں نہیں جانتی۔ اگلا دروازہ کھٹکھٹائیے۔“

”ارے میں ضرار ہوں۔ یہاں جو حفصہ بیگم رہتی
ہیں۔ ان کا بیٹا۔ امریکا سے صبح ہی پہنچا ہوں۔ سامان
نکلو انے میں دیر ہو گئی ورنہ صبح ہی آجاتا۔ اماں کو بتا دو۔
ان کا بیٹا ہے اور اگلا دروازہ بھی اسی گھر کا ہے۔ یہ گھر
میرے نانا کا ہے۔ کھولو۔“ ”یا اللہ مشکل آسان کرنا۔
دھبہ وہ تو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ آسے۔ آپ پھر
آجائیں۔“

”ارے واہ۔ اتنا سامان لے کر کہاں جاؤں۔ کھولو
دروازہ ورنہ میں دھکا دے کر توڑ دوں گا۔ میں ضرار محی
الدین پاڈی بلڈر بھی ہوں۔“ کیس واقعی۔ نشانیاں
بھی صحیح بتا رہا تھا۔ اللہ کا نام لے کر دروازہ کھولا۔
سامنے سوٹ کیسوں، مختلف سائز کے بیگوں اور تھیلوں
کا جمعہ بازار لگا تھا۔ ایک مسنڈا سامنے۔ دوسرا سائڈ
میں ادھر نظر جمائے نظر آئے۔ وہ اپنا کام کر کے بکٹ
اندر بھاگی۔ کمرے میں گھس کر سانس درست کرنے
لگی۔

آنے والے نے ایک اچھتی نظر ہی اس پر ڈالی
تھی۔ اتنا سامان؟ پھر دو مردوں کے بولنے کی آواز اور
سامان کی اٹھان۔ اور پھر۔۔۔ سچ سچ قیامت آگئی۔ صور

اس سے سر پھاڑ دیا کرتی ہوں، نہیں تو اتنے سال سے اکیلی کیسے رہتی۔ تیرے جیسوں سے بچنے کے لیے۔ ارے ہٹ مرو۔

ہانپ رہی تھیں۔ وہ جھکا ہوا ان کی ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ اب آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ شاید اس کے آنسو خالہ بی کے پیروں پر گرے۔ کچھ نرم پڑیں۔
”اچھا۔ چھوڑ مجھے وہ سامنے والا کمرہ خالی ہے۔ اس میں اپنا یہ کباڑ لے جا کر رکھ۔“
”اماں! معافی۔ پہلے معاف کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

”اچھا۔ اچھا۔ چل اوھر۔ اتنے برسوں کی معافی۔ ایک دن میں نہیں ملا کرتی۔ سنا۔ اللہ کے آگے بھی ماتھا گھسنا۔ ناک رگڑنی ہوتی ہے۔ پھر اس کی مرضی۔“
”میں بھی ماتھا رگڑتا ہوں اماں! سچی۔ نماز پڑھتا اور غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔ بہت بڑی خطا کی تھی میں نے۔ بہت یاد آتی تھیں آپ۔ آپ کے ہاتھوں کا بنا ہوا حلوہ اور کرارے پرانے۔ اور۔ اچار۔ اب بھی بناتی ہیں؟ صبح صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ خوشی کے مارے کہ اماں کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔“

خالہ بی نے ہاتھ سے گویا مکھی اڑائی۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔ کمرے میں سلمان رکھ دے۔ کھانا لاتی ہوں۔“ وہ مڑیں۔ وہ مسکرایا۔
”اچھا۔ تو آپ کو امید تھی میرے آنے کی۔ تب ہی میرا کمرہ ابھی تک خالی ہے۔“

”سوچ رہی تھی اس کمرے کو کام میں لے آؤں۔ ایک کتا لا کر باندھ دوں۔“ سختی سے کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھیں۔

”مگر۔ اب ضرورت نہیں۔ ایک خچر آگیا ہے۔“
پھر کچن کا ارادہ چھوڑ کر دوسری طرف چلیں اب ان کا رخ اصباح کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔ دروازہ کھول کر اسے گھورنے لگیں۔ ”یہ کیا حرکت تھی تمہاری؟“

وہ ڈر گئی۔ بہت غصہ تھا چہرے پر۔ ”کتنا ہی منع کرو۔ تم پر اثر نہیں ہوتا۔ کیوں کھولا دروازہ؟ جوان

جہان دو دو مروئے گھسالیے گھر میں۔“

”خالہ لی! وہ بہت زور سے دروازہ بجا رہے تھے۔ گھنٹی بھی۔ کہہ رہے تھے توڑ دوں گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ ضرار محی الدین ہیں۔ تو۔ ہاں۔ کہا حفصہ بیگم کا بیٹا۔ تو پھر۔“

”اچھا۔ کوئی کتا آکر بھونکے کہ میں حفصہ کا بیٹا ہوں تو۔ اگر جو وہ خبیث کرائے وار کا بیٹا یہ کہہ کر آجاتا گھر میں۔ قبضہ کر لیتا پورے گھر پر۔ پھر کہاں جاتیں تم اور کہاں جاتی ہیں۔“

”سوری خالہ لی! مگر۔ میں اتنی پاگل بھی نہیں ہوں۔ انہوں نے۔ پھر آپ کشتیں میرے بیٹے کو باہر کیوں کھڑا رکھا۔“

”وہ میرا بیٹا ہو۔ یا کالے چور کا۔ تمہیں کھولنا نہیں چاہیے تھا۔ نیند پوری ہوئی؟“
”ابھی نہیں۔“

”خیر۔ کھانا پکا رکھا ہے۔ گرم کرو۔ بعد میں سو جانا۔ کھانا کھا کر۔“

نہ اس کا دل کھانے کو چاہ رہا تھا۔ نہ گرم کرنے کو، مگر نیند کا خیال دور بھگا کر کچن میں آگئی۔ واہ۔ قورمہ اور کٹھی وال خشک۔ ایک بونی تو اس نے گرم کرنے سے پہلے ہی منہ میں ڈال لی۔ ہزار حنیا کٹا رکھا تھا۔ وہ وال اور قورمے میں ڈالنا تھا۔ ڈشوں میں نکال رہی تھی تو خالہ بی آگئیں۔

”میں لے جاتی ہوں۔ تم یہیں کھا لینا۔ اچار لینے آئی ہوں۔ نامراؤ کو پہلے اچار کی طلب ہے اور اس کا چکھنا بھی چار پانچ پھاٹکوں کا۔ دو دن میں ختم کر دے گا۔“ لبوں پر دبا دبا تبسم بھی تھا۔ ماں آخر ماں ہی ہوتی ہے۔ سالوں سے امریکا کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ آتے ہی ماں کے قدموں پر گرا۔ پتا نہیں خالہ بی نے کتنا معاف کیا۔ اتنی آسالی سے تو معاف کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔

اس نے کچن سمیٹا۔ پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سلیب پر پلیٹ رکھ کر کھارہی تھی تو خالہ بی برتن رکھنے آئیں۔

”کھانا کھا کر نماز پڑھ لینا“ پھر سو جانا میں ذرا اٹھی طرح اس کی خبر لوں۔ سارا قورمہ ڈال اور اچار چٹ کر گیا۔ نہ جانے امریکا میں فافے کر رہا تھا کیا؟ دو وقت کا کھانا تھا۔ سب ختم۔“

”برتن دھو کر کچن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھ کر بستر پر گری اور بے سدھ ہو گئی۔ شام کو آنکھ کھلی۔ سستی سی تھی۔ عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا جلدی سے ابھی نماز سے فارغ ہو کر کچن میں آئی۔ خالہ بی بریانی کی تیاری کر رہی تھیں۔ بیٹے کی خاطر داری۔ وہ چاول دھو رہی تھی تو جمائی لیتا بولتا ہوا آگیا۔“

”کیا یک رہا ہے۔ اتنی خوشبو۔ اماں چائے مل جائے گی کڑک۔“ یک لخت ٹھٹھک گیا۔ اصباح پر نظر پڑی۔ سیٹی بجانے اور آنکھیں مٹکانے لگا۔

”واہ اماں! افو۔ نوکرائی تو بڑی شان دار رکھی ہوئی ہے۔“ کہیں سے لگتا نہ تھا کہ امریکا کی ہوا اس کو لگی ہے۔ ایسی اردو۔ لہجہ بھی خالص۔

اصباح کو جلال چڑھا۔ اس نے خالہ بی کی پروا کیے بغیر کہا۔ ”شٹ اپ۔“

”او۔ انگلش جانتی ہے۔ واہ۔“ خالہ بی نے گرم کفگیر اس کے بازو پر لگایا۔ ”بی اے کر چکی ہے۔“ اچھل پڑا۔ گرم کفگیر بازو کو سرخ کر رہا تھا۔

”اماں جی۔ اتنا ظلم تو نہ کرو۔ برسوں کے بعد بیٹا آیا ہے اس کو یہ۔“ نگلی پھیر رہا تھا بازو پر۔

”جیسا کرو گے۔ ویسا پھل پاؤ گے۔ سن لو۔ پانچ برس بعد آئے ہو۔ یا دس برس بعد۔ مجھ پر احسان نہیں ہے۔ شریفوں کی طرح زبان قابو میں رکھو۔ ورنہ جہاں جی میں آئے چلے جاؤ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ خالہ بی صاف بات کرتی تھیں۔

”نہیں۔ میں۔ چلا جاؤں؟ آہ۔ آپ یہ کہہ رہی ہیں۔ اس۔ اس۔ اس نوکرائی کی خاطر۔“

اصباح کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ وہاں سے باہر آگئی۔ اب گرم چائے کا مک اس کے بازو کو مزید سینک رہا تھا۔ اچھل پڑا۔ غنیمت تھا کہ چائے گری نہیں۔

”اور سن لو۔ پرانی لڑکی میری ذمے داری پر رہ رہی ہے۔ بیٹی ہے میری۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو انجام کے خود ذمے دار ہو گے۔“

”اماں۔ آتے ہی یہ سلوک۔ بیٹا ہوں۔“

”بھول چکی ہوں کہ میرا کوئی بیٹا تھا۔ آگئے ہو تو اپنا خون اور رشتہ ثابت کرو۔ نکلو یہاں سے۔ کمرے میں جاؤ۔“

جھاڑ کھا کر کمرے میں گھس گیا۔ اب وہ سوچ رہی تھیں اسے رہنے کی اجازت دے کر۔ غلطی تو نہیں کر دی۔ اصباح کی موجودگی۔ چھ سال میں عادات بدل جاتی ہیں۔ آزاد ماحول کی چکا چوند۔ آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔ اصباح نے خود حماقت کی۔ نہ کھولتی دروازہ، پانچ منٹ بعد میں آہی گئی تھی۔ ہرگز اندر آنے نہ دیتی۔ اصباح کا بندوبست کرنے کے بعد۔ بلاتی۔ اب کل کچھ کرنا پڑے گا۔

وہ ماں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔ اصباح پلیٹ میں بریانی لے کر کمرے میں آگئی۔ خالہ بی نے آکر کہا۔

”آج تم میرے کمرے میں سو جانا۔“ اکثر وہ اسے اپنے کمرے میں سلا لیتی تھیں۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔

”میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ کچھ پڑھنا ہو تو کتاب لے آنا۔“ مزید ہدایت۔ کتاب؟ اف، بمشکل تو جان چھوٹی ہے کتاب سے۔

وہ بھی نماز کی تیاری کرنے لگی۔ خالہ بی کی نماز کی چوکی برآمدے میں تھی۔ زیادہ سردی ہوئی تو اپنے کمرے میں چوکی رکھ لیتی تھیں۔ جب تک خالہ بی وضو کر کے چوکی تک پہنچیں اس کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ ان کے کمرے میں جانے کے لیے اپنا تکیہ اٹھا رہی تھی کہ ضرار نے اندر جھانکا۔

”کھانا کھا لیا تم نے؟ آؤ ذرا واک کرتے ہیں۔ پتا نہیں کیسے بھاری دل سے پکائی تھی۔ بہت بھاری پن ہو گیا بریانی سے۔“

”نہیں۔ وہ خالہ بی نے مجھے بلایا ہے۔ میں۔ خالہ بی نے دیکھ لیا تو مسٹر تم ہی بھگتو گے۔“

”وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ جب تک ہم واک کرتے

ہیں بھئی، مجھے کمپنی چاہیے۔ یہاں تو جگہ۔ کم ہے چلو۔ چھت پر ٹھنڈی ہوا ہوگی۔“

اسے دروازے میں جمادیکھ کر وہ رک گئی۔ ”نہیں جی۔ اوپر میں نہیں جاتی۔ میں واک نہیں کروں گی آپ جامیں۔“

وہ یک دم آگ بگولہ ہو گیا۔ ”کیسے نہیں کروگی۔ تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔ مجھے کوئی انکار کرے۔ میں برداشت نہیں کرتا۔ غصے سے بچو میرے۔ سنا۔ آؤ۔“ ہاتھ بڑھا رہا تھا اس نے جھانکا۔ خالہ بی نیت باندھ چکی تھیں۔

”دیکھیے۔ مجھے خالہ بی بلا گئی ہیں اور میں چھت پر نہیں جاتی۔“ نرمی سے کہا اور اگر اسے پھر غصہ آگیا سنہ جانے کیا کرے گا۔

”آہا۔ اچھا۔ تو چلو۔ میرے کمرے میں سہی۔ بہت سارے تحفے لایا ہوں جو تمہیں اچھا لگے لے لینا۔“

اندر آگیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ”نہیں۔ نہیں چاہیے کچھ۔“

وہ پھر غصے میں آگیا۔ اب اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ ”نہیں کیسے۔ تمہیں بتا ہے وہاں امریکا میں لڑکیاں میرے پیچھے پاگل تھیں۔“

”آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔ بری بات ہے۔“

”کیسے چھوڑوں؟ امریکا میں کیسی کیسی لڑکیاں ہیرے جواہرات جیسی چمکتی دھمکتی چھوڑ آیا۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔ انکار کرتی ہو۔“ اس کی گرفت نے اصباح کو بے بس کر دیا۔ پھر بھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ ہٹا کٹا۔ آخری کوشش۔

”خالہ بی۔ خالہ بی۔“ سٹی جیسی آواز حلق سے برآمد ہوئی۔ ضرار کو شاید اس کھینچا تالی میں لطف آ رہا تھا۔ وہ ہاتھ کھینچتے ہوئے پلنگ پر گر کر ہاتھ نہیں

چھوڑا۔ اصباح کو لگا اس کی آستین پھٹ گئی ہے۔ وہ دوہری ہو کر طاقت لگا رہی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ پر کاٹنے کی بھی کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا۔ اصباح کا بازو

سن ہو گیا تھا۔ پھر یکدم کھڑے ہو کر اس نے ایک لالت

اس کے پیٹ پر جمائی۔ وہ اٹھنے لگا تکلیف سے۔ اسی وقت خالہ بی اندر گھسیں۔ سہرا آگئی تھی۔

”چھوڑ۔ چھوڑ اس کا ہاتھ گھٹیا ڈلیل انسان۔“

خالہ بی شیرنی کی طرح اس پر حملہ کر چکی تھیں۔ اصباح کو کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ ہاتھ چھڑا چکی تھی اور وہاں سے نکل کر بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی۔ اسے اس شخص کے درد میں ڈوبی ہائے سنائی دی، مگر رکنے کا موقع نہ تھا۔ گھبراہٹ میں دروازے کی چوٹی بھی کھل نہیں رہی تھی، مگر کھل گئی۔

وہ گلی میں نکل آئی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ کھبے کا بلبل تاریکی میں دور کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اس وقت اسے نہ اندھیرے سے ڈر لگانہ سناٹے سے۔ وہ شینہ آئی کے گھر کی گھنٹی بج رہی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا سا تھا۔ دروازہ ناجیہ نے کھولا۔ وہ اندر گھسی بلکہ تقریباً ”گر پڑی۔ آٹھ۔“ نے آکر اٹھایا اور شینہ کو آواز دی اور اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اب آٹھ، ناجیہ، شینہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ پوچھ رہی تھیں۔ اصباح کا گلاب بند ہو گیا تھا۔

”اصباح باجی کہاں ہیں؟“ اسے شینہ کی آواز سنائی دی وہ نڈھال وہیں پلنگ پر گر گئی۔ ناجیہ گلو کو زپانی میں ڈال کر لے آئی۔ پانی لی کر اوسان بحال ہوئے۔ شینہ اس پر آیات پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ پھر اس نے کچھ انہیں بتایا مگر وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیا کہہ رہی ہے۔

شینہ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ ایک آدی۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔ پھر وہ بھاگی۔ آخر باجی کہاں تھیں۔ آدی کہاں سے آیا۔ وہ کون تھا؟

”ان۔ ان۔ خالہ جی کا بیٹا۔“

شینہ کی چیخ نکل گئی۔ ”بیٹا۔؟“ پھر اطمینان سے بولیں۔ ”چلو۔ پھر وہ اس سے خود نمٹ لیں گی۔ بڑے بڑوں کو سیدھا کر چکی ہیں۔“

اصباح کی کپکپی رکی۔ تو حواس درست ہوئے۔ پھر اس نے آنسوؤں کو بننے دیا۔ بے بسی، بے چارگی۔

”بیٹا! اصباح کو تمہیں دے دو۔ اور تم لوگ سو جاؤ۔“

فکر نہیں کرو۔“

آٹھ نے اس کی پھٹی ہوئی آستین کو دیکھا جہاں مردانہ ہاتھ۔ طاقت ور ہاتھوں کی سخت گرفت کی سرخی بازو پر موجود تھی۔ تھر تھراتے ہاتھوں سے اصباح نے آٹھ کی قمیص پسلی اور پھر سے روئے لگی۔ کسی مرد کے ہاتھوں نے پسلی بار اس کے ہاتھ کو اتنی طاقت ہوتی ہے؟ مرد میں۔

”اچھا اب رونا دھونا بند کرو۔ ابا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ ویسے بھی تم نے گھنٹی بجا کر اور اندر جو ہم نے شور کیا۔ وہ تو شکر ہے ابا اٹھے نہیں۔ پریشان ہو جاتے۔ بڑے بھائی، بھابھی تو اوپر کے پورشن میں رہتے ہیں۔ شاہد زاہد دادا کے کمرے میں ان تینوں کی نیند۔ ڈھول بجانے سے کم میں نہیں کھلتی۔ مگر ابا۔“

اصباح نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”سوری آٹھ۔ میں۔ ڈری ہوئی تھی۔“

چند منٹ بعد۔ خالہ بی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ شیمہ منتظر تھیں۔

”اصباح آگئی؟“ یوں جیسے معمول کی بات ہو۔

”باجی۔ ہوا کیا ہے؟“ شیمہ بے چینی سے پوچھنے لگیں پر کسی سے ہمدردی میں کوئی نقصان نہ کر بیٹھیں۔

”بتاؤں گی، مگر ابھی تو مجھے جانا ہے۔ آؤں تو دروازہ کون کھولے گا۔ شاید دیر ہو جائے۔“

شیمہ نے تسلی دی۔ ”میں کھولوں گی۔“ پوچھ نہ سکیں۔ کہاں جانا ہے۔ بیٹا کہاں ہے؟

”اپنا گھر سے بند کر کے۔ اچھی طرح سے بند کر دیا ہے نا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں۔ ابھی تو اس بے ایمان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑا ہے۔ کمرے لاک ہیں۔ اچھا اصباح کو تسلی دیتا۔ میں بھی یہیں رہوں گی آج۔“ باہر سے کسی نے پکارا۔

”آئی! جلدی کریں۔“

شیمہ حیران۔ یہ تو ان کے کرائے دار کے بیٹے کی آواز ہے۔ نہ جانے کیا کر رہی ہیں اور کرائے دار کے

بیٹے کے ساتھ کہاں جا رہی ہیں۔ ہیں؟ ایسبولینس کی آواز۔ اللہ خیر کرے۔ کچھ دیر پہلے بھی ایسبولینس کا ہارن سنائی دیا تھا۔ اس وقت وہ اصباح کے پاس تھیں۔ غور نہیں کیا۔ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئیں۔ جاگنے کا بہانہ۔ جب تک باجی آنے جاتیں۔ انتظار افسانہ نہ جانے کس پڑوسی کو اسپتال لے گئی ہیں، حفصہ بیگم تنہا سخت زندگی گزار رہی تھیں۔ تنہائی کے تدارک کے لیے کرائے دار رکھ لیے، لیکن وہاں بھی دھوکا ہوا۔

بدرجہ مجبوری اصباح کی ذمہ داری اٹھائی۔ ان سے زیادہ قریبی رشتے دار کوئی نہ تھا۔ اس کے چچا تھے، مگر وہ بھی مصباح کو شاید غیر یا غاصب سمجھ کر اس بیٹی کو اپنا نہ سکے یا بھرجوان بھٹیجوں کی حمایت۔ حفصہ کے لیے مشکل فیصلہ تھا، لیکن حق ان ہی کا تھا۔ یوں بھی مصباح اپنے حصے سے دستبرداری اختیار کر کے حفصہ کو مالک بنا چکی تھی۔ اس کا احسان۔ پھر اصباح کو گھر کا حصہ دینے کا ارادہ کر کے۔ بچی کی یتیمی اور بے سہارا پن۔ ماں باپ سے محروم۔ باپ کے گھر سے بے دخل۔ ان کا دل بچی کے لیے تڑپ گیا، لیکن دنیا کی بے ثباتی۔ خود غرضی اور ریا کاری سے خوف زدہ۔ اس پر پابندیاں لگاویں۔ وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ دوستوں سہیلیوں کو بلانا منع۔ زور سے بولنا، زور سے ہنستا، رشتے داروں سے ملنے کے لیے بھی خالہ بی کا وجود ضروری۔ وغیرہ۔

کرائے دار کے لڑکے سے خوف زدہ، یہ نہیں جانتی تھیں کہ بیٹا بھی راہزن ہو گا۔ اس دن ہزار بدایتیں دے کر کھانا تیار کر کے وہ واجد بھائی سے ملنے گئی تھیں۔ لڑ بھڑ کر آئیں۔ ان کا بیٹا سامنے نہیں آیا۔ یا وہ تھا ہی نہیں۔ گھر آکر دیکھا۔ اپنا بیٹا موجود۔ معہ سامان۔ لاکھ خفگی سہی۔ ماں کا دل گداز جذبوں سے لبریز، مگر وہ گھٹنے بعد ہی سوچنے لگیں۔ امریکا کے تنگ دھڑنگ ماحول میں چھ سال گزار کر آنے والا۔ نہ جانے کس قماش کا ہو گا۔ بگڑنے میں پل نہیں لگا۔ سدھرنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔

اور ان کا دوسو سو، وہم سچا تھا۔ رات ابھی گزری نہ

تھی۔ واردات ہو گزری۔ اصباح کی چیخ نماز کے دوران سنی۔ بغیر دیکھے سمجھ گئیں۔ ڈنڈا برآمدے میں رکھا رہتا تھا۔ اٹھا کر درانہ کمرے میں گھس گئیں۔ چھوڑ۔ چھوڑ اس کا ہاتھ۔ مضبوط تو اتنا مرد۔ ماں کی آواز کی کیا پروا کرتا۔ اصباح جدوجہد کے دوران زوردار لات اس کے پیٹ کے پچلے حصے میں مار چکی تھی۔ اس کا غصہ اور تکلیف۔ ضد ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں لائے بغیر لڑکی کو کھینچا۔ اور ماں نے ڈنڈا رسید کیا پیروں پر لگا۔ وہ ذرا سر جھکا کر اٹھنے لگا کہ دو سرا ڈنڈا۔ عین سر پر۔ اصباح ہاتھ چھڑا کر بھاگ چکی تھی۔

حفصہ بیگم کو اپنی طاقت کا پہلی بار احساس ہوا۔ جب بیٹا چیخ کر دہرا ہوا اور پلنگ سے لڑھک کر نیچے گر آئیں گے سر سے خون بہا۔ چہرہ تر ہوتا گیا۔

”کیا سمجھتا ہے۔ میں اتنی کمزور ہوں۔ جان لے سکتی ہوں۔ عزت کے عوض۔“ ان کا سانس تیز ہو رہا تھا۔ ”بد بخت۔“

کیڑے کی طرح سر تھامے زمین پر سکڑا پڑا تھا۔ طاقت اتنی تھی تو نہیں۔ پھر یہ کہاں سے آئی۔ شاید۔ اس ذمے داری کے احساس نے۔ جو وہ اصباح کے لیے دل میں رکھتی تھیں۔ بے پناہ محبت۔ مامتا۔ ممنونیت۔ جو اس کی ماں نے ان پر احسان کیا تھا۔ جب وہ بے سہارا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ یک لخت انہیں بیٹے کا خیال آیا۔ یہ بہتا ہوا خون۔ کس کا تھا۔ ان کا اپنا۔ ماں کے دودھ سے کشید کیا ہوا خون۔

وہ ڈنڈے سمیت صحن میں دوڑیں۔ درمیان کی دیوار میں کھڑکی جو عرصہ دراز سے بند تھی۔ زور زور سے ڈنڈے سے بجائی۔ کبھی سوچا نہ تھا۔ یہ کھڑکی اس لیے بنائی ہے کہ کبھی اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ اس قسم کی مدد کے لیے۔ کھڑکی کھل گئی۔ چیران پریشان کرائے دار کا بیٹا۔ جسے مردود۔ مستنڈا کہتی تھیں۔

”جی۔ جی۔ خیریت۔“ کہتا ہوا۔

”تمہارے پاس فون ہے؟ ذرا یہ قریب والے اسپتال فون تو کرو۔ ایسبوی لینس منگوا لو۔“

”خے۔ خے۔ خیریت۔ تو ہے۔ خا۔ خالہ جی۔“

حواس باختہ ہو گیا۔

”اوہو۔ تم تو ہکلمے ہو۔ گھنٹہ لگا دو گے۔ نمبر ملا کر مجھے دو ذرا۔“ وہ ہکلتا نہ تھا، مگر ”ڈشمن خالہ“ کے بے وقت درشن اور خطرناک فرمائش۔ بجلی کٹا دی۔ پانی کٹا دیا۔ مقدمہ کر دیا اور اب۔۔۔ جلدی سے نمبر ملا کر انہیں موبائل دیا۔ انہوں نے ایسبوی لینس طلب کی۔ ایڈریس بتایا۔ فون واپس کر دیا۔

”جج جی خالہ جی۔ کون مریض ہے؟“ خالہ جی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی اپنے صحن میں ہی کھڑا تھا۔ اجازت ملتے ہی خالہ جی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اندر کا سین بہت خوف ناک تھا۔ چیخ نکل گئی۔ ”آ۔ آپ نے قتل کر دیا۔“

”نہیں بھئی۔ ڈنڈا مارا تھا۔ میرا بیٹا ہے۔ آج امریکا سے آیا ہے۔“ حیران لڑکے نے آگے آکر ضرار کو دیکھا۔ فرش پر خون پھیل رہا تھا۔ ”آپ نے۔ سر پھاڑ دیا بیٹے کا۔“

”ہاں۔ غلط جگہ لگ گیا۔“

”مگر۔ خالہ جی۔ اس طرح تو ڈاکو کو ہی۔“ ایسبوی لینس آگئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لڑکا ایسبوی لینس والوں کو راستہ بتانے باہر گیا۔ کھڑکی میں نوید صاحب لڑکے کے ابا جان ’سوالیہ نشان بنے کھڑے تھے۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”تمنا شا ہو رہا ہے۔ آئیے۔ آپ بھی نظارہ کر لیں۔“

اور وہ آگے۔ ضرار کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔

”یہ۔ یہ تو آج صبح۔ میں نے دیکھا تھا۔ ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔“

”اچھا سنہیے۔ میں اس کے ساتھ اسپتال جا رہی ہوں۔ آپ کھڑکی کھولے رکھیں پورا گھر آپ کے حوالے میں شاید صبح آؤں۔“

وہ حیرت سے اس عورت کی مضبوط قوت ارادی اور قائم ہوش حواس دیکھ رہے تھے۔ کمروں میں لاک لگا رہی تھیں۔ اس حال میں بھی۔

بھابھی کے ہتھکڑی لگے دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ تمہیں انعام بھی دے گا۔“

”ک ک کون۔ آئی جی یعنی کہ۔“

”یعنی کہ میرا دیور نثار حسین۔ اس لڑکے یعنی کہ زخمی کا سگا چچا۔“ سنتے ہی ڈاکٹر فوجی ہو گیا۔ زخمی کی دیکھ بھال۔ مزاحم پٹی اس پر فرض تھی۔ زخمی کے پٹی ہو گئی۔ انجکشن لگ گیا۔ ڈرپ لگا دی گئی۔ زخم بہت گہرا نہ تھا مگر خون کافی بہہ گیا تھا۔

”اب میں گھر جاؤں؟ یا پولیس آئے گی؟“ مطمئن ہو گئی تھیں۔

”آپ۔۔۔ واقعی اس کی ماں ہیں؟ اس کے پاس رہیں گی نہیں؟“ ڈاکٹر مشکوک تھا۔

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اس کو تمہارے پاس تمہاری ذمہ داری پر چھوڑ کر جاؤں گی۔ سن لو۔ آئندہ بھی ایسا ممکن ہے۔ میں شرمندہ نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر ان کے رعب میں آگیا۔ ڈکٹیٹر۔ ضرار کو ہوش آگیا تھا۔ اماں کہہ کر بیٹھے لگا۔ نرس نے پھر لٹا دیا۔ انہوں نے اس کے پٹی میں بندھے سر کو دیکھا۔ نہ جانے کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ دل دکھ سے بھر گیا۔

”اب میں گھر جا رہی ہوں۔“ بیٹے کے سر پر پٹی کو نرمی سے چھوا۔ آنسو حلق کے اندر اتارے۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں لجاجت کے پیغام ارسال کیے۔

”رک نہیں سکتی۔ یہاں یہ نرسیں ہیں۔ ڈاکٹر ہے۔ تمہاری دیکھ بھال کر لیں گے۔ صبح آؤں گی۔ ناشتہ لے کر۔“

اسپتال کے گیٹ پر کرائے دار کا بیٹا کھڑا تھا۔ متفکر سا۔ (پولیس دیکھ کر دوڑ لگا دوں گا۔ سوچ لیا تھا۔)

”ٹیکسی روک لو۔“ آرڈر ملا۔

”سب ٹھیک تو ہے جی۔۔۔“ گھبرائے ہوئے کرائے دار نے پوچھا۔ جواب ”ہوں“ میں ملا۔ ٹیکسی میں گھر آئیں۔

”سنو! اے لڑکے کیا نام ایسا کرو اپنے گھر کے دروازے سے اندر جاؤ۔ کھڑکی کے راستے میرے کمرے کے برآمدے میں سو جانا اور ہاں۔ ٹین کیٹ۔ یہ والا

”دروازے اندر سے بند کر لیں۔“ دو آدمی ضرار کو اسٹریچر پر لے جا چکے تھے۔ حواس قائم رکھنا ان کی مجبوری تھی گھر جو دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔ ڈوری سے تولیہ بھی کھینچ لیا۔ پھر ہر نکل کر ٹمینہ کا دروازہ۔ وہاں سے۔ آکر لڑکے سے کہا۔

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“ وہ بدک گیا۔ پہلا شک تو یہی تھا کہ اسے کہیں قتل کا ذمہ دار نہ ٹھہرا دیں۔

”جی۔ یہ تو پولیس کیس ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”اوہو۔ تم اسپتال کے دروازے پر کھڑے رہنا۔ میں رات میں اکیلی واپس کیسے آؤں گی۔ چلو۔“

ادھر ایسویٹس والے نے جلدی مچائی۔ مریض بے ہوش ہو گیا۔ ضرار کے ساتھ بیٹھ کر اسے دیکھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ تولیے سے چہرہ صاف کرتی گئیں۔ آنسو بہاتی گئیں۔ یہ وہی چہرہ ہے جس کو دیکھ دیکھ کر زندگی کی دعا مانگا کرتی تھیں۔ اس کے گھنے بالوں میں منہ گھسا کر لوریاں دیتی تھیں۔ بچپن سے نوجوانی تک کے کتنے ہی سین فلم کی طرح سامنے سے گزر رہے تھے مگر اسپتال آگیا تھا۔ ایمر جنسی میں ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہہ دیا۔

”یہ تو سرا سرا تمام قتل کا کیس ہے۔“

”چھا! پھر بلا پولیس کو۔ لگا دو ماں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ میں نے سہر زلش کے لیے ذرا سا ڈنڈا گھمایا۔ بس آج کل کی نازک اولاد۔“

”سچ بتائیں۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ سگی اولاد۔ آپ نے خود اس کو زخم لگایا ہے۔ کوئی اور۔“

”کوئی اور میرے بیٹے کو ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ سر نہ پھاڑوں گی اس کا۔ پھر بد تمیزی کرے گا یہ۔ تو پھر پٹے گا۔“

”آپ تو۔ لگتا ہے۔ عادی ہیں۔ میں مجبوراً“

پولیس سے رابطہ۔ ڈاکٹر ان کو سمجھ نہ سکا۔

”چھا بھئی۔ پہلے زخمی کا حال دیکھ لو۔ پھر بے شک پولیس بلا کر میرے ہتھکڑی لگا دینا اور اس سے پہلے ذرا نیچے اپنا فون دو۔ میں یہاں کے آئی جی کو بلا لوں۔ بڑی

(اشارہ کیا) اندر سے چٹختی کھول دینا۔ میں باہر سے لاک کر کے جارہی ہوں۔ صبح سویرے آؤں گی خود ہی کھول کر۔ ناشتا بنا کر اسپتال لے جاتا ہے۔ ”وہ گردن ہلاتا رہا۔“

کیا مجبوری ہے۔ کنبھوس کو چوکیداری سونپ دی۔ کل تک جن کو غاصب بے ایمان قبضہ گروپ کہہ کر بدنام کرتی تھیں۔ مرو کا سہارا بھی ضروری ہے۔ ایک اپنا بیٹا ہے۔ دوسروں کو الزام دینے کا یہ صلہ ملا کہ اپنا بیٹا ہی ڈاکو بن گیا۔

ثمینہ نے پہلی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ ہمدرد ہستی۔ فکر مند چہرہ۔ ان کی برداشت جواب دے گئی۔ ثمینہ کے گلے لگ کر لڑکھڑا گئیں۔ ثمینہ گھبرا گئیں۔ سہارا دے کر اندر لائیں۔ لی دی بند کیا۔ ساتھ لپٹ کر بیٹھیں۔ وہ بھی اپنا دکھ آنسوؤں کی زبان میں بیان کرنے لگیں۔ ثمینہ نے نپانی پلایا پیٹھ سہلائی۔

رات کا سناٹا۔ ماں کی ورد بھری فغاں۔ ثمینہ کا دل بھر آیا۔ نہ جانے کیا ہوا ہے جو باجی جیسی مضبوط چٹان میں دراڑ پڑ گئی۔ آنسوؤں کی برسات پہلی بار دیکھی تھی۔

”باجی! دل سنبھالیں۔ مجھے بتائیں ہوا کیا ہے۔“
اولاد کا جرم۔ اپنی سنگدلی۔ مجبوری کی داستان کن الفاظ میں سنائیں، لیکن بوجھ ہلکا نہ کیا تو۔ آہستہ آہستہ سنائی چلی گئیں۔

تجی۔ کھری مضبوط ایمان کی مالک عورت۔ ماں بعد میں تھی۔ فرض شناس عورت پہلے۔ ثمینہ تاسف میں گھر گئیں۔ کیا قسمت ہے اس عورت کی۔ تنہا عمر گزار دی شوہر دعا دے گیا۔ بیٹے نے آتے ہی یہ گل کھلائے۔ ان کا بیٹا بھی کئی سال بعد آیا تھا۔ شادی کر کے۔ اب میاں بیوی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا بیٹا پہلے دن ہی اسپتال پہنچ گیا۔ ماں کے ہاتھوں۔ خدایا رحم کر۔ ”مہوش میں تو تھا۔؟“

”ہاں۔ اس کی فکر نہیں ہے، مگر جو کرائے داروں کے سپرد کر کے آئی ہوں۔“

”یہ کیا غضب کیا آپ نے۔“

”ثمینہ! اس گھر میں جانے کو دل نہ چاہا۔ کمرے میں اس کا خون۔“ سر جھکالیا۔ آنسو ٹپکنے لگے۔ پھر سراٹھا کر پوچھنے لگیں۔ ”اصباح۔ ٹھیک ہے؟“

”جی۔ پہلے روتی رہی۔ پھر آٹھ منے بہلا لیا۔ سو گئی ہیں دونوں۔“

”اچھا۔ یہ وقت بھی آنا تھا۔“ سرو آہ۔ ”جس بڑے وقت سے بچانے کے لیے اسے پردوں میں چھپا کر رکھتی تھی۔ یہ خبر نہ تھی۔ میری ہی اولاد۔“ آواز گلے میں پھنس گئی۔

ثمینہ نے تسلی دی۔ ”چلیں جانے دیں۔ اللہ مالک ہے۔ آپ آرام کریں۔ فکر نہ کریں۔“ وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئیں۔

ثمینہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ تاسف۔ عورت کے نصیبوں کے سارے کھیل ہیں اور اب۔ اس بچی کی حفاظت کا مسئلہ۔ نہ جانے کیسے رشتے دار ہیں۔ بچی کو درمیان میں لٹکایا ہوا ہے۔ اللہ اس کے لیے بہتر راہ نکالے۔ وہ تو سو گئیں۔

حفصہ بیگم کی نیند اڑ گئی۔ لاؤنج سے متصل ایک چھوٹا واش روم تھا۔ وہاں جا کر وضو کیا اور تہجد ادا کرنے لگیں۔ دعا میں اور دُخیفے۔ پھر فجر ہو ہی گئی۔ دروازے کھلنے کی آواز۔ ثمینہ کے میاں مسجد جا رہے تھے۔ شاید زائد کو بھی جگا کر لے جاتے تھے۔ کتنا اچھا ماحول ہے۔ امن، محبت، سیدھا سا وہ گھرانہ، ہمدرد لوگ، ایک میں ہوں فکر میں مبتلا۔ اطمینان نصیب ہی نہیں۔ اصباح کی طرف سے ہی کم فکر نہ تھی کہ بیٹے نے پریشان کر دیا۔ بیٹا کسی قابل ہوتا۔ اصباح کی اب بھی اس سے ہو سکتی تھی۔ خلع کے بعد واجد بھائی نے اطمینان نہیں دلایا نہ مایوس کیا۔ عجیب مبہم سا جواب دیا۔ بھئی آپ کا بیٹا انکار کر رہا ہے۔ تو پھر اس سے طلاق کا کہیں۔ بچی کو فارغ کریں۔ ابھی تو۔ اعزاز، افراز اور اتنی معصوم پیاری بچی ہر کسی کی پسند ہوتی ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے۔ لی الحال تو گھر کی فکر کم نہیں تھی۔ نہ جانے۔ ضد میں وہ لڑکا اندر گھسا کیا توڑ پھوڑ کر رہا ہو گا اور ضراس۔ پتا نہیں رات کیسی گزری ہو گی۔

زخم میں ٹانگے لگے ہیں۔ تکلیف تو ہوگی۔ آئمہ الماری سے قرآن شریف لینے آئی۔ ٹھنک گئی۔
 ”ارے۔ آپ جاگ گئیں۔ امی سمجھ رہی تھیں آپ سو رہی ہوں گی۔ میں چائے لاتی ہوں۔“

”چائے بعد میں لے آنا۔ قرآن شریف پڑھ لو۔“
 ”میں چائے بنا رہی ہوں۔ ابو آتے ہوں گے۔ امی بھی جاگ رہی ہیں۔ قرآن میں بعد میں پڑھ لوں گی۔ ابھی تو صبح نے مانگا ہے۔ اس کے لیے لینے آئی تھی۔“

وہ قرآن پاک لے کر چلی گئی۔ وہ بھی صوفے پر لیٹ گئیں۔ جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ دل بے چین۔ کچھ دیر بعد شاہد زہد کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر آئمہ چائے لے آئی۔ صبح بھی وہیں آگئی۔ خالہ بی نے بازو پھیلا دیے۔ وہ سا گئی۔ کیسا سکون ملا۔ رات بھر میں خون پھر نکلا تھا جیسے۔ بچی کیسی خوف زدہ تھی۔
 ”ہم گھر کب چلیں گے۔“ وہ جانتی نہ تھی خالہ بی کیا کارنامہ انجام دے چکی ہیں۔

”تم ابھی یہیں رہو۔ میں جاؤں گی۔“
 ”خالہ بی۔ آپ بھی رکیں۔ ناشتا کر کے جائے گا۔“ آئمہ نے محبت سے کہا۔

”مجھے اسپتال جانا ہے ناشتا لے کر۔ خود بھی کر لوں گی۔“ لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ”اسپتال۔؟“

”ہاں۔ ضرار وہیں ہے۔“ انہوں نے اختصار سے کام لیا۔ لڑکیوں نے نظروں کا تبادلہ کیا۔ چائے ختم کر کے اپنا رس اٹھا کر چلی گئیں۔

گھر کا لاگ کھول کر اندر آئیں۔ کرائے دار لڑکا برآمدے میں نماز کی چوکی پر سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ سرہانے اس نے کرسی رکھ لی تھی۔ اس پر ایک چادر کو تہہ کر کے گویا تکیہ بنالیا تھا۔ ”ہے ہے بے چارا اور میں سمجھ رہی تھی توڑ پھوڑ کر رہا ہو گا۔ گھامڑ کہیں کا۔ اپنے گھر سے بستر ہی لے آنا۔ بھلا مانس ہے۔“

فورا خیال بدل گیا۔ کھٹ پٹ کی آواز سے جاگ گیا۔ خالہ بی کو دیکھ کر اوہ کر کے بولا۔

”آپ اتنے سویرے جاگ گئیں۔“
 ”بس بیٹا۔“ (ہائے۔ کیا وقت پڑا تھا جس کا نام ہی سنڈا مسٹنڈا رکھ چھوڑا تھا۔ آج بے اختیار بیٹا کہہ دیا۔ خود ہی شرمسار ہو گئیں)

”نیند آئی ہی نہیں۔ اسپتال ناشتا بھی لے کر جانا ہے۔ میں تمہارا ناشتا بھی بنا رہی ہوں۔ آلیٹ کھاؤ گے۔ پراٹھے بھی بنا رہی ہوں۔“

لڑکا جھینپ گیا۔ (لڑکا آئی۔ اتنی مہربان)۔
 ”نہیں۔ میں گھر پر کر لوں گا۔ آپ کو زحمت ہوگی۔“
 ”تم نے بھی اتنی تکلیف اٹھائی۔ گھر سے بستر لے کر آتے۔ معاف کرنا۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ تمہیں بتاتی۔ پیچھے گیلری میں پلنگ بھی کھڑا ہے۔ میرے ساتھ کر لو ناشتا۔“

ہائے رے غرض۔ کل تک جو دشمن تھے۔ آج انہیں ہی دوست بنانا پڑا اور جو اپنا بیٹا ہے۔ وہ؟

”نہیں خالہ جی! شکریہ۔ دراصل مجھے بھی دیر سے نیند آئی۔ آپ کے بیٹے کی فکر تھی۔ آپ رک جاتیں یا مجھے کہتیں ہمیں رک جانا۔ اصل میں۔ میں تو ڈر رہا تھا۔ پولیس مجھے ہی نہ دھر لے۔“

”ہاں۔ کہتے تو یہی تھے کہ یہ پولیس کیس ہے۔“
 جلدی جلدی امڈا پھینٹ رہی تھیں۔

”میں نے کہا۔ ٹھیک ہے لگا دو میرے ہتھکڑی۔ پہلے مجھے آئی جی نثار حسین سے بات کرنے دو۔ وہ اپنی بڑی بھابھی کو ہتھکڑی میں دیکھ کر تمہیں انعام دیں گے۔ بس ڈر گئے۔“

”کیا واقعی۔ آپ آئی جی کی بھابھی ہیں۔“ (حیرت پھر ہمارے معاملے میں ان سے مدد کیوں نہ لی۔)
 ”لو۔ میں کیا جانوں آئی جی ٹکوڑے کو۔ اخبار میں کہیں پڑھا تھا۔ تڑی لگا دی۔“

”(ہاں جی۔ اس کی تو ماہر ہیں۔)“ اچھا خالہ میں چلتا ہوں۔

”ارے کر لیتے ناشتہ۔ ویسے شکریہ۔ رات کو ساتھ جانے کا۔ اور گھر کی چوکیداری کا۔“

(چوکیداری؟ جزبہ ہوا۔) ”ابھی تو گھر جا کر سوؤں

گا۔ ”کہہ کر کھڑکی سے اپنے گھر میں کود گیا۔

کھڑکی بند۔ چلو۔ بزرگ کہہ گئے ہیں وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ شاید یہی وقت تھا۔ اسپتال میں صبح بڑی ہلچل ہوتی ہے۔ ناشتے۔ نرسوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ کنٹین کے بیرے ادھر سے ادھر ناشتے لیے پھر رہے تھے۔ ”ضرار جاگ رہا تھا۔ ماں کو دیکھ کر آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس ناشتہ کرایا۔

”رات کو۔ نیند آگئی تھی؟ کوئی درد وغیرہ۔“

ضرار منہ پھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ”خود ہی ڈنڈا مارا۔ اب پوچھتی ہیں۔“

”مرد بنو۔ کیا ہو گیا۔ راسٹھے بنا کر لائی ہوں ویسی گھی کے۔ پنیر والا آلیسٹ۔ کیسا ہے؟“ بہلا رہی تھیں اسے۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھرے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھ پکڑ کے چومنے لگا۔ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ضبط کے باوجود آنکھیں بھر آئیں۔ ہائے؟ ماں کا دل۔ اور کیا رات کو ماں کا دل نہ تھا؟ قصائی بن گئیں۔

نرس ٹھٹک گئی۔ ”آپ سگی ماں ہیں؟ یقین نہیں آتا۔“ ٹھٹک ٹھٹک کرتی چلی گئی۔ اپنے گھر جانے کے بجائے رفیعہ کے گھر چلی گئیں۔ کچھ مشورہ کرنا تھا۔ رفیعہ ان کی بات سن کر دنگ رہ گئیں۔

”یعنی سوا جد بھائی بھی انکاری ہو گئے۔ مجبوراً۔“

”بالکل انکار نہیں کیا۔ گوگو میں تھے۔ لڑکا ماننا نہیں۔ کوشش کرنے کا کہا ہے۔“

”سیدھی طرح طلاق دے دیں۔ بات ختم۔ مگر مر کے معاملے میں۔ جان اٹکتی ہے۔ واجد بھائی شریعت کے پابند ہیں۔ شاید مہر تو دلو اوں گے۔ ورنہ اللہ کا عذاب کون برداشت کرے گا۔ لیکن آپ لڑکے سے ملیں تو سہی۔ ایک بار وہ اصباح سے مل تو لے۔ پتا نہیں کبھی دیکھا بھی ہے۔“

”اب یہ بتاؤ۔ کب تک انتظار کروں ان کی کوشش کا۔ خلع کانولس بھجوا دوں۔“

”کر۔“ من جا میں تو۔ میں تو اس کی گلو خلاصی

ہوتے ہی بہونا کر لے آؤں گی۔“

”رفیعہ! مگر چھ سال سے نکاح کا کچھ اثر تو ہو گا۔ ذکر پر رنگ آڑ جاتا ہے اصباح کا۔ دیکھا تو اس نے بھی نہیں ہے مگر۔ تعلق تو ہوتا ہے۔ لڑکے نے ملنے یا دیکھنے کی شرط رکھی نہیں۔ ورنہ کیا رکاوٹ ہے۔ اصل میں کسی اور لڑکی سے دل لگایا ہے۔“

”تو آپ طلاق کا مطالبہ کریں اصباح کو سمجھاویں۔ یا انتظار کریں۔“

”رفیعہ۔! اصل میں اب میرے پاس انتظار کا وقت بھی نہیں ہے۔ کل۔“

سوچ سمجھ کر مناسب الفاظ میں پورا واقعہ سنایا۔ اپنا کارنامہ۔ رفیعہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ منہ فق۔ حیرت۔ تاسف۔

”اب وہ اسپتال سے آئے گا۔ پتا نہیں کیا کرے گا۔ بدطنہیت ہے تو بدلہ تو لے گا ہی۔ اصباح کو کہاں چھپاؤں۔ تمہیں اپنا سمجھ کر بتا رہی ہوں۔ کبوں کیا؟“

”آپا! ویسے تو میرا گھر حاضر ہے۔ مگر یہ کوئی حل تو نہیں ہے۔ آپ واجد بھائی پر دباؤ ڈالیں۔ اگر۔ ضرار کے آنے پر اصباح کا تعارف گرا دیتیں۔ وہ اتنی ہمت نہ کرتا۔ ظاہر ہے امریکہ کے ماحول کا عادی۔ ابھی یہاں کے طور طریقے سمجھنے میں کچھ عرصے تو لگے گا۔ اس پر بھروسہ کریں۔ آپ کا بیٹا ہے۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ بچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت و درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”ٹھیک ہے۔ صبح کو آج ہی لے آئیں۔
امتحانوں سے فارغ ہو کر لڑکیاں ملنے ملانے جاتی ہی
ہیں۔ افزائے تو اسلام آباد میں ہے۔ ٹرانسفر ہو گیا ہے۔
اعزاز صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ اجیہ کے ساتھ صبح کا
دل لگا رہے گا۔ ثریا بھی آنے والی ہے۔“

صبح کو رفیعہ کے گھر سے قدرتی لگاؤ تھا۔ ان کے
برابر میں ہی تو اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنا گھر۔ جہاں نہ جانے
اب کون رہتا ہے مگر۔ اس کے بچپن کی یادیں۔ اس گھر
سے وابستہ تھیں۔ خالہ بی نے چاہا کہ وہ اپنے کچھ
کپڑے ضرورت کا سلمان لے کر آئے۔ پھر مناسب نہ
سمجھا۔ کمرے میں ضرار کا خون۔ بستر پر خون۔ وہ خود
اپنے گھر سے نظر چرارہی تھیں۔ کمرے کی حالت کا
سوچ کر ماتا کا خون ہوتا محسوس ہوتا۔

نہینہ اپنی ملازمہ کو ساتھ لے کر خود گئیں۔ کمرہ
دھلوا دیا۔ بستر تبدیل کیا۔ خالہ بی نے لڑکی کو انعام کہہ کر
سورہ دے دیے۔ بہت شربانی۔ آپٹل دانٹوں میں دبا کر
نوٹ پکڑ کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

”اس کی تو عید ہو گئی۔“ آئمہ نے بتایا۔ ”ماں آکر
تنخواہ لے جاتی ہے۔ اس کو دو روپے مکئی کے دانوں کے
دتی ہے۔ کبھی دس روپے نہیں دیے، آئس کریم کے
لیے۔“

صبح مگر گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اگر اسپتال
سے اچانک آجائے۔ اسے دیکھ کر پھر غصہ آجائے۔
پیٹ میں لات ماری تھی۔ بھولا تو نہیں ہو گا۔ خالہ بی
خود ہی جا کر کپڑے لے آئیں۔ صبح کو رفیعہ کے گھر
پہنچا دیا۔ وہاں سے اسپتال گئیں۔

”ماں! ڈاکٹر سے کہو۔ مجھے آج ہی چھٹی دے
دیں۔ دل گھبراتا ہے۔ بہت۔“ حاجت سے کہا تھا۔

”کیوں؟ دل کیوں گھبراتا ہے؟ نرسیں دل نہیں
بہلاتیں؟“ طنزاً ”کہا۔“ چھا خیر۔ شام کو رقم لاؤں گی تو
چھٹی کروادوں گی۔ ابھی تو اندازہ نہیں مل کتنا ہو گا۔“

”کمرے میں میرا نیلا بیگ الماری میں رکھا ہے۔
اسی میں رقم ہے۔“ گردن جھکالی۔

”تب گئیں۔“ اللہ وہ دن نہ لائے۔ جو میں تم سے

رقم لوں۔ تم نے جب کبھی ڈالر بھیجے۔ وہ بینک کے لا کر
میں رکھے ہیں۔ لے لینا وہ بھی تم۔ میں کسی سے
ادھار کر لوں گی۔“

بیٹے کو مایوس اور حیران کر کے آگئیں رفیعہ کے ہاں
صبح کا حال پوچھنے اور رفیعہ سے معلوم کرنا تھا۔
سعیدہ کے فون کا۔ انہوں نے اپنے کمرے میں لے
جا کر سرگوشی میں بتایا۔

”سعیدہ خود پریشان ہیں۔ لڑکا راضی نہیں۔ اصل
میں یہاں کوئی لڑکی اسے بہت پسند آگئی ہے۔ کہتا
ہے۔ آپ اس لڑکی کو دیکھ لیں۔ پھر فیصلہ کریں۔ اگر
آپ کو پسند نہ آئے۔ تو پھر جو آپ کہیں گی۔ ماں لوں
گا۔ اب سعیدہ اس دوسری کو دیکھنے جائیں گی۔“

حفصہ بیگم پریشان ہو کر لیٹ گئیں۔ شام کو
اسپتال کا بل بھی جمع کرانا ہے۔ کس سے کہیں۔

”آیا ہو سکتا ہے سعیدہ کو پسند نہ آئے۔ یا اگر وہ
خاندان کے دباؤ کی وجہ سے بظاہر کہہ دیں کہ نہیں پسند
آئی۔ تب۔ آپ تیار رہیں۔ اچھا ایک بات اور کہوں
گی۔“ وہ قدرے ہچکچا کر ان کو دیکھنے لگیں۔

”آپ! بیٹا آپ کا ہے۔ جیسا بھی ہے۔ آپ کے

زیر سایہ تربیت ملی ہوتی۔ تو آپ کی مرضی کے مطابق
ہوتا۔ امریکہ میں وہاں کے رنگ میں رنگ گیا تو کوئی
اجنبی کی بات نہیں۔ اب آگیا ہے تو غنیمت جانیں۔
آپ! ماں کو بہت تقویت ہوتی ہے بیٹے کی ذات سے۔

اسے سمجھا بچھا کر۔ پیار محبت سے اپنا بتائیں۔ یہاں
کے طور طریقوں سے آگئی ہوگی تو اسے عقل آجائے
گی۔ سچ کہتی ہوں آپ! آپ کے نصیب جاگ جائیں
گے۔ اللہ میاں لکھو قہ دیا ہے اسے سمجھنے کا۔ آپ کو
اسے سمیٹنے کا۔ مار پیٹ، سختی ہمیشہ کارگر نہیں ہوتی۔

جہاں آپ کی سرزنش اس کو سدھرنے میں مدد دے گی۔
وہاں ماں کا پیار اور ماتا اس کو سپردھے راستے پر چلنے کا
درس دے گی۔ ماتا میں بڑی کشش ہے آپ! اور اولاد
بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ کا شکر کریں۔ کوئی ہے آپ
کا۔ اکیلی نہیں ہیں آپ! کوئی تڑپ ہے جو اسے واپس

لائی ہے۔ قدر کریں اس کی۔“

حفصہ بیگم سر نیچے کیے خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔
 ”آپا دیکھیں۔ بیٹی کے لیے آپ کو کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔ اس کے ماں باپ نے تو اسے نکاح کر کے مضبوط رشتے میں باندھ دیا کہ وہ محفوظ ہو گئی۔ لیکن آج وہ کتنی غیر محفوظ ہے۔ بے آسرا ہے۔ بیٹے کے ساتھ ایسی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ کم از کم بے بسی نہیں ہوتی۔“

رفیعہ انہیں تسلی دے کر کام میں لگ گئیں۔ کچھ دیر بعد آکر دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی طرح سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔

”اچھا۔ اب فکر کرنا چھوڑیں۔“ انہوں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”ذیقین کریں۔ وہ اگر بگڑا ہے۔ تو سدھر بھی جائے گا۔ آپ کی ایک بار کی سرزنش نے اسے احساس دلادیا ہو گا کہ ماں محبت کرتی ہے تو سزا بھی دے سکتی ہے۔ خیر۔“

”تمہارے سامنے ہے کوئی مثال۔ کہ بگڑی ہوئی اولاد سدھر گئی ہو۔“ وہ ایک دم بولیں۔

رفیعہ مسکرائیں۔ ”بے شمار، لیکن کم از کم آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ اپنی اولاد کو سیدھا کر دیں۔ اچھا خیر چھوڑیں۔ ایک اور معاملہ ہے۔ آپ برا نہ مانیں۔ یہ۔ یہ لے لیں۔“ ایک لفافہ ان کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہ۔ آیا۔ کئی سال پہلے۔ جب اعزاز کے یونیورسٹی داخلے کے لیے میں نے آپ سے قرض لیا تھا۔“ ہچکچا رہی تھیں۔ ”آپ نے دے کر کہا تھا یہ قرض نہیں۔ اعزاز میرا بھی بیٹا ہے۔ تو۔ پھر۔ بعد میں افراز کی جاب بھی ہو گئی۔ میری ہمت نہ پڑی آپ کو یہ واپس کرنے کی۔ اب۔ اعزاز بھی ماشاء اللہ کما رہا ہے۔ تو اس نے دیے ہیں کہ وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنوں کی کچھ خدمت کر سکے۔ آپا! پلیز رکھ لیں۔ بچوں کو یہ احساس ہو جائے کہ جو ان کے برے وقت میں کام آتے ہیں۔ وہی خیر خواہ ہوتے ہیں۔ باقی تماش بین۔“
 ”جیسے تو یاد نہیں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے پتا ہے آپ کس طرح سلوک کر کے بھول جاتی ہیں۔ مگر جن پر برا وقت آئے اور اس وقت جو ساتھ دے۔ اسے بھولنا نہیں چاہیے۔ مجھے یاد ہے۔ اس لیے کہ ان دنوں میں بہت پریشان تھی۔ کتنے لوگوں سے قرض مانگ کر شرمندہ ہوئی۔ کوئی کام نہ آیا۔ صرف آپ تھیں۔ جو دے کر بھی واپس نہ لینے کا وعدہ لے رہی تھیں۔“

ایک وقت وہ تھا۔ جب رفیعہ مانگ کر شرمسار تھیں۔ اور ضرورت پوری ہونے پر بھی شرمندہ۔ آج وہ دے کر شرمندہ ہو رہی تھیں اور حفصہ بیگم لیتے ہوئے۔ وقت کتنا بے رحم اور مہربان ہے۔ دونوں کے احساسات میں عجیب سی یگانگت تھی۔

”اچھا رفیعہ! میں چلتی ہوں۔ اسپتال کا جیکر لگالوں۔ اگر آج ڈسچارج کر دیا تو گھر لے جاؤں گی۔ ممکن ہوا تو واپسی میں شاید دیر ہو جائے۔“ کھڑی ہو گئیں۔

”آپا، پھر گھر پر ہی رک جائیں۔ کہاں اکیلی آئیں گی۔ یا پھر ضرار کو لے کر یہیں آجائیں۔ سب سے مل کر اس پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”اس پر اچھا اثر پڑے۔ نہ پڑے۔ اصباح مر جائے گی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا۔“ کہہ کر باہر آ گئیں۔ اسپتال کے سارے معاملات بلوں کی ادائیگی۔ پھر ڈاکٹروں کی ہدایتیں۔ سب درست۔ پرانی کھسی ہوئی کھٹارا ٹیکسی۔ ویسا ہی بوڑھا گھسا ہوا اس کا ڈرائیور۔ اسپتال کے گیٹ پر وہی دستیاب تھا۔ ٹیکسی کی خوفناک آواز۔ رک رک کر جلنا۔ ضرار کو کوفت ہو رہی تھی۔
 ”میں بہت جلد گاڑی لے لوں گا۔“ اماں کو دیکھ کر کہا۔

اماں نے ہونٹ سکوڑ کر منہ سڑک کی طرف کر لیا۔ گویا۔ اونہ۔ مجھے کیا۔ ضرار نے کم از کم یہی نتیجہ اخذ کیا۔ (اور سچ بھی یہی تھا۔) ٹیکسی سے اتر کر ڈرائیور کو دو ہزار دیے۔ ہمدردی۔

”اچھا۔ اب غور سے سنو میری بات۔“ گھر کے اندر پہنچ کر، ضرار کو کمرے میں لٹا کر انہوں نے اسے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

متوجہ کیا۔ ضرار کے چہرے پر کمزوری کے آثار تھے۔ پورا سر پٹیوں میں اس طرح چھپ گیا تھا۔ گویا ٹوپی منڈھی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو گیا تھا۔

”وہ جو لڑکا۔ تمہارے ساتھ آیا تھا۔ اس کا فون نمبر بتاؤ۔ میں پڑوس میں جا کر کروں گی۔ اسے بلاؤں گی۔ اور تب تک تم اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹو۔ وہ آجائے تو جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔ میں نے جو کرنا تھا۔ کر لیا۔ اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تو یہ گھر تمہارے باپ کا ہے جہاں حق جتا کر رہو۔ یہ گھر میرے باپ کا ہے اور اس کی مالک میں اور وہ لڑکی ہے۔ جسے تم نے شکار کرنا چاہا تھا۔“

ہکا ہکا۔ بلکہ اس سے زیادہ پریشان۔ کن حالت میں وہ ماں کی کھدوری خشک بے درد اور دل چیرنے والے جملے سن اور رہا تھا۔ نقاہت نے از سر نو حملہ کیا۔ آنکھیں بند کر کے شاید ابلتے آنسو اندر ہی دبا دیے۔ بولا تو آواز بھی جھکڑی ہوئی تھی۔

”اماں! بہت برا ہوں۔ بہت سخت سزا کا مستحق ہوں۔ کس طرح معافی مانگوں۔ کہو تو ابھی سڑک پر جا کر لیٹ جاؤں۔ کوئی گاڑی کچلتی ہوئی گزر جائے۔ میرا خاتمہ اسی طرح۔ شاید آپ سے معافی مل جائے۔“

”اے سنو! میں باتوں سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ مر کر بھی تمہیں معافی نہیں ملے گی۔ کوئی ایک جرم تو نہیں ہے۔ لمبی فرست ہے بیٹا۔ جس طرح تم نے تمہارے باپ نے مجھے تڑپایا ہے۔ مجھے اکیلا کر کے بے آسرا کیا۔ وہ تو الگ لگ رہا، تم نے تو بھری دنیا میں مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ سرائٹھا کر جینے کے لائق نہ چھوڑا اور اب جو فخر سے سرائٹھا کر آگئے ہو۔ بلا اجازت، تو آتے ہی اپنا رنگ دکھا دیا۔ اب اس تمہارے کیے ہوئے کارنامے کے بعد میں خود بھی جان دے دوں تو اس معصوم پاک دامن لڑکی کے سامنے میری مدح شرمندہ رہے گی۔ صرف ایک اس گناہ کی وجہ سے کہ تم کو دنیا میرے بیٹے کے نام سے جانتی ہے۔“

ضرار کی ہچکی بندھ گئی۔ نادم اور شرمسار۔

”وہ۔ وہ کدھر ہے۔ میں اس کے قدموں میں گر کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

”وہ تمہاری صورت دیکھتے ہی مرجائے گی۔ ایسی ہی ہے وہ، میں نے پالا ہے سختیوں میں، پابندیوں میں کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کروار پر اور اس نے میرے ہر اشارے کو حکم سمجھ کر تعمیل کی۔ وہ میرے پاس امانت ہے، منکوحہ ہے۔ سمجھتے ہو، تم نے جو کیا۔ چاہتی تو پولیس کے حوالے کر دیتی مگر جرم میرے گھر پر میری موجودگی میں ہوا، تو سزا بھی مجھے ہی دینی تھی، اب اٹھو، سامان سمیٹو اور چل پڑو۔“

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس کا رد عمل دیکھے بغیر دروازے کی طرف چلی گئیں۔ سنگ دل ماں کے زہریلے جملے، ایک ایک لفظ نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔ لمبے لمبے سانس لینے لگا، ایک لخت آکسیجن کی کمی محسوس ہوئی، کوئی عورت جس کا خمیر محبت، ایثار اور درد مندی سے گوندھا گیا ہو، ماں جسے مامتا کی تفسیر کہا گیا ہو، اتنی بے رحم، بے نیاز کیسے ہو سکتی ہے لیکن جب اپنے کروار پر توجہ کی اس ماں کو تنہا چھوڑ کر باپ کے لالچ دینے پر شوق کی خاطر چپکے سے چلے جانا اور سالوں خبر نہ لینا، باپ کا سلسلی دینا، تمہاری ماں کا پورا خاندان ہے وہاں، اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ شاید اماں اپنے رومے میں حق بجانب ہوں، نہ جانے ان پر کیا گزری ہوگی، کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوں گے۔

دروازے پر ٹہینہ اور کرائے وار لڑکا موجود تھے، ٹہینہ نے کہا۔ ”آپ کب آئیں باجی۔“

اور لڑکا کہہ رہا تھا۔ ”میں نے آپ کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تھا۔ میں بھائی کا حال چال پوچھنے آیا تھا، آجاؤں۔“

چاہتی تھیں اسے بھگا دیں مگر ٹہینہ کے چہرے پر دبا دبا سا جوش اور کچھ بتانے والی کیفیت۔ انہوں نے لڑکے کو اندر آنے دیا۔ ٹہینہ کو لے کر اندر آئیں۔

”باجی۔ بڑی اہم خبر لائی ہوں۔“ من کرا نہیں سکتی میں لے آئیں۔ ضرار کے کمرے سے دور۔ ان کا کندھا دبا کر ٹہینہ نے چپکے چپکے بتایا۔

”باقی آج کوئی عصر کا وقت ہوگا۔ میں آٹھ کی پھوپھی وغیرہ کو خدا حافظ کہنے گیٹ تک آئی تو آپ کے دروازے کے سامنے کچھ لوگوں کو کھڑا دیکھا۔“
پر جوش آواز میں بتانے لگیں۔

”میں نے پہچان لیا۔ ایک تو آپ کی سعیدہ بھابھی تھیں۔ دو ان کی بیٹیاں اور ایک جوان خوب صورت سا لڑکا۔ میں اوٹ میں ہو گئی۔ کان اوھر لگا دیے کہ سنوں تو سہی۔ سعیدہ بہت حیرانی سے کہہ رہی تھیں۔ ارے یہ کہاں لے آئے ہو۔“

پھر دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران لڑکے کو دیکھ رہی تھیں۔ لڑکا بولا ”بس یہی گھر ہے۔ اسی گھر میں رہتی ہے وہ مگر یہاں تو لاک لگا ہوا ہے۔“

سعیدہ کہنے لگیں ”دیکھو میں بہت پریشان ہوں۔ نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہو تم۔ پتا نہیں مذاق ہے یہ یا کیا۔ تمہارے ابا ہیں وہ مجھے طعنے دیتے رہتے ہیں تم کو کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ آخر تم نے کیا دیکھا یہاں۔ راستہ بھول گئے ہو۔ چکر کیا ہے۔ وہ لڑکا کہنے لگا۔ ”واہ راستہ کیوں بھولوں گا۔ دو مہینے گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر نگرانی کی ہے۔ یہیں جاتی ہے وہ لڑکی۔“
ثمینہ کا حلق خشک ہو گیا، نلکے سے ہی ایک چلو پانی پنی کر پھر شروع ہو گئیں۔

”سوری باجی۔ لڑکیاں جو چپ کھڑی تھیں۔ دونوں بولنے لگیں۔ تم نے اس سے بات کیوں نہیں کی۔ تم کچھ پوچھتے وہ کچھ بتاتی پتا تو چلتا۔“

لڑکا بولا۔ کیسے بات کرتا اتنا سخت بردہ منہ ڈھانکے رہتی ہے اور بس سے اتر کر گلی میں آتی تو دکان پر بیٹھے بڑے میاں ان کے پیچھے چل پڑتے۔ دو لڑکیاں ہیں۔ دوسری برابر والے گھر میں جاتی ہے۔ برابر آتا رہا ہوں میں۔ پاگل نہیں ہوں کہ راستہ بھول جاؤں گا۔ تو سعیدہ نے کہا۔ گھر چلو سیدھا راستہ تو میں تمہیں دکھاؤں گی۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں ”لڑکا غصہ کرنے لگا۔ کسی پڑوسی سے پوچھیں تو سہی۔ یہ کہاں گئی ہیں۔ بس باجی یہ سن کر میں نے گلی میں منہ نکالا اور سعیدہ کو سلام کہا۔ میں نے کہا ”آپ۔ کہنے لگیں ہاں۔ بغیر اطلاع

کے آئے ہیں۔ معلوم نہ تھا گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آپ بتا سکتی ہیں میں نے کہا جی۔ وہ کسی رشتے دار سے ملنے گئی ہیں۔ شاید کل آجائیں۔ وہ کچھ مایوس ہو گئیں۔ پھر آپس میں کچھ چپکے چپکے بات کر کے چلی گئیں۔ میں نے تو انہیں اندر آنے کا بھی کہا لیکن باجی ایک اور بت بتاؤں۔“

وہ مزید پر جوش پر اسرار انداز میں قریب آکر کہنے لگیں۔

”میں نے آٹھ سے ذکر کیا۔ وہ کہنے لگی ”امی کچھ دنوں سے ایک لڑکا کالج سے بس اسٹاپ تک پیچھا کرتا تھا۔ موٹر سائیکل پر ہوتا تھا۔ دادا کی وجہ سے شاید وہیں گلی کے سرے پر کھڑا ہو کر دیکھتا رہتا تھا۔ باجی ہے نا بمبائشک خبر۔“ باجی بے تاثر۔

”باجی۔! بیٹا کیسا ہے اب آپ کا۔ ٹھیک تو ہے۔“ اتنی بڑی خبر کے بعد باجی کا رویہ۔

”اے۔ کیسا ہوتا۔ ڈھیٹ ہڈی۔ پڑا ہے بستر پر۔ چلو تم بھی دیکھ لو میں نے تو اسے گھر سے جانے کا کہہ دیا ہے۔“

باجی جو ثمینہ کی داستان سن کر گرم صم ہو گئی تھیں۔ پھر اپنی جون میں آگئیں۔ ثمینہ نے کمرے کے باہر سے ہی ضرار کی خیریت دریافت کی ”تو وہ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ سر ہلا کر بولا۔“ جی۔ ٹھیک۔“

”اے باجی۔ بچہ بہت کمزور ہو گیا ہے میں ابھی جا کر سیب کا جوس نکال کر باجی کے ہاتھ بھیجتی ہوں اسے طاقت کی ضرورت ہے دوا میں تو خون سکھا دیتی ہیں۔“

”رہنے دو۔ اسے طاقت کی نہیں۔ ہدایت کی ضرورت ہے۔“ کہہ کر ثمینہ کو اشارے سے بلا کر لائیں۔ برآمدے میں نماز کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔ ثمینہ بھی بیٹھ گئیں۔

”باجی۔ پھر اب۔ آپ کیا کریں گی۔ سعیدہ نے اگر۔“ شکر ہے۔ باجی اب متوجہ تو ہو میں۔

”وہ اگر مجھ سے کچھ کہیں گی۔ تو جواب دوں گی۔ خلع یا طلاق۔ بات ختم۔“

ثمینہ دنگ۔ کرائے دار لڑکا آکر بولنے لگا۔ ”آئی۔
بھائی بہت کمزور ہیں۔ آپ کی اجازت ہو۔ تو رات کو
میں آکر ان کے پاس رک جاؤں۔ شاید کچھ
ضرورت۔“

”نہیں بھیا۔ شکریہ تمہارا۔ یہ تو ابھی یہاں سے چلا
جائے گا۔ میں بھی گھر بند کر کے اپنی بہن کے گھر چلی
جاؤں گی۔“ ثمینہ نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اچنبھا۔ حیرت
لڑکا بھی حیران۔

”باجی! ایسا ظلم تو نہ کریں۔ بچہ ہے۔ غلطیاں بچے
کرتے ہیں۔ اب سزا تو مل گئی۔ رات میں کہاں جائے
گا۔ معاف کروں۔“

”سزا ملنے کے بعد گناہ معاف ہو جاتا ہے کیا۔ ہاں
اگر انسان ہو تو۔ درندوں کو تو مار دینا چاہیے۔“

ضرار لڑکھڑاتا ہوا آیا۔ زمین پر گر کر آن کی گود میں
سر رکھ کر بلکنے لگا۔ ایک ماں۔ بظاہر اصولوں کی سخت
مذہبی اقرار کی پابند۔ لیکن ایک دل ہے۔ ماں کا دل۔ جو
اولاد کے لیے کبھی کبھار بے اصولی برداشت کر لیتا
ہے۔ کرائے دار لڑکا چپ چاپ چلا گیا۔ ثمینہ منمنار ہی
تھیں۔

”باجی! اتنی سختی تو اللہ کو بھی پسند نہیں۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ میں
نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی گری ہوئی حرکت نہیں
کی۔ میں تو کہہ رہا تھا۔ چلو واک کرتے ہیں۔ پتا نہیں وہ
کیوں ڈر گئی۔ میں نوکرانی سمجھ کر۔“

”یہاں رانی اور نوکرانی سب کی عزت برابر ہے۔
سمجھا اور میں نے جب کہا اس کا ہاتھ چھوڑ۔ تو نے
میری بات سنی۔؟“

”نشد آگئی تھی۔ اس نے بھی مجھے زور سے لات
ماری۔ نہیں تو۔ اماں قسم سے۔“ ”خبردار۔ میرے
سامنے جھولی قسم نہ کھانا آئندہ۔ معاف نہیں کروں
گی۔ چل اٹھ اور جا کر لیٹ۔ کمبخت ذلیل
اولاد۔“

ثمینہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے لگیں۔ وہ پھر رو
رہا تھا۔ ”اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ اماں! بہت

دن آپ سے جدا رہا۔ اب نہیں۔ پلیز۔“

”اچھا اچھا۔ دھوکے باز باپ کی اولاد۔ بھول چکی
تھی کہ کوئی بیٹا بھی ہے۔ نہ جانے کہاں سے آگیا۔“

”ثمینہ نے ضرار کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ کمرے میں
لے جا کر چند نصیحتیں اس کی سماعت کی نذر کیں۔

ماں کا رتبہ۔ ماں کی مانتا۔ باہر آکر کہا۔

”باجی رات کے لیے کھانا بھیج دوں گی۔ تھک گئی
ہیں۔ کہاں پکا میں گی۔“

”نہیں۔ پکالوں گی۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہارے گھر
آکر اصباح کو فون کروں گی۔ اس سے تو کہا تھا کہ میں
آجاؤں گی۔“

ثمینہ کے جانے کے بعد کچن کی راہ لی۔ دودھ والا کئی
دن سے آیا نہ تھا۔ خشک دودھ ہمیشہ رکھتی تھیں۔

چائے بنا کر بسکٹ لے کر کمرے میں آئیں۔ اٹھ کر
بیٹھ گیا۔

”یہ۔ میرے لیے۔“

”ہاں۔ تھوڑے بسکٹ اور نمک پارے ہیں۔

رات کے لیے مرغی پکا لیتی ہوں۔ رکھی ہے۔ اس دن
کی بریانی بھی اگلے دن آکر فریز کر لی تھی۔ خیر۔ وہ کل
سہی۔ کل سہی۔“

جانے کونسا بوجھ تھا۔ بول بول کر ہلکا کر رہی تھیں۔
(بیٹا ماں کی طاقت ہوتا ہے۔ اور اگر بد طبیعت ہو۔ مجھ کو
اکیلا سمجھ کر گردن دبا دے۔ کیا بھروسہ باپ نے پٹی
پر دھا کر بھیجا ہو۔ لالچ سوار ہو جائے۔ تو۔ باپ بیٹا۔
ایک ذات۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو
تھوڑا تھوڑا۔ اتنے سالوں بعد محبت جاگ پڑی اور کیا
معلوم۔ گھر پر قبضہ کرنے کا ارادہ ہو۔ دل کی بات کون
جانے) کچن میں مصروف تھیں۔ ہاتھوں سے زیادہ
ذہن کام کر رہا تھا۔ سوچ کا گھوڑا سرپٹ انجانی راہوں کی
سمت اڑا جا رہا تھا۔ ہائے یہ وہم۔ اور سو سے۔

اصباح کو فون کرنا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچتی ہوگی۔
اور اب نیا معاملہ۔ لڑکا خود اپنی انجانی منکوحہ کو پسند کر رہا
ہے۔ اس کو۔ جس سے انکار کر رہا ہے۔ او بھئی! آج کی
نسل ہے۔ سیدھی طرح ناک پکڑنے کے بجائے پیچھے

سے گدی کی طرف سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑے گی۔ اور خوش کہ میدان مار لیا۔ عقل بھی تو گدی کے پیچھے ہوتی ہے۔ اچھا بچو۔ اب تم ذرا رکھنا۔

”اماں! میری وجہ سے کتنی تکلیف ہو رہی ہے آپ کو۔“ سناٹے۔ سوچ کے میدان میں آواز۔ اچھل پڑیں۔

”ہٹے ہٹے ڈرا دیا مجھے کیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ مارے گا مجھے بدلہ لے گا؟“

اس کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر دوسو سوں نے حقیقت کی راہ لی۔ ضرار نے اچھے سے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا دور پھینکا۔ جیسے وہ سانب ہو۔

”برآمدے میں رکھا تھا۔ سہارے کے لیے پکڑ لیا۔ اتنا ذلیل نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا۔ آپ کا خون، پلٹ گیا۔ انہوں نے اسے پیچھے دھکیلا۔

”جس باپ کا خون تیرے اندر دوڑ رہا ہے۔ اس سے ہر برائی کی توقع کر سکتی ہوں میں۔ ظالم۔ جابر۔ خود غرض۔ کینہ پرور۔ خون کے آنسو رلائے تھے۔“

”آپ کا خون زیادہ طاقت ور ہے۔ دودھ کی تاثیر بھی ہے۔ یقین کریں۔ بہت پیچھتا مارا۔ وہاں ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ ان کے درس پر جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ بہت سمجھایا۔ آپ کا بیٹا بن کر دکھاؤں گا۔ کہو تو حلف اٹھاؤں۔“

”حلف کا مطلب جانتا ہے۔“ طنزاً کہا۔

”جی۔ مسلمان ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں۔“

ماں کا دل۔ یک دم مضبوط ہو گیا۔ ”کمرے میں جاؤ۔ دوا کھائی کہ نہیں۔ مجھے ٹیمینہ کے گھر فون کرنے جانا ہے۔ اگر روٹی پکاؤں گی۔“

”گھر پر فون۔ لگوا یا کیوں نہیں؟“ ٹال کر باہر آ گئیں۔ ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ ٹیمینہ کے دروازے پر اس کے سر کھڑے تھے۔ سلام۔ خیر و عافیت۔ بات کر کے اندر آ گئیں۔ ٹیمینہ بوکھلائی ہوئی آرہی تھیں۔

”آپ آ گئیں۔ میں آپ کو بلا نے والی تھی۔ وہ رفیعہ نہیں کا فون آیا تھا۔“ ناجیہ کو آج ماں کے انداز

میں کچھ نیا بن لگ رہا تھا۔ امی آئندہ کو تو بتا بھی دیتی تھیں۔ ناجیہ کو نا سمجھ کہہ کر ہر بات چھپاتی تھیں۔ وہ کھونج میں تھی۔ آخر اصباح کا معاملہ سے کیا۔ آئندہ کو اگر خبر بھی بھی تو اس نے نہیں بتایا۔ آنٹی کو آتا دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہوئی۔ مگر امی۔ کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ بند۔ وہ گیلری والے دروازے کی طرف چلی۔ وہاں ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا کھڑکی کا۔ ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ امی کی بات ختم ہو گئی تھی۔ خالہ بی سوچتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اچھا۔ یہ بات ہے۔ میں رفیعہ سے بات کر لوں ذرا۔“ ٹیمینہ نے نمبر ملایا۔ اور خود کمرے سے باہر چلی گئیں۔ خالہ بی رفیعہ سے بات کرنے میں سر ہلاتی جا رہی تھیں۔ پھر کہا۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم کل ہی انہیں بلاؤ۔ ماں بیٹے دونوں کو۔ اور اب ذرا اصباح کو فون دو۔“

”ہاں بچی۔ نہیں آسکی۔ ضرار گھر آ گیا ہے۔ بہت معافیاں۔ خیر۔ یہ بتاؤ۔ جب میں نے نماز کی نیت باندھی۔“ آواز دھیمی ہو گئی۔ اب شاید اصباح کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ گردن ہلاتی رہی تھیں۔

”اچھا خیر۔“ بہت شرمندہ ہے۔ معافی مانگنے کا کہہ رہا ہے۔ اب سنو غور سے۔ جو میں بتاتی جاؤں۔ وہی کرتا ہے تمہیں۔ وہی کہنا ہے۔ کل جب سعیدہ آئیں۔ ہاں ہاں۔ کل آئے گی۔ تو تم۔

”فوفہ! شاید زاہد کو بھی ابھی آنا تھا۔ مسجد سے آتے ہیں تو لڑتے جھگڑتے۔ جیسے وہاں یہی سبق ملتا ہو۔“ تالاق۔ ایک لفظ سننے نہیں دیا۔ ”مایوس ہو کر باہر آ گئی۔ ٹیمینہ دونوں کی صلح کر رہی تھیں۔ روز کا معمول تھا۔ خالہ بھی آ گئیں۔

”لو بھئی ٹیمینہ! رفیعہ سے بات ہو گئی ہے۔ اب تم دیکھنا، کیسا رگڑتی ہوں سعیدہ کو اور اس کے بیٹے کو۔ کل رفیعہ فون کرے تو مجھے بلا لیتا۔ میں نے سمجھا دیا ہے رفیعہ کو۔ اصباح کو بھی۔“

ٹیمینہ مسکرائیں۔ ”اب آپ فون لے لیں۔“ وہ جانے لگیں تو ٹیمینہ نے ایک ڈش ان کو دی۔

”میں خود لے کر آنے والی تھی۔ ویسی مرغی کا سوپ ہے۔ سبزی اور سیب بھی ڈالا ہے۔ بہت طاقت کی ضرورت ہے بچے کو۔ کل سیب لے کر آؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔“

دونوں خواتین ہشاش بشاش۔ مسکرا رہی تھیں۔
ضرار برآمدے میں نماز پڑھ چکا تھا۔ (یا ایکٹنگ کیا پتا)

”تم نے سجدہ کیسے کیا۔ سر نیچے کرنے میں زخم میں درد نہیں ہوا؟“

”ہوا۔ مگر آپ کے ڈنڈے کی چوٹ سے بہت کم۔“ بے فکر تھا۔ ”اصل میں کمرے میں گھبراہٹ ہوئی تو باہر آگیا۔ نماز کی چوکی دیکھی۔ تو یاد آیا کئی دن سے اللہ کو بھولا ہوا ہوں۔ نماز پڑھی۔ اب سوچ رہا ہوں۔ آپ اکیلی اتنے سال کیسے رہیں؟ اب اپنی خطا زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ کاش۔ میں نے حماقت نہ کی ہوتی۔“

”اچھا اچھا۔ اب جا کر لیٹو۔ دروندہ برہ جائے۔ ڈاکٹر نے آرام کا کہا تھا۔ کل جا کر پی بھی کروالینا۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

”اور یہ کیا ہے؟“ ان کے ہاتھ ڈش دیکھ کر پوچھا۔
پھر ڈھکن کھول کر دیکھا۔

”واہ۔ شکل تو بہت اچھی ہے اور خوشبو بھی مزے کی۔“ کچھ دیر بعد دونوں ماں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔
دونوں کا موڈ اچھا تھا۔

”یہ۔ دیوار کب بنی؟“ وہ جب امریکا گیا تھا دیوار نہ تھی۔ بڑا کشادہ صحن تھا۔

”جب تم بھی دھوکا دے کر بھاگ گئے تو کرائے دار رکھ لیے۔ اس لیے کہ میرے آڑے وقت میں کوئی قریب ہو جس کی مدد لے سکوں، مگر اتفاق دیکھو جس دن تم آئے اس سے پہلے ان کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تمہارے مبارک قدموں کی بدولت ان لوگوں سے مدد لی۔ جن کو دن رات برا بھلا کہتی تھی۔“

”مگر۔ مجھے تو اچھے شریف لوگ لگے۔ یہ جو لیٹ رہا تھا تو اماں حلق میں دوا ڈال رہی

تھیں۔

”ہاں۔ تم کو تو لگیں گے ہی۔ جیسے تم دعا باز۔ ویسے ہی یہ۔ ہر شخص آئینے میں اپنا چہرہ ہی تو دیکھتا ہے۔“
کھانے کے برتن اٹھا کر لے گئیں۔ باہر سے پکارا۔
”سو جاؤ اب۔“

اور وہ فرماں برداری کے ریکارڈ برابر کرنے کے چکر میں فوراً ”آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دوا میں شاید نیند کا عنصر بھی تھا۔ گہری نیند آئی۔ صبح آنکھ کھلی۔ چڑیوں کی چکار سے۔ کھڑکی سے جھانکا۔ آہا۔ بڑی سہالی صبح۔ نرالا سا موسم۔ ہوا میں خشکی۔ چار دن سے کمرے میں رہتے ہوئے اندازہ ہی نہ ہوا۔ کیسی رنگیلی صبح ہوتی ہے۔ آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑے کچھ سفید۔ کچھ کالے۔ کچھ نارنجی۔ سورج کی کرنوں میں نہائے ادھر سے ادھر سفر گشت کر رہے تھے۔ باہر نکل کر لطف لیا۔ چنبیلی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ انار کے درخت میں سرخ کلیاں خوش رنگ۔ کچن کھول کر جائزہ لیا۔ ساس پین میں پانی چولہے پر رکھا۔ چولہا جلانے کا کوئی اندازہ نہ ہوا۔ پھر امریکا کے بجلی کے چولہوں کو بھلا کر مچس پر نظر جمائی کھٹ پٹ کی آواز سے اماں ہوشیار ہوئیں۔ سیدھی کچن میں۔

”ہاں میں یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
”چائے بنا رہا ہوں۔ آئیے۔ آپ کے لیے بھی دم کر دی ہے۔“ چائے پھولی چائے والی میں دم کر چکا تھا۔ دو مک، چینی دان، خشک دودھ کا پالہ، ڈھونڈ کر میز پر رکھ دیا تھا۔ بسکٹ بھی پلیٹ میں رکھے تھے۔

”واہ۔ بڑا سلیقہ آگیا ہے۔ وہاں کیا کسی وزیر سفیر کے گھر خانساں لگ گئے تھے؟“ زور سے ہنسا۔ بے ساختہ اونچا مروانہ قہقہہ۔ کچن گونج گیا۔ صحن تک بازگشت سنائی دی۔ انوکھا۔ برسوں سے یہ گھر کسی مروانہ ہنسی سے محروم تھا۔ جو کبھی کبھار رشتے دار مروانے آتے بھی تھے۔ خالہ بی کی تنک مزاجی کی وجہ سے تمیز سے بیٹھتے تھے۔ قہقہہ درکنار۔ ہنسنے کی آواز بھی نہیں سنی گئی۔ خالہ بی کو آج یہ آواز۔ کھنک دار قہقہہ بہت دل خوش کن لگا۔ تقویت۔

”چائے تو اچھی بنائی ہے۔ بھئی اور کیا کیا بنانا جانتے ہو۔ کھانے میں۔“ (انشروپو)

”ارے۔ میں وہاں کوئی۔ افو۔ وہاں تو ہر چیز ڈباؤں میں بند مل جاتی ہے۔ بس فرائنگ پین میں ڈالو اور تیار۔ آپ چاہیں گی تو کچھ سیکھ لوں گا۔“ ہائے فرماں برداری۔ پتا نہیں باپ نے کیا کیا سکھا کر بھیجا ہو گا۔ شکوک ختم ہی نہیں ہوتے۔

”ناشتا بنانا سیکھ لو۔ آلیٹ، حلوہ پوری، آلو اور پننے کی ترکاری۔“

”آہ۔ آہ اور پھر۔ آہ۔ نہیں ںں۔ ظلم کے پہاڑ نہ توڑیں۔“ تڑپ گیا۔

”آپ کیا روز اتنی دیر سے اٹھتی ہیں۔“
”اٹھتی تو جلدی ہوں۔ اصباح کے لیے ناشتا بنانا۔ کالج جاتی تھی۔ آج تو دیر تک جاگتی رہی کہ پتا نہیں۔ تم رات میں کون سی چیز لے کر بھاگ جاؤ۔“
”بیس؟“ حیرت۔ ”اور اپنا سامان چھوڑ کر آپ کی کوئی چیز چھوڑاؤں گا۔“ پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ”یہاں کون سی ایسی قیمتی چیز ہے جسے لے کر بھاگوں گا۔ افو۔ بہت ہی مذاقہ ہیں آپ۔ ابھی کھولتا ہوں سوٹ کیس۔ کیا کیا چیزیں آپ کے لیے لایا ہوں۔ دنگ رہ جائیں گی آپ۔“ کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں حرام کی کمائی کی نہ ہو۔“ بے مروتی سے منہ بنا کر میسر مستروبے چارہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

”لگتا ہے۔ مجھے ایک قرآن شریف چھوٹا سا، ہر وقت جیب میں لے کر پھرنا ہو گا۔ آپ کے سامنے حلفیہ بیان دینے کے لیے۔“ چند سیکنڈ بعد حواس درست ہوئے تو بولا۔

”اور یہ آپ کر کیا رہی ہیں؟“ انہیں برتن ادھر سے ادھر کرتے دیکھا تو کہا۔

”یہ۔ تمہارے استعمال کے برتن۔ الگ کر رہی ہوں، یہ پلیٹ، مگ، چمچ، پیالہ یہ تمہارے ہیں، میرے برتن استعمال نہ کرنا۔ کیا پتا۔ وہاں تم سو رکھاتے رہے ہو۔ شراب پیتے ہو گے، نپاک پلید منہ ہاتھ۔“ بے

دردی۔

ضرار سر قھام کر کر سی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا ”اؤف۔ میزے پروردگار۔ رحم کر۔ اس ایک اکلوتی ماں کے ساتھ رہ کر نہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔“

”دیکھو۔ اگر پچھتا رہے ہو۔ تو مت رہو یہاں۔ جہاں سے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ وہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ جو چار دن زندگی کے رہ گئے ہیں گزار لوں گی۔“

فورا ”کھڑے ہو کر ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔“ لیکن۔ مجھے تو آپ کی ضرورت ہے، میری ماں۔ میری جنت آپ کے قدموں میں ہے۔ جنت چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں پچھتاؤں گا۔ وعدہ۔“ چٹا چٹ بو سے لے رہا تھا۔

انہوں نے بزور اسے خود سے الگ کیا۔ ”ہٹ برے۔ جھوٹوں کا استاد۔ یہ انگریزوں والی چوہا چالی مجھے یقین نہیں دلا سکتی اور اول تو۔ ابھی یہ بھی یقین نہیں کہ امریکا گیا بھی تھا۔ ایسی اردو۔ وہاں سے آنے والا نہیں بولا کرتا۔ پتا نہیں کسی جیل میں ہی پڑا تھا۔ چھوٹ کر ماں یاد آئی۔“ اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔ ”جیل سے چھوٹ کر؟ اتنا سامان لے کر؟“ ہونٹ شکل بن گئی۔

لفظی جنگ ہوتی رہی۔ کام ہوتا رہا۔ ناشتا زبردست۔ حلوہ پوری آلو کی ترکاری۔ نہ جانے دل میں کتنے ارمان پل رہے تھے۔ کیسے کیسے نکالیں ہا۔ یہ اولاد۔ نہ جانے کیوں دل کے چپے چپے پر قبضہ جما کر بیٹھ جاتی ہے۔

گو کہ ناشتا کافی ہوئی تھا۔ ضرار نے دوپہر کے کھانے کا منع بھی کیا، مگر وہ کھانا تیار کر کے اسے بتا کر۔ دوا کی تاکید کر کے خود نہادھو تیار ہو کر بغیر بتائے چلی گئیں۔ کہاں جا رہی ہیں پوچھتا رہ گیا۔

وہ نمینہ کا دروازہ بجا رہی تھیں۔ ادھر رفیعہ کے گھر میں۔ خالہ بی کا ایکٹ کیا ڈرامہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ سعیدہ بیٹے بیٹیوں سمیت صبح ہی پہنچ گئیں۔

اصباح خالہ بی کی ہدایت کے مطابق اپنا زعفرانی

سوٹ جس کے دوپٹے پر کاسنی پھول بنے ہوئے تھے۔ کاسنی ستاروں کی لیس لگی تھی۔ پس کر آنکھوں میں کاجل لگا کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے مکالے یاد کر رہی تھی۔ (خالہ بی کے) سعیدہ لوگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ چائے سموئے کیک وغیرہ کی ٹرائی ان کے سامنے رکھ کر اجیہ اصباح کے پاس آئی تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ تہمتا رہا تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر چمکی۔

”لو جی۔ ادھر تو زبردست سین چل رہا ہے۔ امی کی خوشامد ہو رہی ہے کہ خالہ بی کو منا میں۔ وہ ناراض ہیں کیونکہ امی سے خالہ بی خوش ہیں تو اب ان ہی پر وارودار ہے اور جناب ہماری امی۔ وہ خالہ بی کی پوری پوری شاگردی کر رہی ہیں کہ میں نامانوں۔ تڑپ رہی ہیں مومالی اور سب سے بڑھ کر میٹا جو گھبراہٹ کا شکار ہے۔ ٹانگیں ہلائے جا رہا تھا۔ جیسے کپکپی چڑھی ہو۔ ہونٹ چبا رہا ہے۔ ارے وہی ہے جو میں نے ثریا آپا کی رخصتی کے بعد دیکھا تھا۔ چلو۔ تمہارا بلاوا آیا ہے۔ اتنی بے قرار ہیں کہ یہیں نہ آجائیں کہیں۔“

یہ ملاقات بھی انوکھی تھی۔ کبھی اس طرح اس سے نہیں ملی تھیں مہرمانو، شہریانو۔ تینوں ماں بیٹیاں اٹھ کر اس سے لیٹ گئیں۔ کھینچ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ لڑکا اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ پلکیں جلدی جلدی ہٹھٹا رہا تھا۔ ہونٹ چباتے چباتے لال سرخ کر لیے تھے۔ ہتھیلی کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔ نظریں اصباح پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اصباح معصومیت سے نظر جھکائے لیس لگے دوپٹے سے سر ڈھکے بت بنی بیٹھی تھی۔ خالہ بی کی ہدایت کے مطابق۔ زعفرانی رنگ کے دوپٹے میں اس کا رنگ دمک رہا تھا۔ اوپر سے کاجل بھری آنکھیں لمبی گھنی پلکیں چین قرار نوٹنے کو تیار (لڑکے کا) پھر مومالی نے رفیعہ خالہ سے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

”بس بھئی۔ اب بلاو حفسہ باجی کو۔ ہم کو ہماری امانت واپس کریں۔ اب صبر نہیں ہوتا۔“

رفیعہ خالہ نے کہا۔ ”مگر ابھی کل ہی تو وہ آپ کے

گھر سے آئی تھیں مایوس ہو کر۔ وہ تو خلع کے لیے تیاری کر رہی ہیں، طے کیے بیٹھی ہیں۔“

اتنا سنتے ہی تینوں بلبلا کر کچھ بولنے لگیں۔ لڑکے پر اور طرح کا دورہ سا پڑ گیا۔ کھڑا تھا۔ دھم سے کرسی پر گرا تقریباً۔ زبان ہونٹوں پر پھیرنے لگا نابرتوڑ انگلیاں زور زور سے جٹھانے لگا۔ سر پر بلاوجہ مکے برسانا شروع کر دیے۔ بہنیں اور اماں جان۔

”وہ تو یہ ہوا۔ اصل میں پتا نہ تھا۔ ارے برسوں کا بندھن۔ ایسے کیسے۔ اور ہم نے انکار کب کیا۔ ہم تو وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ میں فون کرتی ہوں حفسہ کو۔“

سعیدہ اٹھیں۔ رفیعہ نے اطمینان سے کہا۔ ”ان کے پاس فون نہیں ہے۔“

”اوہ۔ ہاں۔ تم نے انہیں بتا تو دیا تھا ہمارے آنے کا۔“

”نہیں۔ کیسے بتاتی؟“

”پڑوس میں جو رہتی ہیں ان کے گھر تو فون ہے۔ ان سے کہو۔ فون پر بلو ادیں۔ میں ان سے خود بات کروں گی بلکہ یہاں آنے کا کہوں گی۔ رفیعہ پلیز۔“

رفیعہ طے شدہ منصوبے کے تحت اٹھیں۔ بظاہر مایل ناخواستہ۔ کچھ دیر بعد آکر بتایا۔

”میں نے ٹینہ سے کہا ہے۔ بچے کو باجی کے گھر بھیج کر بلو ادیں۔ کہتی ہیں کہ پانچ منٹ انتظار کریں۔ وہ خود کال کر لیں گی آکر۔“

”ہاں۔“ سعیدہ نے سکھ کا سانس بھرا۔ ”کیونکہ اب میں دیر کرنا نہیں چاہتی۔“

اور اب وقت تھا اصباح کی برقرار منس کا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور مومالی کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔

”مومالی! بس۔ مجھے اور تماشا نہ بنائیں۔ میں کھلونا نہیں ہوں۔ نہ ہی مٹی کی گڑیا۔ کئی بار پہلے آپ خود انکار کر چکی ہیں۔ ساموں نے مہینوں سے میری شکل نہیں دیکھی۔ آپ لوگوں نے مجھ سے بے زاری کا کئی دفعہ اظہار کیا ہے۔ میں خود اب اس رشتے کو قائم نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھے اب اپنی توہین گوارا نہیں۔ پلیز۔“

میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی اس رشتے سے۔ خالہ بی سے بات کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے خود کسی سے واسطہ نہیں رکھنا۔ نہ آپ سے۔“

سعیدہ مومانی تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں کی مثال بن گئیں۔ رنگ فق تھا۔ بولیں تو آواز بھی کنویں کی گہرائی سے برآمد ہوئی۔

”بیٹا! میری بچی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو معیذ کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئے۔ تو پھر۔۔۔“

”جی! کہ وہ آئے اور اپنی پسند کی کوئی امیر زادی تلاش کرے تو پھر میرا تماشا بنانے کی کیا ضرورت۔ دو مہینے ہو چکے ہیں اس بات کو۔ آپ نے سانس نہ بھری۔ کر لیں آپ اپنے بیٹے کی مرضی اور پسند کی۔“

”ارے۔ وہ دو سری کون۔ وہ تم ہی تھیں جسے اس نے پسند کیا۔ پگلا۔ تمہاری شکل یاد نہ تھی۔ بچپن میں تو پھر۔۔۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ تم ہو گی۔“

”نکھر مجھے خبر تھی مومانی۔ آپ کچھ بھی کہیں۔ دو سری لڑکی پسند کی۔ اب وہ میں ہوں یا کالی دیوی لکھتے والی۔ مجھے غرض نہیں۔ میں بار بار اپنی ہتک برداشت نہیں کر سکتی۔“ کہہ کر باہر کی طرف چلی۔

لڑکا کھڑا ہو گیا۔

”دیکھو۔ (ہونٹ چبائے) میں بتاتا ہوں۔ (مکا رسید کیا سر پر) ایسا ہوا کہ مجھے پتا نہ تھا کہ تمہارا گھر وہاں۔“

اصباح تیزی سے باہر نکلی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ مظاہرہ ناقابل فراموش۔ یہ کیا کر کے آگئی ہوں۔ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ کمرے میں گھس گئی اور یاد کرنے لگی۔ خالہ بی نے اور کیا کیا کہا تھا۔ یہ کہنا وہ کہنا۔ لڑکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے بلکہ انکار کرنے کا بھی کہنا تھا۔ وہ تو ہو نہیں سکا۔ اس قدر تو ہنسی آرہی تھی۔ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تو بھاگ آئی۔ بوکھلاہٹ سوار تھی بے چارہ۔ ہائے مگر اچھے سے تو ہیں۔ کیسے مجھے دیکھ رہے تھے۔ خواہ مخواہ بکواس کر کے۔ ادھو۔ خالہ بی

نے کہا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے۔ بس۔ اب اگر۔ وہ سچ سمجھے۔

”سنو اجیہ!“ اجیہ کو پکارا وہ آگئی۔

”سنو اجیہ! میں۔۔۔ کیسی لگ رہی ہوں۔ اچھی؟ بہت اچھی؟ یا۔۔۔“

”او میری بہنا۔ ایسی ویسی؟ اچھی ی ی ی۔ پیاری ی ی کہ وہ صاحب بے ہوش نہ ہوئے یہی حیرت ہے۔ اب مومانی پھر تمہارے پاس آرہی ہیں۔ تمہیں منانے۔ اس سے پہلے کہ خالہ بی رشتہ ختم کرنے کا اعلان کریں تم خالہ بی کو منالو۔ رشتہ پکا کرنے کے لیے ہوشیار۔ وہ آرہی ہیں اور وہاں لڑکا ایک سو ایک جان سے تم پر عاشق ہو چکا ہے۔ نڈھال پڑا ہے۔ میں اس کے لیے گلو کو زبلی سکینچیں بنانے جارہی ہوں۔“

پھر جاتے جاتے۔ ”عصے کی شکل بنا کر بیٹھو“ مسکراؤ مست۔ کہہ کر ٹل گئی۔

مومانی آگئیں۔ اصباح کو منانے۔ لپٹانے۔

”میری بچی۔ میں تو کئی دن سے تمہارے گھر کے چکر لگا رہی ہوں۔ (جھوٹ) گھر بند دیکھ کر آجاتی تھی۔ کل وہ شینہ ملی تو۔۔۔“ لڑکا۔ ماں کے پیچھے آگیا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ (شرم کیسی۔ منکوحہ ہے۔)

”اس دن جب خالہ بی آپ سے ملنے گئیں۔ تو آپ نے صاف کہا کہ آپ کا بیٹا بچپن کی اس واردات کو گڈے گڑیا کا کھیل کہہ کر انکاری ہے۔ جہاں وہ کہے گا ہم وہیں اس کی شادی کریں گے تب تو آپ نے گھر کے چکر لگانے کا ذکر نہیں کیا۔“

”وہ تو بس۔ ایسے ہی۔ ہے ہے ہے۔“ ہنسنے کی بھونڈی کوشش کھسیانی سی۔ ”مذاق کر رہی تھی۔“

”تو مومانی۔ میری پوری زندگی آپ کے مذاق کی نذر ہو گی اب؟ نہیں۔ اب نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کس لیے مجھ سے کئی کترارہی ہیں۔ میں بن ماں باپ کی غریب لڑکی ہوں۔ میرے پاس کوئی جینز نہیں۔ کوئی سرمایہ نہیں۔ گھر نہیں۔ میں فقیر ہو چکی ہوں۔ کوئی کیا دیکھ کر پسند کرے گا۔ میرا تو آپ نے مذاق ہی بنا رکھا

تھا۔ ماموں نے بھی اپنے رشتے کا خیال نہیں کیا۔ تو میں کیوں کسی کا خیال کروں۔“

وہ اب اندر کمرے میں آگیا تھا۔ انگلیاں مسلتا ہوا۔ ہائے۔ جیسے کہیں کا شہزادہ، مگر کبھی شہزادہ تو دیکھا نہ تھا۔ اچھا ہیرو سہی۔

”آپ نے ادھر ثریا باجی کی شادی پر میرے سلام کا جواب دے کر منہ پھیر لیا۔ بات ہی نہیں کی۔ ماموں نے بھی ملنا چھوڑ دیا۔ میں اتنی کمزور، غیر اہم تھی آپ کے لیے۔ بار بار یہی سنتی رہی۔ وہ نہیں مانتا اب کیا مجھ میں سرخاب کے پر اگ آئے ہیں۔“ (اگتے ہیں کہ لگتے ہیں۔ پتا نہیں خالہ بی نے کیا کہا تھا۔ اف) سعیدہ مومانی پھر لیٹ گئیں۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہے میری جان اور ہمیں دولت جینز کی ضرورت بھی نہیں۔ بس میری چاند۔ میرے گھر میں روشنی کر دے۔ آرزو ہے میری۔“

”لیکن۔ آپ نے پچھلے دنوں۔۔۔ امیر گھر سے بہو لانے کا بہت چرچا کیا۔ اپنی پوزیشن کے مطابق۔ آپ نے کہا۔ ہم فقیروں سے نانا جوڑ کر خاندان میں اپنی سبکی نہیں چاہتے۔ مومانی۔ اب کیا میں فقیر نہیں۔ امیر ہو گئی ہوں۔“ آواز بھرا گئی سچ مچ۔

”کس۔ کس۔ اور کس نے کہا جھوٹ بالکل۔ بلاؤ ذرا۔“ ہڑبڑا گئیں، بوکھلا گئیں۔

”میری موجودگی میں کہا تھا۔ آپ نے کہا۔ میرا بیٹا لٹو بنجو لوگوں میں رشتہ کر کے ہنسی نہیں اڑوا سکتا۔ بس مومانی۔ آپ جا میں۔ خالہ بی سے بات کریں۔“ منہ موڑ لیا۔

ادھر ماں بیٹا جی جی کرنے لگے۔ ”می! میں نے یہ کب کہا۔ ہاں بچپن کے رشتے سے اختلاف تھا۔ آپ نے کوئی تصویر بھی نہیں بھیجی۔ یہاں بھی تصویر نہیں دکھائی۔ مجھے ملنے ہی لے جائیں۔ میں دیکھ۔“ بند لال ہونٹ خون کیو تر۔

”تو مجھے الہام ہوا تھا کیا کہ تصویر دیکھ کر تم راضی ہو جاؤ گے۔“

دروازے میں اجیہ کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ ”خالہ

بی آگئی ہیں مومانی۔“

سعیدہ مومانی ہڑبڑا کر اٹھیں۔ گھبرائی ہوئی۔ دروازے کے بالکل قریب جا کر لڑکھڑائیں۔ بیٹے کو ہٹانے کی کوشش میں خود پہلے نکلنے کی تگ و دو کی، مگر دھڑام سے گر گئیں۔ بیٹا افوہ کہہ کر انہیں اٹھانے کے لیے جھکا، مگر۔۔۔ خالہ بی پجوشن سے بے خبر دروازے کو دھکا مارتی اندر تیزی میں گھسیں تو سعیدہ مومانی کے سر سے ان کا پیر نکلایا۔ سنبھلنے کی کوشش میں۔ خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے ہاتھ کسی ان دیکھے سہارے کی طرف پھیلائے۔ تو جو چیز ان کی ہتھیلی سے نکل آئی۔ وہ لڑکے کے لمبے بال تھے۔ گرنے سے تونچ گئیں۔ بال انہوں نے مٹھی میں جکڑ لیے۔

ادھر لڑکا بے چارہ اس ناگہانی افتاد پر سر اٹھانے پر مجبور کہ بال۔ کسی کی مٹھی میں تھے بھاری بدن کی سعیدہ مومانی خود اٹھنے سے قاصر۔ بیٹا اٹھانا چاہتا تھا وہ بھی آزمائش بن گیا اس لیے۔ اب نہ اماں بیٹے کے ہاتھ چھوڑ رہی ہیں نہ خالہ بی اس کے بال۔ خالہ بی کی تھوکر جو سر پر لگی اس نے چیخیں نکال دیں۔ ”معہذ مجھے اٹھا۔“ کہہ کر پھر سے لیٹ گئیں۔ نہ وہ اٹھتی ہیں نہ بیٹا اٹھا سکتا ہے کہ بال جڑ چھوڑنے کے قریب تھے۔ ادھر اجیہ اندر آکر حیران۔ پھر دونوں لڑکیاں ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال پلنگ پر لو میں لگا رہی ہیں۔

وہ تو رفیعہ حالات حاضرہ کا جائزہ لینے اندر آئیں تو انہیں اس عجیب اور انوکھے جنگ و جدال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سمجھنے کا موقع نہ تھا۔ انہوں نے پہلے ذرا سی جھکی ہوئی خالہ بی کو پکڑ کر کھڑا کیا۔ خالہ بی نے بال چھوڑ دیے۔ لڑکے نے یک لخت اماں کے ہاتھ چھوڑ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اوووف۔ اب رفیعہ سعیدہ کو اٹھانے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ کھڑی ہوئیں۔ تو سعیدہ بے چاری نے چوٹ کو بھلا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

خالہ بی نے بھی ازراہ مصلحت ہاتھ بڑھایا۔ (ارادہ لڑائی کا بھول کر) اب ہاتھ دونوں کے ملے۔ پھر سعیدہ

ہے تو یہاں درجن بھر امیدوار موجود، مگر مہرمانو، شہریانو کی معافی خوشامد۔

خالہ بی کے دل نے پیسجنا شروع کر دیا۔ اب مہمانوں کی فہرست۔ شادی ہال کی بکنگ، مگر سب سے پہلے خالہ بی کی فرمائش اور مشورہ۔

”ویکھو بی سعیدہ! سچ تو یہ ہے کہ نہ مجھے نہ صبح کو سنبھلے لوگ پسند اور تمہارا بیٹا۔ بہت جلد گنجا ہو جائے گا۔ اس لیے پہلے تم سرسوں کا اصل تیل منگا لو۔ اس میں کلو بچی میتھی فلاں فلاں پکا کر مالش کرو۔ روزانہ۔ مجھے بھیجنا تیل۔ میں بنا دوں گی۔“

اور اندر کمرے میں نوجوان جوڑا۔ اب مسکرا رہا تھا۔ صبح شرمانی اور لڑکا دو سو بیس جان سے عاشق ہو گیا۔ لڑکے کے بال بے ترتیب ہو گئے تھے۔ صبح کا جوڑا بھی کھل کر کمر گردن پر بکھر گیا تھا۔

”تم۔ میری ہو۔ ازل سے۔“ لڑکے نے جھجک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

صبح نے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ ہٹا گئی۔ ”تو۔ میں نے کب انکار کیا؟“ اور ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگی۔ باہر بڑی خوش گوار دوپہر چھائی ہوئی تھی۔ دھوپ اور سائے ملن رت کے گیت گارہے تھے۔

خالہ بی اور سعیدہ مہمانی مہمانوں کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ کھانوں کی اقسام مہرمانو، شہریانو طے کر رہی تھیں۔ صبح بھاگتے بھاگتے اجیہ سے لپٹ گئی۔ دونوں پر از سر نو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

ساری عمر غم کے دریا میں غوطے لگانے والی صبح۔ ہنسی کو ترستی رہی۔ آج اپنے ہی قہقہوں سے حیران ہو رہی تھی۔ شاد کام ہو رہی تھی۔

زندگی کے امتحان کا رزلٹ تو بہت شاندار آیا تھا۔ میں تمہاری ہوں۔ بچپن سے۔ دل نے لہک کر کہا تھا۔

نے ایک چیخ ماری۔ ساتھ ہی خالہ بی نے ایک ساتھ تین چیخیں۔ دولہا میاں (متوقع) کے بالوں کا گچھا جو بذریعہ خالہ بی کی ہتھیلی کے سعیدہ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ انہوں نے ”ہائے اللہ یہ کیا ہے؟“ کہہ کر ہاتھ جھٹکا۔ خالہ بی نے سعیدہ کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ جھٹکا۔ سعیدہ ڈر گئیں۔ یہ نرم سی جان دار جیسے مکڑی کا جالا جیسی چیز کو ہتھیلی سے چھڑانے کی کوشش میں دونوں خواتین ایک دوسرے سے بازی لے جا رہی تھیں ان کی یہ کاوش بے چاری رفیعہ نے بھگتی جوان کے درمیان آگئی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں چپکے ہوئے بال رفیعہ کے منہ پر چپک گئے۔ وہ آخ۔ آخ کرتی ہاتھوں سے اس دن دیکھی چیز کو چرے سے ہٹاتی باہر لپک گئیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مکڑی کا جالا آگیاں سے کیا۔ منہ پر چپکنے کے لیے۔

کمرے میں لڑکیوں کو ٹوٹن کو تر بنا دیکھ کر خالہ بی کو بھی ہنسی آگئی۔ شرما شری سعیدہ بھی ہنسنے لگیں۔ لڑکا یعنی دولہا (متوقع) سر سے ہاتھ ہٹا کر بال جھٹکنے کے فعل سے فارغ ہوا تو سب کو زعفران کے کھیت میں موجود پا کر گھورنے لگا۔ جڑیں کافی دکھ رہی تھیں۔ بالوں کی۔ اذیت اب بہت بڑھی تو کھلکھلا ہٹ نے زور پکڑا۔

اجیہ ہنستے ہنستے نیچے جا گری۔ ساتھ ہی صبح کو گھسیٹ لیا۔ پیٹ پکڑے ہنستی چلی گئیں۔ پھر دونوں اٹھ کر باہر بھاگیں تو ٹکرا گئیں دولہا میاں سے۔ اور دولہا موقع کو ضائع کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اجیہ پہلے نکلی۔ دولہا نے صبح کا ہاتھ پکڑ لیا۔

صبح کھڑی رہ گئی۔ حیران یہ نرم ہاتھوں کی حرارت۔ ملاحت۔ گداز۔ مضبوط گرفت زبان حال سے کچھ بیان کر رہی تھی، گرمی جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ جیسے انہیں اپنی آغوش میں سمونے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ حالات حاضر سے بے خبر۔ خالہ بی سعیدہ کو ساتھ لے کر چلی گئی تھیں۔ اور۔ صبح کے متوقع کئی رشتے گنوانے کے بعد۔ یعنی اگر سعیدہ کی طرف سے انکار



مختصر قصہ جہان سکونِ قلب

سے کچھ مسئلے والی بات نکال چکی ہوگی۔
”نہیں... سلمیٰ نے حسرت سے نہیں کہتے ہوئے
آہ بھری ”بھئی جسے اللہ ہی اتنا دے تو زندہ کیا کر سکتا ہے
سوائے شکر کرنے کے۔“

”تو بندے نے اور کرنا بھی کیا ہے سوائے شکر
کرنے کے۔“ اصغر صاحب نے نرمی سے مسکراتے
ہوئے بیگم کی ٹھنڈی آہوں کو مزید ٹھنڈا کرنے کی ایک
اور کوشش کی۔

یہ اور بات ہے کہ ان کا دل آنے والے مکالموں
کے خوف سے یہاں سے رنچو چکر ہونے کا سنگنل دے

”آپا آئی تھیں آج۔“ سلمیٰ بیگم نے چاول چنتے
ہوئے بظاہر سرسری سے انداز میں میاں کو مخاطب
کرتے ہوئے گویا اطلاع دی۔

”اچھا!“ اصغر صاحب کو جیسے اندازہ تھا کہ بات
صرف اطلاع پر ہی ختم نہیں ہوگی اب کچھ اور بڑھے
گی وہ اپنی بیوی کی ہر ایک کی رپیں کرنے اور دیکھا
دیکھی کرنے کی عادت سے بخوبی واقف تھے۔

”کیسے آنا ہوا تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی خاص
بات۔“ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ آیا کوئی خاص بات کر
کے گئی ہوں یا نہ گئی ہوں ان کی بیوی ضرور اس میں

**Downloaded From
Paksociety.com**

Section

چکر لگا آؤں۔ پس آپا ہی پھر دوبارہ ٹپک پڑیں کوئی نئی چیز لے کے ہمارے پاس آؤد لکھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ الٹا شرمندگی ہوتی ہے۔ کوئی ڈھنگ سے بیٹھنے تک کی جگہ تو ہے نہیں گھر میں۔“ اب اس بات کا جواب تو اصغر صاحب کے پاس بالکل نہ تھا۔

”جاؤ گی تو اطہر کے گھر کا بھی چکر لگا لیتا۔ تمہاری آیا کے محلے میں ہی اس نے کرائے کا گھر لیا ہے۔ بتا رہا تھا کہ چھوٹی کو ذرا بخار ہے۔ اس کا بھی پتا کرتی آتا۔“ اصغر سے چھوٹے اطہر تھے جو پہلے دو سرے علاقے میں مقیم تھے۔ دونوں بھائی ایک ہی ادارے اور تقریباً ایک جیسے عہدوں پر فائز تھے۔

”اس دفعہ تو میں نے سوچ چلیا ہے اب جو کمیٹی کھلے گی تو LED یا سونے کا سیٹ اور کچھ نہیں لینا ہے بس۔“ وہ اپنا چاولوں کا تھال لے کے بچن کی طرف

چل پڑیں اور ساتھ ہی میاں کو بھی اپنے عزائم سے باخبر کر دیا۔

پورے دو دن دوئے سونے کے سیٹ سلمی کے حواسوں پہ چھائے رہے۔ آپا کی بیٹیاں ابھی اتنی بڑی بھی نہ تھیں کہ یوں ان کی شادی کی تیاریاں شروع کی جاتیں۔ چھوٹی ندا تو ابھی نویں میں جبکہ بڑی فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ بڑا بیٹا دو تین دفعہ میٹرک میں فیل ہو کے اب باپ کے ساتھ دکان پہ بیٹھتا تھا جبکہ چھوٹا والا ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

تیسرے ہی دن وہ آپا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ رنج آپا کو اپنے آنے کا جب بتایا تو انہوں نے دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کا کہا اس لیے وہ بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد فوراً ہی چل پڑیں۔ وہ تقریباً ۱۵ مہینے بعد آپا کی طرف جا رہی تھیں ورنہ تو اکثر آپا ہی ایک آدھ مہینے میں ان کی طرف چکر لگا لیتی تھیں۔ آپا کے گھر کم جانے کی ایک وجہ ان کے میاں کا مزاج بھی تھا جو ہر وقت ساتویں آسمان پر چڑھا رہتا تھا اور میکے والوں کو دیکھ کر تو وہ اور بھی بد نگاہ ہو جاتے تھے۔

رہا تھا مگر مجبوری کہ چائے ابھی کپ میں آؤمھی سے زیادہ بڑی تھی اور ابھی تک گرم تھی ورنہ اس کو بیگم کو گرم کر کے لانے کے لیے تھما دیتے۔ اسی لیے مسکراتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرنے پر ہی اکتفا کیا۔ ان کی یوں اطمینان بھری مسکراہٹ نے تو جیسے جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔ سلمی نے چاولوں کے تھال کو جھٹکے سے فرش پر دھرا کہ ظاہر ہے میاں کو قائل کرنے کے لیے زبان اور ہاتھ دونوں کی ضرورت تھی۔

”بات سنیں میری۔“ انہوں نے اشارے سے میاں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”شکر بھی وہ ہی کرتا ہے جس کے پاس کچھ ہوتا ہے۔ ادھر میرے پاس کیا ہے جو میں شکر کرتی پھوں۔“

اب اسی بات سے وہ بچنا چاہ رہے تھے۔ ”اچھا تو کیا کہہ رہی تھیں آپ کی آپا صاحبہ۔“ چائے کا

گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔ لہجہ ہنوز سرسری سا تھا۔ اندازہ تو اصغر صاحب کو بھی تھا کہ آپا یقیناً ”کوئی الیکٹرونک آئٹم۔“ کوئی نئے ماڈل کا موبائل بس کچھ نیا ہی دکھا کے یا بتا کے گئی ہوں گی۔ مالی اعتبار سے وہ ان لوگوں سے کافی بہتر تھیں۔ ان کے میاں کا کپڑے کا کاروبار تھا جو اچھا خاصا چل رہا تھا۔ ادھر اصغر صاحب ٹھہرے نوکری پیشہ اور لکی۔ نہ ہی کمانے والے۔

”کہنا کیا ہے؟“ سلمی نے بات شروع کی۔ ”کہہ رہی تھیں کہ سونا سستا ہوا ہے تو دونوں بچیوں کے لیے سونے کے سیٹ بنوائے ہیں یہ ہی کہہ رہی تھیں کہ آ کے دیکھ جاؤ کسی دن ہم LED بھی دیکھنے نہیں آئیں۔“

”ہاں تو چلی جاؤ کسی دن؟“ انہوں نے چائے کا خالی کپ بیگم کو تھماتے ہوئے کہا۔ صحن میں کچھی ایک چارپائی تھی وہ اور سامنے رکھی چارپائی پر سلمی بیگم براجمان تھیں۔ سلمی نے سستی سے خالی کپ نیچے فرش پر رکھا اور چاولوں والا تھال اٹھا۔ دوبارہ چاول چنے لگیں۔

”ہاں سوچتی ہوں۔۔۔ ایک دن میں آپا کی طرف

READING
Section

سیٹ T.V لاؤنج کے حساب سے۔۔۔ ست بھاری بھر کم تھا، اور سے سامنے والی دیوار پہ لگا اتنا بڑا LED کچھ عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ صوفے اور LED کا فاصلہ کافی کم تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ہی ڈیپ فریزر بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پہ بچوں کے بیگ اور اسکول کی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ فرش پر بھی لگتا تھا جھاڑو نہیں لگی ابھی تک حالانکہ دو ڈھائی بج رہے تھے۔

آیا ان لوگوں کی خاطر تواضع کولڈ ڈرنک سے کر چکی تھیں اور اب کچن میں چولہے پہ پڑھا ہوا سالن دیکھنے آئیں تو سلمیٰ بھی بہن کے ساتھ ہی کچن میں آگئی۔ کچن کے سنک میں بھی برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لگتا تھا رات کے کھانے کے برتن تک نہیں دسلے ابھی تک۔

”ارے توبہ ہے پورا گھنہ گزر گیا۔ گوشت تو لگتا

ہے، گلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔“ آیا نے بھاپ اڑاتی ہوئی کو توڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں آیا۔“ اب سلمیٰ بیچاری کیا کہتی۔ بچے تو بغیر کچھ کھائے یہ اسکول سے سیدھے یہاں آئے تھے۔ ان کی تو فکر تھی اور آیا کو بھی جیسے اندازہ ہو گیا۔

”ارے لڑکیوں! وہ تم لوگ کیا ٹکٹ وگٹ تلتی رہتی ہو۔ وہ تل کے دو نا بچوں کو۔“ سلمیٰ! ڈیپ فریزر بھرا رہتا ہے ان کے چوچلوں سے۔ ارے ندا! بابر کو پانچ سو روپے دے کہ کہہ کہ کسی اچھے سے ہوٹل سے بریانی لے آئے۔ یہ گوشت تو گلنے کا نام نہیں لے رہا۔“

ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں پڑے ڈائمنگ ٹیبل کی جو گرد سے اٹا پڑا تھا۔ جھاڑو پچھ کر کے عزت افزائی کی گئی۔

”آیا! آپ کی کام والی ماسی نہیں آتی اب۔“ کب سے دل میں آتی بات سلمیٰ کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ سلمیٰ بہت نفاست پسند اور گھر کو چمکا کے رکھنے والی عورت تھی۔ ہاں پر جیسے تیسے کر کے گھر کی روز کی صفائی کر رہی تھی۔ کم از کم گرد میں

سلمیٰ کے دو بچے تھے۔ 12 سالہ مریم اور 8 سالہ زیشان۔ بچوں کے ساتھ دو دو بسیں بدل کے وہ آخر کار اپنی آیا صاحبہ کے گھر پہنچ ہی گئیں۔ آیا T.V لاؤنج ہی میں مل گئیں۔ کوئی ڈرامہ وغیرہ دیکھ رہی تھیں۔ صوفے کے آگے رکھے شیشے کے میز پر چائے کے کپ اور پلیٹیں بکھری پڑی تھیں۔ لگتا تھا ابھی یہیں ناشتہ کیا گیا ہے۔ دونوں لڑکیاں بھی ادھر ہی تھیں۔

”ٹھہرے آنے کی خوشی میں تنوں بچوں نے آج اسکول کالج سے چھٹی کی ہے۔ سلمیٰ دیکھ لو کتنا پیار ہے اپنی خالہ سے۔“ آیا نے گلے ملتے ہی جتاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو خالہ کو بھی تو پیار ہے۔“ سلمیٰ نے بھی ندا اور سرہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

”تو صبح سے ہی کیوں نہ آئے پھر۔۔۔ تیرے دولہا بھائی تو 10 بجے تک گھر سے نکل جاتے ہیں تو 11 بجے تک آجاتی۔ ابھی تیرے بچے کونے PHD کر رہے ہیں جو تو ان کی ایک دن کی بھی چھٹی نہ کرا سکی۔“

”ارے آیا! اب بس آگئی ہوں نا۔ اب رہنے دس۔ آپ کو پتا تو ہے، صغیر پڑھائی کے معاملے میں بالکل رعایت نہیں برتتے۔“ سلمیٰ نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

لگتا ہے کاربٹ بھی نیا لیا ہے آیا! سلمیٰ نے فرش سے بچھے سرخ اور کالے رنگ کے امتزاج کے قالین کو دیکھتے ہوئے آیا کو خوش کرنا چاہا۔۔۔

”ہاں بھئی اب وہ براؤن والا تو ان صوفوں سے بیچ نہیں کرتا تھا تو جب صوفہ سیٹ بدلا تو قالین بھی نیا لیتا پڑا۔“ آیا کے جتانے پر کہ صوفے۔۔۔ نہیں۔ سلمیٰ نے صوفے کو بھی ذرا غور سے دیکھا۔

گو کہ جیسے آٹھ مہینے ہی ہوئے ہوں گے صوفے کو پر یوں جا بجا دھبے پڑے ہوئے تھے صوفے پر کہ لگتا تھا آٹھ دس سال تو ضرور پرانا ہے۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ ابھی چند ماہ پہلے ہی نیا لیا ہو۔ ایک تو صوفہ

انی چیزیں اور ادھر ادھر بکھرے خالی سپر فرش پر نہیں ملتے تھے۔

بھوک زوروں کی لگی ہوئی تھی اس لیے سلمیٰ نے بھی بچوں کے ساتھ ساتھ خود بھی چپس اور گٹ پلیٹ میں ڈال کے کھانے شروع کر دیے۔

”بتائیں یہ کبخت، بریائی ابھی تک کیوں نہیں لے کے آیا۔ دیکھ، تین بج رہے ہیں۔“ آپا دونوں سونے کے سیٹ ڈانگ بیبل پر ہی لے آئیں تو سلمیٰ نے بھی اپنی پلیٹ سائڈ پہ کر لی۔

”ہاں واقعی بہت خوب صورت سیٹ ہیں۔ دونوں ہی بہت خوب صورت ہیں آپا۔“ سلمیٰ نے دل کھول کے زیورات کی تعریف کی اور ستائشی نظروں سے مٹلی ڈلوں میں رکھے سیٹوں کو دیکھا۔

”خالہ یہ والا زیادہ پیارا ہے نا۔ یہ والا میرا ہے۔“

چھوٹی ندانے ایک سیٹ کو اپنے گلے میں لگاتے ہوئے خالہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”نہیں یہ میرا ہے۔“ اس سے بڑی سمرہ نے اس کے ہاتھ سے سونے کے ہار کو جھپٹا۔

”اری منحوسو! شادی تو ہو جانے دو۔ یہ کوئی میں تمہیں ایسے ہی پہننے کو دوں گی۔ جب شادی ہوگی تب ہی دوں گی جینز میں۔ ابھی سے کیوں لڑ رہی ہو۔“ لڑکیوں پر آپا کو غصہ آیا۔

”کس کی شادی پر ای۔“ سلمیٰ کی بارہ سالہ بیٹی نے جو ندا سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹی تھی معصومیت سے پوچھا۔

”کسی کی نہیں، تم چپ رہو۔“ سلمیٰ نے اسے ڈپٹا۔

”ارے یہ بابر کہاں مر گیا۔ ابھی تک بریائی لے کے نہیں آیا۔“ ابھی آپا کی منہ سے ہی نکلا تھا کہ بیل کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھ چھوٹی! بابر آیا ہو گا۔“ آپا نے ندا کو آواز دی۔

”بابر نہیں! ابا آئے ہیں اماں۔“ سمرہ کی صحن میں سے آواز آئی۔

”ہائے اللہ!“ آپا اپنا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی صحن کی

طرف نکلیں۔ جہاں سے ابا صاحب کی خوب زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی تھی۔

”کیا مصیبت ہے اس گھر میں۔ کب سے انتظار کر کر کے خود آگیا ہوں۔ کھانا بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا یا آج پھر بھول گئی تھی، جاہل عورت۔“ اب ان کی آواز بخوبی ڈرائنگ روم میں سنائی دی رہی تھی۔

”وہ اصل میں میں نے آج وہ۔۔۔ ارے سمرہ! تجھ سے کہا تو تھا کہ یا سر کو فون کر دے کہ آج بازار سے کچھ منگوا لے اپنے اور ابا کے لیے۔ آج گھر پہ سالن نہیں بنا۔ تو نے فون نہیں کیا کیا دکان پر؟“

یا سر۔۔۔ وہ آج دوکان پہ آیا ہی کب ہے۔“ ابا غصہ میں دھاڑے۔

”صبح سے اکیلا ہی سر کھپا کھپا کے اب تک آ کے آیا ہوں۔ تمہارا لاڈلا تو اپنے ننھیال پر گیا ہے۔ اتنا

کاہل اور ست ہے۔ سو مر رہا ہو گا اور۔۔۔“ آبا کو شک لگا۔ ”اری سمرہ بتانا تو تھا۔ تو نے فون کیا تھا بھائی کو۔۔۔“

”نہیں اماں بھائی کا فون بند جا رہا تھا۔ پھر آپ نے کہا کہ خالہ اور بچوں کے لیے گٹ مل لو تو اس میں یاد نہیں رہا۔“ اپنا حوالہ سنتے ہی سلمیٰ کا دل ایک دم سکڑا۔

اف! خواجواہ ہی وہ یہاں آگئی۔ دولہا بھائی کے کڑوے مزاج سے پورا خاندان ہی واقف تھا لیکن ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا دولہا بھائی نے۔ تین بجے تک انسان مغز ماری کرے، بڑا بیٹا کام کا بوجھ نہ پائے، گھر والے کھانا بھجوانا بھول جائیں تو سلمیٰ نے حقیقت پسندی سے سوچا۔

”میری تو قسمت ہی خراب ہے جو تجھ جیسی کاہل عورت پلے پڑ گئی۔ ارے نہیں پکایا جاتا تو کام والی رکھ لے، جاہل عورت۔ پتا بھی ہے بلڈ پریشر اور شوگر کا مریض ہوں۔ باہر کا نہیں کھا سکتا پر تجھے کیا تیری بلا سے۔۔۔“

”ارے میں دیکھتی ہوں۔ سالن پک ہی گیا ہو گا۔ ارے سمرہ! جلدی سے آٹا گوندھ، ابھی روٹیاں ڈال

دیتی ہوں۔ ”آپا جلدی جلدی باورچی خانے کے لیبنٹ کو کھول کر آٹا نکالنے لگیں۔

”اب جو پکار رہی ہو پہلے نہیں پکا، مر سکتی تھیں۔“
 دلہا بھائی زور سے چٹکھاڑے اور پھر دھپ دھپ کرتے سیڑھیاں چڑھ گئے۔ ان کے اوپر جاتے ہی سلمیٰ کی جان میں جان آئی۔ واقعی اسی وجہ سے وہ مہینوں یہاں کا رخ نہیں کرتی تھی۔ یہ شخص تو کسی رشتہ دار کی بھی پرواہ نہیں کرتا حالانکہ سمرہ بتا بھی چکی تھی کہ خالہ اور بچے آئے ہیں تب بھی سلمیٰ نے اپنا برس سنبھالا اور آہستگی سے کچن میں چلی آئی جہاں آپا آٹا گوندھ رہی تھیں اور ندا اسلاد کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھی۔

”ارے سلمیٰ، تم کیوں آگئیں۔“ آپا کے لہجے میں سیاں کی لعن طعن کی وجہ سے شرمندگی جھلک رہی تھی۔

”بیٹھو سلمیٰ، میں بس آ رہی ہوں یہ شوگر کے مریض ہیں نا اس لیے۔“

”ارے نہیں آپا کوئی بات نہیں۔ میں بس تھوڑی ہی دیر کے لیے آئی تھی۔“

”ارے کیوں بھئی۔“ آپا کے آٹا گوندھتے ہاتھ رک گئے۔

”وہ آپا، اصل میں اصغر نے تاکید کی تھی کہ اطہر بھائی کے گھر بھی ضرور چکر لگا آؤں۔ آپ کے محلے میں ہی تو رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی بیٹی کی طبیعت بھی خراب تھی تو اس کو بھی دیکھنا ہے اور کل بچوں کا ٹیسٹ بھی ہے تو پھر جلدی گھر بھی جانا ہے۔“ سلمیٰ نے بہن کو تفصیل سے بتایا کہ وہ اس کے جلدی جانے سے پریشان ہی نہ ہو جائے۔

”فارے تم آتی ہی کب ہو۔ سلمیٰ یہ تمہارے دولہا بھائی تو ہم جانتی ہو۔“

”ارے آپا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے اگر اطہر بھائی کی طرف نہ جانا ہوتا تو رک جاتی۔ اب ٹائم دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ اوھر بھی ایک گھنٹہ تو لگے گا۔ پھر واپسی میں دو دو بیس بدل کے جانا ہے۔ میں پھر آؤں گی

انشاء اللہ۔“ سلمیٰ نے جلدی جلدی یہاں سے نکلنے کے لیے جواز دیا۔

”گھر پتا ہے تمہیں اس کا۔“ آپا نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں آپا! وہ اصغر آئے تھے پچھلے ہفتے۔ آپ کی پیچھے کی طرف کی تیسری گلی میں کوئے کا مکان ہے۔“
 ”اپنا لیا ہے یا کرائے پر ہی ہے ابھی تک۔“ آپا نے پوچھا۔

”ابھی تو کرائے پر ہی لیا ہے۔ اچھا آپا، میں چلتی ہوں اللہ حافظ۔“ سلمیٰ نے جلدی جلدی باہر کی طرف قدم بڑھائے۔



تیسری گلی کے کوئے والے گھر بہ بڑا سا تالا دیکھ کر

ابھی سلمیٰ سوچ ہی رہی تھی کہ یہیں سے رکشہ پکڑے اور سیدھی اپنے گھر جائے۔ یہ سوچ کر مڑی ہی تھی کہ دیو رانی صاحبہ بالکل پیچھے کھڑی نظر آئیں اور ان کی پریشانی کو سمجھ کے مسکرا کے پوچھیں۔

”میں دور سے دیکھ رہی تھی کہ یہ بھابھی اور بچے ہی لگ رہے ہیں۔ تیز تیز چلتی ہوئی آئی ہوں کہ آپ لوگ تالا لگا دیکھ کے پریشان نہ ہوں۔“ ساتھ ہی انہوں نے گیٹ کھولا۔

”ہاں میں تو جانے ہی کا سوچ رہی تھی۔“ سلمیٰ نے اندر صحن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ کیا؟“ سامنے ہی برآمدے میں ایک سائڈ پیڑی میز پر دیو رانی کے دونوں بچے کتابیں رکھے اسکول کا کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھا تو فوراً ہی سلام کرنے چلے آئے۔

”ان کو تم گھر پہ چھوڑ کے گئی تھیں۔“ سلمیٰ نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھابھی، میں بس دو منٹ کے لیے ذرا کام سے گئی تھی۔ یہیں دوسری گلی میں یہ پروے دیئے گئی تھی۔“

”کون سے پروے؟“ اب سلمیٰ کی نظر دیو رانی کے ہاتھ

میں پکڑے تھیلے پہ پڑی جو اس نے اب ساتھ ہی پڑے میز پر رکھ دیا تھا۔

”ابھی بتاتی ہوں بھابھی“ ایک منٹ۔ ”وہ اٹھ کر برآمدے کا پنکھا چلا کر بولی۔ ”ذرا ٹھنڈا پانی لے آؤں پھر بتاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے ساتھ ہی بنے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئی۔

”آؤ رملی۔“ اپنی نو سالہ بیٹی کو اس نے شاید اپنی مدد کے لیے آواز دی۔ جو فرمانبرداری سے کچن کی طرف چل پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں رملی ٹرے میں ٹھنڈی سککھجبین کے گلاس اٹھائے داخل ہوئی۔ ٹھنڈے مشروب سے سلمیٰ کے اندر تک تازگی آگئی۔ دیورانی (حنا) ابھی تک کچن میں ہی تھی۔

سلمیٰ نے ایسے ہی سامنے صحن پہ نظر ڈالی تو جہاں قطار سے لگے گملے اور ان میں لگے خوشنما پھول بہت

ہی بھلے لگ رہے تھے۔ صحن کافی کشادہ اور صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ برآمدے میں جہاں وہ بیٹھی تھی لکڑی کی چار کرسیاں اور بیچ میں چھوٹی سی شیشے کی میز بڑی تھی۔ ایک سائڈ میں ڈائمنگ ٹیبل تھا جس پہ بچے بڑھ رہے تھے۔ برآمدے کو یقیناً ”T.V لاؤنج اور ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ سامنے کی دیوار کے ساتھ T.V ٹرالی بھی لگی تھی۔ سامان بہت عام سا تھا مگر صفائی اور خوب صورتی سے کی گئی سمیٹنگ کی وجہ سے بہت اچھا تاثر دے رہا تھا۔ گملوں کے پاس ہی صحن میں تخت پہ صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی۔

اندر کمروں میں بھی صفائی کا یہی عالم تھا۔ وہ دل ہی دل میں دیورانی کے سکھڑاپے کی قائل ہو گئی۔ گو کہ حنا کا گھر کرائے کا تھا پر سلمیٰ کا تو اپنا تھا تب بھی سامان اس طرح سے سلیقے سے نہیں رکھا ہوا تھا۔ ہر وقت چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی رہتی تھیں۔ ابھی وہ تھوڑی دیر کے لیے آیا کے گھر اور اپنے گھر کا موازنہ کر رہی تھی تو اسے لگا کہ آپا کا گھر تو بہت ہی ٹھنڈا اور گندہ ہے اس کا اپنا گھر بہر حال اس سے بہتر ہے پر اب حنا کا گھر جو کہ سلمیٰ کے گھر کا آدھا ہی ہو گا اور سامان بھی یقیناً ”ستا تھا لیکن ہر چیز صفائی اور طریقے سے رکھی ہوئی تھی۔

کرسیوں کے سامنے رکھی میز پہ خوب صورت سا میز پوش اور اس پہ رکھا پیارا سا نازک سا گلہ این چمکتا صاف ستھرا صحن۔ ابھی وہ ان ہی خیالوں میں تھی کہ حنا ٹرے ہاتھوں میں پکڑے کچن سے نمودار ہوئی۔

”چلو بیٹا! بکس اٹھاؤ ٹیبل پر ست“ ادھر ہی کھانا لگاؤں گی۔“

”ارے تم نے کیوں تکلیف کی حنا!“ سلمیٰ نے کھانے کا اہتمام دیکھا تو دیورانی کو ٹوکا۔

”تکلیف کیسی بھابھی! مٹریلاؤ اور راستہ بنا کے گئی تھی۔ آ کے صرف شای کباب تلے ہیں۔ آپ کے آنے کا پتا نہیں تھا ورنہ کوئی اچھی سی چیز بناتی۔“

”ارے نہیں یہ ہی بہت ہے۔“ کھانا واقعی مزیدار تھا۔ مٹریلاؤ پودینے کی چٹنی، راستہ شای کباب سب ہی کچھ بہت ذائقہ دار تھا۔ کھانے کے برتن اٹھانے کے

جب حنا اٹھی تو وہ بھی اس کی مدد کی غرض سے کچن میں آگئی۔ چھوٹا پرائیوٹ صاف ستھرا سا کچن دیکھ کے سلمیٰ کو گندے برتنوں سے بھرا اپنی بہن کا امریکن کچن یاد آ گیا۔ اس کچن میں سلمیٰ کا کھڑے ہونے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اور یہاں اس چھوٹے سے کچن میں جیسے بندے کا آپ ہی آپ کام کرنے کو دل چاہے۔

”بھابھی آپ بیٹھیں۔ میں بس چائے کا پانی رکھ کے آتی ہوں۔“ حنا نے اس کے ہاتھ سے برتن لے کر رکھتے ہوئے کہا۔

ارے نہیں حنا! چائے پھر کبھی۔ تم بس ادھر بیٹھو میں تھوڑی دیر میں واپس چلی جاؤں گی۔“

”ارے! ایسے ہی! آپ کے شوہر ناچار آرہے ہیں اطہر کے ساتھ۔ آپ ایسے ہی چلی جائیں گی۔“ حنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا واقعی!“ سلمیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بیچوں نے ابھی بتایا کہ جب میں گھر سے باہر تھی تو بابا کا فون آیا تھا۔ آج تایا ابو شام میں ان کے ساتھ ہی آئیں گے۔ وہ میرے پاس موبائل نہیں ہے ورنہ وہ مجھے فون کر دیتے۔ آپ کو شاید فون کیا ہو“ آپ اپنا فون چیک کریں۔“

”ہاں اچھا دیکھتی ہوں۔“ سلمیٰ نے ہینڈ بیگ کھول کے اپنا فون چیک کیا تو کئی مسیڈ کالز تھیں۔
 ”اوہ یہ موبائل سائلنٹ پہ تھا شاید۔“ سلمیٰ نے فون کو واپس بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے حنا تم بھی لے لو نا موبائل فون اب تو ہر ایک کے پاس ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اسے آپا کی چھوٹی بیٹی ندا کی بات یاد آگئی۔

جب اس نے سلمیٰ کے موبائل فون کو دیکھا تھا تو کہا تھا۔ ”خالہ یہ والا موبائل تو اب ماساں بھی نہیں لیتیں۔ خالو سے ٹیچ اسکرین موبائل منگوائیں اور اسے کسی کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیں۔“

”ارے نہیں بھابھی۔“ اسے حنا کی آواز نے متوجہ کیا۔ ”مجھے موبائل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گھر میں فون تو ہے ہی اور اظہر کے پاس ہے ایک موبائل وہ

ہی ہمارے لیے کافی ہے اور میں کونسی جاب کرتی ہوں۔ سلمیٰ دیورانی کے اطمینان پر حیران ہی تو رہ گئی۔

شام میں اصغر بھی اظہر کے ہمراہ آگئے تو پھر خوب محفل جمی۔ دونوں بھائی برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے ’T.V‘ کی خبروں کے ساتھ ساتھ چائے کا مزہ لے رہے تھے۔ حنا اور سلمیٰ چائے کے کپ اٹھائے صحن میں رکھے موڑھوں پر بیٹھی تھیں۔ قریب ہی رکھے گیلے اور ان میں کھلے خوشنما پھول ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں سے ہلتے بہت دلفریب اور فرحت بخش محسوس ہو رہے تھے۔ حنا نے چائے کے ساتھ پکوڑے اور وہ جٹھیل رولز بنائے تھے جو کہ بہت ہی لذیذ تھے۔ ساتھ میں پودینے اور اہلی کی چٹنی۔

اس کو خیال آیا کہ حنا کھانا تو پہلے بھی بہت اچھا بناتی تھی لیکن آج جب آپا کے گھر سے موازنہ کیا تو حنا کے گھر کی ہر چیز میں ترتیب، قرینہ اور سلیقہ جھلک رہا تھا جبکہ آپا کے گھر میں اس چیز کا فقدان تھا۔ اسے اپنی کل تک کی سوچ یہ حیرت ہوئی کہ وہ کیسے آپا سے جھپلس ہو رہی تھی کہ آپا کے پاس کتنا پیسہ ہے۔ آپا کتنی عیش کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اور وہ بیچاری قسمت کی ماری صرف آیا کو شومارتے ہوئے دیکھ ہی سکتی ہے۔

جبکہ صرف دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد ہی اس کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ بچوں کا ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا مارا ماری کرنا کہا ماں کا بچوں کو بات بات میں لعن طعن کرنا۔ آپا نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔
 کہاں گم ہیں بھابھی۔“ حنا نے پکوڑوں کی پلیٹ اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی تم اتنا سارا ٹائم کیسے نکال لیتی ہو!۔ میرا مطلب ہے اتنا اچھا صاف ستھرا گھر۔“ اس نے دوسرے کمرے میں جو کہ شاید بچوں کا تھا اور چاروں بچے بیڈ کے ساتھ بچھی ہوئی جٹائی پر بیٹھے کوئی یکم وغیرہ ٹھیل رہے ان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ بچوں کے کمرے میں ہی دیوار کے ساتھ بنی کتابوں کی الماری بھی تھی۔ جس میں بچوں کی اسکول کی کتابوں کے علاوہ دوسری بہت ساری کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

”ٹائم ہی ٹائم ہے بھابھی۔ اور اب تو بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ انہیں اسکول بھیج کے۔ گھر کا کام تو دوڑھائی گھنٹے میں ہو ہی جاتا ہے تو میں تو محلے والوں کے کپڑے بھی سی لیتی ہوں۔ وہ جو آج تھیلالے کے آرہی تھی نا“ جب آپ آئیں تھیں۔ اس میں پردے تھے۔ درزی پردے سینے کے بہت زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں نے اپنے گھر کے پردے خود بے تو میری پردوں نے کہا کہ تم میرے بھی سی دو۔ پھر اس طرح محلے میں اور بھی لوگوں نے سلوائے۔ آج سامنے والی گلی میں ایک گھر ہے ان کے پردے سلعے ہوئے تھے تو ان کو دینے گئی تھی پر وہ لوگ کہیں گئے ہوئے تھے تو واپس لے آئی۔“

”اچھا! تمہیں عجیب نہیں لگتا۔ میرا مطلب ہے کافی مشکل کام ہے۔“ سلمیٰ نے حیرت سے پوچھا۔
 ”نہیں۔ بس ذرا دل لگا کے اور روحیان سے کریں تو کوئی بھی کام مشکل نہیں بلکہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے زیادہ اس میں بچت ہے۔“ حنا کے جواب پر تو وہ اور حیران ہوئی۔

”تم ٹیوشن بھی پڑھاتی ہو حنا۔“

”ہاں۔۔۔ ابھی ابھی امتحان ہوئے ہیں تو اس مہینے نہیں ورنہ اکثر تین چار بچے تو آ ہی جاتے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو پڑھانا ہوتا ہے۔ اب تو سوچ رہی ہوں خود پرائیویٹ لی اسے کر لوں تو اور اچھی طرح اور ذرا بڑی کلاسوں کو بھی ٹیوشن پڑھالوں گی۔“

”یار! تم تو بھی ہر فن مولا ہو۔ پتا نہیں اتنا ٹائم کیسے آجاتا ہے تمہارے پاس۔“ سلمیٰ کے پاس تو اپنے بچوں تک کو پڑھانے کا ٹائم نہیں تھا۔ اس کے دونوں بچے محلے میں ٹیوشن پڑھنے جاتے تھے جبکہ وہ بھی حنا کی طرح انٹریاس تھی۔

”بھابھی ٹائم نکالنے سے نکلتا ہے۔ میں ٹائم کو بناوجہ ضائع نہیں کرتی۔ میں تو اتنا وقت بھی نکال لیتی ہوں کہ دوپہر میں بچوں کو لے کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کر لوں۔۔۔ پھر شام میں ٹیوشن والے بچے آجاتے ہیں۔۔۔ اس کے بعد کھانا کھانا اور پکن سیٹنا۔ بچوں کے اور ان کے کپڑے استری کرنا اور بس۔“

”اور کپڑے کب سیتی ہو۔“ سلمیٰ نے پوچھا۔
”وہ صبح بچوں کے اسکول جانے کے بعد۔ گھر کی صفائی سے فارغ ہو کے ایک دو گھنٹے ہی لگا لیتی ہوں، اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔“ اور سلمیٰ بیگم سوچنے لگیں کہ ٹائم تو ان کے پاس بھی اتنا ہی ہوتا ہے پر انہیں کتنا کم محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب ہر روز تین چار ڈرامے، مارنگ شو، ٹاک شو، یہ سب دیکھے جائیں گے تو دوسرے کاموں کے لیے ٹائم کہاں بچے گا۔۔۔
”تم ٹی وی کب دیکھتی ہو۔“ سلمیٰ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھا۔ ”بس جب کوئی اچھا پروگرام آتا ہے تب دیکھ لیتی ہوں۔ ہر وقت نہیں۔“ حنا نے مختصر سا جواب دیا۔

ایک میں ہوں بھلے سے دو دن تک اپنا چہرہ آئینہ میں نہ دیکھوں پر 24 میں سے چار چھ گھنٹے ٹی وی ضرور دیکھوں گی۔ سلمیٰ نے جل کے سوچا۔

شام کے سات بجے تک ان کی واپسی ہوئی۔ اصغر نے اسے کہا بھی کہ تم گھر پر ٹھہرو میں رکشہ لے آتا ہوں پر سلمیٰ کا رکشہ اسٹینڈ تک اک کر کے کاموڈ تھا

۔۔۔ موسم بھی اچھا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جو آتی سردیوں کا پتا دے رہی تھی۔ پیدل چلنا اور اچھا لگ رہا تھا۔ بچے بھی خوش تھے۔

ایسے ہی چلتے چلتے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج میں دعا کر رہا تھا کہ تمہاری آیا نے کوئی نئی چیز نہ خریدی ہو۔“

”کیوں؟“ سلمیٰ نے مصنوعی خفگی سے میاں کو گھورا۔ ”میں کوئی جلتی ہوں ان کی چیزوں سے۔“
”جلتی تو نہیں ہو۔۔۔ پر تمہارا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔“

”کوئی نہیں! خوشگوار زندگی نت نئی چیزوں کی مرہون منت تو نہیں ہوتی۔“

”اچھا! تو پھر خوشگوار زندگی کن چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔“ اصغر نے بیگم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے

تو دلچسپی سے سوال کیا۔

”خوشگوار زندگی۔“ سلمیٰ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”خوشگوار زندگی شاید دل کے سکون کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب ہم اپنی اصلاح کرنے کا پہلے سوچتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی ریس نہیں کرتے بلکہ جو اپنے لیے کر سکتے ہیں اپنے زور بازو پہ بھروسہ کرتے ہوئے وہ کرتے ہیں اور جو ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں تو اللہ بھی پھر ہمارے دلوں میں اطمینان ڈال دیتا ہے۔۔۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ آیا کے گھر جانے سے تمہارے خیالات میں اتنی تبدیلی آجائے گی۔۔۔ ورنہ یقین کرو میں خود تمہیں۔۔۔ آپا سے روز ملوانے لے آتا۔“ اصغر نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ میاں کی بات پہ وہ بھی ہنس پڑی اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ آپا کی کس بات سے یہ تبدیلی آئی ہے۔۔۔ اب شوہروں سے کچھ تو میکے کا پردہ رکھنا پڑتا ہے!

بچہ

Downloaded From Paksociety.com

صائمہ اکرم چوہدری



سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ ”پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عَدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے رومی والے کو دے دی ہیں۔ عَدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھ لے گی۔ عبد اللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موزن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عَدینہ کی اس کے ساتھ ملگنی

ماہنامہ شعاع فروری 2016 152

READING
Section

Downloaded From Paksociety.com

گاولیٹ

ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل نئی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ
حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آتی ہے۔
عدینہ عبد اللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبد اللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی
صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کو بھی میں اپنے بیٹے ارصم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کو بھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دوشادی
شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس
بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیر ان کے پاس لندن میں ہے۔
اوریدا اور ارصم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبد اللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر بھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرب اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ
ایک چائس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں
ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو

کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شو بزم میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبد اللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبد اللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبد اللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اورید ارمم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارمم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اورید کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اورید اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں، آغا جی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

لی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارمم اورید کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اورید ارمم کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبد اللہ عدینہ سے فوراً شادی کر لے۔ عبد اللہ نے فوراً شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبد اللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آ جاتی ہے۔

عدینہ پر عبد اللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل، شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارمم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈروپتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

کیا سیون قیظ

سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔

”لیکن اگر ایسا ہی ہوا تو۔“ وہ بے بس انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئی۔

”وہ اتنا اچھا انسان ہے، کسی کو تکلیف دے ہی نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے اس کے بھائی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے خود کو دلاسا دیا۔

”لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو؟ میں کہاں جاؤں گی۔“ تلخ سوچیں بد صورت چمکاوڑیوں کی طرح اس کے سر پر بے ہنگم انداز میں گھوم رہی تھیں۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے ہی کوئی اور جائیداد وغیرہ کا چکر ہو گا۔“ وہ خود کو تسلی دیتے دیتے غڈ محال ہو

بختاور خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے دوبارہ ہیڈ کی طرف بڑھی اور لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئی۔

سرا کی اس تنگ بستہ رات میں اس کا سارا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ دل کو گویا پکھے لگ گئے تھے اور دماغ میں ایک حشر پھٹا تھا۔

”اگر وہ مسلمان نہیں تھا تو اس نے میرے ساتھ کورٹ میں ج کیوں کی؟“ ذہن میں پہلا سوال ابھرا۔

”شاید مجھے مطمئن کرنے کے لیے۔“ اس جواب کو سوچ کر اس کا وجود پھر زلزلوں کی زد میں آ گیا۔

”نہیں نہیں، ہاشم کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ بھلا کیوں مجھ سے جھوٹ بولے گا۔“ ایک اور

”وہی جو سب کا رب ہے“ بخاور کو اپنے اندر کچھ
ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔

”تم نے دیکھا ہے کبھی اس کو؟“ اس نے بے
زاری سے اپنا تکیہ درست کیا۔

”ہاں دنیا کی ہر چیز میں اس کا عکس جھلکتا ہے“
صرف دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل ہونا
چاہیے۔ ”وہ نماز چھوڑ کر پریشانی سے اس کے پاس پہنچ
گئی۔

”اچھا پلیز اب صبح صبح تبلیغی لیکچر مت دینا“ اچھی
خاصی نیند خراب کر دی میری۔ ”اس نے غصے سے
کمر لیا اور دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ بخاور
ہکا ہکا انداز کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔
”نیند میں ہو گا اسی لیے اوٹ پٹانگ بول گیا۔“

اس نے سر جھٹک کر اپنی پریشانی کو دور کیا اور جائے
نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ جب کہ دوسری جانب ہاشم
ایک دفعہ پھر گہری نیند میں جا چکا تھا۔ اس کے خراٹوں
کی آواز سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے یہ ساری
گفتگو نیند ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے لاشعوری انداز
میں کی ہے وہ بھی نماز پڑھ کر مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔



”اوہ مائی گاڈ! تیمور نے میری بات سن لی۔ اب کیا
ہو گا؟“ بینش تیمور کے پلٹنے پر حواس باختہ ہوئی۔ وہ
ڈیزیز کی پسند کی شادی کا ذکر جتنے بھونڈے انداز میں
کر رہی تھی اور باقاعدہ اس خبر سے لطف اٹھا رہی تھی
یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تیمور اس سے خفا نہ ہوا ہو۔
”تیمور بھائی بہت غصے میں واپس گئے ہیں۔“ بندیا
نے ڈرتے ڈرتے اسے اطلاع دی۔

”بے وقوف لڑکی تم مجھے بتا نہیں سکتی تھیں۔“
اس نے کھا جانے والی نظروں سے بندیا کو دیکھا وہ اپنا
غصہ خوا مخواہ اس پر اتارنے لگی تھی۔
”میں کس طرح بتاتی وہ اچانک ہی آگئے تھے۔“
اس نے بھی گھبرا کر صفائی دی۔

کر لیٹ گئی۔
”بعض دفعہ جوان لڑکے تھوڑے بہت گمراہ ہو ہی
جاتے ہیں میں اپنی محبت سے اسے واپس لے آؤں
گی۔“ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ بیٹھی اس سوچ
نے اس کے اندر توانائی بھروی تھی۔

”بھلا ہاشم جیسا انسانیت سے محبت کرنے والا
شخص کیسے ملحد ہو سکتا ہے۔“ اس کے خوش فہم دل
نے اسے نئی راہ دکھائی۔

”مجھ سے ہی بات کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہوگی۔“
وہ خود کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔
دوسری طرف ہاشم شاید اپنے بھائی کے ساتھ
مصروف ہو چکا تھا کیونکہ اب باتوں کی آواز بہت مدھم

آ رہی تھی۔ بخاور بھی اپنے ذہن کو پرسکون کر کے نیند
کی وادیوں میں گم ہو گئی اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ
کب ہاشم سونے کے لیے آیا۔ صبح فجر کی اذان کے
ساتھ اس کی آنکھ کھلی وہ جلدی سے اٹھی اور وضو کر
کے نماز پڑھنے کے لیے کمرے کی لائٹ جلائی۔ ہاشم
نے بے زاری سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف
دیکھا۔ ناگواری کا ایک تاثر اس کے پورے چہرے پر
پھیلا ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ جائے نماز بچھاتے بچھاتے رکی۔
”یار تم! تم یہ اپنی اٹھک بیٹھک کہیں اور جا کر نہیں
کر سکتیں۔“ وہ نیند کے خمار کے زیر اثر جھنجھلا کر بولا۔
”کون سی اٹھک بیٹھک؟“ بخاور کو بہت برا لگا۔
”یہی جو تم صبح و شام کرتی ہو اب صبح میری نیند
خراب کر دی۔ اس سے اچھا ہے تم دن چڑھے یوگا
کر لیا کرو۔“ اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے وہ حد
ورجہ چڑا ہوا تھا۔

”ہاشم! میں نماز پڑھتی ہوں جو اللہ نے ہم سب
مسلمانوں پر فرض کر رکھی ہے۔“ اس نے پریشانی سے
اسے یاد دلایا۔
”کس اللہ نے؟“ وہ سستی سے جمالی لیتے ہوئے

”میرا خیال ہے وہ آغا جی کو بلانے آیا ہو گا۔“ بینش نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔
 ”لیکن بیا! اب کیا ہو گا؟“ بندیا اس سے زیادہ سہم گئی۔

”ہونا کیا ہے، منالوں گی۔ آخر اتنی تو محبت کرتا ہے وہ مجھ سے۔“ بینش کی بات پر اسے دھچکا لگا۔ اس نے حیرانی سے اس کا پر اعتماد چہرہ دیکھا وہ ضرورت سے زیادہ خود آگاہ تھی اور ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کا ہنر جانتی تھی لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ مرد بڑی سے بڑی بات پی سکتا ہے لیکن اپنے خونی رشتوں کا اڑایا جانے والا مذاق کبھی بھی برداشت نہیں کرتا۔
 بڑے ابا کے گھر میں موت کا سنا سنا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے درد دیوار تک سہم گئے ہوں۔ ڈاکٹر جلال اور ان کی بیگم، ڈیزی کے بغیر ہی واپس آچکے تھے۔ اس واقعے

کے بعد بڑے ابا کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی اور بڑی اماں کو نے کھدروں میں چھپ کر روتی تھیں کہ کہیں ان کے میاں کو خبر نہ ہو جائے۔ گھر کی دیواروں پر لگی وہ ساری تصویریں ہٹا دی گئی تھیں جن میں ڈیزی موجود تھی۔ ان ہی دنوں طیبہ کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو گیا اور اس خبر نے بھی بڑے ابا کے وجود پر پھیلے جمود کو نہیں توڑا۔

”اللہ عارت کرے تمہیں، تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ بڑی اماں کے دل سے نکلنے والی آہیں ارد گرد کے لوگوں کو خوفزدہ کر دیتیں۔

”بیگم صاحبہ! خدا کے واسطے بد دعا مت دیں۔“ رحمت بوا کی آنکھیں ان سے التجا کرتیں۔

”کیا کچھ نہیں کیا تھا اس کے لیے۔ باپ سے جھپ کر کون کون سی فرمائشیں پوری نہیں کی تھیں میں نے۔“ بڑی اماں منہ پر دوپٹہ رکھ کر جو رونا شروع کر تیں تو حجب کرنا محال ہو جاتا۔

”جھگڑا اتنی دور ایڈمیشن کروایا یونورسٹی میں اور اس نے خاک ڈال دی ہمارے سروں پر۔“ ان

کے سارے دکھ ایک ساتھ جاگ اٹھتے۔
 ”اللہ جانے کون لڑکا تھا، کس خاندان کا تھا۔ کچھ پتا ہوتا تو تحقیق ہی کروا لیتے۔“ بوا رحمت نے بھی سر د آہ بھری۔

”اب تو جیسا بھی چوڑا بہمار ہو، اسی کے ساتھ منہ کالا کرے اپنا۔“ بڑی اماں جل کر بولیں۔
 ”خیر اب چوڑے بہمار سے تو شادی کرنے سے رہی وہ، اتنی بھی پاگل نہیں ہے۔“ بوا نے سنجیدگی سے لقمہ دیا۔

”دیکھ لیتا بوا، چاہے شہزادہ ہی کیوں نہ ہو لیکن ماں باپ کی آہوں پر رکھے گئے گھروں کی بنیادیں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتیں۔“ انہوں نے بے دردی سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔

”اللہ کسی آزمائش سے بچائے۔“ بوا کا دل دہل گیا۔

”دیکھ لینا ایک کے بجائے دو دو بیٹیاں پیدا ہوں گی، تب اسے احساس ہو گا میرے جذبات کا۔“ انہوں نے دکھی دل سے آہ بھری۔

تیمور نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور بینش کے بار بار دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی اندر سے کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ اس ساری صورت حال نے بینش کو وقتی طور پر بوکھلا دیا تھا۔ ڈیزی کے گھر سے جانے کی ساری خوشی ملیا میٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس ساری صورت حال میں بندیا لمحہ لمحہ بڑی اماں کے ساتھ تھی۔ طیبہ تو اپنی میڈیکل کی پڑھائی میں مگن ہو گئی تھی اور تیمور نے اپنی سیٹ کچھ ہفتے اور آگے کروالی تھی۔ وہ ان حالات میں اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جب کہ بڑے ابا تو سارے خاندان سے خفا ہو گئے تھے۔ انہوں نے سرد مہری اور خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

وہ اسپتال سے آکر اپنے کمرے تک محدود ہو جاتے اور ان کے کمرے میں صرف بینش اور آغا جی کو جانے کی اجازت تھی۔ آج کل تو بینش بھی تیمور کے رویے کی وجہ سے کافی پریشان تھی، اسی لیے دن میں ایک دو دفعہ چکر لگاتی اور اس نے اوپر اوپر سے بڑی اماں سے

افسوس کا اظہار بھی کر لیا تھا یہ اور بات کہ انہیں بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ تیمور کے رویے سے گھبرا کر بینش نے کچھ دن کے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس دن بھی بندیا خاموشی سے پچھلے صحن کے برآمدے میں رکھے لکڑی کے تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ بڑی اماں کی متورم آنکھوں کو دیکھ کر اس کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ بوار رحمت ان کے پاس بیٹھیں ان کا سر دوبارہ ہی تھیں۔

”بوا اتنی وحشت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب آغا نے عین شادی کے دن میری بہن کے گھر بارات لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔“ بڑی اماں کی بات پر بندیا زبردست انداز میں چونکی۔

”وہ بھی تو قیامت کا دن تھا بیگم صاحبہ!“ بوار رحمت رنجیدہ ہوئیں۔

”ڈیزی نے تو میری کمرہ توڑ دی۔ کیسے چن کر اس

کا نام رکھا تھا میں نے بخاور اور وہ کتنی بد نصیب نکلی۔“ وہ بے آواز رونے لگیں۔

”تائی اماں! پلیز بس کریں نا۔“ بندیا نے ہلکا سا جھجک کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”اولاد کی خود سری ماں باپ کو وقت سے پہلے مار دیتی ہے بیٹا، مت پوچھو، کس جہنم میں جل رہی ہوں میں۔“ تائی اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بندیا نے افسردگی سے سر ہلایا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس زبان میں انہیں تسلی دے۔

”اماں، شفیق چچا آئے ہیں آپ سے ملنے۔“ طیبہ افسردہ انداز میں چلتی ہوئی وہاں پہنچی۔

”لو! جلال صاحب پھر میری تربیت میں کی کا کھاتہ کھول کر بیٹھ جائیں گے۔“ وہ تلخ لہجے میں کہتی ہوئی ان سے ملنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”خاندان والے بھی تو سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہے، جس کو دیکھو چسکے لینے کے لیے آ رہا ہے۔“ بوار رحمت کو غصہ آیا۔

”بوا جب اپنی ہی جھولی میں چھید ہوں تو وہ سروں

سے کیا گلہ۔“ ان کا لہجہ نرم ہوا۔

”میری مائیں تو بڑے صاحب سے مت ملو ایسے گا انہیں۔“ بوار رحمت نے فوراً مشورہ دیا۔

”وہ ابا کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔“ طیبہ نے منہ بنا کر

اطلاع دی تو بوار رحمت کے چہرے پر مروہ سے چھا گئی۔

طیبہ اپنی ماں کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی، اب وہاں صرف بندیا اور بوار رحمت بیٹھی تھیں۔

”بوار رحمت! ایک بات پوچھوں۔“ بندیا نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

”ڈیزی بیٹا کے بارے میں مت پوچھنا، یقین مانو کلیجہ جل جاتا ہے۔“ بوار رحمت نے لحاظ ہوئیں۔

”نہیں نہیں بوا، ان کے بارے میں نہیں ہے۔“

اس نے بوکھلا کر وضاحت دی۔

”چھا، پھر پوچھو۔“ انہوں نے اپنا پاندان کھول

دیا۔

”بوا بینش کے بابا نے تائی اماں کی بہن سے شادی

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

کتاب کا کتب خانہ

کامیاب ترین قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا خزانہ

قیمت - 225/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آن لائن 800/- روپے کا مٹی آؤزار سٹال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

ماہنامہ شعلہ دسمبر 2016 157

READING
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے انکار کیوں کیا تھا؟“ اس نے محتاط انداز میں دریافت کیا۔

”عشق کا بھوت جو سوار تھا ان پر۔“ بوانے مختصر جملے میں جواب دیا۔

”پھر شادی والے دن ہی کیوں انکار کیا؟“ وہ ابجھن بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

”پہلے تو بڑے بھائی اور بھانج کے لحاظ میں چپ رہے، ہم سمجھے کہ بینش کی ماں کے عشق کا بھوت اتر گیا ہے، لیکن عین بارات کے دن انکار کر دیا۔ مت پوچھو، کتنی جگ ہنسائی ہوئی پورے خاندان کی۔“ وہ افسردہ ہوئیں۔

”کیسی تھیں اس کی والدہ۔۔۔؟“ بندیا نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

”مطلقہ عورت تھی اور ایک پانچ سال کا بیٹا بھی تھا اس کا، جو اس نے چھوٹے صاحب کی محبت میں چھوڑ دیا۔“ بوار حمت کی بات براے وچ کالگا۔ وہ ہکا بکا انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی جو مزید انکشاف کر رہی تھیں۔

”اور سچ پوچھو، شکل و صورت تو اللہ نے بنائی ہے، اس میں کیا نقص نکالنا، لیکن مزاج بھی سوانیزے پر رہتا تھا اس کا۔“ انہوں نے مزید اسے حیران کیا۔

”توبیا کا بھائی کہاں رہتا ہے؟“ بندیا نے حیرانی سے پوچھا۔

”ماں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس لیے باپ کے ساتھ باہر چلا گیا اور پھر کوئی خبر نہیں ملی اس کی۔“ انہوں نے چھالیہ کترتے ہوئے لاپرواہی سے بتایا۔

”اسی وجہ سے ان کی تالی اماں کے ساتھ نہیں بنی؟“ اسے کچھ معاملہ سمجھ میں آ ہی گیا۔

”بڑی بیگم صاحبہ نے تو دل بڑا کر ہی لیا تھا، لیکن اس کی ماں کا مزاج بہت عجیب تھا۔ بہت اونچھے ہتھکنڈے استعمال کرتی تھی وہ۔“

”وہ کیسے؟“ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ان کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”جب سے پہلے تو اس نے اس گھر میں آنے کے

بعد بڑے صاحب کو قابو کیا، انہیں بچوں اور بیگم صاحبہ کی طرف سے بدگمان کیا، حالانکہ وہ تو بینش کی والدہ سے بہت بری طرح چڑتے تھے، لیکن جلد ہی اس کی باتوں میں آگئے۔ رہی سہی کسر بینش کی پیدائش کے بعد پوری ہو گئی۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

”لیکن وہ ایسا کیوں کرتی تھیں؟“ بندیا کو اب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

”واغ کی خرابی۔“ انہوں نے منہ بنایا۔ ”اسے لگتا تھا کہ ساری دنیا اس کی دشمن ہے۔ سارے خو ساختہ وہ ہمال رکھے تھے اس عورت نے۔“

”آغا جی نے کبھی نہیں سمجھایا انہیں۔“ اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

”وہ بے چارے تو شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد بچھتانے لگے تھے، لیکن بینش کی پیدائش کے بعد مجبور ہو گئے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا، اس عورت کی زندگی ہی کم تھی، لیکن اس مختصر عرصے میں جو اس نے اپنی بیٹی کے ذہن میں زہر بھرا، وہ ساری زندگی کے لیے کافی تھا۔“ بوار حمت کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

یہ ساری تفصیل جان کر بندیا کا دل بھی رنجیدہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بینش کی والدہ شدید قسم کے عدم تحفظ کا شکار تھیں اور انہیں لگتا تھا کہ وہ زبردستی اس گھر میں آئی ہیں اور کہیں ان سے یہ گھر اور ان کا مقام چھین نہ لیا جائے، اس لیے انہوں نے اس گھر کے سربراہ ڈاکٹر جلال کو قابو کرنے کے لیے انہیں باقی گھر والوں سے بدگمان کر دیا اور رہی سہی کسر ڈیڑی اور تیمور کی خود سری نے پوری کر دی۔ جس کے نتیجے میں جلال صاحب اپنے سارے ہی بچوں سے دور ہوتے گئے۔ اسی وجہ سے اب اس گھر میں صرف بینش کی اہمیت تھی۔ جس کا وہ اکثر ناجائز فائدہ اٹھاتی نظر آتی تھی۔ بندیا کو یہ ساری حقیقت جان کر دکھ ہوا۔



”تم نے نئے سیریل کا کنٹریکٹ سائن کر لیا؟“

رباب ہکا بکا انداز میں شانزے کا چہرہ دیکھنے لگی اسے لگا

جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے، جبکہ شانزے اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری اور پریشانی سے نظریں خراے اپنا اسکرپٹ پڑھنے کی اداکاری کرنے لگی۔
”تو کیا ہوا۔“ اس نے دانستہ لاپرواہی سے کہا۔
”وماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ رباب نے آگے بڑھ کر اس سے غصے سے اسکرپٹ چھینا۔

”اس میں وماغ کی خرابی کی کیا بات ہے۔“ شانزے تھوڑا سنبھل کر گویا ہوئی۔

”تم نے ماہیر بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ تم فیکسٹ ٹائم کوئی ایسا کام نہیں کرو گی۔“ رباب نے ناگواری سے اسے یاد دلایا۔

”وہ میری بے وقوفی تھی۔“ وہ ڈھٹائی سے اس کے ناراض چہرے کو دیکھنے لگی۔

”تمہیں شرم آتی چاہیے وعدہ خلافی کرتے ہوئے۔“ رباب نے غصے سے اسکرپٹ بیڈ پر پھینکا۔

”وہ خود تو انگلینڈ جا کر بیٹھ گیا ہے اور چاہے ساری زندگی واپس نہ آئے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”وہ کیوں واپس نہیں آئے گا بھلا؟“ رباب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک آدھ تھپڑ گھما کر اس بے

وقوف لڑکی کو لگا دے۔ جو اپنے بے صبرے پن اور جذباتیت سے چیزوں کو خراب کرنے پر تل گئی تھی۔

”پندرہ دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے اور صرف ایک دفعہ کال کی ہے اس نے مجھے۔“ وہ ناراضی سے بستر پر بیٹھ گئی۔

”کوئی فنکشن اینڈ کرنے نہیں گیا وہ۔“ اس نے طنزیہ انداز میں اسے یاد دلایا۔

”پتا ہے مجھے اس کے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ شانزے نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

”تم بہت بے حس اور فضول لڑکی ہو۔ تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے۔“ رباب جیسی ٹھنڈے مزاج

کی لڑکی بھی بری طرح تپ گئی۔ وہ ناراضی سے کمرے سے نکل گئی جب کہ شانزے کا دل لمحہ بھر کو پریشان ہوا

اور اس کے بعد اس نے خود کو سنبھال کر اپنا اسکرپٹ اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ان دنوں سرمد بھی کسی

براجیکٹ میں مصروف تھا۔ اس لیے اسے شانزے کی مصروفیت کا اندازہ نہیں ہو سکا، وہ کچھ گھنٹوں کے لیے آفس جاتی اور پھر اس نے ایک مہینے کی چھٹی لے لی وہ جلد از جلد اپنے ڈرامے کی ریکارڈنگ کروانے میں مصروف تھی۔ اس دن اس کا آخری شوٹ تھا، جب سیریل کے ڈائریکٹر کے ساتھ سرمد کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، وہ بھی گولی کی طرح اڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔

”تم یاور کا سیریل کر رہی ہو اور تم نے بتایا تک نہیں۔“ اس کے کچھ سے خفگی جھلکی۔

”وہ سرمد بھائی! میں آپ کو سربراہنا چاہتی تھی۔“ شانزے نے جلدی سے بات بتائی۔

”تمہیں پتا ہے ماہیر اس بات کو سخت ناپسند کرے گا۔“ وہ حد درجہ سنجیدگی سے اس کا بدلا بدلا سا روپ دیکھ رہا تھا۔

”حالانکہ کرنا تو نہیں چاہیے۔“ شانزے نے بے نیازی کی انتہا کی۔

”لیکن تمہیں کم از کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔“ وہ اس پر ناراض ہوا۔

”کہانا کہ میں آپ کو سربراہنا چاہتی تھی۔“ اس نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

”یہ میرے لیے بھی کوئی خوشی کی خبر نہیں ہے شانزے۔“ سرمد کی ناراضی پر وہ تھوڑا بے چین ہوئی۔

”آئی ایم سوری بھائی۔“ اس کی معذرت بھی سرمد کا موڈ بحال نہیں کر سکی تھی تب ہی تو وہ ہنوز

سابقہ لہجے میں بولا۔ ”اپنی ہاؤس سٹ آف لکس میں چلتا ہوں اب۔“ وہ اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اپنی

گاڑی کی طرف پلٹ گیا۔

شانزے اب ٹھیک ٹھاک پریشانی کا شکار ہو چکی تھی، اسی لیے وہ اپنے کام پر بھی پوری توجہ نہیں دے

پارہی تھی۔ وہ ڈائریکٹر سے معذرت کر کے ہاسٹل چلی آئی، جہاں ایک اور پریشان کن خبر اس کی منتظر تھی۔

وارڈن نے اسے ہاسٹل خالی کرنے کی وارننگ دی تھی، وہ ایم ایس میں ایڈمیشن لے کر یہاں موجود تھی۔

ڈیپارٹمنٹ سے بھی اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا۔

”اب کیا ہو گا رباب۔؟“

”ہاسٹل تو تمہیں خالی کرنا ہو گا“ کیونکہ وارڈن کو پتا چل گیا ہے کہ تم شو بیز جوائن کر چکی ہو۔“ رباب اپنی سیاری خفگی بھلائے اب اس کے ساتھ اپ سیٹ تھی۔

”لیکن میں تو ایک سال کے ڈیو ز ادا کر چکی ہوں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”وارڈن کو اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا“ اگر تم کہتی ہو تو ہم دونوں دوبارہ اس سے بات کرتے ہیں۔“ رباب نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ وہ بادل نخواستہ اس کے ساتھ وارڈن کے آفس چلی آئی، لیکن اتنی زیادہ بحث کا صرف اتنا فائدہ ہوا تھا کہ وارڈن نے اسے پندرہ دن کی مہلت دے دی تھی۔

”تم سرمد بھائی سے بات کرو نا“ وہ جو تم نے پہلے ڈی ایچ اے میں ایک فلیٹ لیا تھا کرائے پر۔“ رباب نے اسے یاد دلایا۔

”وہ تو ان سے ایڈوانس واپس لے کر ایگری منٹ ختم کر دیا تھا کیونکہ قلم جو کینسل ہو گئی تھی میری۔“ اس نے رنجیدگی سے بتایا۔

”دوبارہ بھی تو مل سکتا ہے نا“ تم بات تو کرو سرمد بھائی سے۔“ رباب کے اصرار بھرے انداز پر اس نے آنکھیں چرائیں۔ رباب کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

”تم کال کیوں نہیں کر رہی ہو انہیں۔؟“ وہ ابھن کا شکار ہوئی۔

”وہ خفا ہیں مجھ سے۔“ شانزے کی بات پر اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے سیریل میں کالم کرنے کا بتایا جو نہیں تھا انہیں۔“

”یہ ناراضی تو ان کا حق بنتی ہے تم بھی تو بے مقویاں کرتی پھرتی ہو۔“ وہ منہ بنا کر شانزے کے پاس بیٹھ گئی۔

”لیکن اس کے باوجود میں انہیں کال کروں گی تو وہ بالکل ضرور کریں گے میری۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ظاہری سی بات ہے ساری دنیا تمہاری طرح بے وفا اور بے مروت تھوڑی ہوتی ہے۔“ رباب کے دل جلے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور سرمد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

پڑی اماں کے جانے کے بعد اوریدا نیلی کوٹھی میں ہی تھی۔ بوا رحمت نے زبردستی اسے یہیں روک لیا تھا۔ دوسری طرف ارصم کے گھر میں اس کے کزن کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور وہ کافی مصروف نظر آتا تھا۔ اس کی یہ مصروفیت اوریدا کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

”تم تو ایسے مصروف ہو گئے ہو جیسے تمہاری کزن کی نہیں تمہاری شادی ہو۔“ اس دن وہ ان کے پورشن میں آیا تو اوریدا نے جھٹ سے گلہ کر دیا۔ وہ میز پر رات کا کھانا لگا رہی تھی۔ ارصم اس کے چڑنے پر بے ساختہ مسکرایا۔

”اپنی شادی تو میں بہت ساوگی سے کروں گا۔“ اس نے سلاڈ کی پلیٹ سے کھیر اٹھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”ہاں جیسے آنٹی بینش تو مان ہی جائیں گی۔“ اوریدا نے اسے ڈرایا۔

”شادی میری ہے اور اس میں وہی سب کچھ ہو گا جو میں چاہوں گا۔“ وہ پُر اعتماد انداز میں بولتا ہوا بینش کے چھکے چھڑا گیا جو اس وقت شادی کا ڈلیے بڑے ابا کو ڈھونڈتی ہوئی ادھر آنکلی تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق تو اوریدا ہاسٹل میں تھی، لیکن اسے سامنے دیکھ کر انہیں ناگواری کا جھٹکا لگا۔

”السلام علیکم بینش آنٹی۔“ اوریدا نے بوکھلا کر انہیں سلام جھاڑا۔

”تایا ابا کہہ رہی ہیں؟“ انہوں نے سلام کا جواب دیے بغیر ناگواری سے پوچھا۔

”تین سال ہو گئے بیٹا، کیا ابھی تک نہیں پتا چلا“ بڑے صاحب اس وقت مطالعہ کرتے ہیں۔“ بوا

رحمت کے طنزیہ انداز پر ان کا چہرہ سرخ ہوا۔
”بہت اچھی طرح سے پتا ہے مجھے اس لیے بتانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ چڑ کر بولیں۔

”ممی! کوئی کام تھا کیا بڑے ابا سے۔۔۔“ ارصم نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”میرے کاموں کو چھوڑو اور ارسلہ کو پار لے کر جاؤ، وہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے تمہیں۔“ انہوں نے ناگواری سے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔

”آئی ایم سوری ممی، کوئی اور کام ہے تو بتادیں، یہ خواتین والے کام میں نہیں کر سکتا، آپ ڈرائیور کے ساتھ بھجوادیں اسے۔“ ارصم کے دو ٹوک انداز پر وہ تھوڑا سا جھنجھلا میں، لیکن انہوں نے خود پر قابو پا ہی لیا۔

”ٹھیک ہے پھر جونی کے ساتھ جا کر اس کی شاپنگ کرو آؤ۔“ انہوں نے ایک اور کام سوچ کر بتایا۔
”وہ تو کب کا جاچکا اپنے فرینڈز کے ساتھ۔۔۔“ ارصم ڈائننگ میز کی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ بینش کے اعصاب تن گئے۔

”اچھا، میں تایا ابا سے مل کر آرہی ہوں، پھر مجھے اپنی آنٹی صوفیہ کی طرف لے جاؤ، انہیں شادی پر انوائٹ کرنا ہے۔“ وہ ہر حال میں اسے یہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں اور بڑی مشکل سے ایک معقول بہانہ انہیں سوجھ ہی گیا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ بڑے ابا سے مل کر آئیں، میں اتنی دیر میں کھانا کھالوں، سخت بھوک لگی ہے۔“ وہ بے تکلفی سے کہتا ہوا کھانا پلیٹ میں نکال چکا تھا۔
”ہوا! دو کپ کافی کے تایا ابا کی اسٹڈی میں بھجوادیں۔“ انہوں نے بے زار لہجے میں فرمائش کی، کچھ بھی تھا، وہ اپنے بیٹے کو کھانے کی میز سے نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ بوا رحمت سر ہلا کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

دس منٹ کے بعد انہوں نے ایک چھوٹی ٹرے میں دو کپ رکھ کر اوریدا کے ہاتھ اسٹڈی میں بھجوا دیے۔ وہ بڑے محتاط انداز میں ان کی اسٹڈی کی طرف بڑھی

اور جیسے ہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اندر سے آتی بینش کی بلند آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

”بڑے ابا! ارسلہ کے رشتے میں برائی کیا ہے آخر؟ مجھے تو ارصم کے لیے بہت سوٹ ایبل لگ رہی ہے۔“ بینش کی بات نے اوریدا کا سارا سکون وراہم برہم کر دیا۔

”برائی تو کوئی نہیں ہے، لیکن ارصم کے لیے کوئی اسی کے پروفیشن کی لڑکی ہونی چاہیے۔“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوئے۔

”رہنے دیں تایا ابا! ڈاکٹر لڑکیاں کہاں گھر سنبھال سکتی ہیں۔“ وہ بے مزاح ہو کر بولیں۔

”لیکن کچھ عرصہ پہلے تک تو تم ارصم کے لیے کسی ڈاکٹر کی ہی تلاش میں تھیں، اب بیٹھے بیٹھائے کیا ہوا؟“ بڑے ابا کو حیرانی ہوئی۔

”وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ اور خیالات بدل بھی تو جاتے ہیں۔“ وہ ذرا سی شرمندہ ہوئیں۔

”بہر حال دیکھ لو اور ارصم سے پوچھ لو۔“ انہوں نے محتاط انداز میں مشورہ دیا۔

”ارصم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، وہ میرا بیٹا ہے اور وہی کرے گا جو میں چاہوں گی۔“ ان کے کبجے سے چھلکتا زعم اور اعمکو بڑے ابا کے زخموں کے کئی ٹاپکے ایک ساتھ اڑھیر گیا۔

”ہاں بھئی! تم اور حماد خوش قسمت ہو، جنہیں اتنی فرمانبردار اور نیک اولاد ملی۔“ ان کے لہجے میں کئی حسرتیں ایک ساتھ چھلکیں۔ اس سے زیادہ سننا اوریدا کے لیے مشکل تھا تب ہی وہ ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی، وہ دونوں اسے دیکھ کر دانستہ خاموش ہو گئے۔ اس نے بھی آہستہ سے ٹرے میز پر رکھی اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ جیسے ہی ڈائننگ روم میں پہنچی، اس کا دھواں دھواں سا چہرہ ارصم کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

”کیا ہوا، بڑے ابا نے ڈانٹا ہے کیا؟“ ارصم نے بے ساختہ پوچھا۔

”نہیں تو۔“ اور یدانے لاشعوری طور پر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”پھر اتنی بو کھلائی ہوئی کیوں ہو؟“ وہ کھانا چھوڑ کر جا بختی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا، وہ بو کھلا گئی۔ ”کیا مصیبت ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے؟“ اس نے مزے سے کہا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے، تم یہ کباب کھاؤ اور تباؤ ہاسٹل کب جاؤ گے؟“ اور یدانے بات کا رخ تبدیل کیا۔

”ہوسٹل تو اب شادی کے بعد ہی جاسکوں گا۔ سنڈے کو ویکہ ہے۔“ وہ ایک دفعہ پھر افغانی پلاؤ اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے مزید بولا۔ ”تمہارا کب تک ارادہ ہے؟ شادی اٹینڈ کرو گی کیا؟“

”شادی اٹینڈ کرنا تو مشکل ہے، پھر عدینہ کی بار بار کالز آرہی ہیں وہ اکیلی بور ہو رہی ہے ہاسٹل میں۔“ اور یدانے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا ذہن ابھی تک بینش آنٹی کی بات میں الجھا ہوا تھا۔

”تو یہ کون سا مشکل ہے، تم عدینہ کو بلوالو یہاں۔ کچھ دن تمہارے ساتھ رہ لے، صبح اکٹھے چلے جایا کریں گے کلج۔“ ارصم نے مفت مشورہ دیا، جسے سن کر وہ ایک دم چرچوش ہو گئی۔

”ارے واہ، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“

تھوڑے ہی عرصے میں اسے عدینہ سے خاصی انسیت ہو گئی تھی اور پاکستان آنے کے بعد وہ واحد لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کی دوستی دنوں میں گہری ہوئی تھی۔

”ارے نہیں یار، امی اجازت نہیں دیں گی۔“ اگلے دن کلج میں عدینہ نے اس کی بات سن کر فوراً انکار کیا۔

”تم میری ان سے بات کرو، میں پوچھ لیتی ہوں ان سے۔“ اور یدانے سب سے چینی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”تم انہیں جانتی نہیں ہو، وہ بہت سخت مزاج خاتون ہیں۔“ اس نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”تم جیسی نرم مزاج لڑکی کی ماں اتنی سخت ہو ہی

نہیں سکتی۔“ اسے یقین ہی نہیں آیا۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی اور ہلکی دواؤں سے تم مجھے اپنے گھر کیوں لے جانا چاہتی ہو؟“ عدینہ نے مسکرا کر اس کا پر خلوص چہرہ دکھا۔

”میں بڑے ابا کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی، جیسے ہی بڑی اماں واپس آجائیں گی، ہم دونوں ہاسٹل شفٹ ہو جائیں گے۔“ اس کی بات پر عدینہ نے بے توجہی سے سر ہلایا لیکن اور یدانے کی اگلی بات نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

”ہم دونوں سارے مشکل ٹاپک بڑے ابا سے سمجھ لیں گے، وہ ہماری کافی اہمیت کر سکتے ہیں۔“

”لو، خود تو تم ان سے اتنا ڈرتی ہو اور اب اپنے ساتھ مجھے بھی پھنساؤ گی۔“ عدینہ اس کے متعلق کافی کچھ جان چکی تھی۔

”اسی لیے تو تمہیں ساتھ لے جانا چاہ رہی ہوں، بڑے ابا کو ذہین لوگ بہت اثریٹ کرتے ہیں۔“ اس نے ہنس کر بتایا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”بہت تیز ہو گئی ہو تم۔“ عدینہ نے تبصرہ کیا۔

”بس تم اپنی امی کا نمبر ملا کر دو، میں ان سے بات کرتی ہوں۔“ عدینہ نے اس کے پر زور اصرار پر صالحہ بیگم کا نمبر ڈائل کر کے سیل اسے پکڑا دیا تھا۔

اور خود کو ریڈور کے کونے میں کھڑی اپنی دوسری کلاس فیلو کی طرف بڑھ گئی، اسے یقین تھا کہ صالحہ بیگم کسی صورت نہیں مانیں گی، اور وہ اور یدانے کے چہرے پر پھیلی افسردگی سے بچنا چاہتی تھی۔ اور یدانے سیل فون کان سے لگائے تھوڑے کم رش والی جگہ پر چلی گئی تھی۔

پندرہ منٹ کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ خاصی پرسکون تھی۔

”لو، تم خواہ مخواہ ڈرا رہی تھیں مجھے، تمہاری امی تو اتنی آسانی سے مان گئیں۔“ اور یدانے کی بات پر اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ اسے بالکل بھی یقین نہیں آیا، تب ہی تو اس نے فوراً ہی آپا صالحہ کا نمبر ملا لیا۔

دوسری طرف وہ اپنی آواز سے اسے کچھ مدد حال سی

لگیں۔

”ہاں ہاں میں نے ہی کہا ہے اسے کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے۔ اچھا ہے اس کے دادا سے کچھ پڑھ لوگی تم بھی۔“ آپا صالحہ نے اسے مزید حیران کیا۔

”ویسے بھی ان کے گھر میں کون سا کوئی اور بندہ رہتا ہے، صرف دادا اور پوتی ہی تو ہیں۔“ آپا صالحہ کو اور پیدا کافی معلومات دے چکی تھی۔

”آپا، کیا میں واقعی چلی جاؤں؟“ عدینہ نے دوبارہ تصدیق کے لیے پوچھا۔

”ہاں ہاں چلی جاؤ کچھ دن کے لیے، لیکن خیال سے رہنا اور سارا دھیان پڑھائی پر دینا۔“ وہ اسے نصیحت کرنا نہیں بھولی تھیں۔

اور پیدا کے ساتھ ہاسٹل اور پھر وہاں سے پیکنگ کرتے ہوئے بھی عدینہ کو دھڑکا سا لگا رہا کہ آپا صالحہ ابھی فون کر کے اسے منع کر دیں گی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ شام میں اور پیدا کے ساتھ نیلی کو بھی پہنچ گئی۔ اس نے توصیفی نگاہوں سے مارگلہ کی پہاڑیوں کے عین سامنے بنے اس خوب صورت بنگلے کو دیکھا۔ پورنج میں ہی اس کی اور اوریدا کی ڈاکٹر جلال سے سرسری سی ملاقات ہو گئی تھی۔ ارصم بھی ان کے ساتھ تھا، تب ہی بڑے ابارک گئے تھے۔

”بڑے ابا ابیہ عدینہ ہے، اوریدا کی روم میٹ اور فرینڈ، کچھ دن یہیں رہے گی۔“ اس نے غجلت بھرے انداز میں تعارف کروایا تو عدینہ نے جھٹ سے انہیں سلام کرویا، انہوں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اوریدا کے ساتھ کھڑی لڑکی پر ڈالی اور چونک گئے۔

”مجھے بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا، میں خود بھی بہت اچھی میڈیکل اسپیشلسٹ بننا چاہتی ہوں۔“ عدینہ کا اعتماد انداز انہیں حیرانی میں مبتلا کر گیا۔

”اللہ آپ کو کامیاب کرے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے جیسے ہی گاڑی پورنج سے نکالی، اوریدا کے حلق سے ایک پُر سکون سانس خارج ہوئی۔ گھر میں بوار حمت نے ان

کا استقبال بڑے پرجوش انداز میں کیا تھا۔ وہ عدینہ کی آمد سے خاصی خوش تھیں۔ بڑی اماں کو گئے ہوئے بیس دن ہو چکے تھے۔ اور سب ہی لوگ ان کی کمی بہت زیادہ محسوس کر رہے تھے۔

”یہ ارصم کی والدہ کچھ عجیب سی نہیں ہیں۔“ رات کو اوریدا کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے عدینہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ رک گئی۔ آج شام میں ہی آنٹی بینش کے ساتھ اس کا بھی پائرا ہو گیا تھا۔ وہ کسی کام سے بڑے ابا کے پاس آئی تھیں اور انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں اوریدا کے ساتھ بیٹھی عدینہ کو کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی بلکہ اس کے سلام کا جواب بھی لایروائی سے بس سر ہلا کر دیا تھا اور پھر بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”ان کا مزاج خاصا ڈفرنٹ ہے۔“ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”جو لوگ منفی عادات کے حامل ہوتے ہیں ان کے وجود سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو سامنے والے انسان کو بھی عجیب سا احساس دلاتی ہیں، ان خاتون سے مل کر مجھے ایسے ہی فیل ہوا تھا۔“ وہ بے تکلف انداز میں تبصرہ کر رہی تھی۔

”ارصم کے سامنے ایسا کچھ مت کہنا، وہ ہرٹ ہو گا۔“ اوریدا نے گھبرا کر کہا۔

”تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟“ وہ برا مان گئی۔

”ارے نہیں نہیں، میں تو یونہی کہہ رہی تھی، کبھی کبھی بندہ روائی میں بھی تو کمینٹ پاس کر دیتا ہے۔“ اس نے فوراً اپنی بات کی بوضاحت کی۔

”ٹینشن مت لو، میں روائی میں بھی سوچھ سمجھ کر ہی بات کرتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ دونوں واک کر کے اندر آگئی تھیں اور اب لاؤنج میں اپنی کتابیں کھولے بیٹھی تھیں۔ ایک بٹاپک دونوں کی ہی سمجھ سے باہر تھا۔ بڑے ابا نے لاؤنج میں آتے ہی دونوں کو اپنی کتابوں پر جھکے پایا، وہ اس وقت ٹی وی پر نیوز سننے کے لیے آئے تھے اور اب شش و پنج کا شکار تھے۔

عدینہ کی ان پر نظر بڑی تو اس نے فوراً ہی سلام کر دیا۔
”آپ کوئی وی دیکھنا ہے کیا۔“ عدینہ نے جھٹ سے اندازہ لگایا تو انہوں نے سر ہلادیا۔

”اگر آپ برائہ مانیں تو فری ہو کر ہمیں ایک ٹاپک سمجھا دیں گے۔“ وہ عدینہ کی فرمائش پر حیران ہوئے جبکہ اوریدا ہکا بکا انداز میں اپنی دوست کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو بے تکلفی سے بڑے ابا سے مخاطب تھی۔
بڑے ابا نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی چلایا اور خبریں سننے لگے، دس منٹ کے بعد جب وہ دونوں ہی مایوس ہو گئی تھیں، انہوں نے ٹی وی کی آواز بند کر کے کتاب مانگی اور انہیں پڑھانے لگے۔ لاؤنج میں داخل ہوتی بوار حمت نے یہ منظر خاصی دلچسپی سے دیکھا۔

اوریدا کو پہلی دفعہ پتا چلا تھا کہ بڑے ابا کا پڑھانے کا انداز بہت زبردست تھا، وہ خاموشی سے انہیں سن رہی تھی جبکہ عدینہ کے سوال و جواب کی وجہ سے پڑھائی کا سیشن خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ بڑے ابا کو عدینہ کے سوالات اچھے لگ رہے تھے اور ڈیڑھ گھنٹے کی ڈسکشن کے بعد عدینہ انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔
”آپ کی فیملی میں کوئی اس پروفیشن میں ہے کیا؟“
بڑے ابا نے اچانک ہی اس سے پوچھا۔

”نہیں“ میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں۔“ اس کے فخریہ لہجے پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ان کے سامنے عدینہ تھی جو کلاس روم میں اپنے بڑے بڑے پروفیسرز کے چھکے چھڑا دیا کرتی تھی۔

”آپ پیڈز کارڈک سرجری (surgery Pedis cardiac) میں اسپیشلائزیشن کیجئے گا۔“ انہوں نے لاؤنج سے اٹھتے ہوئے اسے مشورہ دیا تو وہ مسکرا دی۔

”تھینک یو سر! لیکن میری والدہ کی خواہش ہے کہ میں ایک اچھی میڈیکل اسپیشلسٹ بنوں۔“ عدینہ نے اپنی مجبوری بتائی۔

”ایزیووش، لیکن اس شعبے میں محنتی اور ذہین لوگ کم ہیں، آپ انہیں کنوینس کریں گی تو وہ مان جائیں گی۔“ بڑے ابا اوریدا کو حیران کر رہے تھے۔

”جی ضرور“ میں ان کو آپ کی رائے سے ضرور آگاہ کروں گی، مجھے امید ہے وہ مان جائیں گی۔“ عدینہ نے خوش گوار لہجے میں انہیں تسلی دی۔

”مائی گاڈ، تم نے بڑے ابا پر کیا بڑھ کر پھونکا تھا، مجھ سے تو انہوں نے کبھی ایسے بات نہیں کی۔“ رات کو کمرے میں آتے ہی اوریدا نے کھل کر اپنی حیرانی کا اظہار کیا اور عشاء کی نماز سے فارغ ہوتی عدینہ نے مسکرا کر جائے نماز تہہ کی۔

”تم نے میری ای پر کیا جادو کیا تھا، جو انہوں نے تم پر اعتبار کر کے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی۔“ اس نے ہنستے ہوئے اسے الٹا جواب کیا۔

”وہ تو محبت کا جادو تھا، جو ہر کسی پر چل جاتا ہے۔“ اوریدا نے شوخی سے کہا۔

”کسی کسی پر نہیں بھی چلتا۔“ اس نے کندھے اچکا کر اس کی بات سے اختلاف کیا۔

”جن پر محبت کا جادو نہ چلے، ان پر بنگال کا کالا جادو کروادینا چاہیے۔“ اوریدا کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ عدینہ کے آنے سے کافی خوش تھی اور اس کا اظہار اس نے بڑی لہجہ کو انگلینڈ فون کر کے بھی کر دیا تھا۔ تیمور کی حالت کافی سنبھل گئی تھی، لیکن کسی نے بھی اوریدا کے سامنے ان کی بیماری کا ذکر نہیں کیا تھا، وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ بڑی لہجہ یونہی اس کے پیلا سے ملنے لگی ہیں۔



”اوریدا کے ساتھ کون لڑکی آئی ہوئی ہے، تایا ابا کی طرف۔“ رات کو کھانے کے بعد بینش نے ارصم سے پوچھا وہ اس وقت آغا جی کے ساتھ شطرنج کی بازی سچائے بیٹھا تھا۔ جب کہ ان کے مہمان کسی اور رشتے وار سے ملنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔

”اوریدا کی کلاس فیلو ہے۔“ ارصم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”کیا بہت ذہین لڑکی ہے؟“ ان کے لہجے میں حسد کی آمیزش شامل ہوئی۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ ارصم چونکا، اس کا سارا دھیان اپنی ماں کی طرف تھا، جو بے زار سے انداز میں کھڑی تھیں۔

”تایا ابا، بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔“ انہوں نے بادل ناخواستہ اصل بات بتائی۔

”ہاں میں بھی ملا ہوں، بہت جینٹلس لڑکی ہے وہ۔“ آغا جی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”ایک تو آپ اور تایا ابا، ہر ایرے غیرے سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اب ایسے بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے اس میں۔“ وہ حسب عادت کسی اور کی تعریف سن کر جڑ گئیں۔

”ممی، وہ واقعی بہت لائق لڑکی ہے۔ میٹرک اور ایف ایس سی میں بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اس نے۔“ ارصم نے ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

”سوداٹ؟ تو تم کون سا کسی سے کم ہو۔ پوزیشن تو تمہاری بھی آتی ہے۔“ انہوں نے جل کر جواب دیا۔ ”تو میں اس کے ساتھ اپنا مقابلہ تھوڑی کر رہا ہوں، آپ کو بتا رہا ہوں۔“ ارصم کو ان کے چہرے پر پھیلی بے زاری پریشان کر گئی۔

”بس بس رہے دو۔ ادھر گئی تو تایا ابا، اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے مل رہے تھے اور ادھر آئی ہوں تو تم شروع ہو گئے۔“ وہ ناگوار انداز میں اصل بات اگل گئیں اور ان کی بات سن کر ارصم اور آغا جی دونوں مسکرائے۔

”اب آپ لوگ کیوں مسکرا رہے ہیں۔“ ان کی تیوری کے بل گہرے ہوئے۔

”ہم ہنس اس بات پر رہے ہیں کہ تم خود ہی کسی بات پر ہماری رائے پوچھتی ہو اور اوپر سے تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اس پر تمہارا من پسند تبصرہ کریں تو یہ مشکل کام ہم نہیں کر سکتے بھئی، ہمیں معافی دو۔“ آغا جی کی بات پر بیش نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیں۔ ان کا مزاج کچھ بہتر ہو چکا تھا۔

”آغا جی، وہ جو میں نے آپ کو کام کہا تھا، آپ نے

کیا؟“ بیش نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ کرتے ہوئے گھما پھرا کر پوچھا۔

”نہیں، ایک دو دن میں کروں گا۔“ ان کے پر اسرار انداز پر ارصم چونکا۔ ”آپ لوگ کس کام کی بات کر رہے ہیں؟“

”کسی کی نہیں، اسپتال کا کوئی مسئلہ ہے۔“ بیش نے بوکھلا کر جواب دیا تو ارصم اچھا خاصا مشکوک ہو گیا۔

”آغا جی! میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ ارصم کی کھوجتی نگاہوں سے گھبرا کر لاؤنج سے نکل گئیں۔

”آغا جی، یہ آنکھوں آنکھوں میں کس بات کی طرف اشارے ہو رہے تھے۔“ اس نے آغا جی کو گھیرنے کی کوشش کی۔

”لو ہم تو آنکھوں آنکھوں میں اس لیے اشارے کر رہے تھے کہ تمہیں کانوں کان خبر نہ ہو۔“ آغا جی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

”دیکھ لیں آغا جی، آپ میرے ساتھ فراڈ کریں گے اب!!“ وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

”ایسا ممکن ہے بھلا۔“ انہوں نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے اگلوتے نواسے کو دیکھا، جو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔

”پھر بتائیں، یہ ممی کن چکروں میں ہیں؟“ وہ بے تاب ہوا۔

”تمہارے سر پر سہرا سجانا چاہتی ہے تمہاری ماں۔“ انہوں نے بھی اسی وقت بات کرنے کی ٹھانی۔ ”ابھی میرے میڈیکل کے دو اور ہاؤس جاب کا ایک سال باقی ہے آغا جی۔“ ارصم نے منہ بنا کر انہیں یاد دلایا۔

”تو کیا ہوا؟ تم نے کون سا گھر چلانا ہے۔“ انہوں نے اس کا اعتراض چٹکی میں اڑایا۔

”گھر نہ سہی، گھر والی کو تو ٹائم دینا ہو گا نا، اتنی لف اسٹڈی میں یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ سنجیدہ ہوا۔

”تم ہاں کرو، سب کام ہو جائیں گے۔“ وہ لاپرواہی

چٹانوں سے بھی زیادہ سخت تھی۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔



سے گویا ہوئے۔
”یہ ممی کو بیٹھے بٹھائے کیا سوچھی؟“ وہ تھوڑا سا پریشان ہوا۔

”بھئی تمہاری پھپھو نے اپنی بیٹی ارسلہ کے لیے بات کی ہے ان سے۔“ آغا جی نے اس کے سر پر ہم پھوڑا۔

”کیا ارسلہ؟“ اسے ایک دم شاک لگا اور وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آغا جی“ صاف منع کر دیں انہیں۔“

”تم کیسے انکار کر سکتے ہو بھلا۔“ بینش چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے چونک کر ان کے ناراض چہرے کو دیکھا۔ وہ ان کی بات کا مطلب سمجھ نہیں سکتا تھا۔

”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں تمہیں لاہور کی بجائے یہیں ایڈمیشن لے دوں تو تم میری ہر بات مانو گے۔“ بینش کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری، ارصم کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ اسے اپنے الفاظ اچھی طرح یاد تھے۔

”آغا جی! آپ کو یاد ہے نا؟“ انہوں نے فوراً پلٹ کر گواہی کے لیے آغا جی کو دیکھا، جو نظریں چرائے بیٹھے تھے۔ ارصم کو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بینش اس کے کہے ہوئے لفظوں کے جال میں اسے اس طرح پھنسا دیں گی۔

”لیکن میں ابھی فی الحال شادی افورڈ نہیں کر سکتا۔“ اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

”اس بات کو کہیں پر لکھ کر رکھ لو، تمہاری شادی جب بھی ہوگی، چاہے دس سال بعد، لیکن ہوگی میری مرضی سے۔“ ان کے سفاک لہجے پر وہ تھوڑا سا جھنجھلا یا۔

”لیکن ممی۔“ اس نے بولنے کی کوشش کی۔

”تم اگر انکار کرو گے تو خود کو ختم کر لوں گی میں۔“ انہوں نے اس کے تابوت میں آخری کھیل ٹھونکی، ارصم نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا، ان کے چہرے

جوں جوں اس کی ڈیسوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ بختاور کو فطری سی پریشانی لاحق ہوتی جا رہی تھی، اس نے بھی عام خواتین کی طرح پوری نمازیں باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دی تھیں اور ساتھ ساتھ اللہ سے ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند اولاد کی دعائیں بھی جوش و خروش سے کر رہی تھیں۔ اس دن وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی جب ہاشم نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی، اسے دروازہ کھولنے میں دیر ہو گئی تو وہ اس پر برس پڑا۔ ”میں نماز پڑھ رہی تھی۔“ اس نے شرمندگی سے صفائی پیش کی۔

”ہاں قاریغ لوگوں کو اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔“ وہ بیزار سی سے کہہ کر۔۔۔ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے سر دلچے پر وہ پریشان ہو گئی، اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا۔ وہ نماز بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ اس نے تو اسے کبھی جمعہ تک پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس بات نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دن اچانک ہی بختاور کو ہاشم کے بڑے بھائی کی بات نے ایک دم بے چین کر دیا۔ اگلے دن اس نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنی واحد دوست، نیلم کو کال ملائی۔

”ہاشم کے بڑے بھائی اس کے متعلق بہت عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔“ اس نے تفصیل سے ساری باتیں بتائی تھیں۔

”ارے یار! ایسا کیسے ممکن ہے، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ دوسری طرف نیلم بھی اس کی بات سن کر گھبرا گئی تھی۔

”ہاں دل تو میرا بھی نہیں مانتا لیکن ہاشم آج کل جب اس طرح کی بات کرتا ہے تو دل خراب ہوتا ہے میرا۔“ اس نے اپنی الجھن بیان کی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے یار! آج کل بنگ جنریشن، ماڈرن بننے کے چکر میں بھی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں

کرتی ہے اور بعد میں یہی مرو لمبی لمبی واڑھیاں رکھ کر حج اور عمرے کر کے اللہ سے اپنے گناہ بخشوانے چلے جاتے ہیں۔“ نیلم نے اس کی پریشانی کو چٹکیوں میں اڑایا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو ناں۔“ اسے کچھ تسلی ہوئی۔
 ”ہاں نا اور خیر وار ہاشم بھائی سے اس موضوع پر بحث کر کے لڑنا جھگڑنا نہیں۔“ نیلم نے اسے پریشان لہجے میں فوراً ہی نصیحت کی۔

”اور وہ جوان کے بھائی کہہ رہے تھے۔“ بختاور نے پریشانی سے یاد دلایا۔

”یار! خاندانوں میں سو مسئلے مسائل چل رہے ہوتے ہیں اور بہن بھائی غصے میں کیا کچھ نہیں کہہ دیتے ایک دوسرے کو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔
 ”یہ تو واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ بختاور مطمئن ہو گئی تھی۔

”خوا مخواہ ہی اپنا دماغ خراب کر رہی ہو پتا ہے ناں! ایسی حالت میں اسٹریس لینا بالکل اچھا نہیں ہوتا۔“ اس نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

”آئی ایم سوری یا۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔
 ”چلو اب فون بند کرو اور سکون سے جا کر اپنا کام کرو، کال کافی لمبی ہو گئی ہے۔“ نیلم سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔

اس نے جلدی جلدی فون بند کیا اور کچن میں آکر کھانا گرم کرنے لگی، ہاشم کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ کھانا گرم کر کے فارغ ہوئی تھی کہ فلیٹ کی گھنٹی بج اٹھی، وہ مسکراتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی، حسب توقع سامنے ہاشم ہی تھا وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ بختاور نے جھٹ سے سلام کیا۔
 ”اعظم بھائی دوبارہ تو نہیں آئے۔“ اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں کیا آتا تھا انہوں نے۔“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاشم سنجیدگی سے کہہ کر لاؤنج میں چلا

آیا۔

”آپ نے مجھے ان سے ملوایا ہی نہیں میں تو انتظار کرتی رہی۔“ اس نے گلہ کیا۔

”ہاں وہ صبح کچھ جلدی میں تھے اس لیے ناشتہ کیے بغیر نکل گئے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے ماتھے کو مسلنے لگا۔

”کیا ہوا ہاشم؟ سر میں درد ہے آپ کے؟ کوئی ٹینشن ہے کیا؟“ وہ فکر مند انداز میں صوفے پر اس کے قریب آ بیٹھی۔

”میری جاب ختم ہو گئی ہے بختاور۔“ ہاشم کی بات پر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ڈلیوری سے ایک ماہ پہلے جاب ختم ہونے کا مطلب وہ جانتی تھی۔ اوپر سے اللہ نے ایک کے بجائے دو دو فے واریاں ان کو سونپ دی تھیں۔

”وہ کیوں۔۔۔؟“ وہ بوکھلا کر بولی، اس کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

”اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کے ایک منجوس بندے سے جھگڑا ہو گیا تھا، وہ پرنسپل کا چیتا تھا، انہوں نے مجھے اس کی شکایت پر نوکری سے نکال دیا۔“ ہاشم کے تلخ لہجے پر وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی۔

”جھگڑا؟ لیکن کس بات پر۔۔۔؟“ وہ بے چین ہوئی۔

”ایسے ہی فضول میں بحث کیے جا رہا تھا۔ بات زیادہ برہم گئی اور پرنسپل نے ہم دونوں کو بلا لیا۔“ اس نے ہنسی سے وضاحت کی۔

”لیکن بات تھی کیا آخر۔۔۔؟“ بختاور نے اصرار کیا۔

”کوئی خاص نہیں تھی، تم چھوڑو اس بات کو، کھانے کے لیے کچھ ہے۔“ ہاشم نے دانستہ بات کا رخ بدلا۔

”ہاں۔“ اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا، اس لیے اس نے بھی مختصر جواب دیا اور کچن میں آ گئی۔ کھانا ٹرے میں رکھ کر جب وہ باہر نکلی تو وہ اپنے کسی دوست سے پانی سی ایل پر کافی غصے میں بات کر رہا تھا۔ اس

نے گفتگو کے دوران ایک انتہائی قابل اعتراض گالی دی تو بخٹاور کو شاک لگا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر اس نے فوراً ”خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔“

”تم کیوں اس طرح میری طرف دیکھ رہی ہو۔“ ہاشم نے غور سے اس کا ہر اسان چہرہ دیکھا۔

”آپ ایسے گالیاں کیوں دے رہے تھے کسی کو“ مجھے سن کر بہت عجیب احساس ہوا۔ ”اس نے اپنی ناگواری کا صفائی سے اظہار کیا۔“

”تو کیا کروں“ اس الو کے پٹھے کی وجہ سے اچھی خاصی جاب ہاتھ سے نکل گئی۔ ”وہ چڑ کر بولا اور سر جھٹک کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔“

”تو آپ کو اس سے بحث نہیں کرنی چاہیے تھی ناں۔“ اس نے محتاط انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ ملک رہنے کے قابل ہی نہیں ہے“ سارے پاگل، جنونی لوگ بستے ہیں یہاں۔ مجھے امریکہ واپس چلے جانا چاہیے۔“ اس کی بات پر بخٹاور کو کرنٹ سا لگا۔

”آپ کیا پہلے بھی امریکہ رہ کر آئے ہیں۔ آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔“ اس کے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی۔

”ہاں ایف ایس سی کے فوراً بعد کچھ سال رہا تھا وہاں گرسن کارڈ بھی ہے میرے پاس۔“ اس نے ایک اور حیران کن انکشاف کر کے اسے تعجب میں مبتلا کیا۔ ”پھر واپس کیوں آگئے۔“ اسے تجسس ہوا۔

”بس ابا جی کی جذباتیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگیا تھا، غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔

”اچھا چھوڑیں“ اپ سیٹ مت ہوں“ اللہ بہتر کرے گا۔“ بخٹاور کے تسلی بھرے انداز پر اس نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

”ہاں“ اس کے نام نہاد بندے دو سروں کا کام بگاڑ کر اپنے خدا کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا تے

رہیں۔“ تلخی اس کے لہجے میں رچی تھی اس کی بات نے بخٹاور کو پریشان کیا۔

”آپ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ہاشم۔؟“ اس کو بھی غصہ آیا۔

”دیکھو بخٹاور! میرا موڈ اس وقت سخت خراب ہے اور میں پہلے ہی جاب ختم ہونے کی وجہ سے ٹینشن میں ہوں“ اس لیے تم مجھ سے فضول قسم کی بحث نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔“ ہاشم نے ناراضی سے کھانے کی ٹرے پرے کر دی بخٹاور گھبرا گئی۔

”آپ کھانا تو کھالیں“ درمیان میں کیوں چھوڑ دیا۔“ اس نے التجائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ہاشم کا یہ رویہ اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے“ جاکر ڈسٹ بن میں ڈال دو۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”کیسے ڈسٹ بن میں ڈال دوں“ اللہ کو رزق کی بے حرمتی پسند نہیں“ گناہ ملتا ہے ایسا کرنے سے۔“ وہ اپنے بے ساختہ انداز سے اسے مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر گئی۔ ہاشم غصے سے اسے گھورتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”وہ کیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور یہ لوگ گناہ ثواب کے چکروں میں پڑے ہیں۔“ وہ تلخ لہجے میں کہہ کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

بخٹاور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ فکر مند انداز سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاشم کے لہجے کی دھمک اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟

”میں ہی پاگل ہوں“ جو اس کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی“ ظاہر ہے جاب کا ختم ہونا کوئی معمولی بات تو نہیں۔“ اس نے خود کو ڈانٹا اور اپنا ذہن بٹانے کے لیے میز پر رکھے برتن سمیٹنے لگی۔ ابھی اسے جا کر ہاشم کو بھی تسلی دینی تھی۔

آنے والے دنوں کا سورج بخٹاور کے لیے بے تحاشا پریشانیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ جاب ختم ہونے کی وجہ سے کئی معاشی مسائل منہ کھول کر سامنے آنے لگے۔

کھڑے ہوئے۔ دو کانوں سے آنے والا معمولی سا کرایہ بس ان کا کچن ہی چلا رہا تھا اور اوپر سے ڈیوری کا اچھا خاصا خرچا سر پر تھا۔

ان ہی مسائل کو سوچتے سوچتے بختاور کا دماغ بھٹنے لگتا۔ اپنے والدین کے گھر میں پیسہ اس کے لیے کبھی بھی ایشو نہیں بنا تھا، وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی اور ان کے گھر میں پیسوں کی ریل پیل تھی۔ ان چیزوں کا حساب کتاب رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی، لیکن یہاں تو صبح ہونے کے ساتھ ہی وہ جمع تفریق کرنے پر لگ جاتی، ابھی تک اس نے بچوں کے لیے شاپنگ بھی نہیں کی تھی۔ ہاشم خود شدید قسم کے ڈیپریشن کا شکار تھا اور بیروزگاری نے اس کے مزاج پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ بات بات پر اس سے لڑنے لگتا۔ یہ بات بختاور کے لیے اور بھی زیادہ ازیت ناک تھی۔



”اماں! مجھے بینش سے کسی قیمت پر شادی نہیں کرنی۔“ وہ ابھی ڈیزیز والے حادثے سے نہیں سنبھلی تھیں کہ ایک رات تیمور نے آکر ان کے سر پر دھماکہ کر دیا۔

اس وقت بندیا ”تائی اماں کے کمرے کے ساتھ ملحقہ ڈریسنگ روم میں کھڑی ان کے کپڑے پر لیس کر رہی تھی۔ تیمور کی بات پر اس کا ہاتھ بے خیالی میں گرم گرم استری سے جالگا۔ اس نے فوراً ”جلے ہوئے ہاتھ پر منہ سے پھونکیں مارنا شروع کر دیں۔“

”تمہارا باپ گولی مار دے گا تمہیں۔“ تائی اماں جو لیٹی ہوئی تھیں، بوکھلا کر بیٹھ گئیں۔ بندیا کا بھی سارا دھیان ان دونوں کی گفتگو کی طرف ہو گیا۔

”اس سے شادی کرنے سے اچھا ہے، بندہ خود زہر کھا کر مر جائے۔“ تیمور کا اپنا لہجہ بھی زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

”بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے تمہیں، پہلے تو میں بھی راضی نہیں تھی اور پھر بھی تم اپنے بابا کی ہاں میں ہاں

ملانے بیٹھ گئے تھے۔“ ان کو بھی اپنے بیٹے پر غصہ آیا۔ ”آپ کو اچھی طرح پتا ہے، مجھے بینش سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی، میں نے صرف بابا کو خوش کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا، کیونکہ ان کی یہی خواہش تھی، اس نے سر جھکا کر افسردگی سے جواب دیا۔

”اور وہ پھر بھی خوش نہ ہوئے، الٹا ان کی تم لوگوں سے شکایتیں اور زیادہ برپا گئیں۔“ انہوں نے منہ بنا کر یاد دلایا۔

”بابا کو بدگمان کرنے میں سو فیصد بینش کا ہاتھ ہے، پتا نہیں وہ چاہتی کیا ہے؟“ تیمور کو اس پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔

”مجھے تو ساری زندگی اس کی ماں کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آئی، تمہیں اس کی بیٹی کی کیا آئے گی۔“ وہ بینش سے خاصی بدگمان تھیں۔

”بہر حال آپ بابا سے بات کریں، میں اس دفعہ یہ قصہ ختم کر کے جانا چاہتا ہوں۔“ وہ حد درجہ بیزار تھا۔ ”لیکن ہوا کیا ہے؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”میں بھلا ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہوں، جو ہمارے دکھوں پر ہنسے، ہمارا مذاق اڑائے۔ اللہ جانے کون سا ایسا بغض اور نفرت ہے، جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی، میں نے خود اسے ڈیزیز اور آپ کے خلاف زہر اگلتے سنا ہے۔“ اس نے بھی اندر کی بات بتائی۔

”لیکن تمہارا باپ یہ بات کبھی نہیں مانے گا، ڈیزیز نے ان کا مان توڑ کر رکھ دیا ہے۔“ وہ افسردہ ہوئیں۔ ”بابا مانیں یا نہ مانیں، مجھے اس مینٹل لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔ میں اپنی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

”لیکن تمہارے بابا۔۔۔“ وہ گھبرا گئیں۔ ”میں بابا سے خود معافی مانگ لوں گا، لیکن ان سے کہیں، اپنی بیٹی کے لیے اس کے جیسا ہی کوئی بے حس، سر پھرا بندہ ڈھونڈ لیں۔“ تیمور غصے سے کہہ کر ان کے کمرے سے نکل گیا۔ تائی اماں نے دونوں

ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ بندیا ڈرتے ڈرتے باہر نکلی۔

”تائی اماں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟“
”میری اولاد مجھے کبھی بھی سکھ کا سانس لینے نہیں دے گی، تم نے سنا جو یہ کہہ کر گیا ہے۔“ وہ پریشانی سے اس سے مخاطب ہوئیں، ”بندیا نے جھٹ سے سر ہلا دیا۔

”بیٹا! خدا کے واسطے بینش سے ذکر مت کرنا، ورنہ تیمور کا باپ اسے باہر بھجوانے کے بجائے زیر دستی و دیول پڑھوا دے گا راتوں رات، انہیں تو آج کل ویسے ہی بہت غصہ آتا ہے ہر کسی پر۔“ انہوں نے بندیا سے التجا کی۔

”تائی اماں! میں نے پہلے کبھی ایسا کیا ہے، جواب کروں گی۔“ وہ افسوس ہوئی۔

”نہیں نہیں بیٹا، تم تو بہت بھلی مانس ہو، تمہاری ماں نے بہت اچھی تربیت کی ہے تمہاری۔“ انہوں نے کھلے دل سے اسے سراہا۔

اسی شام کو جب بینش اپنی پڑھائی میں مصروف تھی، تیمور کافی دنوں کے بعد بندیا کے پاس چلا آیا۔ وہ خاصا سنجیدہ سنجیدہ سا تھا۔ بندیا جو چائے کا کپ پکڑے لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی اس نے چونک کر تیمور کو دیکھا۔ اس کی شکل کبھی کبھی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے شاید کئی راتوں کے رتے جگمگے کا اثر تھا۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ بندیا کو اس کی خاموشی سے الجھن ہوئی۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔“ وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔
”ڈیزنی باجی کا کچھ پتا چلا۔۔۔؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”پتا ان کا چلایا جاتا ہے جو دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائیں، جو اپنی مرضی سے چلے جائیں، ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتا ہوا اسے ساری دنیا سے خفا لگا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ بندیا خاموشی سے چائے پینے لگی۔

”مجھ سے شادی کرو گی بندیا۔۔۔“ اس نے اتنا اچانک پوچھا کہ اسے ایک دم کرنٹ لگا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے کپ سے گرم گرم چائے چھلک کر اس کے دوسرے ہاتھ پر جا گری۔ اس کے منہ سے نکلنے والی سی کی آواز پر تیمور نے پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑا۔ بندیا کو جھٹکا سا لگا، وہ اپنے پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ بندیا کے دل کی دھڑکنیں مرتعش ہوئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دل میں کوئی بھونچال سا برپا ہو گیا ہو۔

”اٹھو، ذرا میرے ساتھ نل تک چلو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لان میں لگے پانی کے نل کے نیچے لے آیا۔

”سنو، مجھے سوچ کر جواب دینا۔ میں نکاح کر کے جانا چاہتا ہوں تاکہ اگلی دفعہ آؤں تو تمہارے ڈاکو منٹس تیار کر لاؤں۔ ہم یہاں نہیں انگلینڈ میں رہیں گے۔“

وہ کھڑے کھڑے سارے معاملات خود ہی طے کر چکا تھا۔ بندیا نے خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے بینش لان کی طرف آرہی تھی۔

”مبارک ہو بندیا! تمہارے بابا کی کال آئی تھی، وہ آج کو بتا رہے تھے کہ انہوں نے تمہاری بات طے کر دی ہے۔ تمہارے چچا کے بیٹے۔“ وہ بلند آواز میں اعلان کرتی آرہی تھی، ”تیمور کو دیکھ کر وہ ایک دم چپ ہوئی۔ وہ کافی دن کے بعد ان کی طرف آیا تھا۔

”ہیلو تیمور! کیسے ہو تم۔۔۔؟“ اس نے اس طرح اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے ان کے درمیان کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ تیمور خاموش رہا۔

”بھئی مبارک باد دو بندیا کو، اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے، کسی آفس میں کام کرنے والے ہیڈ کلرک کے ساتھ۔“ وہ استہزائے انداز میں ہنسی۔

بندیا کے اندر کوئی چیز چھن کر کے ٹوٹی تھی۔ تیمور نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے پورشن کی طرف برہ گیا۔ بندیا کا سارا سکون و برہم برہم ہو گیا۔ اپنے چچا کا بیٹا اسے سخت ناپسند تھا اور چچا اکثر اٹھتے بیٹھتے جب اسے سوہناتے کا ارادہ ظاہر کرتے تو تب بھی بندیا کو سخت غصہ آ جاتا تھا۔ اب تو اس سے

پوچھے بغیر اس کی بات طے کر دی گئی تھی۔
اس نے اسی شام اپنی والدہ کو فون کیا اور بتا دیا کہ
کا اظہار کرتے ہی جو اسے جھاڑ پڑی اگلے دو گھنٹوں
تک اس کے کانوں سے دھواں نکلتا رہا۔ دوسری طرف
بینش 'دل ہی دل میں تیمور کو منانے کے سنجیدگی سے
منصوبے بنا رہی تھی۔



آپا صالحہ کے چہرے پر تفکر کے سائے گہرے ہو
رہے تھے اور وہ بے بس نگاہوں سے اپنے ہاتھوں میں
پکڑی رپورٹس دیکھ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کو
یقین نہ آ رہا ہو اور وہ کافی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں
بیٹھی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہیں بڑی
آنت کا کینسر ہو چکا ہے جو ابھی ابتدائی اسٹیج پر تھا۔
”آپا یہ دوائی کھالیں۔“ مونا فکر مند انداز میں ان
کی میڈیسن والا لفافہ اور پانی کا گلاس اٹھائے اندر
داخل ہوئی۔

”سائیڈ میز پر رکھ دو۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھیں۔
”اچھا ہوا“ میں نے اس دفعہ عدینہ کو گھر آنے سے
منع کر دیا۔ ”وہ دھیرے سے بڑھتا میں۔“
”میں بھی حیران تھی کہ تم نے اسے اس کی انجان
سہیلی کے گھر میں رہنے کی اجازت کیوں دے دی۔“
بے نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”سنو مونا! عدینہ کو میری رپورٹس کے بارے میں
بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے دروازے
میں کھڑی مونا کو اچانک مخاطب کیا وہ گڑبڑا سی گئی۔
”لیکن آپا۔“ مونا نے احتجاج کرنے کے لیے منہ
کھولا ہی تھا کہ آپا صالحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔
”تمہیں جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ اس کا پہلا
سال ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرا علاج کروانے
چل پڑے گی میں نہیں چاہتی اس کی پڑھائی کا حرج ہو۔“

”لیکن اس طرح تو تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو
جائے گی پتر ڈاکٹر نے کہا ہے فوراً آپریشن کروالو۔“

بے نے فکر مند انداز میں انہیں یاد دلایا۔
”میں کچھ عرصہ میڈیسن کھا کر گزارا کر لوں گی،
عدینہ کا خیر خیریت سے پہلا سال گزر جائے۔“ انہوں
نے فوراً ”ہی دل ہی دل میں حساب کتاب کیا۔
”عدینہ باجی بہت سمجھ دار ہیں وہ اپنی پڑھائی کو
ساتھ ساتھ مینج کر لیں گی۔“ مونا نے ڈرتے ڈرتے
کہا۔

”ہونہ“ رہنے دو تم دیکھ رکھی ہے اس کی ذہانت
میں نے، عبد اللہ کے مرنے پر پورے دو سال ضائع
کئے تھے اس نے۔“ آپا صالحہ نے منہ بنا کر یاد دلایا۔
”لیکن سو تم تو الحمد للہ ابھی ٹھیک ٹھاک ہو۔ وہ
ایسا کیوں کرے گی۔“ بے کو بھی ان کی منطق
اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”بے جی! میں عدینہ کو آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔
اس لیے آپ مہربانی کر کے مجھے وہی کرنے دیں جو میں
کرنا چاہتی ہوں۔“ آپا صالحہ نے اس دفعہ التجائیہ انداز
اپنایا تو مونا اور بے دونوں کو ہی چپ لگ گئی۔

رات کو آپا صالحہ نے عدینہ کا نمبر لیا، وہ اپنی
دوست اوریدا کے گھر میں خاصی خوش تھی اس کے
لہجے سے بے ساختہ جھلکتی خوشی کو محسوس کر کے وہ
تھوڑا پر سکون ہو گئی۔

”اوریدا کے دادا بہت زبردست فریشن ہیں اور
بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔ میرے بہت سے کٹسمیٹ
کلینر کیے ہیں انہوں نے۔“ وہ بڑے پر جوش انداز میں
ان کو بتا رہی تھی۔

”اس کی دادی امں کب آرہی ہیں واپس؟“ آپا
صالحہ نے یونہی پوچھا۔

”ان کو ابھی کچھ دن لگیں گے، کیونکہ اوریدا کے
فادر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے فوراً ہی
بتایا۔

”چلو اچھا ہے، تم بھی کچھ دن وہیں رہ لو، لیکن اپنی
اسٹڈی کا حرج نہیں کرنا۔“ انہوں نے فون بند کرتے
ہوئے حسب عادت اسے نصیحت کی۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ عدینہ نے ان کی

بات کا جواب دینے کے بجائے اچانک پوچھا۔
”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ذرا سا سنبھل کر گویا ہوئیں۔

”نمیر پھر دوبارہ تو نہیں ہوا؟“ عدینہ کے لہجے میں چھپی فکر مندی انہیں اچھی لگی۔
”نہیں۔۔۔“ انہوں نے جھوٹ بولا۔

”چلیں لنکسٹ ٹائم آپ میرے ساتھ پنڈی آئے گا“ میں آپ کا چیک اپ اور یاد کے بڑے ابا سے کرواؤں گی۔“ اس کی بات پر وہ مبہم انداز میں مسکرائیں۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔“ انہوں نے ایک دفعہ پھر اسے ہلایا۔

”چلیں اپنا بہت زیادہ خیال رکھیے گا“ بھریات کریں گے۔“ عدینہ نے سلام دعا کے بعد فون بند کر دیا۔ دوسری طرف آپا صالحہ نے شکر ادا کیا کہ وہ اس سفتے گھر نہیں آئی تھی ورنہ ان کی حالت دیکھ کر کچھ نہ کچھ اندازہ لگاتی۔

ہاشم اس دن ایک جگہ برانٹرویو دے کر تھکا تھکا سا گھر میں داخل ہوا تو بخٹور کو پہلی دفعہ اس پر رحم آیا۔ اس نے کئی جگہ نوکری کے لیے درخواستیں جمع کرائی تھیں، اول تو کسی جگہ سے انٹرویو کے لیے کال ہی نہ آتی اور اگر کوئی بھول کر اسے انٹرویو کے لیے بلا لیتا تو بات اس سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی۔ وہ دن بہ دن چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا اور ایک دن پہلے تو وہ اپنی ایک دکان کا گریہ لینے گیا تو وہاں سے بھی لڑجھکڑ کر آگیا کیونکہ کرائے دار نے اسے آدمی رقم دے کر باقی پندرہ دن بعد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

جوان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔

آج کل وہ سارا سارا دن جاب کی تلاش میں مختلف جگہوں پر دھکے کھا کر جب واپس لوٹتا تو کھانا کھا کر سو جاتا، اس کی بخٹور کے ساتھ گفتگو بس چند جملوں تک محدود ہو گئی تھی۔ بخٹور سارا دن گھر میں اکیلے بیٹھ بیٹھ

کر کڑھتی رہتی اس تنہائی نے اسے اللہ کے اور قریب کر دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ مذہبی تو کبھی بھی نہیں رہی تھی لیکن بے ورپے پیش آنے والی پریشانیوں کا حل اس نے دعاؤں میں تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ مختلف اخبارات کے دینی صفحات سے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر وظیفے نکالتی اور نمازوں کے بعد گھنٹوں تسبیح لے کر بیٹھتی رہتی۔

اس دن ہاشم ذرا جلدی گھر آگیا تھا، وہ ایک اخبار سے بچوں کے اچھے اچھے اسلامی نام اپنی ڈائری میں تحریر کر رہی تھی۔ ہاشم کا مزاج آج کچھ بہتر تھا۔ اس لیے وہ اس کے پاس ہی صوفے پر آکر بیٹھ گیا اور سامنے میز پر رکھی اس کی تسبیح اٹھا کر لا پرواہی سے انگلی میں گھمانے لگا۔ بخٹور کو ناگواری کا احساس ہوا۔

”افوہ تسبیح! ایسے نہیں گھماتے، گر کر ٹوٹ جائے گی۔۔۔“ اس کے سنجیدہ انداز پر اس نے خلاف توقع اس کی بات مان لی اور تسبیح لا پرواہی سے دوسرے صوفے پر اچھال دی، اس کا یہ اقدام بھی بخٹور کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

”کیا لکھ رہی ہو۔۔۔؟“ وہ تجسس بھرے انداز میں اس کی ڈائری پر جھکا اور اس پر لڑکوں کے اسلامی نام دیکھ کر چونکا۔
”تم تو سارے لڑکوں والے نام لکھ رہی ہو، اگر بیٹیاں ہو گئیں تو۔۔۔؟“

”لڑکیوں کے نام بھی ابھی تلاش کر کے لکھوں گی، پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اللہ مجھے اولاد نہ پہنچا رہا ہے، وہ ضرورت سے زیادہ پر اعتماد تھی اس لیے اس نے الٹا ساؤنڈ کروا کر بھی ڈاکٹر سے بچوں کی جنس کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

”اچھا، لیکن نام تو تم نے سارے لڑکوں کے لکھے ہیں۔“ وہ بڑھنے لگا، ”عمر، ابوبکر، علی، عثمان۔۔۔“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بیزار لہجے میں گویا ہوا۔

”لیکن میں اپنے بچوں کے نام یہ نہیں رکھوں گا۔“ اس نے ڈائری اس کے ہاتھ سے پکڑ کر بے دردی سے ان ناموں کو بال پوائنٹ سے کاٹ دیا۔ بخٹور کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کر پھینک دیا ہو۔ وہ
جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کے ساتھ پرالہم کیا ہے۔ کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔“ غصے کی زیادتی سے اس کا منہ سرخ ہوا۔
”تو کیا میں اپنے بچوں کے نام بھی اپنی پسند سے نہیں رکھ سکتا۔“ اس کے نرم لہجے میں موجود شکوہ محسوس کر کے اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔

”آپ اپنی پسند کے نام ضرور رکھیں، لیکن یہ صحابہ کرام کے نام ہیں۔ ان ناموں کو برامت کہیں۔“ اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔
”اچھا بابا! نہیں کتنا معاف کر دو۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ سنجیدگی سے دوبارہ بیٹھ گئی۔

”تمہیں پتا ہے اگر ہمارے ہاں بیٹے ہوئے تو میں ان کا نام کیا رکھوں گا؟“ وہ اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے دانستہ مسکرایا۔

”کیا رکھیں گے۔“ وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔
”یزوان اور سلمان۔“ وہ پراسرار انداز میں مسکرایا۔

”سلمان نام تو چلو ٹھیک ہے، لیکن یزوان سے کیا مراد ہے۔“ بخاور نے حیرانی سے دریافت کیا۔
”آتش پرست مذہب میں یزواں نیکی کے خدا کو کہتے ہیں۔“ اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
”تو کیا آپ آتش پرستی پر یقین رکھتے ہیں۔“ بخاور کا سانس رکنا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس کی بات پر بخاور کا سانس بحال ہوا اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے یہ نام اس لیے پسند آیا تھا کہ یہ ان کے نیکی کے خدا کا نام تھا، ورنہ مجھے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”لیکن مجھے تو یہ نام بہت عجیب لگا ہے، میں تو ہرگز نہیں رکھوں گی۔“ بخاور نے بھی ٹاک چڑھا کر کہا تو وہ

اس کے اسٹائل پر ہنس پڑا۔

”کیا بدلہ لے رہی ہو۔۔۔؟“ اس نے فوراً ہی مسکرا کر پوچھا۔

”بدلہ کس بات کا؟ مجھے نہیں اچھا لگا تو بس نہیں لگا۔۔۔“ بخاور کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔
”بھئی، میں نے تمہارے منتخب کردہ نام جو مسترد کر دیے تھے، تم نے حساب برابر کر دیا۔“ اس کی وضاحت پر وہ حیران ہوئی۔

”ہرگز نہیں، میرے دل میں ایسا کچھ نہیں تھا، خیر یہ بتائیں کہ اگر اللہ نے ہمیں دو بیٹیاں دے دیں تو ان کے نام کیا رکھیں گے؟“ بخاور نے کچھ سوچ کر پوچھا تو وہ ایک دم چپ کر گیا۔

”بتائیں نا۔۔۔“ بخاور نے ضد کی۔
”مایا اور مونیکا۔۔۔“ اس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔

”لیس، یہ دونوں نام بھی ایک دم فضول ہیں، مایا ہندوؤں کا نام لگتا ہے اور مونیکا کرسچن۔۔۔“ بخاور کی بات پر وہ سنجیدہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”تم اتنی زیادہ کنزرویٹو کیوں ہو بخاور، دنیا کی ہر چیز میں مذہب کو لے آئی ہو۔ ہمارے لیے اہم انسان ہونا چاہیے اس کا مذہب نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ہم اپنی زندگیوں میں مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔“ وہ بحث پر اتر آئی۔

”لیکن مذہب کے پیمانے پر کسی انسان کو پرکھنا، انسانیت کی توہین ہے، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ بھی دوید و انداز میں بولا۔

”میں کسی مذہب کو برا تو نہیں کہہ رہی، لیکن اسلام ہمیں ایسے نام رکھنے سے منع کرتا ہے۔ ہمیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“ سنجیدگی اس کے چہرے کے ہر نقش سے عیاں تھی، ہاشم نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا اور مصلحتاً بات کا اختتام کرنے کے لیے بولا۔

”اچھا بابا، تمہیں جو نام پسند ہو، تم رکھ لینا، بات ختم۔“

ہاشم نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی اور بخاور کا خوش قسم دل ایک دم پرسکون ہو گیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے ہاشم صرف ایک بھٹکا ہوا نوجوان ہے جسے اس کی توجہ اسلام کی طرف راغب کر سکتی ہے اور وہ دل ہی دل میں اس بات کا تہیہ کر چکی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی ایک اچھا مسلمان بنانے کی کوشش کرے گی۔ اس نے پانچ وقت کی نماز شروع کر دی تھی اور عافیت رہی کہ ہاشم نے اس کے بعد اسے نہیں ٹوکا تھا۔



”اور یدا! تم مجھے کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو۔“ عدینہ نے میڈیکل کی بھاری بھر کم کتاب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور یدا کی نظریں سامنے دیوار پر اور دھیان کہیں اور تھا۔ جب کہ گود میں اس نے بھی سلیبس کی کتاب کھول کر رکھی ہوئی تھی۔ ”نہیں تو۔“ وہ ایک دم ہی ہوش کی دنیا میں آئی، خفت اور شرمندگی کا بڑا بھر پور حملہ ہوا تھا اس پر۔ ”کوئی پرابلم ہے تو تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔“ عدینہ نے نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں تو میں تو بڑی اماں کی وجہ سے اپ سیٹ تھی وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔“ اور یدا نے جلدی سے بات بنائی۔

”خیر اصل بات تو کچھ اور ہی ہے اب تم بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے۔“ عدینہ لا پرواہی سے کہہ کر اپنی کتاب پر جھک گئی۔ اور یدا اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی۔ ”وہ اصل میں۔“ وہ تھوڑا سا انکی۔

”اگر کوئی پرسنل بات ہے تو اس اوکے اور یدا میں ماسٹڈ نہیں کرتی۔“ اس نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

”ار صم کی ممی اس کی انگیجمنٹ اس کی کزن ارسلمہ کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔“ اور یدا کی آواز اندھم تھی عدینہ نے بوکھلا کر اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔

”لیکن کیوں؟ کیا ار صم نے ان سے بات نہیں کی؟“

عدینہ اس کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

”کی تھی، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلتے ہوئے بولی۔

”ار صم کو اس بات پر اسٹینڈ لینا چاہیے۔“ عدینہ نے اپنی کتاب بند کر دی، اس کی پڑھائی سے طبیعت ایک دم ہی اچاٹ ہو گئی تھی۔

”تم بیش آنٹی کو نہیں جانتی ہو، وہ جس بات پر اڑ جائیں اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوتیں۔“ وہ سر جھکائے افسردگی سے گویا ہوئی۔

”لیکن یہ تمہاری اور ار صم کی زندگی کا معاملہ ہے، وہ ایسے کیسے کر سکتی ہیں؟“ عدینہ کو غصہ آ گیا۔

”وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔“ اور یدا مکمل مایوس ہو چکی تھی۔

”کہاں ہے ار صم، میں بات کرتی ہوں اس سے۔“ عدینہ کے دو ٹوک انداز پر وہ گھبرا اٹھی۔

”آج اس کے کزن کی برات ہے، وہ ان کے ساتھ گیا ہے۔“ اور یدا نے جلدی سے بتایا۔

”اسی وجہ سے تم برات کے ساتھ نہیں گئیں۔“ عدینہ کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی، وہ پچھلے دو دن سے اسے حد درجہ پریشان اور الجھا ہوا دیکھ رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ شاید اپنے پاپا کی وجہ سے پریشان ہے کیونکہ ماہیر نے اسے پاپا کی بیماری کے متعلق بتا دیا تھا۔

”نہیں، برات کے ساتھ تو میں تمہاری وجہ سے نہیں گئی، اور ویسے بھی مجھے اس فنکشن میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔“ وہ حد درجہ بیزار کی کاشکار تھی۔

”چلو اٹھو پھر، کہیں باہر چلتے ہیں، اچھا سا سوپ پی کر آتے ہیں۔“ عدینہ نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کے لیے فوراً ”پروگرام ترتیب دیا“ جسے اور یدا نے باؤل خواستہ مان لیا تھا۔ اب تو اور یدا کی ڈرائیونگ بہت اچھی ہو چکی تھی، وہ دونوں جناح سپر مارکیٹ چلی آئیں۔ موسم اچھا تھا اور گرے سیاہ باؤلوں نے پورے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ ایک

چائیز ریسٹورنٹ میں چلی آئیں۔ سوپ پیٹے ہوئے وہ ریسٹورنٹ کی گلاس وال سے گرتی بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگیں۔ بارش کے تسلسل میں تیزی آگئی تھی۔ عدینہ ہر طریقے سے اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اوریدا کے وجود پر گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تب ہی وہ اس کی باتوں کے جواب ہوں ہاں میں دے رہی تھی، حتیٰ کہ عدینہ جھنجھلا اٹھی۔

”میں نے کہا تھا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے، ارصم میرے لیے کیا ہے؟“

”میں نے بھی اس کرب کو بہت عرصہ اپنی ذات پر جھیلایا ہے۔“ وہ بھی افسردہ ہوئی۔

”تمہیں وہ شخص یاد آتا ہے۔“ اوریدا نے جھجک کر پوچھا۔

”بھولے گا تو یاد آئے گا، اس کی محبت تو خون بن کر میری شریانوں کے ساتھ دوڑتی ہے۔“ وہ بے بس انداز میں گویا ہوئی۔

”محبت تو ہے ہی فضول چیز، ہم لڑکیوں کو تو بالکل بھی نہیں کرنی چاہیے۔“ اوریدا کو فوراً ہی غصہ آگیا اور وہ ایک دم کھڑی ہو گئی، عدینہ نے حیرانی سے اس کے سامنے پڑے سوپ کے باؤل کو دیکھا، وہ جوں کا توں پڑا تھا۔

”یہ سوپ تو ختم کرو۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا، چلو کہیں اور چلتے ہیں عجیب سی وحشت ہو رہی ہے مجھے اس جگہ سے۔“ اوریدا بے چین روح بنی ہوئی تھی، اس نے بھی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا، دونوں بل ادا کر کے باہر نکل آئیں۔ رات کا وقت تھا اور بارش کی بوندوں میں روائی آچکی تھی۔

”گاڑی تک جاتے جاتے تو ہم اچھے خاصے بھیک جائیں گے۔“ عدینہ نے پریشانی سے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے منجیلے لڑکوں کو دیکھا جو موسم کو

انجوائے کر رہے تھے اور اس وقت دل چسپ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے، وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ دونوں اپنی گاڑی تک پہنچنا چاہتی ہیں۔

”چلو ہمت کرو، اب ہمیں تو کھڑے نہیں رہ سکتے نا۔“ اوریدا نے بیزاری سے کہا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سڑک کی طرف دوڑ لگادی، ان کی گاڑی پارکنگ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے سڑک کی دوسرے سائیڈ پر کھڑی تھی۔ سخت سردی میں عدینہ کپکپاتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جبکہ اوریدا موسموں کی شدت سے بے نیاز نہلتی ہوئی آرہی تھی۔

”یا گل تو نہیں ہو گئی ہو تیز چلو۔۔۔“ عدینہ نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے پلٹ کر اوریدا کی طرف دیکھا اور جیسے ہی سیدھی ہوئی، سامنے سے آتے ہوئے نوجوان سے بری طرح ٹکرائی، نوجوان کے ہاتھ میں پکڑا چھاتہ اچھل کر سڑک پر جاگرا۔

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ ایک مانوس شناسا لہجہ عدینہ کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ جوتا گواہی سے اپنا ہاتھ مسل رہی تھی، اسے جھٹکا سا لگا، اس نے تعجب انگیز نگاہوں سے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا، اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔

”عبداللہ۔۔۔“ عدینہ خوف زدہ ہو کر کچھ قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسلام آباد کی کسی سڑک پر تیز بھگتی بارش اسے اس شخص کے سامنے لا کھڑا کرے گی، جس کی یاد کا پودا وہ ابھی تک اپنے دل سے اکھاڑ نہیں سکی تھی۔

”عدینہ! کیسی ہو۔۔۔“ بارش ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی، وہ ایک دوسرے کے چہرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”عدینہ! جلدی آؤ۔۔۔“ اوریدا گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔۔۔“ عدینہ سکتے کی کیفیت سے باہر نکل آئی تھی، وہ جو سوچتی تھی کہ جب عبداللہ واپس آئے گا تو وہ سب سے پہلے اس سے اپنی بے تحاشا محبت کا اظہار کرے گی لیکن اس

پورے وجود میں آگ لگاتا ہے۔



اورید اور عدینہ دونوں واپس آچکی تھیں۔ عدینہ تو آتے ہی کبل تان کر سو گئی تھی یا سونے کی اداکاری کرنے لگی جبکہ اورید اکونیند نہیں آرہی تھی وہ باہر نکل آئی۔ برات واپس آچکی تھی۔ اس وقت بینش آنٹی کے پورشن میں خوب ہلہ گلہ ہو رہا تھا۔ تیز میوزک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ اپنی سیاہ شال اوڑھ کر پچھلے صحن کی طرف آگئی۔ بارش رکنے کے بعد اب آسمان صاف ہو چکا تھا۔ وہ برآمدے میں پڑے اپنے لکڑی کے مخصوص جھولے پر آکر بیٹھ گئی۔

”اورید!۔۔۔“ ارصم پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم کسی بدروح کی طرح ادھر ہی بیٹھی ہوگی۔“ وہ بھی مسکراتا ہوا اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”برات واپس آگئی ہے۔“ اورید انے یونہی بات کا آغاز کرنے کے لیے پوچھا۔

”ہاں آگئی۔۔۔“ ارصم نے بغور اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔

”بڑی اماں اور ماہیر کب آرہے ہیں واپس؟“ ارصم کو اچانک یاد آیا۔

”ابھی کچھ پتا نہیں، پاپا کی طبیعت مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی ابھی۔۔۔“ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”ناراض ہو مجھ سے۔۔۔؟“ ارصم نے ہاتھ کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر کیا۔

”نہیں تو۔۔۔“

”تم ٹینشن مت لو، میں ممی کو منالوں گا۔“ اس نے اسے دلاسا دیا۔

”مجھے معلوم ہے، وہ کبھی نہیں مانیں گی۔“ اورید ا خاصی حقیقت پسند تھی۔

”انہیں ماننا ہو گا اورید!۔۔۔“ ارصم ناراض انداز

دشمن جاں کو سامنے دیکھ کر اسے اپنی ڈھائی سالوں کی ازیت، تکلیف اور پریشانی یاد آگئی تھی۔ تیز بارش نے اس کا پردہ رکھ لیا تھا۔ وہ ناراض انداز سے پلٹی اور گاڑی کی طرف جانے لگی، وہ بری طرح سے بھیگ چکی تھی۔

”عدینہ! میری بات سنو۔۔۔“ وہ بے تابی سے اس کے پیچھے لگا۔

”مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سنی۔۔۔“ وہ اب فٹ پاتھ پر کھڑی رو رہی تھی۔ ”وہیں چلے جائیں، جہاں ڈھائی سال رہے ہیں۔“

”آج سے دو سال، پانچ مہینے اور دس دن پہلے بھی تم نے میری بات نہیں سنی تھی۔ اس کا دکھ آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔“ عبداللہ کی آواز میں گلے، شکوے اور بے انتہا ازیت تھی۔ عدینہ کو لگا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ بارش کے تسلسل میں ایک دم ہی کمی آئی۔ اورید ا جھنجھلا کر گاڑی سے باہر نکل آئی اور چیرانی سے ان دونوں کو دیکھ کر سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، جواب اسے کسی حد تک سمجھ آ ہی گیا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ لوگ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی نمونہ کروا میں گے، پلینز، میری گاڑی میں بیٹھ کر سارے گلے شکوے کر لیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر عدینہ کا بازو پکڑ کر اسے گاڑی میں زبردستی بٹھایا۔

عبداللہ اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا۔

”آپ بھی شرافت سے بیٹھ جائیں میری گاڑی میں، کیونکہ میرا موڈ آج بہت خراب ہے۔“ اورید ا کے دھمکی آمیز انداز پر وہ مسکرایا۔

”آپ اپنا سیل نمبر مجھے دے دیں، میں کل کسی وقت آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“

عبداللہ کے کہنے پر اس نے جلدی سے اپنا سیل نمبر اسے نکھوایا اور خاموشی سے اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ عدینہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اسے رونے دیا کیونکہ بعض دفعہ آنسوؤں کا بہنا بہت ضروری ہوتا ہے، یہ ممکن پانی اگر انسان اپنے اندر ہی جذب کرنے کی کوشش کرے تو یہ

میں جھولے سے اتر اور اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔

”اگر وہ نہ مانیں تو۔۔۔؟“ اوریدانے اس دفعہ ہمت کر کے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

”تو پھر ہم بھی وہی کرس گے جو تیمور انکل نے کیا تھا۔۔۔“ اس کی بات پر اورید اگوشاک سالگا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟“ اورید اگوشاک اپنی سماعت پر شک ہوا۔

”تیمور انکل اور تمہاری ماما نے بھی تو پسند کی شادی کی تھی نا۔۔۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”اس کا انجام دیکھا ہے تم نے“ آج تک بڑے ابا نے معاف نہیں کیا انہیں۔۔۔“ وہ بھی ناراضی سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”تو کیا ہوا؟ زندگی تو اپنی پسند سے گزاری نا انہوں نے۔“ وہ آج مکمل بغاوت کے موڈ میں تھا۔

”ارصم! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔“ وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

”تو پھر ویسا بالکل نہیں ہو سکتا جیسا ہم چاہتے ہیں۔“

مئی کبھی نہیں مانیں گی، وہ مجھے مرنے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔“ ارصم نے تلخ لہجے میں کہا۔

”بے شک نہ مانیں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔“ اورید اکی بات پر اسے دھچکا دگا۔

”کیا کہا تم نے۔۔۔؟“ وہ ایک دم تپ اٹھا۔

”میں بڑے ابا اور بڑی اماں کو دکھ پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتی، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں انہیں وہ دکھ دوں جو پاپا نے اور ڈیزی پھپھو نے انہیں دیا تھا۔“ اورید اکا سنجیدہ انداز ارصم کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب کر گیا۔

”تو کیا میں بے وقوف گدھا ہوں، بے حس ہوں، مجھے کسی کا احساس نہیں، میں بھی تو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔“ غصے سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ارصم، تم پلیز آئی بینش کو منانے کی کوشش کرو۔“ اورید ا اس کے ناراض

انہیں دیکھا گئی۔

”تم سونے کی بھی بن کر آجاؤ گی تو وہ کم از کم تمہارے لیے نہیں مانیں گی۔“ ارصم کا سفاک لہجہ اس کی روح تک کو زخمی کر گیا۔

”اسی لیے کہتا ہوں کہ دو سال تک میں مئی کو مالتا رہوں گا اور میرا میڈیکل مکمل ہونے کے بعد ہم کوئی اسٹیپ اٹھالیں گے۔“ وہ ابھی بھی اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری ارصم، میرا جواب جو آج ہے، وہی دو سال کے بعد ہو گا۔ میں بڑے ابا اور پاپا کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“ اوریدانے بھی دل پر جبر کر کے اپنی بات دہرائی، وہ کچھ لمحے ناراضی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”ٹھیک ہے، میں بھی مئی کو ارسلمہ کے لیے ہاں کہنے جا رہا ہوں، تم اب مجھ سے گلہ مت کرنا۔“ ارصم نے ایک دم اس پر پہاڑ توڑا تھا، وہ بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

جو غصے سے پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے جا چکا تھا۔ اورید ا کو اپنا سارا سکون لگتا ہوا محسوس ہوا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے بڑے ابا نے ان دونوں کی گفتگو کو بقیائی ہوش و حواس سنا تھا، ایک اور زلزلہ ان کے وجود میں برپا ہو چکا تھا۔ انہوں نے افسر وہ انداز میں اپنے کمرے کا پروہ برابر کیا۔

☆ ☆ ☆

اس دن صبح ہی سے بخنار کی طبیعت کچھ خراب سی تھی اور احتیاطاً ”ہاشم آج گھر میں ہی ٹھہر گیا۔ وہ فکر مندی سے اس کے ارد گرد ہی ٹہل رہا تھا اور دل ہی دل میں آنے والے خرچ کا حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا۔ دونوں نے کچھ دن پہلے ہی چھوٹی مولی شاپنگ کی تھی اور ہاشم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جاب ہوتے ہی اسے بچوں کی ڈھیر ساری چیزیں اور بھی خرید کر دے گا۔

”بخنار! زیادہ کنڈیشن خراب ہو رہی ہے تو میں بھاگ کر ٹیکسی لے آتا ہوں۔“ وہ تشویش زدہ نگاہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے اس کا زرد چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”ہاں لے آؤ۔۔۔“ وہ تکلیف کے زیر اثر اتنا ہی بول سکی۔

ہاشم بڑی سرعت سے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا اور اگلے ہی پانچ دس منٹوں میں وہ نیکی لے کر واپس فلیٹ میں آیا۔ بخٹاور کو سہارا دے کر اس نے بمشکل سیڑھیوں سے اتارا اور اس لمحے دونوں کو ہی اپنے ساتھ کسی بزرگ خاتون کی کمی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ بخٹاور کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی اور جیسے ہی وہ سرکاری ہسپتال کے گائنی ڈپارٹمنٹ میں پہنچی اسے نرسز نے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کر دیا تھا۔ یہ لمحات ہاشم کے لیے انتہائی پریشان کن تھے۔ خون کا انتظام کر کے اس نے سب سے پہلے اپنے دوست سرفراز کو کال کی جو ایک گھنٹے بعد اپنی بیوی کے ساتھ اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اس کی بیوی سرکاری اسپتال میں پھیلی افراتفری اور صفائی کی غیر نسلی بخش حالت کو کوفت بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

”ہاشم بھائی، کیا ضرورت تھی سرکاری ہسپتالوں میں دھکے کھانے کی، مجھے بتاتے، میں ایک اچھے پرائیوٹ اسپتال میں لے جاتی۔“ فائزہ بھابی کی بات پر وہ خفت کا شکار ہوا۔

”بس بھابی! کچھ حالات ہی ایسے تھے، سرفراز کو بتا تو ہے آج کل میں جاب لیس ہوں۔۔۔“ اس نے شرمندگی سے جواب دیا۔

”تو یار تم مجھے بتاتے ایسی بھی کیا بات تھی۔ دوست ہی تو دوست کے مشکل وقت میں کام آتے ہیں۔“ سرفراز بھائی نے محبت بھرے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

”بس یار، مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔۔۔“ وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

”اللہ کرے خیر خیریت ہو، اتنی دیر ہو گئی ہے۔۔۔“ فائزہ بھابی نے پریشانی میں ہسپتال کے کوریڈور میں ٹھلنا شروع کر دیا۔ ابھی اندر سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، فکر کے سائے ہاشم

کے چہرے پر بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور نرس کو دیکھ کر وہ تینوں اس کی طرف لپکے۔ جس کے چہرے کی سنجیدگی انہیں ہراساں کر رہی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے آپریشن تو ٹھیک ہو گیا، لیکن ہسپتال کا ایچ بی لیول بہت کم تھا اور ایک پیچی کی تو ڈیوڑی کے دوران ہی ڈھتھ ہو گئی۔“ نرس نے محتاط طریقے سے انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ ان کے ہاں دونوں بیٹیاں ہوئی تھیں۔

”اور دو سراسر ابلی؟“ ہاشم بوکھلا کر بولا۔

”دوسری پیچی ماشاء اللہ ٹھیک ہے، لیکن بہت کمزور ہے۔۔۔“ نرس کی بات پر ہاشم کے چہرے کی رنگت بحال ہوئی۔

”بہت بہت مبارک ہو یار، اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے تمہیں۔“ سرفراز بھائی نے کھلے دل سے مبارک باد دی۔

”تھینک یو سرفراز بھائی۔۔۔“ ہاشم زبردستی مسکرایا۔

اسے پیچی کی پیدائش کا سن کر کچھ زیادہ خوشی کا احساس نہیں ہوا تھا، وہ بھی بخٹاور کی طرح دل ہی دل میں بیٹوں کی آمد کا منتظر تھا لیکن اس نے اپنے دوست اور اس کی بیوی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ بخٹاور کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور فائزہ بھابی پیچی کو نہلا کر بخٹاور کے پاس لائیں تو وہ بے تاب انداز سے اس کے اوپر جھکی۔ بخٹاور کو اپنے اندر مامتا کا ایک ٹھانکھیں مارنا ہوا سمندر بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ محبت بھرے انداز سے پیچی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو جو م رہی تھی۔

”ہاشم دیکھو تو کتنی کیوٹ ہے یہ۔۔۔“ بخٹاور بے تحاشا خوش تھی اور اس خوشی میں اس نے ہاشم کا بچھا بچھا انداز نوٹ نہیں کیا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ اس نے ذرا سا پیچی کے گالوں کو چھوا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے یار! شرم کیوں رہے ہو، اپنی پیچی کو اٹھا کر

پیار کرو اور اس کے کانوں میں اذان دو۔“ سرفراز بھائی کی بات پر اس نے منہ بنایا۔

”ارے چھوڑیں سرفراز بھائی یہ چونچلے گھر جا کر کر لیں گے۔ ابھی میں کچھ میڈیسن لے آؤں۔“ وہ جلدی سے اپنی بات مکمل کر کے دروازے کی جانب بڑھا۔ سرفراز بھائی اور فائزہ بھابھی دونوں کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ انہوں نے الجھن بھرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا، وہ ہاشم کے رویے کو سمجھ نہیں پائے تھے، جبکہ بخٹور ان سب سے بے نیاز اپنی بیٹی کی طرف متوجہ تھی۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری ہے تمہاری بیٹی۔“ فائزہ بھابھی نے بچی کو پیار کرتے ہوئے ایک ہزار کانوٹ اسے تھمایا، بخٹور شرمندہ ہوئی۔

”ارے بھابھی اس کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے فوراً منع کیا۔

”بس بس یہ مروت دکھانے کی ضرورت نہیں، یہ ہماری گڑیا کا حق ہے، اب آپ لوگوں کے پاس اور کوئی تو نہیں، اس لیے ہمیں ہی رسمیں نبھانے دیں۔“ فائزہ بھابھی نے محبت سے اسے ٹوکا تو وہ بھی مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر شفٹ ہو گئی تھی۔ چھوٹے آپریشن کے بعد بھی ڈاکٹر نے اسے کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن اکیلے ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کر گڑیا کے لیے فیڈر بنانے جاتی۔ ہاشم بچی کی پیدائش کے بعد کچھ چپ چپ سا تھا لیکن بخٹور نے اپنی مصروفیت میں اس کا یہ انداز نوٹ نہیں کیا تھا۔ بچی کی آمد کے بعد دودھ کا خرچہ اچھا خاصا بڑھ گیا تھا اور یہ بات ان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث تھی، لیکن فی الحال اس کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاشم اپنی نوکری کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور بخٹور اس کا بھرپور ساتھ دیتی تھی، اس نے ہاشم کی مخالفت کے باوجود بچی کا نام فاطمہ رکھا تھا۔ جب کہ وہ اسے گڑیا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

”آپ فاطمہ کو اٹھا کر پیار کیوں نہیں کرتے۔؟“ بخٹور کو بچی کی پیدائش کے دس دن بعد احساس ہوا کہ ہاشم اسے ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا۔

”بھئی۔ اتنی چھوٹی بچی ہے، مجھے تو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے بہانہ بنایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

اسی رات کے کسی پل بخٹور کو بچی کے گلے سے خرخر کے ساتھ عجیب سی آوازیں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس نے بوکھلا کر ہاشم کو اٹھایا، وہ بھی فاطمہ کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ دونوں ہانپتے کانپتے بچی کو لے کر قریبی اسپتال میں پہنچے، بچی کا سانس اکھڑ رہا تھا اور اسپتال پہنچنے کے دس منٹ کے بعد منہ بھی فاطمہ نے بخٹور کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ دونوں اس اچانک موت پر ہکا بکا رہ گئے۔

ڈاکٹر نے بچی کی موت کی وجہ سانس کی نالی کی الرجی بتایا تھا۔ اسے پیدائشی دمہ تھا اور وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے۔ فاطمہ کی موت نے بخٹور کو شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا۔ وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اسے بچی کی موت کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔



وہ ایک عجیب بیزار کن سا دن تھا۔ بڑے ابا آج کافی دن کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکلے تھے۔ سب ہی نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا، ان کا حلیہ خاصا ملگجھا اور شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بڑی اماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طیبہ کو اشارہ کیا۔

”بابا! ناشتہ لے کر آؤں آپ کے لیے۔“ وہ ڈرتے ڈرتے ان کے قریب پہنچی۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ ان کے لہجے میں بے زاری ہی زاری تھی۔

”اچھا، صرف چائے بنا دوں۔؟“ شائستہ بیگم نے بھی محتاط انداز میں پوچھا۔

”ہاں بنا دو۔“ وہ لاؤنج کے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔

”تیمور کہاں ہے؟“ انہوں نے دائیں بائیں دیکھ کر
 سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”ٹریول ایجنٹ کے پاس گیا ہے، ٹکٹ کا پوچھنے۔۔۔“
 ”کب جا رہا ہے واپس انگلینڈ۔۔۔؟“ وہ آج خلاف
 توقع لمبی بات کر رہے تھے۔ شائستہ بیگم نے سکون کا
 سانس لیا۔

”شاید دس پندرہ دن تک چلا جائے۔۔۔“ وہ کچن کی
 طرف برہہ گئیں۔

”شکرا الحمد للہ بڑے صاحب نے آج اپنے کمرے
 کی جان چھوڑی۔۔۔“ بوارحمت فوراً ”لیک کر ان کے
 پاس آئیں اور سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرنے
 لگیں۔

”بوا! آہستہ بولو، کہیں وہ سن ہی نہ لیں۔۔۔“ وہ
 خوف زدہ انداز میں بولیں۔

”آپ پاس جا کر بیٹھیں نا، یہاں کچن میں کیوں
 آئی ہیں؟“

”چائے کی فرمائش کر رہے ہیں وہ۔۔۔“ انہوں نے
 جلدی سے ساس پین میں پانی ڈالا۔

”آپ چھوڑیں چائے کو، میں بنا کر لاتی ہوں۔۔۔“
 بوا کی بات پر وہ فوراً ”کچن سے نکل آئیں، ڈاکٹر جلال
 صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

”بیش نہیں آرہی آج کل، خیریت تو ہے نا۔۔۔؟“
 انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر پوچھا ”ان کے
 اس سوال کو سن کر ان کی بیگم کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”نہیں، آجاتو رہی ہے، آپ ہی اپنا کمرہ بند کیے
 ہوئے تھے، اس لیے اندر نہیں آئی۔“ انہوں نے بادل
 نخواستہ جواب دیا۔

”آپ نے تو کچھ نہیں کہا اسے۔۔۔؟“ ان کا کڑا الجھ
 ”شائستہ بیگم کی آدھی جان نکال گیا۔

”حد کرتے ہیں آپ بھی میں کیوں کہوں گی بھلا ایسا؟“
 وہ برامان گئیں۔

”سوچ رہا ہوں، اگلی دفعہ تیمور آئے تو اس کی شادی
 کروں، یا پھر کم از کم نکاح۔۔۔“ ان کا یہ جملہ تیمور نے
 لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے سنا تھا۔ اس کے چہرے

پر ناگواری کا تاثر پوری قوت سے ابھرا۔ شائستہ بیگم
 نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے خاموش رہنے
 کی التجا کی، جو اس نے خلاف توقع مان بھی لی۔

”ہاں، بھئی برخودوار! کیا ارادے ہیں تمہارے؟“
 انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے تیمور کی طرف دیکھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ بہتر جانتے ہیں۔۔۔“
 اس نے گول مول سا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

”خیر، کہہ تو تم بھی بہت کچھ سکتے ہو، اللہ نے
 ضرورت سے زیادہ ہی عقل و شعور سے نوازا ہے میری

اولاد کو۔“ ان کے لہجے میں طنز کی آمیزش محسوس کر
 کے تیمور نے بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلا، لیکن

مصلحتاً ”خاموش رہا۔ ڈاکٹر جلال خاموشی سے اخبار
 پڑھنے لگے۔ جب کہ ان کی باتوں نے تیمور کا سارا

سکون غارت کر دیا تھا۔



”کیا بات ہے اور پیدا! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ رات
 کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب بڑے ابا کسی کام سے
 اپنے کمرے سے نکلے تو اسے کارپٹ پر صوفے کے
 ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا، سامنے ٹی وی چل رہا تھا
 لیکن اس نے اس کی آواز بند کر رکھی تھی، خود وہ کافی
 دیر سے قالین کے ڈیزائن کو زیر کرنے میں مگن تھی۔
 اس کے چہرے پر افسردگی کی گہری تہ تھی۔ ارصم کی
 باتوں نے اس کے دل و دماغ میں ایک خشر بپا کر رکھا
 تھا۔

ہستی پلاٹیک



شرہ بخاری

قیمت - 300 روپے

ہوں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور خلاف توقع وہ مان گئے تھے۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ہاتھ میں پکڑا کافی کا ڈبہ شیفت پر رکھ دیا اور خود کچن سے نکل گئے۔

یہ آج کی رات میں اوریدا کے لیے دو سرا خوش گوار جھٹکا تھا، اس کا دل چاہا کہ وہ فوراً ”ارصم کو کال کر کے اس انہونی کے متعلق بتائے لیکن پھر اچانک یاد آیا کہ وہ اس سے خفا تھا۔ اس سوچ نے ایک دفعہ پھر اسے پریشان کر دیا، رات سے اسی بات نے تو اس کی نیند حرام کر رکھی تھی، اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ارصم اس کے لیے اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ اس نے سر جھٹک کر اس سوچ کو اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور جلدی سے کافی کپ میں ڈال کر بڑے ابا کے کمرے میں چلی آئی، وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑے تھے جو پچھلے صحن کی جانب کھلتی تھی۔

”بڑے ابا۔۔۔ کافی۔۔۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا اور کپ سائڈ میز پر رکھ دیا۔

”تھینک یو۔“ اس دفعہ ان کی بات پر اوریدا کو حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ سے ان کے کمرے سے نکل آئی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اوریدا نیند میں بھی بے چین تھی اور بار بار کدو میں بدل رہی تھی۔

”کون تھا وہ شخص، جس کی طرف دیکھ کر یہ اتنی زیادہ جذباتی ہو گئی۔“ اپنی پریشانی سے اس کا دھیان بٹا تو اس نے عہدہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

”کہیں یہ وہی شخص تو نہیں تھا، جس سے وہ محبت کرتی تھی۔“ اس کے ذہن میں خیال ابھرا تھا۔

”لیکن وہ شخص تو مر گیا تھا۔“ ایک اور سوچ نے اس کا دامن پکڑا۔

”ہو سکتا ہے عہدہ نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو اور وہ شخص زندہ ہو۔“ اس نے ایک اور اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

تب ہی اس کے سیل فون کی ٹیکسٹ ٹون بجی، اس کا دل بے اختیار دھڑکا، اسے یقین تھا کہ یہ ارصم کی

بڑے ابا کی آواز پر وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ کئی لمحے تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کہ بڑے ابا نے اسے نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ کھو جتی ہوئی نگاہوں سے اوریدا کا چہرہ پڑھنے میں مصروف تھے۔

”کک کچھ نہیں بڑے ابا! ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔“ وہ اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے انہیں خاصی پریشان لگی۔

”تمہاری دوست چلی گئی ہے کیا؟“ ان کے اگلے سوال پر اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

”نہیں، وہ میرے کمرے میں سو رہی ہے۔“ وہ ابھی تک بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کے لہجے میں اتنی مروت نرمی تو کبھی بھی اس کے لیے نہیں رہی تھی۔

”جیلو، تم بھی جاؤ اپنے کمرے میں اور سونے کی کوشش کرو۔“ ان کا نرم لہجہ اسے لمحہ لمحہ حیران کر رہا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بڑے ابا کبھی اس سے ایسے بھی مخاطب ہو سکتے ہیں، اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے دو دفعہ اپنی آنکھوں کو بری طرح مسل کر دیکھا، یہ واقعی کوئی خواب نہیں تھا۔

”خدا انخواستہ بڑے ابا کی طبیعت تو خراب نہیں تھی۔“ اس سوچ نے اسے بے چین کیا۔

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے کھولتے رکی اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ پلٹ گئی، اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ وہ جلدی سے لاؤنج کی سیڑھیاں اتر کر کچن کی طرف بڑھی، سامنے بڑے ابا اپنے لیے کافی بنا رہے تھے، اس کے قدموں کی آواز پر وہ پلٹے، اوریدا کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔

”بڑے ابا! مجھے اچانک خیال آیا، آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ اس نے جھجک کر کہا اور فوراً نظریں جھکا لیں۔

”ہیں۔۔۔ بس کافی کی طلب تھی، وہ بنا رہا ہوں۔“ وہ اب خاصے سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

”آپ اپنے کمرے میں چلیں، میں بنا کر لاتی

طرف سے سوری کامیاب ہو گا لیکن جیسے ہی اس نے ان باکس کھولا، اسے چار سو بیس والٹ کا جھٹکا لگا، دوسری طرف سرمد بھائی کامیاب تھا۔

”بڑی اماں نے تیمور ماموں سے تمہارے اور میرے پروپوزل کی بات کی ہے، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

یہ ٹیکسٹ پڑھتے ہی اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ ساری پریشان کن خبریں اسے آج ہی کی تاریخ میں مل رہی تھیں۔ ساری رات اس کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے گزری، وہ کوئی ایک سو ایک دفعہ سرمد کامیاب پڑھ چکی تھی، اسے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بھلا ایسے کیسے ممکن ہے۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی ماہیر سے بات کرے گی اور صاف انکار کر دے گی۔

اگلی صبح اتوار تھا وہ دونوں ناشتے سے فارغ ہوئیں تو دن کے دس بجے کے قریب اوریدا کے نمبر پر عبداللہ کی کال آگئی۔ وہ عدینہ سے ملنے کے لیے آنا چاہتا تھا۔ اوریدا نے کن اکھیوں سے اپنے سامنے اخبار پڑھتی عدینہ کی طرف دیکھا۔

”وہ تم سے ملنے کے لیے آنا چاہتا ہے۔“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”اس سے کہہ دو، پچھلے ڈھائی سال وہ جہاں تھا وہیں رہے، مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔“ عدینہ نے بے رخی کی انتہا کر دی۔ اپنی بات کر کے وہ ایک دم اٹھی اور گھر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ فون کے دوسری جانب موجود عبداللہ نے اس کا یہ جملہ بخوبی سنا تھا۔

”میں سوری، اس کی آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ اوریدا نے شرمندگی سے کہا۔

”اس اوکے میں جانتا ہوں، وہ مجھ سے خفا ہے اور اسے خفا ہونا بھی چاہیے۔“ دوسری جانب وہ اس کو حق بجانب سمجھتے ہوئے مسکرایا۔

”اگر آپ ماسٹرنہ کریں تو مجھے بتائیں گے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“ اوریدا کو تجسس ہوا۔

”وہ آپ کی بہت اچھی فرینڈ لگتی ہیں، کیا انہوں نے نہیں بتایا آپ کو؟“ دوسری طرف موجود عبداللہ کو حیرانی ہوئی۔

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں اس کی بہت اچھی دوست ہوں۔“ اوریدا کو اس سے گفتگو میں مزہ آنے لگا۔

”اس لیے کہ عدینہ کی والدہ آپا صالحہ اسے کسی قیمت پر بھی کسی انجان دوست کے ہاں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔“ اس کی صاف گوئی متاثر کن تھی۔

”آپ عدینہ کی والدہ کو بھی جانتے ہیں؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”کیا مطلب؟ ہمارا سارا بچپن ایک ہی علاقے میں گزرا ہے اور میں عدینہ کی والدہ کا دینی مدرسہ چلاتا تھا۔“ عبداللہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

”اوہ۔“ اوریدا کو کچھ کچھ معاملہ سمجھ میں آنے لگا۔

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ آپ کی۔۔۔“ اوریدا جھجک کر رکی، وہ بھلا کیسے کسی کے منہ پر اس کے مرنے کی بات کر سکتی تھی۔

”یہی سنا ہو گا کہ میری ایر کریش میں ڈنٹھ ہو گئی؟“ اس نے جلدی سے بات مکمل کی۔

”ایر کریش کا تو نہیں پتا لیکن ڈنٹھ کا ضرور پتا تھا، آپ پلینز مجھے ساری بات بتائیں، پھر ہی میں کوئی آپ کی ہیلپ کر سکوں گی۔“

اسے بہت زیادہ تجسس ہونے لگا۔ عبداللہ افسروگی سے اسے سارا قصہ سنانے لگا۔ جسے سنتے ہی اوریدا کو اپنی ساری پریشانی دکھ اور غم بھول گئے تھے، وہ بس منہ کھولے حیرانی سے اس شخص کی باتیں سن رہی تھی، جو لمحہ لمحہ اسے حیران کر رہا تھا۔ محبت کی ایسی داستان بھلا اس نے پہلے کب سنی تھی۔

”آلیٹ میں اتنا زیادہ نمک کیوں ڈالا ہے؟“ ارصم ناشتے کی میز پر ایک دم ملازمہ پر برس پڑا۔ بینش کے ساتھ ساتھ آغا جی نے بھی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ گھر میں شادی کے فنکشن ختم ہو چکے تھے اور اب ارصم کی پھپھو کی دو تین دن کے بعد واپسی تھی، اس وقت سب ہی لوگ ناشتے کی میز پر موجود تھے۔

”تم فرائی اندا لے لو۔“ بینش نے اپنی نند کی موجودگی میں ذرا دھیمے انداز میں کہا۔

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے میں فرائی اندہ نہیں کھاتا۔“ وہ ایک دم کرسی پیچھے گر کے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے ڈانٹنگ روم سے نکل گیا۔ ارسلہ اور اس کی ممی نے حیرانی سے بینش کی طرف دیکھا جو ارصم کی اس حرکت پر شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھیں۔

”بیٹا۔۔۔ جب آپ کو پتا ہے رات سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ کو خود خیال کرنا چاہیے تھا۔“ آغا جی نے بینش کی شرمندگی کم کرنے کے لیے بات بنائی۔ بینش کے تنے ہوئے اعصاب کچھ پر سکون ہوئے۔

”آئی ایم سوری آغا جی۔ مجھے صبح دھیان ہی نہیں رہا، ایک جوگی اسے میرے ہاتھ کے کھانوں کی عادت پڑ چکی ہے۔“ انہوں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی جو انہیں خاصی مہنگی پڑی۔

”معاف کیجئے گا بینش بھابھی! آپ نے ارصم کو خاصی غلط قسم کی عادتیں ڈال رکھی ہیں، کل کو اسے آپ کے بغیر رہنا پڑ گیا تو کیسے گزارا کرے گا۔“ ان کی نند عمیرہ کا تیکھا لہجہ ان کا دل جلا گیا۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”میرے بغیر۔۔۔؟“ وہ بے ساختہ بولیں۔ ”اللہ نہ کرے، ارصم کو میرے بغیر نہیں رہنا پڑے، میں تو ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔“

”کچھ عرصہ کے لیے تو رہنا پڑے گا، ظاہر ہے وہ آسٹریلیا جائے گا تو تب ہی آپ کو بلا سکے گا۔“ ان کی بات نے بینش کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجادی، آغا جی نے طنزیہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو

اس بات کو سن کر کچھ مضطرب دکھائی دے رہی تھیں۔

”تب کی تب دیکھی جائے گی، آپ لوگ ناشتا تو کریں نا، میں ذرا جنید اور دلہن کے لیے ناشتے کا کمرہ کر آؤں۔“ وہ بہانے سے انھیں اور کچن میں ملازمہ کو ہدایات دے کر اپنے کمرے کی طرف برہم آئیں، جہاں آغا جی پہلے سے موجود تھے۔

”اپنی نند کے ارادے دیکھ لیے نا؟“ ان کی جتاتی ہوئی نگاہوں سے وہ ہلکا سا خائف ہوئیں۔

”میں بات کروں گی اس سے، ارصم کہیں نہیں جائے گا۔“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”لیکن اس کی بیٹی پاکستان میں بھی نہیں رہ سکتی، دیکھا نہیں صبح و شام یہاں کی چیزوں پر تنقید کرتی ہے وہ۔“ آغا جی کی صاف گوئی ہضم کرنا آسان نہیں تھا اور یہ مشکل کام بینش نے بھی مشکل ہی سے کیا تھا۔

”شادی کے بعد بچیوں کے مزاج بدل جاتے ہیں اور وہ وہیں رہتی ہیں جہاں ان کا شوہر انہیں رکھتا ہے۔“ انہوں نے محتاط انداز میں انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”وہ مشرقی بچیاں ہوتی ہیں، جن کی تربیت یہاں کے ماحول میں ہونی ہوتی ہے۔“ آغا جی نے بھی آج ان کی کسی بھی بات سے متعلق نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”آغا جی۔۔۔ آپ خوا مخواہ خود کو اور مجھے پریشان کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“ وہ چڑ گئیں۔

”وقت پر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب چیزیں ابھی سے دکھائی دے رہی ہیں۔“ انہوں نے بھی بے زاری کا برملا اظہار کیا۔

”نی الحال تو میں جا کر اس ارصم کو دیکھوں، ناشتے کی میز پر اتنی زیادہ بد تمیزی کر کے گیا ہے۔“ وہ تیر کی طرح کمرے سے نکلیں اور ارصم کے کمرے میں جا کر ہی دم لیا لیکن خالی کمرہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا کر باہر نکلیں اور ملازمہ سے پوچھا۔

”وہ تو ابھی ابھی اپنے ہاسٹل کے لیے نکلے ہیں۔“

ملازمہ کی بات پر انہیں شاک لگا۔

”ہاسٹل کے لیے لیکن مجھ سے ملے بغیر کیسے جاسکتا ہے۔“ ان کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

”پتا نہیں جی، بہت غصے میں گئے ہیں وہ، مجھے بھی خواہ مخواہ ڈانٹ دیا تھا۔“ ملازمہ نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اچھا پیچھے ہٹو، راستے میں دیوار چین بن کر کھڑی ہو گئی ہو۔“ انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ ملازمہ پر اتاری جو گھبرا کر کوریڈور کے ایک طرف ہو گئی تھی۔

”بینش آئی! ذرا ارصم کے کام دیکھیں، میں نے اتنا منع کیا، وہ پھر بھی ہاسٹل چلا گیا۔“ وہ جیسے ہی لاونج میں پہنچیں تو ارسلہ منہ بنائے وہاں بیٹھی تھی۔ اس کی والدہ کا مزاج بھی کچھ برہم لگ رہا تھا۔

”ہاں اس نے بتایا تھا مجھے، اس کا کوئی اہم ٹیسٹ تھا۔“ انہوں نے فوراً ہی بات بنائی۔

”یہ ٹیسٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں اب جا کر تو شادی کے ہنگاموں سے فرصت ملی تھی سوچا تھا ارسلہ اور وہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھ لیں گے لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار نکل گیا۔“ ان کی نند کو بھی برا لگا تھا اور انہوں نے فوراً ہی اس کا اظہار کر دیا۔

”عمیرہ! تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو، آجائے گا ایک دو دن میں۔“ بینش نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ خود بھی ارصم کے رویے پر بری طرح الجھی ہوئی تھیں۔ وہ تو ان کا بہت ٹھنڈے مزاج کا بچہ تھا جو آج کل آتش فشاں بنا گھوم رہا تھا۔

”بھئی۔ جلدی بلو الینا اسے، میں جانے سے پہلے ارصم اور ارسلہ کی منگنی کا فنکشن کر کے جانا چاہتی ہوں۔“ عمیرہ نے انہیں اپنا پروگرام بتایا۔

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔“ وہ پھلکے سے انداز میں مسکرا کر دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ انہیں ارصم کو کس طرح دوبارہ گھرواپس بلوانا ہے اور اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی، جو انہیں فوراً ہی سمجھ میں آگئی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ چھل گئی۔

شانزے کے ساتھ ناراضی کے باوجود سرمد نے اسے اپنے ایک دوست کافلیٹ کرائے پر لے دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ زبردستی رباب کو بھی وہیں لے آئی تھی اور یہاں آنے کے بعد اس کی زندگی میں کافی خوش گوار تبدیلی آئی تھی، دو کمروں کا کھلا اور کشادہ سافلیٹ دونوں کو بہت پسند آیا تھا۔ اسے اپنے پہلے سیریل کا ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملا تھا۔ جس سے اس نے اپنا فلیٹ سیٹ کر لیا تھا۔ رباب کا آخری سمسٹر چل رہا تھا اور وہ اس کی وجہ سے خاصی فکر مند رہتی تھی۔ رباب کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور اسے اپنا امتحان دے کر یہاں سے چلے جانا تھا۔

”تم کیوں میری ٹینشن لے رہی ہو یا رباب۔“ شانزے اس کے ساتھ کچن میں کھڑی بحث کر رہی تھی۔

”میرے جانے کے بعد تم اکیلی اس فلیٹ میں کیسے رہو گی؟“ اس نے چاولوں کو دم لگاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اللہ کوئی نہ کوئی سبب بناوے گا۔“ پہلے سیریل نے اسے کافی اعتماد دے دیا تھا۔ اس کا ڈراما آن ایر آنے والا تھا اور شہر بھر میں اس کے بڑے بڑے بل بورڈز لگ چکے تھے، جس پر شانزے کا خوب صورت و لکش چہرہ سجا ہوا تھا۔

”ایک بات کہوں رباب! اگر تم برا نہ مانو تو؟“ وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

”ہاں بولو۔“ رباب نے سلا دینا کے لیے کھیرا کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں اکثر سوچتی ہوں، کاش تمہاری شادی سرمد بھائی کے ساتھ ہو جائے۔“ شانزے کے شرارتی انداز پر اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

”تمہارے سرمد بھائی اپنی کسی کزن کو پسند کرتے ہیں، یہ تم نے ہی بتایا تھا مجھے۔“ رباب نے منہ بنا کر یاد دلایا۔

”تو وہ کون سا گھاس ڈالتی ہے انہیں۔“ وہ کھیرے

کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے زور سے ہنسی۔
 ”ہاں جس کو کوئی نہیں گھاس ڈالتا اسے میں اپنے
 سر کا تاج بنالوں۔ اتنی فالتو ہوں میں۔“ رباب نے
 بھی اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔
 ”تم مان جاؤ، انہیں منانا میرا کام ہے۔“ شانزے نے
 شوخ لہجے میں اسے دوبارہ چھیڑا۔

”شانزے! باز آ جاؤ اور اپنی خیر مناؤ، تمہارا ہیرو بھی
 آنے والا ہے پاکستان اور اس کے عتاب سے تمہیں
 تمہارا بھائی بھی نہیں بچا سکے گا۔“ رباب نے اسے
 ڈرا دیا۔

”اللہ مالک ہے یار، سوچ رہی ہوں اس کے آنے
 سے پہلے ایک آدھ سیریل اور کرلوں، اکٹھے ہی ڈانٹ
 سن لوں گی۔“ شانزے کی بات پر رباب نے جھنجھلا کر
 اس کی طرف دیکھا۔

”شرم کرو، اچھے خاصے انسان کو ہرٹ کر رہی ہو۔“
 اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس ایک دفعہ گاڑی خرید لوں، پھر چھوڑ دوں
 گی۔“ شانزے کے پاس بہانہ تیار تھا۔
 ”گاڑی تو تم ویسے بھی خرید سکتی ہو، اپنے بابا کی
 لاہور والی پر اپنی میں سے کچھ سیل کرو۔“ اس نے
 اسے مفت مشورہ دیا۔

”اس پر اپنی پر تو خدجہ پھپھو سانپ بن کر بیٹھی
 ہیں، ان کا کہنا ہے وہ شادی کے بعد میرے کام آئے
 گی۔“ اس نے منہ بنا کرتا دیا۔

”ہاں کہتی تو وہ ٹھیک ہیں۔“ رباب فوراً ہی متفق
 ہوئی۔

”سوچ رہی ہوں ایک آدھ چکر لاہور کا بھی لگا
 آؤں، پھپھو کئی دفعہ فون کر چکی ہیں۔“ شانزے کو
 اچانک یاد آیا۔

”شانزے! ایک بات کہوں، برا مت ماننا، اس دفعہ
 جاؤ تو اپنی پھپھو سے اپنی مدر کے بارے میں ضرور
 پوچھنا۔“ رباب کی بات پر ایک تاریک سا سایہ
 شانزے کے چہرے پر دوڑا۔ ہر دفعہ یہ موضوع اس کا
 دل دکھانے کا موجب بنتا تھا۔

”جب انہوں نے کبھی مڑ کر ایک دفعہ بھی میرا
 نہیں پوچھا تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔“
 وہ ناراضی سے کہہ کر کچن سے نکل گئی۔ رباب کو
 افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ اسے رنجیدہ کر دیا، وہ
 فوراً سلاو بنا کر اس کے پیچھے گئی، تاکہ اس سے
 معذرت کر سکے۔



”آخر تم عبداللہ بھائی سے ملنا کیوں نہیں چاہتی
 ہو؟“ اوریدا نے آج کلج میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔
 گھر میں تو وہ سارا وقت بڑے ابا سے میڈیکل کے
 مختلف موضوعات پر بحث کرتی، اسے بھی ان کی طرح
 میڈیکل سے عشق ہو گیا تھا۔ بڑے ابا اب اس کی وجہ
 سے اوریدا سے بھی بے تکلفی سے بات کرنے لگے
 تھے۔

”میں تم سے مخاطب ہوں عدینہ۔“ اوریدا نے
 اس کی خاموشی پر جھنجھلا کر کہا۔

”مجھے اب عبداللہ کی ضرورت نہیں رہی۔“ وہ
 سپاٹ لہجے میں بولی۔ اس کی اس بات پر اوریدا کو دھچکا
 لگا۔

”دھائی سال تم جس شخص کے لیے دن رات روتی
 رہی ہو، اب وہ سامنے آ گیا ہے تو تب بھی تمہارا رونا
 نہیں ختم ہو رہا۔“ اوریدا کو اس پر غصہ آیا۔

”دھائی سال میں اس کی ناراضی اور موت پر روتی
 رہی اور اب اپنی بے قدری پر رونا آتا ہے مجھے۔“ اس
 کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا، ناراضی، بے وقعتی اور
 اپنی انا کو نہیں پہنچنے کا دکھ۔ اوریدا ایک لمحے کے لیے
 چپ ہو گئی۔

”تم ان سے ایک دفعہ بات کر کے تو دیکھو، ان کے
 پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔“ وہ ہلکے سے توقف
 کے بعد بولی۔

”لیکن اب مجھے اس کے کسی جواب کی ضرورت
 نہیں۔ وہ اتفاقاً مجھ سے ملا ہے۔ خود سے ڈھونڈتا ہوا تو
 نہیں آیا میرے پاس۔ کیا میرا ایڈریس، آپا کا فون نمبر

اور گاؤں میں میرے گھر کا راستہ نہیں آتا تھا اسے؟“
عدینہ کے پاس پوری چارج شیٹ تیار تھی۔
”ہو سکتا ہے وہ بھی خفا ہو اسی وجہ سے نہ آیا ہو۔“ اوریدانے اس کا دفاع کیا۔

”ایسی کون سی ناراضی تھی جس میں اس شخص نے ایک دفعہ بھی مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ زندہ ہے وہ مجھ سے خفا رہتا لیکن مجھے اس اذیت میں جلنے کے لیے اکیلا تو نہ چھوڑتا۔“ اس کا لہجہ نرم ہوا۔

”ہاں۔ یہ تو واقعی غلط کیا انہوں نے۔“ وہ بھی متفق ہوئی۔

”اب بھی اتفاقاً وہ مجھ سے ٹکرایا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ساری زندگی وہ مجھے نہ بتاتا کہ وہ زندہ ہے؟“
عدینہ نے اسے لا جواب کیا۔

”اچھا۔۔۔ اب تم مجھے تو بتاؤ میں کیا کہوں؟ وہ بار بار فون کر رہا ہے مجھے۔“ اس نے اپنا مسئلہ بتایا۔

”کہہ دینا مرگئی ہے عدینہ اس کی مغفرت کے لیے دعا کرے اور بھول جائے اسے۔“ وہ بے لچک لہجے میں گویا ہوئی۔

”یار! کچھ تو گنجائش نکالو۔ محبت کا دامن تو بہت وسیع ہوتا ہے۔“ اوریدانے آخری دفعہ اصرار کیا۔

”محبت کا دامن دنیا کے سب رشتوں سے زیادہ وسیع ہوتا ہے لیکن اس کے پندار کو نہیں پہنچے تو اس رشتے میں پھر ایک لفظ کی بھی گنجائش نہیں نکلتی۔“
اس کے چہرے پر عجیب سی سختی آگئی تھی اوریدانے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”تم بتاؤ ارصم سے بات ہوئی تمہاری۔۔۔؟“ عدینہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔ وہ مجھ سے خفا ہے کالج میں بھی صبح سامنا ہوا تھا لیکن وہ آگور کر کے دوسری سلاٹ پر چلا گیا۔“ وہ افسردگی سے بتانے لگی۔

”ہر انسان اپنے ذاتی معاملات میں اتنا ہی جذباتی اور امیچور ہو جاتا ہے۔“ اوریدانے سنجیدہ ہوئی۔

”لیکن اس کی ممی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے اس

طرح تو وہ اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔“ عدینہ پریشان ہوئی۔

”انہیں اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے انہوں نے زندگی کے کسی مقام پر شکست نہیں کھائی۔“ اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”خیر ایسا تو نہ کہو زندگی میں اتنے بے رحم فیصلے کرنے والا خود بھی کسی نہ کسی مقام پر بدترین شکست کا شکار ہو چکا ہوتا ہے تب ہی تو ایسا ہو جاتا ہے۔“ عدینہ نے کہا۔

”تمہیں بتا ہے ماضی میں ارصم کی ممی کی میرے پیپا کے ساتھ انکمیج منٹ ہوئی تھی لیکن پیپا نے میری ماما کو پسند کر لیا۔“ اوریدانے روستی مسکراتے ہوئے بولی۔
”دیکھا کوئی نہ کوئی بات تو نکل آئی نا۔“ عدینہ اپنے اندازے کی درستی پر مسکرائی۔

”بہر حال تم ارصم کو سمجھاؤ کہ ایسے فیصلے کرنے کے بجائے کسی طرح اپنی ممی کو سمجھانے کی کوشش کرے۔“ عدینہ کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن دل ہی دل میں اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ بینش کو سمجھانا دنیا کا ناممکن کام ہے۔

”ہاں ایک دفعہ اور بات کر کے دیکھوں گی۔“ اوریدانے اسے تسلی دی تو وہ مسکرا دی۔

”میری دلی خواہش ہے کہ میں تم دونوں کو ہستا مسکراتا ایک ساتھ دیکھوں۔“ عدینہ کی بے غرض محبت پر اوریدانے مسکرا دی تھی۔

”اور میری دلی آرزو تھی کہ میں تمہیں اپنی بھابھی بناؤں لیکن عبد اللہ بھائی اللہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے۔“ اس نے بھی شرارت کی۔ ”اگر تم عبد اللہ بھائی کے لیے انکار کرو تو میری آفر برقرار ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ فضول مت بولو۔ گھر چلتے ہیں مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے جان بوجھ کر بات کا رخ بدلا۔

وہ دونوں بڑے ابا کے ساتھ گھر پہنچی تھیں۔ بوا رحمت نے دوپہر کا کھانا لگا دیا تھا۔ بڑے ابا عدینہ اور اوریدانے ڈائنینگ میز پر موجود تھے عدینہ انہیں کالج میں

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✿ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✿ بے ہال آگاتا ہے۔
- ✿ بالوں کو مضبوط اور پگھلا دیتا ہے۔
- ✿ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✿ یکساں مفید۔
- ✿ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک

بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج

کر جیٹر پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے نئی آڈر اس

حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

ملی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

ہونے والے ایک سیمینار کے متعلق بتا رہی تھی، جسے وہ دلچسپی سے سن رہے تھے۔

ایک دم سے آنٹی بیٹش بڑے پرجوش انداز میں ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوئیں۔ اوریدا کے دل کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے آنٹی بیٹش کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

”آؤ، آؤ بیٹش، کھانا کھاؤ ہمارے ساتھ مل کر۔“ بڑے ابا نے خوش گوار انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

”نہیں تایا ابا، ابھی کچھ جلدی میں ہوں، شاپنگ پر جانا ہے۔“ خوشی ان کے چہرے کے ہر نقش سے عیاں تھی۔

”شاپنگ۔۔۔ خیریت۔۔۔ وہ تینوں ہی چونکے۔“ جی تایا ابا! کل شام ارصم اور ارسلہ کی منگنی کا فینکشن ہے، آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے۔۔۔ آئی تھی۔“

آنٹی بیٹش نے دھماکا ہی تو کیا تھا۔ اوریدا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پھسلا اور سفید ٹائلوں کے فرش پر جا گرا۔ گلاس اس کے دل کی طرح ٹوٹ چکا تھا لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ گلاس کے شیشے فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور اس کے دل کی کرسیاں کسی کو نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ ہراساں نگاہوں سے بس آنٹی بیٹش کی استہزائیہ نگاہوں کو دیکھ رہی تھی۔



بٹی کی ناگہانی موت نے بخٹاور کو نیمپاگل سا کر دیا تھا، وہ سارا سارا دن بیٹھی روتی رہتی، اس موقع پر ہاشم نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر اسے دلاسا دیتا لیکن بخٹاور کے دل کو کسی صورت بھی چین نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے اللہ نے مجھے کسی بات کی سزا دی ہے۔“ اس کی باتیں ہاشم کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں لیکن وہ دانستہ اس بات کا اظہار نہیں کر رہا تھا، کیونکہ اسے بخٹاور کی ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ تھا۔

سرفراز بھائی اور فائزہ بھابی کو بھی ننھی فاطمہ کی موت

ماہنامہ شعاع فروری 2016 187

Section

کی خبر سن کر دھچکا پہنچا تھا اور فائزہ بھا بھی، بختاور کی دل جوئی کے خیال سے آج کل ہر دوسرے دن اس کے پاس آرہی تھیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھی اسے تسلیاں دیتی رہتیں۔

”بختاور! تم قرآن پاک پڑھا کرو اللہ تمہارے دل کو صبر دے گا۔“ انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

”صبر ہی تو نہیں آ رہا بھا بھی۔“ وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

”ابھی تو میں نے اس کے ننھے وجود کی گرمی کو محسوس کرنا شروع کیا تھا۔“ وہ روتے ہوئے بمشکل بول رہی تھی۔

”پریشان مت ہو اللہ جلد تمہاری گود بھر دے گا۔“ انہوں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”مجھے لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی گناہ کی سزا دی ہے، ایک بچی کو دنیا میں آتے ہی واپس لے لیا اور دوسری گودس دن بعد۔“ بختاور کو کسی صورت سکون نہیں آ رہا تھا۔

”اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے، اپنا دل چھوٹا مت کرو بختاور۔“ فائزہ بھا بھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے سمجھایا۔

”میں کیا کروں بھا بھی! ہر وقت میرا دل بے چین رہتا ہے۔“ وہ نم لہجے میں گویا ہوئی۔

”تم زیادہ سے زیادہ استغفار کیا کرو اور اللہ سے دعا مانگا کرو۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہاشم نے ان کا یہ جملہ بغور سنا اور فوراً ہی بولا۔

”میں تمہیں انگلش لٹریچر کی بہت سی کتابیں لائبریری سے ایٹو کروا کر لادوں گا۔“ ہاشم کو پتا تھا کہ اسے مطالعے کا کریز ہے۔

”ہاشم بھائی! اسے انگلش لٹریچر کے بجائے اللہ سے رجوع کرنے دیں، اس کا ذہن پُر سکون ہو جائے گا۔“

فائزہ بھا بھی کی بات پر ہاشم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن اس کی تیوری کے بل کچھ گہرے ہو گئے تھے۔

وہ دونوں میاں بیوی کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے تھے ان کے جانے کے بعد ہاشم نے اسے سمجھانے کے لیے اچھا خاصا بڑا لیکچر دیا تھا۔ بختاور کا دل کچھ ٹھہر گیا تھا۔

اسی لیکچر کے نتیجے میں اگلے دن بختاور نے ننھی فاطمہ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھا کر ایک بڑے شاہر میں ڈالیں۔ وہ انہیں کسی ایسی جگہ چھپا دینا چاہتی تھی جہاں پر اس کی نظر نہ پڑے اور انہیں دیکھ کر اس کے دل کو اذیت کا احساس نہ ہو۔ ان چیزوں کے لیے اسے ہاشم کا بڑا ٹرنک ہی بہتر اور محفوظ لگا تھا۔

اس نے افسردگی سے بیڈ کے نیچے پڑے ہاشم کے بڑے ٹرنک کو نکالا وہ خاصا وزن تھا۔ اس نے جیسے ہی اسے کھولا وہ مختلف بوسیدہ کتابوں، کاغذات، فائلوں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اکثر چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ شاہر کو اندر رکھنے کے لیے جگہ بنانے لگی، اچانک اس کی نظر اسی باکس میں ایک طرف رکھی کتاب پر پڑی۔ بختاور کو بری طرح جھٹکا لگا۔

اس نے سرعت سے اس کتاب کو اٹھایا اور اس کی گرد پر ہاتھ پھیرا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر تمام مسلمان ممالک نے بین لگادیا تھا اور وہ پاکستان میں اس کی موجودگی خصوصاً ہاشم کے پاس اس کے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

یہ شیطان رشدی کی مشہور زمانہ شیطانی کتاب The Satanic Verses تھی۔ اس کتاب کے سرورق پر ”شیطانی آیات“ کے لکھے گئے الفاظ پڑھ کر بختاور کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ وہ صدمے کے عالم میں اس کتاب کو دیکھ رہی تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ہاشم فلیٹ کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

نداحسین

لکھی چکل

غرضی نے بھی سیرا کر ڈالا تھا۔ گول کے خوابوں میں جو شہزادہ اکثر سیاہ کرولا میں آتا تھا وہ کوئی اور نہیں عذیر ہی تھا۔ اس نے اکثر عذیر کی خوابناک آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات دیکھے تھے۔ اور ان ہی جذبات نے اسے یقین دلایا تھا کہ عذیر یہ صرف اس کا حق ہے۔ جلد یا بدیر عذیر نے خالہ جان کو اس کے گھر رشتے کے لیے ضرور بھیجنا تھا۔ یہ بات وہ ابھی طرح جانتی تھی۔

عذیر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوا جب خدیجہ نے گول کے لیے اس کی رائے جانی۔ وہ تو اس کے دل کی ملکہ تھی۔ اتنی حسین، پیاری لڑکی کو کوئی عقل کا اندھا ہی نظر انداز کر سکتا تھا اور وہ عقل کا اندھا تو بہر حال نہیں تھا۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش تھا کہ ماں نے اسی لڑکی کا انتخاب کیا۔ جسے وہ دل دے چکا تھا۔ پہلی ہی فرصت میں ماں کو اقرار میں اپنا جواب دے کر خالہ کے گھر رشتہ بھیجنے کا عندیہ دیا۔ خدیجہ بیٹے کی ہاں سے پھولی نہ سمائی تھیں۔ جھٹ سے مٹھالی اور پھلوں کے نوکرے منگوائے اور اگلے ہی دن زلیخا کے گھر روانہ ہو گئیں۔

زلیخا بہن کے۔ آنے کا مقصد جان کر دل ہی دل میں کوئی لاکھ بار تو اللہ کا شکر ادا کر چکی تھیں۔ ان کے تو من کی مراد تھی کہ بہن کے گھر کا اجالا ان کی بیٹی بنے۔ ان کے دل کی مراد پوری ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں کہ بیٹی ماں جیسی خالہ کے گھر بیاہ کر جائے گی اور سدا خوش رہے گی۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے دل کے حال سے بے خبر تھے۔ مگر خبر رکھنے والی ذات تو

جس طرح ایک فوجی کو اپنی وردی پر ڈاکٹر کو اپنے کلینک میں بیٹھے مریضوں کے قطار پر لکھاری کو اپنے قلم پر کسان کو اپنے کھیت پر تازہ ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بیٹے کی ماں کو اپنے خوبرو، اعلا تعلیم یافتہ، فرماں بردار، اعلا عہدے پر فائز بیٹے پر بھی تازہ ہوتا ہے۔ اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ اگر بیٹا اکلوتا ہو تو پھر تو مانو سونے پہ سہاگہ والا عالم ہوتا ہے۔

خدیجہ خاتون کے لیے بھی عذیر ان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ تھا۔ جوانی میں ہی شوہر کے انتقال کے بعد جس محنت مشقت سے انہوں نے پڑھا لکھا کر اسے جوان کیا تھا یہ تو صرف ان کا دل اور اللہ ہی جانتا تھا۔ ایسے مشکل وقت میں جب دنیا نے ساتھ چھوڑ دیا تھا سب صرف ان کی بہن زلیخا اور اظہار احمد (بہنوئی) نے بہت ساتھ نبھایا۔ اس ساتھ کی بنا پر خدیجہ کے دل میں اپنی بہن اور بہنوئی کی قدر مزید بڑھ گئی تھی۔ اور آج جب عذیر ایک پھل دار درخت کی صورت پھل دینے کے قابل ہو گیا تو ان کے دل میں بھی بیٹے کے سر پر سرے کے پھول سجانے کی خواہش جاگی اور نظر انتخاب اپنی عزیز از جان بہن زلیخا کی بیٹی گول پر جا بھری۔

گول اپنی نام کی طرح گول حسن کی مالک تھی۔ ایسا حسن جو شہزادیوں جیسا تھا، کچھ زلیخا نے اکلوتی بیٹی کو بے انتہا لاڈ پیار میں پالا کہ گھر میں گرا ایک تنکا تک اسے اٹھانے نہ دیا۔ اور اس بے جالاڈ پیار نے گول کے مزاج پہ بھی خوب اثر ڈالا تھا۔ کہتے ہیں جب اللہ حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔ پر یہاں صرف نزاکت ہی نہیں غرور، تکبر، تاز و ادا، خود پسندی اور خود

جانتی تھی کہ اس نے ان سب کی مراد پوری کر دی تھی۔ یوں کچھ ہی دنوں میں چٹ منگنی بیٹ بیاہ کے مصداق 'کول ماں کی دعا' میں لے کر باب کی شفقت کے سائے تلے خالہ کے گھر چھم چھم کرتی عذیر کی ہمراہی میں انری۔

اکلوتی بسو وہ بھی بہن کی بیٹی خدیجہ نے خوب خرے اٹھائے چاؤ چونچلے کیے۔ دو مہینوں تک وہ بیٹے اور بسو کی خدمتیں کرتی رہیں۔ یہ ماں کا پیار تھا اپنی اولاد

کے لیے ماں تھا بیٹے پر کہ وقت آنے پر بیٹا بھی ان کی خوشیوں کا یوں ہی خیال رکھے گا ان کی خدمت کرے گا۔ یقین تھا بھانجی پر کہ وہ بھی انہیں ماں جیسا عزت و احترام بخشے گی۔ پر ہوتا یوں ہے کہ انسان جب بندوں سے توقعات رکھتا ہے تو بس دھوکا کھاتا ہے۔ وہ اگر یہی توقعات اللہ سے رکھے تو کبھی مایوس نہ ہو۔

شادی کو ڈھائی ماہ ہی گزرے تھے کہ اظہار احمد آفس سے آتے ہوئے ایک اندوہناک حادثے کا شکار



READING
Section

ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ زلیخا جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بھری دنیا میں وہ اکیلی رہ گئیں۔ کومل ماں کے دکھ کو تم کرنے کی خاطر چالیسویں تک میکے آکر رہنے لگی۔ خدیجہ بہن کا دکھ اپنی طرح سمجھتی تھیں۔ خود بھی ایک عرصے تک یونہی تنہا زندگی گزاری تھی۔ تنہائی کی اذیتوں کو خوب واقف تھیں لہذا چالیسویں کے بعد بہن کو ہمیشہ کے لیے گھر لے آئیں اور ان کا گھر کرائے پر اٹھا دیا۔

پانچ ماہ گزر جانے کے باوجود بھی کومل کو خدیجہ نے اب تک گھر کے کام میں حصہ لینے کے لیے نہیں کہا تھا۔ زلیخا بھی بیٹی کو بڑی بہن کے گھریلو عیش و عشرت میں خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔ اپنی بیٹی کے آرام کے لیے وہ خدیجہ کے ساتھ سارا دن لگی رہتیں کہ بہن کو کبھی شکایت نہ ہو۔ پر کب تک۔ دونوں ہی ضعیف خواتین تھیں۔ دن رات گھر داری، چولہا ہانڈی کرتے کرتے شدید تھکن کا شکار ہو جاتیں۔ اور ایسے ہی ایک دن تھکن سے چور ہو کر خدیجہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ بہن کے بیمار پڑنے پر زلیخا گھر کی ساری ذمہ داریاں اٹھانے پر مجبور ہو گئیں اور دن رات ماں کو اکیلا کام کرتے دیکھ کر مجبوراً ”کومل کو ان کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ پر یہ ہاتھ بٹانا کومل کو کافی گراں گزر رہا تھا۔ اوپر سے عذیر کا بھی سب کچھ بھول بھال ماں کی خدمت میں لگنا اسے ناگوار گزر رہا تھا۔

خدیجہ کو میری نے آگھیرا تھا۔ اور ان کے یوں بستر سے لگنے پر زلیخا کی مدد کروا کر کومل بے زار ہو گئی تھی۔ اور اسی بے زاری و چڑچڑاہٹ کی وجہ سے اس دن اس نے خدیجہ سے بد تمیزی کر ڈالی۔ بات بہت معمولی سی تھی مگر کومل نے بڑھا جڑھا کر پیش کیا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ کچن کی صفائی کر کے انتہائی بگڑے مزاج کے ساتھ کومل کچن سے باہر آئی تھی کہ اسے خدیجہ نے آواز دے کر یخنی بنانے کا کہہ ڈالا جس پر وہ چراغ بیا ہو کر غصے سے پھنکاری۔

”خالہ جان! سارا دن آپ نے بستر پر پڑے پڑے

حکم ہی دینا ہوتا ہے۔ ذرا دوسروں کا بھی خیال کر لیا کریں۔ اب ایسی بھی کوئی بیمار نہیں پڑیں آپ کہ بندہ گھڑی گھڑی کچھ کھلاتا پلاتا رہے۔ سارا دن پاگلوں کی طرح کچن میں لگی ہوئی ہوں پر ذرا جو خیال ہو آپ کو میرا بس اپنی ہی فکر لگی رہتی ہے یہ چاہیے وہ چاہیے۔“ انتہائی غصے سے کہتی ہوئی وہ پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھی تھی کہ سامنے عذیر کو دیکھ کر گڑبڑا گئی۔ اسے پتا بھی نہ چلا تھا کہ عذیر کب اس کے عقب میں آکھڑا ہوا۔

”نہ جانے عذیر نے میری کتنی بات سنی۔“ اپنی دھن میں خالہ کو بے بھاؤ کی سنا کر وہ اب پچھتا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی عذیر ماں سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس کی اس بد تمیزی پر کہیں بد ظن ہی نہ ہو جائے۔ کومل کا یہ جارحانہ رویہ خدیجہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سامنے بیٹے کو کھڑا دیکھ کر تکلیف سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور ماں کی آنکھوں سے نکلتے آنسو عذیر کو ترپا گئے۔

”کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم میری امی سے کومل! تمہیں ذرا احساس ہے کہ جس عورت کو تم باتیں سنارہی ہو۔ وہ تمہیں اب تک بستر پر بٹھا کر کھانا کھلاتی رہی ہے تمہارے نخرے اٹھاتی رہی ہے۔“ وہ انتہائی غصے سے بول رہا تھا۔ اسے حقیقی معنوں میں کومل کے رویے سے دکھ پہنچا تھا۔

”عذیر! میں بس اتنا کہہ رہی تھی کہ میں شام کو بنا دوں گی۔ ابھی اس گرمی میں میری حالت خراب ہو رہی تھی۔“ عذیر کو غصے میں دیکھ کر اس نے فوراً ”پینترا بدلا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے وہ اب بڑی معصومیت سے بول رہی تھی۔

”تم نے جو کہا میں نے سب سن لیا ہے کومل! رہنے دو تم عین خود اپنی ماں کے لیے یخنی بنالوں گا۔“ عذیر کے درشتی سے کہنے پر وہ پہلے حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور پھر پیر پختی غصے سے کمرے سے نکل گئی۔

عذیر ماں کے پاس۔ بیٹھ کر ان کی دل جوئی کرنے لگا۔ زلیخا غسل کر کے آئیں تو خدیجہ کا اترا ہوا چہرہ دیکھ

کر حیرانی سے اس کا سبب دریافت کرنے لگیں۔ جس پر عذیر نے من و عن سب کچھ سچ بتا دیا۔



”یہ عذیر کو بھی آج جلدی گھر آنا تھا۔ آج پہلی بار خالہ کے سامنے منہ کھولا تھا اور عذیر نے سب سن لیا۔ اب منانا پڑے گا دونوں ماں بیٹے کو۔ ہونہ! غصے سے کمرے میں ٹھہرتی وہ مسلسل برید لائے جا رہی تھی۔ تب ہی زلیخا اسے گھورتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔“

”یہ کیا بد تمیزی کر کے آئی ہو تم آیا سے“ اتنی منہ پھٹ اور بد لحاظ کیسے ہو گئی ہو تم۔ چلو چل کر معافی مانگو ان سے۔“ وہ اسے گھر کتے ہوئے بول رہی تھیں۔ عذیر نے جو بتایا اسے سن کر ان پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

”امی! میں کیوں معافی مانگوں۔ میری کیا غلطی ہے جو میں معافی مانگوں۔“ وہ بری طرح حد کی۔ ”تمہاری نہیں تھی تو کس کی تھی؟ اک ذرا سی بات پر آیا کو کتنا سنا کر آئی ہو تم۔“ زلیخا کو اس کی بات پر سخت ناؤ چڑھا۔ کومل کو جھڑکتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”امی آپ کو نہیں معلوم خالہ نے مجھے کتنا سنایا ہے۔ عذیر نے تو ادھی بات سن کر مجھے اتنا ڈانٹا مجھے بتانے بھی نہ دیا کہ خالہ نے مجھے کیا کیا کہا تھا۔“ اسے کوئی اور بہانہ نہ ملا تو جھوٹ بولنے لگی۔

”کیا کہا تھا آنے۔“ اس کی بات پر زلیخا ٹھٹھکیں۔ ”کہہ رہی تھیں دن بھر تم کرتی کیا ہو۔ زلیخانے بالکل تمہاری تربیت نہ کی۔ وہ تو میں ہوں جس نے تمہیں شنرا دیوں جیسا رکھا ہوا تھا کوئی اور ساس ہوتی تو کب کی گھر سے نکال باہر کر دیتی۔“

بس پہلا جھوٹ بولنا مشکل لگتا ہے اور وہ جھوٹ جب خاطر خواہ نتیجہ دیتا ہے تو جھوٹ بولنے کے اگلے تمام مراحل بخوبی طے پا جاتے ہیں اور یوں انسان جھوٹا ہونے کا تاج خوشی خوشی سر پر سجالیتا ہے۔ کومل بھی اب دھڑلے سے منہ بھر بھر کر جھوٹ بول رہی تھی۔

اور زلیخا کا دل بیٹی کی باتیں سن کر پیسہ جا جا رہا تھا۔ ”عذیر اور خدیجہ نے تو یہ سب نہیں بتایا۔“ ساری بات سن کر زلیخا آزر و گی سے بولیں۔

”عذیر تو اس وقت آئے ہی نہیں تھے جب خالہ مجھے باتیں سنا رہی تھیں۔ اور خالہ کیوں اپنی غلطی بتائیں گی۔ وہ تو بس میری ہی شکایت لگا میں گی ناں۔“ وہ ماں پر اپنے آنسوؤں کا اثر ہوتا دیکھ کر سوس سوس کرتی بول رہی تھی۔

”آیا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ خود کلامی کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

خدیجہ کے کمرے میں پہنچیں تو وہ وہاں اکیلی بیٹھی تھیں۔ عذیر شاید کچن میں تھا۔

”کیا ہوا کومل نہیں آئی۔“ خدیجہ کومل کا انتظار کر رہی تھیں کہ اسے پیار سے سمجھا سکیں۔ اور دونوں میاں بیوی کا دل صاف کر سکیں۔ مگر زلیخا کو اکیلا آنا دیکھ کر ٹھٹھک کر پوچھنے لگیں۔

”نہیں آیا۔“ زلیخا اتنا کہہ کر ایک لمحہ کو خاموش ہوئیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے شکوہ کناں ہوئیں۔

”آپ! آپ کو بھی کومل کو میری تربیت نہ کرنے کا طعنہ نہیں مارنا چاہیے تھا۔ میں مانتی ہوں کومل سکھڑ نہیں پر میں شکایت کا کوئی موقع نہ دیتی۔ آپ مجھے کہہ دیتیں میں بنا دیتی سوپ کومل سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں آپ کو۔“ اتنا کہہ کر زلیخا وہاں سے فوراً چلی گئیں۔ اور خدیجہ مارے حیرت کے انہیں جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ پردوں بہنوں کے دلوں میں گرہ ی پڑ گئی۔

اولاد کی محبت بڑی ظالم شے ہے ہر رشتے ناتے سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ یوں کہ اولاد کی محبت ہی سب سے عزیز ہو جاتی ہے۔ خدیجہ اور زلیخا کی لازوال محبت اب اولاد کی محبت کے نذر ہونے لگی تھی۔ زلیخا اب خدیجہ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھیں جبکہ زلیخا کی اس بدگمانی نے خدیجہ کا دل بھی دکھا دیا تھا جبکہ عذیر اور کومل سب بھول بھال کر پہلے کی طرح رہ رہے تھے۔

چند ماہ اور گزرے تو عذیر کو دینی کی ایک کمپنی سے جاب کی آفر آئی۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ رکھ سکتا تھا۔ مگر پہلے اسے جاب کے سلسلے میں اکیلے ہی دینی جانا تھا۔ پر یہاں بھی اختلاف نے سر اٹھایا۔ خدیجہ بیٹے کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ بیٹا نظروں کے سامنے رہ کر ہی کمائے انہوں نے شوہر کے انتقال کے بعد ساری امیدیں بیٹے سے ہی لگائی تھیں۔ اب اگر بیٹا باہر چلا جاتا تو وہ کس کے سہارے جیتیں۔ جبکہ کومل چاہتی تھی کہ عذیر دینی کی ملازمت کے لیے حامی بھرے۔ عذیر وہاں جائے گا تو اسے بھی ضرور بلوائے گا۔ اور پھر وہ وہاں آسائشوں بھری زندگی گزارے گی۔ دینی کے منگے مالز میں شاپنگ کرے گی۔ اس کی سہیلیاں تو اس کے دینی جانے کا سن کر ہی جل اٹھیں گی۔ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ مسلسل عذیر کو دینی جانے کے لیے راضی کرتی رہی۔ خود عذیر کی بھی یہی منشاء تھی۔ شاید تب ہی وہ خدیجہ کو روز منانا اور یقین دلانا کہ وہ انہیں وہاں جا کر ضرور بلا لے گا۔

زلیخا خاموش تھیں۔ مگر ان کا جھکاؤ بھی عذیر کے دینی جانے میں تھا۔

ان سب کی خواہشوں کو مد نظر رکھ کر خدیجہ نے عذیر کو دینی جانے کی اجازت دے دی۔ عذیر نے سارے انتظامات مکمل رکھے تھے۔ ماں پر بھی یقین تھا کہ جانے کی اجازت دے دیں گی۔ سو اجازت ملتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر وہ دینی روانہ ہو گیا۔ عذیر کے دینی جاتے ہی کومل کے رنگ ڈھنگ بدل گئے عذیر کے رعب میں وہ خالہ کی جو تھوڑی بہت عزت کر لیتی تھی ان کی بات مان لیتی تھی۔ اب مکمل طور پر اپنی من مانی پر اتر آئی۔ جس بات نے خدیجہ کو سب سے زیادہ حیرت میں مبتلا کیا وہ زلیخا کی کومل کے لیے خاموش حمایت تھی۔ یعنی بہن سمجھن کا اور بھانجی روایتی بہو کا روپ دھار چکی تھی۔ بیٹے کے جاتے ہی وہ خود کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگی تھیں۔ مگر پر ان کی اجارہ داری ختم

ہو رہی تھی۔ کومل رفتہ رفتہ گھر کی کرتا دھرتا بن گئی تھی۔

خدیجہ فطرتاً "نرم دل اور نیک طبیعت کی مالک تھیں۔ دور اندیش ضرور تھیں مگر تیز و طرار، جھگڑالو عورتوں کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ جبکہ کومل ساس کی خاموشی پر مزید شیر ہو گئی تھی۔ زلیخا بری بہن نہ تھیں مگر بیٹی کی محبت نے ان کے اندر کی مخلص بہن کو کہیں دبا کر رکھ دیا تھا۔ ناز و نعم میں بیٹی بیٹی عیش و عشرت اور بحیثیت گھر کی ملکہ کے طور پر زندگی گزارتی کس ماں کو بری لگتی ہے؟

یہ بڑا ہی عجب دستور ہے دنیا کا۔ اچھائی سے محبت اور برائی سے نفرت تو ہر کوئی کرتا ہے پر جو اچھے لوگ کہلاتے ان میں ایسا نہ ہوتا اور جہاں برے لوگ ہوتے وہ اتحاد بنا کر رہتے۔ ماں جیسا قابل احترام رشتہ جس کا نام سن کر ہی نظریں عقیدت سے جھک جائیں۔ دل میں محبت بھر جائے۔ وہی ماں ایک دوسری ماں کے درو کو جانتے ہوئے بھی زیادتی کر رہی تھی۔ حد سے زیادہ بڑھی اندھی محبت انسان کو اکثر غلط فیصلوں اور غلط رویوں کو اپنانے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ بیٹی کی خاموش حمایت نے دو بہنوں کے رشتے کو رفتہ رفتہ کمزور کر ڈالا تھا۔

عذیر کو گئے تین ماہ سے زائد کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مکمل انتظام کرنے کے بعد وہ اب ان سب کو اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ مگر یہاں بھی کومل کی خود غرضی آڑے آگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ساس نام کا منٹنا دینی میں بھی اس کے ساتھ لگا رہے۔ وہ زلیخا کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی کیونکہ ماں کو ساتھ لے جانا اس کے لیے فائدہ مند تھا۔ وہ گھر بھی سنبھال سکتی تھیں۔ اور بناء روک ٹوک کے وہ اس کی کافی مدد بھی کر سکتی تھیں۔ کومل جیسی خود غرض لڑکی کو ماں کی ضرورت بھی فقط کام کے حوالے سے تھی۔ سو اس نے خدیجہ کو دینی جانے سے روکنے کے بہانے سوچنا شروع کر دیے۔ زلیخا بیٹی کا ارادہ جان کر خوش تھیں۔ دینی جانے کے شوق نے انہیں بہن کی فکر سے بھی بے پروا کر دیا تھا۔

دونوں ماں بیٹی نے خدیجہ کو دینی جانے سے روکنے کے لیے تراکیب لڑانا شروع کر دیں۔ خدیجہ ان کے خیالات اور نیتوں سے لاعلم نہیں تھیں مگر اپنی فطرت سے مجبور خاموش تھیں۔ وہ جان چکی تھیں کہ اب پہلے جیسا نباہ ممکن نہیں۔ بہو اور بہن کا پلڑا ان سے بھاری ہے اور وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ پر کیا وہ اتنی آسانی سے اپنا حق انہیں لوٹنے دیں گی۔

کومل سے انہیں اتنی شکایت نہ تھی جتنی بہن سے تھی۔ زلیخا کو انہوں نے کبھی خود سے الگ نہ سمجھا۔ بیٹے سے محبت انہیں بھی تھی۔ بے انتہا تھی۔ پر انہوں نے اس محبت سے مجبور ہو کر کوئی غلط یا نا انصافی پر مبنی رویہ نہیں اپنایا تھا نہ ہی بہن یا بھانجی کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی کی تھی۔ پر زلیخا نے ان کے رشتے اور محبتوں کو بھلا کر بیٹی کی ہرجائز و ناجائز بات پر ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو ان کے گھر کے حالات آج یہ نہ ہوتے۔

انہوں نے دینی جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہی رہنا چاہتی تھیں۔ ان کے دینی جانے سے انکار سن کر زلیخا اور کومل بے حد خوش تھیں۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان کے کسی چال چلنے سے قبل ہی خدیجہ نے خود ہی دینی جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پر عذیر کے اگلے فیصلے سے کومل اور زلیخا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ عذیر نے ماں کے انکار کے بعد صرف کومل کو دینی بلایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماں اکیلے نہیں رہ سکتی اس لیے خالہ کو ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کومل نے زیادہ چوں چوں کہ ان کی اسے خوف تھا کہ ضد کرنے پر کہیں اس کا جانا بھی کینسل نہ ہو جائے۔ زلیخا کو کومل کے اس فیصلے نے دکھ پہنچایا تھا۔ جس بیٹی کے لیے انہوں نے بہن سے رشتہ خراب کر ڈالا تھا وہ بڑے اطمینان سے انہیں یہاں چھوڑ کر دینی روانہ ہو گئی تھی۔

انہیں دینی گئے ایک سال ہو چکا تھا۔ آج صبح

READING
Section

اطلاع آئی تھی کہ ان دونوں کو اللہ نے اولاد نرینہ سے نوازا ہے۔

”مبارک ہو زلیخا۔ تمہاری بیٹی بھی بیٹے کی ماں بن گئی۔“ خدیجہ نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔
”تمہیں بھی مبارک ہو آیا۔ تم بھی پوتے کی دادی بن گئی ہو۔“ زلیخا نے مسکرا کر آٹا گوندھتے ہوئے جواب دیا۔

ان دونوں کی اولادیں انہیں چھوڑ کر دور جا بسی تھیں۔ سواب ان کے بیچ جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔ بہنوں والا رشتہ دوبارہ استوار ہو چکا تھا۔ نہ شکایت کی ایک دوسرے سے نہ طعنہ بازی اختیار کی گئی۔ جو درمیان میں فاصلوں کا سلسلہ آگیا تھا وہ خود بخود ختم ہونے لگا۔ اختلاف کی وجہ دور ہوئی تو اختلاف بھی ختم ہو گیا۔

بہنوں کی ازلی محبت پھر سے جاگ اٹھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتیں خیال رکھتیں اپنے اپنے دکھ درد بانٹتیں بچوں کو مل کر یاد کرتیں۔ گھر کے کام کاج کا کیا تھا۔ نہ پہلے جیسی جسم میں طاقت تھی۔ نہ پہلے جیسا کام کا جنون۔ مل کر ہانڈی بنا لیتیں اور صبر شکر کر کے کھاتیں۔ باہر کے کام کاج کے لیے دن بھر کے لیے ایک ملازم بچہ رکھ لیا تھا۔ جو ان کے باہر کے کام کر دیا کرتا تھا۔ آمدنی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ خدیجہ کو شوہر کی پنشن بھی ملتی اور بیٹے کی طرف سے بھی اچھی خاصی رقم آتی۔ زلیخا کو شوہر کی پنشن اور گھر کا کرایہ ہر ماہ وقت پر مل جاتا۔ سو گزر بسر اطمینان سے ہو رہی تھی۔

رات کا وقت تھا گوکہ دن گرمی کے تھے پر راتیں پھر بھی ٹھنڈی تھیں اس بل بھی کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا بڑی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بہنیں گھر کے دروازے بند کر کے ایک نظر ڈال کر اب سونے کی نیت سے بستر لیٹی تھیں۔

”جانے کیسا دکھتا ہو گا میرا نواسا۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں جو ارمان پورے کرتی اب نواسا ہوا ہے تو میلوں دور

ہے۔ ”نواسے کے خیالوں میں گم زلیخا بولیں۔ خدیجہ ان کی بات سن کر مبہم سا مسکرا دیں۔

”بیٹے والی ماں ہونا بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے آیا۔ اللہ نے مجھے تو نہ بخشا یہ اعزاز پر صد شکر اللہ تعالیٰ کا کہ میری بیٹی کو یہ نعمت عطا کی۔“ زلیخا اب خدیجہ کی جانب کروٹ لے کر ان سے مخاطب تھیں۔

”نہ جانے کیوں بیٹے کو اعزاز سمجھا جاتا ہے زلیخا۔ شاید اس لیے کہ وہ برہا پے کا سہارا بنے گا۔ بیٹی کی رخصتی تو فرض ہے ماں باپ پر بیٹی کے گود میں آتے ہی اس کی رخصتی کی فکر سناپی ہے پر بیٹے کے گود میں آتے ہی کوئی بھی ماں اس کے رخصت ہونے کا نہیں سوچتی پر بیٹا پھر بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ اور زلیخا یہ جو اولاد ہوتی ہے ناں یہ بڑی آزمائش ہوتی ہے اور اس آزمائش میں کامیابی کا دار و مدار ان بیجوں پہ ہوتا ہے جو ہم اب تک بوتے چلے آ رہے ہیں۔ کوئل کی گود میں بھی آزمائش اتری ہے۔ اللہ اسے حوصلہ دے اس آزمائش میں پورا اترنے کا۔“ بڑی گہری بات کہی تھی خدیجہ نے۔

زلیخا کو چپ سی لگ گئی۔ بہن نے بھانجی کے لیے دعائیں حوصلہ مانگا تھا۔

دل کو عجیب سے احساس نے آگھیرا۔ کچھ مل کمرے میں خاموشی چھائی رہی اتنی کہ بس چلتے ہوئے پنکھے کی گھر گھر کرتی آواز گونجتی رہی۔ بالآخر زلیخا کی آواز نے چھائی خاموشی کے سکوت کو توڑا۔

”آیا میں نہیں چاہتی تھی کہ تم بیٹے کے ساتھ دی جاؤ۔ مجھے لگتا تھا کہ وہاں جا کر بھی ہم لوگ ایک ساتھ خوش نہیں رہ پائیں گے بلکہ مزید جھگڑے بڑھیں گے۔“

زلیخا کے کہنے پر خدیجہ نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر بولیں۔ ”جانتی ہوں۔ اسی لیے میں نے خود انکار کر دیا تھا وہاں جانے سے۔ اور۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

زلیخا کو ان کی اس آگہی پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ خدیجہ نے ایک نظر زلیخا کو دیکھا اور سلسلہ کلام پھر سے

وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع کیا تھا۔

”اور عذیر کو بھی میں نے ہی منع کیا تھا تمہیں دینی بلانے سے۔“ اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے زلیخا کی طرف کروٹ کر لی۔

”جانتی ہوں آیا۔“ زلیخا کے لب پھیل کر مسکرائے۔

خدیجہ نے بے فکری سے ایک نظر بہن کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ کھڑکی سے ایک ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔

”ہائے بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے آج۔ نیند بڑی اچھی آئے گی۔“ زلیخا جمائی لیتے ہوئے بولیں۔

”ہو نہ! اب سو جاؤ تم بھی مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ خدیجہ نیند سے بو جھل لہجے میں بولیں۔ اور پل بھر میں دونوں بہنیں نیند کی وادی میں چا سوئیں۔

برہنچلا اکیلے نہیں گزرتا۔ کوئی سا بھی ضرور چاہیے ہوتا ہے۔ ہم سفر تو کب سے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب اولاد بھی پرندوں کی مانند اڑان بھرنے کو تھی، لیے میں کون سا تھ رہتا۔ تب ہی دور اندیش خدیجہ نے پرندوں کو اڑنے دیا۔ اور بہن کو روک لیا۔ جانتی تھیں وہاں جا کر بہن اکیلی رہتی اور یہ یہاں اکیلی۔ سولا کھ درجے بہتر تھا کہ ایک دوسرے کی غم گسار بن کر پھر سے بہنیں بن کر ساتھ رہیں۔ یہ خدیجہ کی پہلی اور آخری چال تھی جو انہوں نے چلی تھی۔ اور زلیخا اس دن سے ہی یہ راز جانتی تھیں جس دن انہوں نے یہ ساری باتیں خدیجہ کو عذیر سے فون پر کہتے سنی تھیں۔ اور اب وہ بہن کے اس فیصلے پر بڑی مطمئن تھیں۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ----- فریڈا
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ----- موسیٰ رضا

مصباح اعوان



Downloaded From
Paksociety.com

سردی اور اندھیرے کی پروا کیے بغیر جینز اور آدھی آستینوں والی سفید ٹی شرٹ میں ہی باہر کی طرف بھاگا۔

کل شام جب وہ گھر پہنچا تھا تو بے حد صدمے میں تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس قسم کی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ صدمے کے بعد وہ شدید قسم کا غصہ تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ وہ کسی بھی طرح اس قسم کے سلوک کا مستحق نہیں تھا۔ پھر خود کو اس غصے اور تکلیف سے نکالنے کے لیے کوشش کرنے لگا کہ اس واقعہ کو بھول جائے۔ جو ہوا سو ہوا۔ اسے بھول جانا ہے اور کبھی دوبارہ وہاں نہیں جانا، بلکہ وہ یہ کالج ہی چھوڑ دے گا۔ وہ کہیں اور جاب تلاش کر لے گا، لیکن اس سب کے باوجود ایک بات اسے بے حد مضطرب کر رہی تھی کہ ”وہ وہاں ہوگی یا نہیں۔“ ساری رات اس سوچ کو جھٹکنے کے بعد صبح جب اس کی نگاہ جو گھر پر پڑی تو اس نے سوچا اسے وہاں جا کر دیکھ لینا چاہیے۔

وہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا۔ بار بار ایک ہی خیال دل و دماغ پر چھایا رہا۔ دور کہیں ہوتی فجر کی اذان سماعت سے ٹکرائی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خاموشی میں اس آواز نے اسے جھنجھوڑا تھا۔ وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھا اور اندھیرے میں بن پر ہاتھ مارا تو واش روم میں بلب کی روشنی پھیل گئی۔ چند قدم پر پہنچ کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ وجہ سے چہرے پر کھپڑ اور گردن پر انگلیوں اور خراشوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ اس کے اندر ایک بار پھر غصے کی شدید لہر ابھری۔ دانت اور مٹھیاں بھینچ کر چند لمحے دیکھتا رہا اور پھر ذہن میں وہی سوچ جس نے اسے پوری رات بے چین رکھا تھا ابھری۔

”وہ وہاں ہوگی یا نہیں؟“ واپس مڑا اور کمرے میں آکر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر کچھ سوچا۔ پھر اپنے سامنے اٹنے پڑے جو کر کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کچھ واضح ہوا تھا۔ فیصلہ کر کے تیزی سے اٹھا۔ دو سرا جو کر اور جرابیں ڈھونڈ کر پہنے۔

مُکمل ناول

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

بھاگتے ہوئے اس کا سانس پھولنے لگا تھا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ روزانہ اس سے کہیں زیادہ بھاگتا تھا۔ روزانہ دوڑنا اور سخت جسمانی ورزش اس کا معمول تھا لیکن آج کل کے واقعہ اور سنسنی کی وجہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے پر رک کر سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر خود پر قابو پایا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ کرسی کے ساتھ اوندھی پڑی تھی۔ بالکل اسی جگہ جہاں وہ کل گری تھی۔ تقی نے پوری رات سوچا تھا۔ ”وہ وہاں ہوگی یا نہیں۔“ یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ وہاں ہوئی تو وہ کیا کرے گا۔



ارسہ کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جسم میں طاقت بالکل ختم ہو گئی ہے اور اندر سے کوئی کاٹ رہا ہے۔ عجیب اندھیرا سا تھا۔ پوری طاقت لگا کر آنکھیں کھولنے پر بھی وائرے سے ملتے۔ آہستہ آہستہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی سہارا دے کر کچھ پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ارسہ کڑواہٹ محسوس کرتے ہوئے پی رہی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ یہ مشروب اندر گھوم کر واپس آ رہا ہے۔ متلی کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے اس نے منہ پھیر کر خود کو مزید پینے سے بچایا۔ پلانے والے نے سمجھ کر اسے واپس لٹا دیا۔ بہت دیر بعد جب اس کیفیت سے نکلی اور واپس غنودگی میں جا رہی تھی کہ کوئی پھر سے اٹھانے لگا۔ اس بار وہ اسے دوا کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بمشکل دوائی نگل کر وہ پھر سو گئی۔



صبح تک ارسہ کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ تقی نے اسے جگا کر اس کے بیڈ کے ساتھ رکھی میز کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا اور خود چلا گیا۔ ارسہ کوشش کر کے اٹھ بیٹھی۔ وہ دودن بعد ہوش میں آئی تھی۔ اسے بے حد نقاہت محسوس ہو رہی

تھی۔ اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی، اب اس کا ذہن سوئی سوئی کیفیت سے نکل رہا تھا۔ کمرہ بے حد ساوہ تھا۔ ایک بڑی سی یز کمرے کے کونے میں کھڑکی کے سامنے رچی تھی۔ جس پر لیپ ٹاپ، ٹیبل لیمپ، کچھ کتابیں، نوٹس اور چار جریدے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ دو پلنگ جن میں سے ایک پر وہ خود ابھی بیٹھی تھی اور ان کے درمیان چھوٹی سی کمزور سی میز تھی۔ جس پر اس کا ناشتا اور دوائی رکھی تھی۔ سامنے دو دروازے تھے، ایک دروازہ کھلا تھا جو کچن کا تھا اور دوسرا یقیناً ”واش روم“ کا تھا۔ گردن گھما کر دیکھنے پر نظر آتا، تیسرا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ یہاں بیٹھے وہ اتنا ہی دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے ہمت کر کے اٹھی اور دیوار پکڑتی بند دروازے تک پہنچی۔ اسے دھکیلا، اس کے اندازے کے مطابق وہ واش روم ہی تھا۔ اندر ایک بڑا پرانا شیشہ نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھنے پر اسے اپنے ماتھے پر پیٹی بندھی نظر آئی پھٹے ہونٹ پر گھرنڈ آگیا تھا۔ اس پاس کی جگہ نیلی پیلی سی ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے ہونٹ کے زخم کو چھوا۔ پھر ٹونٹی کھول کر ہاتھ بستے پانی کے نیچے رکھے۔ بائیں ہاتھ کی نکالی میں بے حد درد ہو رہا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے ہاتھ دھوئے اور گیلے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ مزید کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ بے حد کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے واش روم تک جانا بھی ایک بڑی مشقت ثابت ہوا تھا۔ واپس آکر پلنگ پر ڈھے گئی۔

لیکن پھر سے ہمت کر کے اٹھی اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوئی۔ چائے کا کپ، جیم ڈبل روٹی اور ابلا ہوا انڈھ۔ ایسا ناشتا ارسہ نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ارسہ ناشتے میں بھی چائے پینے کی عادی نہیں تھی اور یہ تو اب ویسے بھی پینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کو سامنے چارپائی کے ساتھ دودھ کا گلاس رکھا دکھائی دیا۔ ارسہ چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھی اور ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا۔ گلاس میز پر رکھ کر چارپائی کے سارے اٹھی۔ یہ یقیناً ”وہی دودھ تھا جو تقی رات کو اسے پلا رہا تھا۔ گلاس کو تقی نے نوٹ پیڈ سے ڈھانپ دیا تھا۔

گلاس تقریباً بھرا ہوا ہی تھا۔

”اس چائے سے یہی بہتر ہے۔“ اس نے سوچا۔

سردی کی وجہ سے دودھ بھی ٹھنڈا تھا۔ ارسہ نے گھونٹ بھرا۔ اس کا ذائقہ اچھا تھا۔ دوسرے تیسرے گھونٹ پر اسے اندازہ ہوا کہ دودھ میں شہد بھی ملا ہوا ہے۔ اس نے گلاس پورا خالی کر دیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ناشتے میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پھر چارپائیوں اور دیوار کا سہارا لیتے کمرے سے باہر نکل آئی۔ صحن میں چمیلی دھوپ پھیلی تھی۔ اس گھر میں ایک ہی کمرہ تھا۔ کمرے سے باہر ایک چبوترہ اور آگے کچا صحن تھا اور صحن میں ایک نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ چبوترہ اونچا تھا۔ ارسہ آگے بڑھ کر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ زمین ابھی تک سرد تھی لیکن دھوپ سامنے سے پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے سکون محسوس ہوا اور اس کے بے جان وجود میں جان پڑنے لگی۔

”کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟“ ارسہ نے سوچنے کی کوشش کی۔

آج سے دو دن پہلے کی شام تھی وہ۔ اوائل سردیوں کے دن تھے لیکن رات اور صبح وقفے وقفے سے ہونے والی بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بہت بڑھ گئی تھی۔ شام کو جب ارسہ اور نور اکیڈمی جا رہی تھیں۔ ارسہ نے نور کو بتایا۔

”آج علشبا اور اس کی کزن دونوں نہیں آئیں گی۔ علشبا نے ٹیکسٹ کیا تھا۔“

”ہم بھی آج جلدی فارغ ہو جائیں گے۔“ نور نے ایک نظر ارسہ کو دیکھا۔ بولی کچھ نہیں لیکن اکیڈمی کے قریب جا کر رک گئی۔

”مجھے نہیں جانا تم جاؤ میں واپس جا رہی ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“ ارسہ کو اچنبھا ہوا۔

”میری مرضی۔“ نور ہشودھری سے بولی۔

”لیکن نور! اکیڈمی کے دروازے سے واپس کیوں جا رہی ہو آخر؟“ ارسہ کو اکیلے رہ جانے کے خیال سے

پریشانی ہوئی۔

”میں نے کہا نا، میری مرضی، تم جاؤ۔“ نور نے بھڑک کر تیز آواز میں کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔ اس کے اونچا بولنے پر ارسہ سم جاتی تھی۔

”نور ایسا مت کرو پلیز۔“ ارسہ منسنا کر رہ گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی چھوٹی بہن کی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ واپس جاتی۔ ارسہ نے ایک نظر تیزی سے دور جاتی نور کو دیکھا، پھر مجبوراً اکیڈمی میں داخل ہوئی اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔

”کاش علشبا آج آجاتی۔“ جس کلاس میں وہ پڑھتی تھیں وہاں پہلی ایس سی کی لڑکیوں کی کلاس ہوتی تھی۔ پھر ارسہ لوگوں کی آج وہ بھی کم ہی آئی تھیں۔ ارسہ پیچھے جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اس کی کلاس ہونی تھی۔

”میں بھی آج نہ ہی آتی۔ نور تو بالکل بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ آج کے بعد علشبا نے نہ آنا ہوا تو میں بھی نہیں آؤں گی۔“ اس نے مضمر اراد کیا اور کل کا لیکچر دہرانے لگی۔ میڈم نے بڑی لڑکیوں کو فارغ کر کے اسے پڑھایا اور چلی گئیں۔ پھر سر تقی آئے اور اسے نئے باب کے نوٹس دیے۔ اس سے پہلے وہ اگلا لیکچر شروع کرتے، اس نے پچھلے لیکچر کے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے سوال سامنے کیے کہ پہلے یہ سمجھا دیں۔ وہ سمجھ کے اس نے اگلے لیکچر کے نوٹس سر کے سامنے کر دیے لیکن سر نے پڑھانے کی بجائے کہا کہ وہ خود یہ پڑھ کر آئے۔ جو سمجھ میں نہیں آئے گا وہ کل سمجھا دیں گے۔

”یہ پورا باب؟“ ارسہ نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ سر پھر سے بیٹھ کر نشان لگا کر بتانے لگے کہ وہ کیا کیا پڑھ کر آئے۔ اسی اثنا میں اکیڈمی کا پچھلا دروازہ جو اسی کمرے میں کھلتا تھا، ٹھاہ کی آواز کے ساتھ کھلا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ آنے والے ارسہ کے بابا اور ساتھ میں نور تھی لیکن وہ کہہ کیا رہی تھی؟

”دیکھا بابا آپ نے؟“ روزی ہی ہوتا ہے یا ہمیں یہ دوسری کلاس میں بھیج دیتا ہے یا اسے لے جاتا ہے۔“

نور انتہائی بدتمیزی سے اونچا اونچا بول رہی تھی۔ ارسہ کو نور کی بات اپنے بابا کا غصے سے مسخ ہوتا چہرہ دیکھ کر سمجھ میں آئی تھی۔ یہ نور کا ایک اور وار تھا۔ وہ کچھ اور سیٹ کر چکی تھی اس پر لیکن یہ کیا تھا؟ اور اسے کتنا مہنگا پڑنے والا تھا۔ یہ وہ قطعاً نہیں سمجھ پائی تھی اس وقت۔ زیادہ تر کلاسز ختم ہو چکی تھیں موسم کی وجہ سے اسٹوڈنٹس کی اکثریت جا چکی تھی۔

ان کے بابا سر تقی پر بھوکے شیر کی طرح جھپٹے تھے۔ انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر بری طرح پیٹنے لگے، ساتھ ان کے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو ارسہ ٹھٹھری گئی۔ پھر تیزی سے خود کو سنبھال کر آگے بڑھی۔ وہ انہیں روکنا چاہتی تھی۔ اس نے جیسے ہی اپنے بابا کے بازو کو پکڑتے ہوئے انہیں روکنا اور صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔ ان کے زبانی وار ٹھٹھرنے سے دھول چٹاوی۔ اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ ٹھٹھرے اس کا سر دیوار سے لگا اور وہ پلٹ کر اوندھے منہ جا گری۔ پھر نہ اٹھنے کے لیے یہ ارسہ کو اب تک کی زندگی میں پڑنے والا پہلا ٹھٹھر تھا۔ اس کے منہ میں مٹی اور خون کا ملا جلا ذائقہ گھلنے لگا۔



رات کے کسی پہر ہوش میں آنے پر بھی وہ سیدھی نہیں ہوئی۔ اسے اب کبھی نہیں اٹھنا تھا۔ اس سب کے بعد تو کبھی بھی نہیں۔ اتنا رکیک الزام۔ جانوروں سے بدتر سلوک۔ مجھے مارا اور پھینک کر چلے گئے۔ کسی کا گناہ ایسا سلوک کر سکتا ہے اپنی اولاد کے ساتھ؟

مگر پھر کوئی آیا اس کا بازو دو چا اور ٹھٹھرتے ہوئے لے جا کر کسی کمرے میں چارپائی پر پھینک دیا اور خود کہیں چلا گیا۔ اندھیرا روشنی میں بدل رہا تھا۔ پھر کچھ لوگ آگئے وہاں۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ جو اس کا خون صاف کر کے پٹی کر رہی تھی لیکن پھر جو ہوا۔ وہ اس کی زندگی میں ہونے والی ایک اور بڑی تبدیلی تھی۔

صرف اس کی ہی نہیں کسی اور کی بھی زندگی بدل گئی تھی۔ ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور انجان لوگوں کے درمیان ایک تعلق، ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ارسہ اور تقی کا نکاح۔ تقی۔ اسلام آباد سے کچھ عرصہ پہلے آنے والا کیمسٹری کا نیا پھر۔

اس نے خوف زدہ ہو کر یہاں سے وہاں دیکھا۔ صبح اب دوپہر میں ڈھل گئی تھی۔ ارسہ وہاں ہی بیٹھے بیٹھے خود پر گزرنے والے واقعات کو سوچ رہی تھی۔ جو اس لوٹنے پر اسے ادراک ہوا تھا کہ وہ کن مشکلات میں گھر چکی ہے۔ اب اگر وہ کالج گئی تو لوگوں کا سامنا کس طرح کرے گی؟ وہ سر تقی کے ساتھ آتی جاتی ہے، سر کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ یہ بات چھپ تو نہیں سکتی۔ یہ دیہاتی ماحول ہے، زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ پھر لوگوں کے سوالوں کے جواب کس طرح دے پائے گی؟ اس سب کے بعد وہ پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ جب روتے روتے سر چکرانے لگا تو اسی طرح بیٹھے بیٹھے پیچھے زمین پر لیٹ گئی۔

”اگر میں کالج ہی نہ جاؤں تو۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ اگلے لمحے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی۔ ”ایسے منہ چھپانے سے مشکلات حل نہیں جاتیں۔ مجھے پتا ہے نا، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ پھر کالج کیوں نہ جاؤں؟ مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ میری امی بھی مجھے پڑھانا چاہتی تھیں۔ فرسٹ ایر میں اتنی محنت کی ہے میں نے اب سیکنڈ ایر میں لوگوں کے ذر سے پڑھائی چھوڑ دوں؟ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔“ نفی میں سر ہلاتے خود کلامی کی۔ ”اگر مجھے کسی نے روکا تو میں اس بھوت بنگلے میں مر ہی جاؤں گی۔“ اس نے اس دوران سنسان پڑے گھر کو دیکھا۔ پھر بہت حوصلے سے اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



تقی کے کالج سے واپس آنے سے پہلے وہ اپنے مسئلے کا حل ڈھونڈ چکی تھی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ تقی کو اکیڈمی سے اپنا بیگ لانے کو کہے گی لیکن اندر

آئی تو اسے اپنا بیگ تقی کی چارپائی کے دوسری طرف بڑا نظر آگیا۔ تقی اس کا بیگ اور کتابیں جو وہ اکیڈمی لے کر جایا کرتی تھی بعد میں وہاں سے اٹھالایا تھا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا تو اسے اپنا پوچ مل گیا۔ جس میں اس کے گھر کی چابیاں تھیں جہاں وہ پہلے اپنی امی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

اس کی زندگی میں مصائب کا آغاز تو اس کی امی کی حادثاتی موت کے بعد ہی ہوا تھا۔ امی کی وفات کے بعد جب اس کا باپ اسے لینے آیا تھا تو ارسہ نے صرف اپنے یونیفارم کے علاوہ چند کپڑوں کے جوڑے اور کتابیں ہی اٹھالی تھیں کیونکہ اس کے باپ نے بڑے کروفر سے یہ کہہ کر اسے کچھ اور لینے سے منع کر دیا تھا کہ اسے وہاں سب ملے گا۔ اس کے باپ کے پاس سب کچھ ہے۔ ارسہ کو واقعی وہاں سب ملا تھا۔ سوائے عزت اور محبت کے۔ اب اسے تقی کی اجازت درکار تھی۔ اپنی چارپائی پر لیٹ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ارسہ تقی کے رد عمل سے ڈر بھی رہی تھی۔ اس کے باپ نے تقی کو بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ اب وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ جو چاہے سلوک کرتا اس کے ساتھ اسے کون پوچھنے والا تھا؟ اگر وہ کچھ برانہ بھی کرتا تب بھی ارسہ کے لیے اس سے نظر ملانا کتنا مشکل ہو گا۔ وہ ساری زندگی سر نہیں اٹھا سکے گی اس کے سامنے۔ تقی حسب معمول کھانا لیتے ہوئے آیا تھا اور اپنے ساتھ اس کے لیے بھی نکال کر اسے دیا۔ یہ تقی کا بڑا پین ہی ہے۔ ارسہ نے سوچا اور خاموشی سے لے کر تھوڑا سا کھالیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا۔

”سر! میں علشبدہ کے ساتھ جا کر اپنے گھر سے اپنا ضروری سامان لے آؤں؟“ تقی نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کون سا گھر؟ اس کے بجائے انتہائی خشک لہجے میں ”جو کرنا ہے کرو۔“ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ ارسہ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بمشکل اٹھی۔ دل بھر آ رہا تھا۔ پیٹ کھول کر چادر اوڑھی پیمباہ۔

ماہنامہ روشن

فروری 2016 کا شمارہ شائع ہوا

اداکارہ ”ایمن خان“ سے شاہین رشید کی ملاقات،

اداکارہ ”سجل علی“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“

”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ مہمان ہیں ”نعیم خان“

اس ماہ ”سیدہ لوباسجاد“ کے ”مقابل ہے آئینہ“

”من مورکھ کی بات نہ مانو“ آسیہ مرزا کا

نیا سلسلہ وار ناول،

”رہنزل“ حزیلہ ریاض کا سلسلہ وار ناول،

”ردائے وفا“ فرحین اظفر کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،

”دل ٹوٹ کے ہارا تھا“ نایاب جیلانی کا مکمل ناول،

”وہی درد میری حیات ہے“ قرۃ العین خرم ہاشمی

کا مکمل ناول،

”شاید“ فائزہ افتخار کا دلکش ناول،

”جان حیات“ سوبر اللہ کا ناول،

”برسات محبت کی“ شبینہ گل کا ناول،

شبانہ شوکت، ماہم علی، بدت سحر اور فرحت شوکت کے

افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کون کتاب

چھوڑے بولتے ہیں

کون کے ہرگز اسے کے ساتھ ہرگز اسے ہرگز اسے ہرگز اسے

ماہنامہ شعاع فروری 2016 203

READING
Section

نکل آئی لیکن ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئی، اسے جانا کس طرف ہے؟ یہ اس کا اپنا قصبہ تھا مگر وہ اس طرف کبھی نہیں آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کس طرف جائے، لیکن پھر اندازے سے کسی طرف جانے کے بجائے وہاں سے گزرتی ایک عورت سے اپنے محلے کا نام بتا کر رہنمائی لی۔ اس نے چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ آنسو اس کی چادر میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ بہت مہینوں بعد اس طرف آئی تھی۔ علشبدہ کے گھر کے دروازے کو دیکھ کر اسے لگا جیسے لمبی مسافت کے بعد لٹی پٹی اینوں میں پہنچ گئی ہو۔ علشبدہ کے گھر کا گیٹ کھٹکھٹانے سے پہلے مڑ کر اس کے مقابل اپنے گھر کو دیکھا۔ اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ ”پہلے سب کتنا اچھا تھا۔“ اس نے ایک ہچکی لی۔ پھر بہتی آنکھوں کے ساتھ علشبدہ کے گھر کا گیٹ دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔ وہ کن دقتوں سے یہاں تک پہنچی تھی یہ بس وہی جانتی تھی۔ گیٹ علشبدہ کی چھوٹی بہن نے کھولا۔ حیران نظروں سے روتی ہوئی ارسہ کو دیکھ کر پوچھا۔

”ارسہ باجی! کیا ہوا؟“ پھر اندر کی طرف منہ کر کے زور سے علشبدہ کو آواز دی۔ علشبدہ کچن سے نکلی، ارسہ کو دیکھ کر دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔ بے اختیار اسے گلے لگاتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”ارسہ! کیا ہوا؟ کہاں غائب ہو؟ دو دن سے کالج کیوں نہیں آ رہیں؟ اور یہ زخمیہ کس نے مارا ہے تمہیں؟“ کوئی جواب دیے بنا ارسہ، علشبدہ کے گلے لگی۔ ہچکیوں سے روتی رہی۔

”کچھ تو بولو۔“ علشبدہ کا دل ہول رہا تھا۔ بہت دیر بعد سنبھل کر پانی پیا اور علشبدہ کو ساری بات بتائی۔ پوری بات سن کر علشبدہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر صدمے کے عالم میں بیٹھی رہی۔

”میرے خدا! نور ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ اور تمہارے فادے تمہاری شادی ہو گئی۔ وہ بھی سر تقی کے۔ وہ تو اس علاقے کے ہیں بھی نہیں۔ وہ کون

ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ یہ تو شاید ٹیچرز کو بھی نہیں پتا۔“ بے یقینی سے تیز تیز بولتے گڑبڑائی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی دوست کو مزید پریشان کر رہی ہے۔

”خیر برنسل صاحب کو تو پتا ہی ہوگا، سر کے بارے میں سب ظاہر ہے انہوں نے کچھ سوچ کر ہی یہ کیا ہوگا۔ اللہ بہتر کرے گا تم حوصلہ رکھو۔“ اب کہ ڈھارس بندھائی۔ ”اتنا کچھ ہو گیا تمہارے ساتھ اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ تمہارے کالج نہ آنے پر میں تمہیں کالز کرتی رہی، کسی نے پک نہیں کی اور پھر کل نمبر ہی آف ہو گیا۔ موبائل کی بیٹری ختم ہو گئی ہوگی۔“ علشبدہ خود کلائی کے انداز میں بول رہی تھی۔

”علشبدہ! باقی چیزیں تو میں یہاں سے لے جاؤں گی، پرانا یونیفارم بھی رکھا ہے لیکن آدھی کتابیں اور نوٹس تو وہاں ہی رہ گئے۔“ ارسہ نے وہ بات کی جس کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔ اس کی آواز رونے سے بھاری ہو رہی تھی۔

”اچھا۔ اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ میرے پاس جو ہے سب، ہم مہینج کر لیں گے، تم فکر مت کرو۔“ علشبدہ نے اسے پریشانی سے نکالنے کی کوشش کی۔ علشبدہ کے امی ابو گھر پر نہیں تھے۔

دونوں نے جا کر ارسہ کے گھر کو کھولا اور ضرورت کی چیزیں اٹھائیں۔ علشبدہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ارسہ کو چھوڑنے آئی تھی۔ گھر کا گیٹ اسی طرح کھلا تھا۔ تقی کمرے میں بھی نہیں تھا۔ تینوں نے سامان رکھا۔ علشبدہ نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور چارپائی پر اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ارسہ اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت تھکی تھکی اور کمزور لگ رہی تھی۔ وہ ارسہ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ سر کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہے؟ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ آنے والا وقت اس کے لیے خاصا کٹھن ہوگا۔

ارسہ گیٹ بند کر کے اندر آئی۔ پھر کچن کے پچھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ تقی سیڑھیوں پر لپٹ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے ارسہ کی موجودگی

محسوس کر کے بھی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔
ارسہ نم آنکھیں رگڑتی واپس کمرے میں چلی آئی۔



اگلے دن کالج میں بریک سے پہلے پرنسپل صاحب نے ارسہ کو اپنے آفس بلانے پر اس نے بہت سے لوگوں کا متوجہ ہونا محسوس کیا تھا۔ یہ بات کالج میں اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے پھیلی تھی۔ سرفون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ ارسہ کے اجازت طلب کرنے پر پرنسپل صاحب نے اشارے سے آنے کی اجازت دی۔ پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”بیٹھیں بیٹا، کیسی ہیں آپ؟“

”فائن سر۔“ ارسہ نے بہت ہلکی آواز میں جواب

دیا۔

”ارسہ بیٹا! آپ ہمارے کالج کی بہترین طالبہ ہیں۔“ سر نے بات کا آغاز کیا۔ ”جو بھی ہوا وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ میں نے اسی وقت صداقت صاحب (ارسہ کے بابا کے کاروباری شراکت دار) سے آپ کے والد صاحب کا نمبر لے کر انہیں کال کی تھی۔ لیکن ان کا رویہ بڑا مایوس کن تھا۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ انہوں نے جو آخری بات کی وہ یہ تھی کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ مجھے دوبارہ نظر آئی تو میں اسے جان سے مار دوں گا اور مزید اسی قسم کی کچھ باتیں۔“ مزید باتیں یقیناً ”وہ ہوں گی جو وہ ابھی ارسہ کے سامنے دہرا بھی نہیں پارہے تھے۔ پھر کرسی سے ذرا آگے جھک کر مزید کہا۔

”بیٹا اس وقت مجھے جو حل سوچا وہ میں نے تجویز کے طور پر سب کے سامنے رکھا۔ پھر تقی صاحب کی رضامندی سے یہ نکاح ہوا ہے۔“ ارسہ کو بغور دیکھا۔ ”بیٹا آپ پریشان مت ہوں۔“ پرنسپل صاحب نے پیشانی مسلی۔ ”میں تقی صاحب اور ان کے بھائی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مزید کوئی مسئلہ ہو تو آپ بلا جھجک مجھے کہہ سکتی ہیں۔“ ان

کے لہجے میں خلوص جھلکتا تھا۔

”لیس سر۔“ ارسہ بمشکل بول پائی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹک رہا تھا۔ واقعی کچھ آسمانی اور بہت مقدس رشتے بھی ہمیں راس نہیں آتے۔ جیسے میری ماں کو شوہر اور مجھے باپ۔ آنکھیں میچ کر کھولیں۔ پرنسپل صاحب نے بات ختم کر کے اسے جانے کی اجازت دی۔ تو ارسہ مرے مرے قدموں سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔



دو ہفتوں بعد زندگی اسی ڈگر پر چلنے لگی، جانے کتنی مدت تک چلتی انجام کیا ہوتا۔ اس سب سے بے خبر وہ دونوں بس دن سے رات اور رات سے دن کر رہے تھے۔ ارسہ کے آنے سے پہلے تقی باہر کھانا کھاتا، لیکن کبھی کبھار گھر میں بھی بنالیتا تھا۔ اس لیے کچھ سالان بھی لاچکا تھا جو باقی تھا۔ اس کی لسٹ اور جو چیزیں ارسہ کو ذاتی استعمال کے لیے چاہیے تھیں، ان کی لسٹ بنانے کے لیے اس نے ارسہ سے کہا تھا۔ ارسہ کو صرف پڑھنے اور اپنے پودوں میں دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ اس کی ماں نے اس سے کبھی کام کا نہیں کہا تھا، نہ اس کو خود کبھی ایسا خیال آیا تھا۔ وہ بہت دل جمعی سے پڑھتی تھی، کیونکہ اس کی ماں اس سے صرف اچھے گریڈز چاہتی تھی لیکن اب ظاہر ہے، کھانا اور گھر کے دیگر کام ارسہ کو ہی کرنے تھے۔ سو اس نے علشیہ سے پوچھ کر کچھ الٹا سیدھا کھانا بنانا شروع کر دیا تھا۔ تقی جو بھی جیسا بھی ہوتا خاموشی سے کھا لیتا۔ اس کے علاوہ دونوں ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ تقی صرف ضرورت کے وقت بات کرتا تھا اور ارسہ کے لیے یہ بھی مشکل تھا۔ تقی اتنا سنجیدہ اور لیے دیے رہتا کہ ارسہ کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس سے کوئی بات کراپاتی۔

ارسہ اور تقی کا جو استاد شاگرد والا رشتہ تھا، وہ بھی ایسا نہیں رہا تھا۔ پہلے جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ بڑے اعتماد سے پوچھ لیا کرتی تھی، مگر اب ایسا

نہیں تھا۔ ارسہ کو اسے مخاطب کرنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے لگتا کہ وہ اسے مخاطب کرے گی، تو وہ اپنی ساری بھڑاس، سارا غصہ اس پر نکال دے گا۔ کالج میں ان کا تعلق ایک بہت بڑا اسکینڈل بن چکا تھا۔ لوگ کچھ بھولتے نہ اسے بھولنے دے رہے تھے۔

کلاس کی وہ لڑکیاں جو پڑھائی یا دوسری غیر نصیبی سرگرمیوں میں کبھی ارسہ کے مقابلے میں آگے نہیں برہ پاتی تھیں۔ اب اس ساری جلن کا بدلہ لینے کا وقت تھا۔ اس کو دیکھ کر سرگوشیاں کرنا، طنز کرنا، تفتی کے حوالے سے باتیں کرنا، پھر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ ان کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ اس سب کی وجہ سے اس کا اعتماد ختم ہوتا جا رہا تھا۔ پڑھائی سے اس کا دل اچھاٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ٹیسٹ رپورٹس پر واضح فرق پڑا تھا، بلکہ اب اس کا کالج جانے کو ہی دل نہیں کرتا تھا۔

وہ اکثر کالج جاتے ہوئے پورا راستہ سوچتی، کوئی گاڑی اسے کچل کر نکل جائے یا کالج میں بلاسٹ ہو جائے اور صرف وہ مرجائے۔ زلزلہ آئے اور کالج کی بلڈنگ گر جائے اور وہ اندر ہی دب کر مرجائے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی پریشانی، اپنی تکلیف کس کو بتاتی؟ لے دیے کر علشبا، ہی تھی لیکن وہ کون سا تجربہ کار عورت تھی۔ وہ بھی تو ارسہ کی طرح ہی کم عمر اور ناوان سی لڑکی تھی۔ علشبا، حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کرتی کہ اسے لوگوں کی باتوں کو دل پر نہیں لینا چاہیے اور خاموشی سے اپنا کام کرنا چاہیے مگر ایسا ہو نہیں پایا تھا۔ لوگوں کے رویے اور طنزیہ باتیں۔ اسے کہیں نہ کہیں بہت بری لگتی تھیں۔ وہ بری طرح ہرٹ ہوتی تھی۔ وہ اکثر غائب دماغی کی سی کیفیت میں کالج سے اٹھ آتی۔ جیسے ابھی سامنے کتاب کھول کر بیٹھی تھی اور پڑھ کچھ نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر تفتی کو دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا، کل کے لیے لیکچرز تیار کر رہا تھا۔ ارسہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کا

”جانے سر کی زندگی پہلے کیسے تھی۔ کون کون تھا ان کی زندگی میں؟ پتا نہیں کتنے لوگوں کی ذمہ داری تھی ان پر اور مجھے میری تمام ضروریات کے ساتھ ان کے سر ٹھوپ دیا گیا ہے۔“ وہ تفتی کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں جانتی تھی۔ کیونکہ تفتی نے اس کو اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا، نہ اس سے کبھی کچھ پوچھا تھا لیکن تفتی کے رویے سے ایک بات سمجھ چکی تھی۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔

اس دن اردو کی کلاس تھی۔ آخری پیریڈ تھا لیکن سر نہیں آئے تھے۔ سر جمید بڑی عمر کے شیق سے پروفیسر تھے۔ ارسہ تشریح میں لکھنے کے لیے حوالے کے شعروٹ کر رہی تھی۔ جو سر نے لکھوائے تھے لیکن ارسہ نوٹ نہیں کر سکی تھی۔ ارسہ کو شعریاد نہیں رہتے تھے۔ لکھ کر بار بار دہرانے پڑتے تھے۔ جب ہی کچھ یاد رہتا۔ تھوڑی دیر بعد تفتی کلاس میں داخل ہوا۔ سب لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ درمیان سے کسی کی آواز آئی۔

”سر! یہ تو سر جمید کی کلاس ہے۔“

”جی۔ وہ نہیں آئے۔ اس لیے مجھے بھیج دیا گیا ہے۔“ تفتی نے نظریں گھما کر بولنے والی کو تلاشنا چاہا۔ ”سر! ان کے فادر کی ڈیوٹی ہو گئی ہے۔“ رافعہ نے بتایا۔

”ان کے فادر ابھی تک زندہ تھے؟“ تفتی معصومیت بھری حیرت سے بولا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب کھول لی۔ ارسہ سمیت پوری کلاس کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری۔

”یہ بھی نا۔ ساتھ ہی ٹیچر کے بارے میں بھی کوئی ایسے لا علم ہو سکتا ہے بھلا۔“ ارسہ نے علشبا کو دیکھا شاید وہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔

”سر! آپ کے فادر ہیں؟“ رافعہ نے بڑی ہمت دکھائی تھی۔

”یہی بہتر ہیں۔ جو دل ہو، پوچھ تو لیتی ہیں۔“ ارسہ

نے سوچا اور جواب کے لیے تقی کی طرف متوجہ ہوئی۔
 دو مہینے ہو گئے ہیں ایسے رہتے ہوئے۔ چلو کچھ تو پتا
 چلے۔ تقی کتاب میں کوئی چیز انہماک سے دیکھ رہا تھا۔
 ”جی؟“ چونک کر سر اٹھایا اور رافعہ کو سوالیہ نظروں
 سے دیکھا۔

”سر آپ کے فادر ہیں؟“ رافعہ نے اپنا سوال
 دہرایا۔

”اپنا پڑھیں بچے شاباش۔“ یہ تقی کا جواب تھا۔
 اب وہ دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس
 پر رافعہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ جبکہ ارسہ نے سوچا۔
 ”کچھ نہ ہی پوچھنا بہتر ہے۔“

”ڈگریٹر! آپ کچھ پڑھ لیں اور کلاس سے باہر آواز نہ
 جائے پلینز۔“ اور خود شکل پر ڈھیروں بے زاری لیے
 کلاس سے نکل گیا۔ شاید پورا دن کھڑے کھڑے تھک
 لیا تھا۔ تقی کا آخری پیریڈ فری ہوتا تھا۔

رافعہ نے پیچھے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ارسہ کو آواز
 لگائی۔

”ارسہ! تم بتاؤ سر کے فادر ہیں؟ تمہیں تو پتا ہی ہوگا
 سر کی فیملی کے بارے میں۔“ اس بات پر سب لڑکیاں
 ارسہ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگیں،
 ارسہ نے تھوک نکالا۔ وہ اب کیا جواب دے۔ وہ بھی
 اتنی ہی انجان تھی جیسے کہ وہ سب۔ ارسہ نے سر
 گھما کر رافعہ کو دیکھا اور بگڑے لہجے میں بولی۔

”تمہیں کیا انٹرسٹ ہے سر کی فیملی میں؟ اپنے کام
 سے کام رکھو۔“ اور کتاب چہرے کے آگے کر لی۔ اکثر
 دو گوں کے پاس جب کسی بات کا جواب نہ ہو یا وہ جواب

دینا نہ چاہ رہے ہوں تو الٹا اگلے پر بگڑ کر جان چھڑاتے
 ہیں۔ ارسہ نے بھی یہی کیا تھا۔



سردی اپنے عروج پر تھی اور اس رات تو سردی اتنی
 بڑھی کہ ارسہ کو کمبل سردی کی شدت کے سامنے کم
 لگنے لگا تھا۔ وہ کب سے سردی سے دھیان ہٹا کر سونے

کی کوشش کر رہی تھی مگر بے سود۔ ارسہ کے دانت
 بجنے لگے تھے۔ پتا نہیں رات کا کون سا پر تھا اور صبح
 کب ہونی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ جلدی صبح
 ہو جائے ورنہ تو وہ اکڑ کر مر جائے گی۔ اتنی سردی اور
 اندھیرے میں وہ کیا کرے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 وہ اٹھی اور ٹانگیں سینے سے لگا کر بیٹھ گئی اور کمبل اچھی
 طرح اپنے ارد گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ بہت دیر اسی
 طرح بیٹھنے کے باوجود بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اسے
 ٹھنڈا اپنے جسم سے لہریں بنا کر گزرتی محسوس ہو رہی
 تھی۔ ارسہ نے بے بسی سے رونا شروع کر دیا۔ وہ آواز
 دبا کر گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی مگر کبھی کسی سسکی کی
 آواز سے کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا
 ہوتا۔ بیٹھ کر روتے روتے اب اس کی باقاعدہ ہچکی بندھ
 چکی تھی۔ کسی احساس کے تحت تقی کی آنکھ کھل گئی۔
 کچھ محسوس کرتے ہوئے اس نے پکارا۔

”ارسس۔“ تقی کی نیند میں ڈوبی آواز پر وہ ساکت
 ہوئی۔ ”ارسہ کیا ہوا؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”سردی ہے۔“ ارسہ بمشکل آواز پر قابو پا کر بول
 پائی۔ تقی نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر لائٹ آن کی۔
 ارسہ نے ڈرتے ڈرتے تقی کی طرف دیکھا۔ رورو کر
 اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بلب کی روشنی
 پڑنے پر اس کے گالوں اور آنکھوں کی نمی چمکنے لگی۔ وہ
 پتا نہیں کب سے رو رہی تھی۔ تقی اب دونوں ہاتھ سر
 پر رکھے حیرت سے آنکھوں اور نیم والیوں سے کھڑا
 اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے اسی طرح دیکھتے رہنے کے
 بعد پوچھا۔

”تم سردی کی وجہ سے رو رہی ہو؟“ آواز میں بھی

حیرت نمایاں تھی۔ ارسہ کوئی جواب دیے بغیر اسی
 طرح دیکھتی رہی۔ تقی نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے الفاظ
 گم ہو گئے ہوں۔ پھر آگے بڑھ کر اپنا کمبل اٹھایا اس کو
 ڈبل کیا اور ارسہ کی طرف مڑا۔

”لیٹو۔“ ارسہ لیٹ تو گئی لیکن اگر وہ اپنا کمبل اس
 کو دے رہا تھا تو اس نے خود کیا کرنا تھا؟ ارسہ کو نئی

ضروری۔۔۔ دن۔۔۔ ٹھہر۔۔۔ تھری۔۔۔“ مگر بولا ہی نہیں گیا۔
 ناشتے کے بعد تقی کے لیے چائے لینے کچن میں گئی۔
 ”چلو پوچھتی ہوں چائے کیسی ہے؟“ چائے کا کپ
 اٹھایا اور خاموشی سے دے کر واپس آگئی۔ بولی کچھ
 نہیں۔ ”اگ کیا مصیبت ہے بولا ہی نہیں جاتا کچھ۔“
 بری طرح جھلائی۔ اپنی اس کم ہمتی پر، کاؤنٹر پر ہاتھ
 رکھے، سامنے بڑے جگ کو گھورتی رہی۔

”جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔“ باہر سے تقی کی آواز
 اسے ہوش میں لائی۔ وہ ”اوہ۔۔۔“ کہہ کر واش روم کی
 طرف بھاگی۔ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر آئی۔ شوز
 پہن کر چادر اوڑھی۔

تقی چائے پی کر کپ اندر رکھ آیا تھا اور اب
 موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ اصل میں ارسہ کے تیار
 ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ارسہ نے بیگ اٹھایا۔ بیگ
 رات کو ہی تیار رکھتی تھی۔ تالے سے چابی نکال کر
 تقی کو اٹھائی اور خود دروازے بند کیے۔ گیٹ کو تالا لگا کر
 تقی کے پیچھے چلنے لگی۔

”چلو اب پوچھتی ہوں۔ چائے کا پوچھوں یا رات
 کا؟ چائے کا تو تب پوچھنا چاہیے تھا نا۔ اب سردی کا
 پوچھتی ہوں۔“ فیصلہ کر کے تیز قدم اٹھاتے ہوئے
 تقی کے قریب جانے کی کوشش کی اور خاموشی سے
 چلتی رہی۔ یہاں تک کہ کالج کا گیٹ نظر آنے لگا۔ پھر
 منہ بنایا، سر جھٹکا اور اچانک زوردار آواز میں بول
 اٹھی۔

”سر آپ کو رات سردی تو نہیں لگی تھی؟“ پھر
 احساس ہوا کہ آواز تو کچھ زیادہ ہی اونچی تھی۔ مگر۔۔
 تقی نے کچھ چونک کر اپنی رفتار کم کرتے ہوئے اسے
 دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ سردی نہیں تھی اور میرا نہیں خیال اس
 علاقے میں کچھ خاص سردی پڑتی ہوگی۔ ہم پہاڑی
 لوگ ہیں۔ ہمارا اس سردی سے کچھ نہیں بگڑتا۔“
 اپنے مخصوص متانت بھرے انداز میں جواب دیا۔

”اور ہر بار مسائل صرف رونے سے حل نہیں
 ہو جائیں گے۔“ کچھ توقف کے بعد اپنی بات میں

پریشانی لاحق ہوئی۔ تقی نے اپنا کبل اسے اوڑھا دیا
 تھا۔ تقی کا کبل زیادہ بڑا اور بھاری تھا۔ ارسہ نے ایک
 لمحے کو آنکھیں موند کر سکون محسوس کیا۔ پھر آنکھیں
 کھولیں اور سر اٹھا کر تقی کو دیکھنے لگی۔ تقی نے اپنا گرم
 جیکٹ پہنا۔ پھر نیچے جھک کر اپنے جوتوں سے جرابیں
 نکال کر پہنیں۔ ادھر ادھر دیکھا تکیے کے ساتھ بڑی
 ہوئی اوئی ٹوپی اٹھا کر پہنی۔ پھر تکیہ اور اپنا موبائل اٹھا کر
 چارپائی کی چادر اتاری، آگے بڑھ کر لائٹ بند کر لی اور
 چادر اوڑھ کر سو گیا۔ ارسہ کو اب بھی اس کی فکر ہو رہی
 تھی۔ اتنی سردی میں بنا کبل کے وہ کیسے سویائے گا۔
 مگر کچھ ہی دیر بعد تقی کے آہستہ آہستہ خراٹوں کی آواز
 مطمئن ہو کر دانت نکالے اور کبلوں میں منہ چھپا کر
 گروت لی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد نیند کی واویلوں میں اتر
 گئی۔

صبح ناشتا بناتے ہوئے ارسہ مسلسل سوچتی رہی کہ
 وہ تقی سے پوچھے گی کہ وہ رات کو ٹھیک سویا تھا۔ اس کو
 سردی تو نہیں لگی تھی۔ لاشعوری طور پر تشکر کے
 جذبے کے زیر اثر شکریے کے طور پر اس سے یہ
 پوچھنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ارسہ نے کبھی کوئی
 بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آج کرنا چاہتی
 تھی لیکن براہ راست شکریہ ادا کرنا اس کے لیے ایک
 مشکل امر تھا۔

”ہاں مجھے ضرور پوچھنا چاہیے۔“ ایک باب۔۔۔ مصمم
 ارادہ کرتے ہوئے ناشتا باہر لا کر رکھا۔ ناشتا کرتے
 ہوئے ارسہ نے تقی کو دیکھا۔ پھر فوراً ”نظریں
 جھکا لیں۔“ ”اب پوچھتی ہوں۔“ پھر چور نظروں سے

دیکھا تو احساس ہوا کہ کوئی بات کرنا تو دور کی بات اس
 کے لیے نظر بھر کر تقی کو دیکھنا بھی مشکل تھا۔

”سر کو صرف لیکچر کے دوران ہی دیکھا جاسکتا
 ہے۔“ اس نے سوچا، پھر تقی کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ
 اس کے چھوٹے چھوٹے پراٹھوں کے بڑے بڑے
 زانے لے رہا تھا۔ ”کچھ بھی ہو“ ایک بار پوچھوں گی

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اضافہ کرتا اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا۔ یعنی کہنا بڑے گایا مسائل کے حل کے لیے کوشش کرنی پڑے گی۔ مگر ارسہ نے اس بات پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اسی بات پر خوش ہو رہی تھی کہ اس نے ایک بات پوچھ لی ہے اور سرنے اس کا جواب بھی دیا ہے وہ بھی اتنا لمبا۔

”پہاڑی لوگ۔۔۔“ کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اس نے یوں منہ بنا کر سر ہلایا جیسے کسی تفتیشی آفیسر کے ہاتھ بڑی اہم معلومات لگی ہو۔



ہر تین ماہ بعد کالج میں تمام مضامین کی ایک ٹیسٹ رپورٹ تیار ہوتی تھی۔ ارسہ کی یہ رپورٹ تقی کو ملی تھی۔ اس وقت تو تقی اپنی فائل میں رکھ کر کلاس لینے چلا گیا تھا۔ اب گھر آکر رپورٹ دیکھی تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ ارسہ ہاشم کی رپورٹ ہے۔ تقی صرف ارسہ کی وجہ سے یہاں رکا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا ارسہ یہاں اپنا پورا سال پورا کر لے۔ وہ اسے کہیں اور لے جا کر ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر ارسہ کی پڑھائی کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کب کا یہاں سے جا چکا ہوتا۔ اس کا کنٹریکٹ بھی اس کے لیے مسئلہ نہ بنتا۔ وہ پرنسپل صاحب سے درخواست کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اسے نہیں روکیں گے مگر ارسہ۔

تقی نے کمرے میں داخل ہوتی ارسہ کو دیکھا۔ اسے شدید غصہ آیا۔ حالانکہ وہ غصہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کو نرمی سے سمجھانا چاہتا کہ وہ صرف اپنی پرہائی پر توجہ دے جو آئندہ اس کے کام آتی مگر۔

اٹھ کر اس تک پہنچا اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کر کے اس کے ہاتھ میں رپورٹ پکڑائی۔

”یہ ہے تمہاری رپورٹ۔ مجھے بتاؤ؟ ہم کس لیے ہیں اس عذاب میں۔ اگر اسی طرح پڑھنا ہے تو بہتر

ہے چھوڑ دو۔ اپنی وجہ سے مجھے بھی خوار مت کرو۔ پلیز۔ ہر چیز کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔“ سرخ اور تنے ہوئے چہرے کے ساتھ انتہائی سخت اور کھردرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کا بازو جھٹکا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ رپورٹ ارسہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ وہ ایک بت کی طرح ساکت کھڑی تھی لیکن آنکھوں سے نکلتے آنسو، ٹھوڑی سے قطروں کی صورت میں پھسلتے جا رہے تھے۔

”کیا میں ہمیشہ سے ایسی ہوں؟ ان حالات میں جب سب مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں، ہر وقت کسی انجانے خوف کے حصار میں رہتی ہوں کہ ابھی پھر کچھ ہو جائے گا۔ جیسے پہلے سارے رشتے مجھ سے چھن گئے۔ آپ بھی مجھے چھوڑ دیں گے۔ ایک لمحے کا سکون نہیں ملتا مجھے۔ کیسے پڑھوں میں؟ یاد کیا ہوا، سبق بھول جاتا ہے مجھے۔ پھر کیا کروں میں؟ مار کس کیسے آسکتے ہیں؟ میری جگہ کوئی بھی ہو۔ آپ بھی ہوں تو نہیں پڑھ سکتے۔ اب وہ ادبچی آواز میں روتے ہوئے، شکوہ کناں تھی۔



انگلش کی کلاس ختم ہوئی تھی۔ ارسہ اور علشبدہ بھی میڈم کے پیچھے ہی باہر نکل آئیں۔ اگلا پیریڈ سر تقی کا تھا۔ علشبدہ نے ہال کے ستون کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے ارسہ کو غور سے دیکھا۔

”ارسہ! کیا ہوا؟ آج بہت چپ چپ ہو۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“

”کوئی بات نہیں ہوئی یا رسہ۔“ سو بے منہ کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ارسہ۔ باتیں چھپانے لگی ہو مجھ سے؟“ اس

سے پہلے ارسہ کوئی جواب دیتی۔ سر بلال پاس سے گزرے۔ وہ میٹھس کے پروفیسر تھے۔ دونوں نے بیک وقت سر کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! کیسے ہیں بیٹا آپ لوگ؟“ رک کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں سر۔“ علشبدہ نے جواب دیا۔

”ارسہ آپ کے ٹیسٹ۔“ ارسہ کو دیکھتے ہوئے معنی خیزی سے جملہ ادھورا پھوڑا۔ ارسہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اس بات پر پہلے بھی کافی کچھ سن چکی تھی۔

”سوری سر۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہوگا۔“

”چلیں کوئی بات نہیں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ ہم آپ سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔“ سر مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ نقلی پاس سے گزر کر کلاس میں جا رہا تھا۔ علشبدہ نے سلام کیا لیکن ارسہ بلال صاحب کی طرف ہی متوجہ رہی جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ ارسہ نے سر بلال کی بات سمجھ کر سر ہلایا۔

”ان شاء اللہ سر! میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گی۔“ اس نے واقعی اب توجہ سے بڑھنے کا تہیہ کیا تھا۔ سر بلال سے بات کر کے دونوں کلاس کے دروازے تک آئیں۔

”مے آئی کم ان سر!“ علشبدہ نے پوچھا۔

”نوس۔“ انتہائی قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے فرمایا گیا۔

”ہیں۔ کیوں؟“ دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”جب ٹیچر کلاس میں ہے تو آپ باہر کیا کر رہی تھیں؟“

”ہم سر بلال سے بات کر رہے تھے۔“ علشبدہ نے جواباً کہا۔

”بہر حال۔ آپ کو مجھ سے پہلے کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔ اب باہر ہی رہیں۔“

”یہ کیا۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”سر آپ ابھی تو کلاس میں آئے ہیں۔ ہم باہر گھوم

نہیں رہے تھے۔ آپ نے بھی دیکھا۔ ہم سر سے بات کر رہے تھے۔“ علشبدہ جب رہ سکتی تھی بھلا۔ اس کے جواب میں سر چار قدم آگے آئے اور کلاس روم کا دروازہ بند کر دیا۔ یوں منہ پر دروازہ بند ہونے پر ایک

لمحے کو دونوں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہاں تک نہیں مگر پورا ایک منٹ بھی نہیں۔ ان سے آگے لڑائیاں ابھی سیٹوں پر بیٹھ رہی تھیں پھر۔

”تم نے دیکھا اس آدمی کو؟“ ارسہ کی آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔

”ہاں دیکھا۔ ڈانہلا گز پر نہیں ایکشنز پر یقین رکھتا ہے۔“ علشبدہ ہنستے ہوئے بولی۔ ارسہ کو حیرت ہوئی۔ اس کے ہنسنے پر۔

”ان کے ڈانہلا گز بھی اتنے ہی برے ہوتے ہیں۔“ اس کے ذہن کے پردے پر کل شام کا منظر تازہ ہوا۔

”کل تو بری رپورٹ پر اتنی سنا رہے تھے۔ آج خود ہی کلاس سے نکال دیا۔“

”چھا واقعی؟ ویسے تو بولتے ہوئے بڑے کیوٹ لگتے ہیں۔“ علشبدہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”ابھی جب تم سر سے بات کر رہی تھیں مجھے لگا تم ابھی رو دو گی اور اب تم ہنس رہی ہو۔“ ارسہ نے الجھ کر پوچھا۔

”دیکھا۔ میں اچھی ایکٹریس بن سکتی ہوں نا؟“ علشبدہ نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔

”ہاں ضرور۔“ ارسہ نے دانت پیسے دراصل علشبدہ کو بھی اتنی ہی بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔

صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ٹیچر اسٹوڈنٹ والا معاملہ نہیں ہے۔ وہ اس وقت ارسہ کی وجہ سے ہی باہر کھڑی تھی مگر ارسہ کے ”دیکھا تم نے اس آدمی کو“ کہنے پر فوراً

سنبھل گئی۔ وہ جانتی تھی ارسہ پہلے ہی پریشان ہے۔ وہ مزید اس کو بد دل ہونے سے بچانے کے لیے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یار سب کیا سوچ رہے ہوں گے جنہوں نے

ہمیں ایسے دیکھا اور پوری کلاس ہنس رہی ہوگی ہم پر۔“ ارسہ بسورنے لگی۔

”اوس۔ کم آن ارسہ! یہ چیز اسٹوڈنٹ ڈائف کا

”جسے ہے یار۔ کل کو ہسپتال سے یاد کر کے۔“
علشبدہ اُرسہ کا بازو پکڑ کر کیمین کی طرف چلتے ہوئے
بولی۔

”اور جہاں تک بات ہے کلاس کے بننے کی تو تم
اگلے پیر سے ہی نوٹ کرنا شروع کرو کہ کس کی کس
بات پر اسی قسم کی انسٹل ہوتی ہے۔ جس کی عزت
ہوتی جائے۔ اس کا نام نوٹ کر لو۔ تم دیکھنا دو دن میں
ہی پوری کلاس کے نام لکھے ہوں گے تمہارے پاس۔
اس بات پر کوئی روتا ہے یوں؟ پاگل ہو بالکل۔“
”میں اس بات پر کبھی ہنس نہیں سکتی۔“ اُرسہ پر
کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ علشبدہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ
گئی۔

”اُرسہ پلیرنایا۔ کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو
دل پر لے لیتی ہو؟“ علشبدہ بے چارگی سے گویا ہوئی۔
”علشبدہ یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ دنیا میں کسی کو
میری ضرورت نہیں۔ میں ایک ناکارہ چیز ہوں۔
دو سروں پر بوجھ ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتیں یہ کتنی
تکلیف دہ بات ہوتی ہے۔“ علشبدہ کی طرف جھک کر
بڑے پردرد لہجے میں اسے بتایا۔

”تم خدا ہو جو کسی کو تمہاری ضرورت ہوگی؟
صرف تمہیں تمہاری ضرورت ہے اور کیوں بوجھ بنی
ہوئی ہو دو سروں پر۔ خود کو اتنا مضبوط کرو کہ کسی پر کوئی
بوجھ نہ رہے۔ ہاں اس میں کچھ وقت ضرور لگے گا اس
وقت کا انتظار حوصلے اور حکمت عملی سے کرو۔ اس
طرح روتے سورتے، مظلوم بن کر نہیں۔ تمہیں اس
سوچ سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے کہ تم ناکارہ ہو اور
کچھ کر نہیں سکتیں۔ تم انسان ہو اور انسان کچھ بھی
کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ پاگل مخلوط الحواس نہ ہو۔ بس
اور کچھ نہیں یہی چاہیے داغ۔ داغ کو مثبت سوچ کا
پیشروں دو اور مثبت سوچ دعا تو کل اور امید سے ملے
گی۔ چھوٹے بڑے، اچھے برے واقعات کو کوئی خود پر

حاوی ہی کیوں ہونے دے۔ ہول۔“ انتہائی کڑے
لہجے میں کہا گیا تھا۔ دونوں نے جھٹکے سے سر اٹھا کر

دیکھا۔ یہ عکرشہ باقی تھیں۔ ایم اے فائنل ایر کی
اسٹوڈنٹ۔

”آپ۔۔۔ اُرسہ کے لب بولے۔
”ہاں جی! پاس سے گزرتے تمہارا شکوہ کانوں میں
پڑا تو۔۔۔ یہ جواب شکوہ تھا۔“ اُرسہ نے جھینپ مٹانے
کو مسکراتے کی کوشش کی۔

”ویسے میرا بچہ۔! تمہارے پاس تو یہ حسن اضافی
خوبی ہے۔ خوب صورتی اور معصومیت کیا امتزاج ہے
واف۔ کون نہ مر جائے حسن و خوب صورتی کے اس پیکر
پر۔“

”آپ اُرسہ پر کوئی غزل تو نہیں لکھ رہیں؟“
علشبدہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”یہ کام ہم تقی صاحب پر چھوڑتے ہیں۔“ عکرشہ
نے آنکھ ماری۔ ساتھ ہی قہقہہ لگایا اُرسہ گھبرا کر پانی
کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی لیکن عکرشہ باجی کی باتوں
نے اسے پریشانی اور ناامیدی کے اس حصار سے نکلنے
میں مدد دی جس میں وہ کل شام سے قید تھی۔



جیسے ہی بریک ہوئی اُرسہ اور علشبدہ بھی باقی
لڑکیوں کی طرح ڈھوپ بیٹھنے گراؤنڈ کی طرف جانے
کے لیے کلاس سے نکلیں۔ مس تمبوہڑھیوں سے
اترتی دکھائی دیں۔ دونوں نے آگے بڑھ کر انہیں سلام
کیا تو مس تمہونے مسکرا کر خوش دلی سے جواب دیا۔
”بچے! ایک گلاس پانی پلا دیں۔“

”شیور میس۔“ دونوں مستعدی سے اسٹاف کی
طرف بڑھیں۔ کیونکہ ٹیچرز کے لیے پانی اسٹاف روم
میں ہی رکھا جاتا تھا۔ انہیں مس تمبوہڑھی پسند تھیں۔
خاص طور پر اُرسہ کو بڑی خوشی ہوئی تھی ان کا کوئی کام
کر کے

اسٹاف روم میں تقی بھی بیٹھا تھا۔ اور دو اور ٹیچرز
بھی۔ اُرسہ نے ایک نظر تقی کو دیکھا۔ وہ مگن سا بیٹھا

اخبار پڑھ رہا تھا۔ اُرسہ نے کانچ کے نفیس سے گلاس

میں پانی بھرا اور باہر لے آئی۔ کالج کی تینوں خواتین ٹیچرز اسٹاف روم سے باہر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ ارسہ نے پانی کا گلاس مس تھرہ کی طرف بڑھایا۔ جو انہوں نے ”تھینکس“ کہتے ہوئے پکڑ لیا۔

”ارسہ! مجھے بھی پانی لا دو۔“ مس صدف کا لہجہ ہمیشہ کی طرح کرخنگی لیے ہوئے تھا۔

”لیس میم۔“ ارسہ نے تھوک نکلا۔ وہ ہمیشہ پاک اسٹڈیز کی اس ٹیچر سے خائف ہوتی تھی۔ دونوں نے پھر اسٹاف روم کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔

”علشبدہ!“ مس صدف نے پکارا تو دونوں نے رک کر سوالیہ نظروں سے ٹیچر کو دیکھا۔ ”ارسہ تم پانی لے آؤ۔“ مس صدف نے دانت پیسے۔

”جی۔“ ارسہ تیزی سے اسٹاف روم کی طرف چلی گئی۔

”علشبدہ! تم ارسہ کی اسٹنٹ ہو یا باڈی گارڈ؟“ مس صدف نے تسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ”ہم فرینڈز ہیں اور اسکول سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، ہمیں ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ اس میں اسٹنٹ یا باڈی گارڈ والی کیا بات ہے۔“ اعتماد سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا علشبدہ کا خاصہ تھا۔ چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔

”ہاؤ سوٹ اتنے پرانے دوست کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں میرے ساتھ اسکول میں کون کون تھا۔“ مس تھرہ ہمیشہ کی طرح چہرے پر میٹھی سی مسکان لیے بولی تھیں۔

”کیا آپ میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا؟“ اس بار مس سدرہ نے پوچھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ کبھی نہیں، جہاں اختلاف ہوتا ہے وہاں وہ ”اکثر“ میری مان لیتی ہے۔“ ”کبھی“ میں اس کی۔ ”علشبدہ مسکرائی۔

”بہت اچھے بھئی۔“ جواب میں دونوں ٹیچرز بھی ہنس پڑیں۔

”تھیک ہے، آپ جائیں۔“ مس صدف نے

اسے وہاں سے ہٹایا۔ علشبدہ چلی گئی۔ چونکہ ارسہ نے ان کے سامنے پڑا اور چائے لا کر رکھی۔ ارسہ بھی پانی لے آئی تھی۔ اب پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور مس نے چائے کا کپ اٹھالیا تھا۔ مس تھرہ پڑا کا پیس الگ کر کے سپدھی ہو میں تو ارسہ کو دیکھا۔

”ارسہ پانی رکھ دیں یہاں۔“ ان کے سامنے چھوٹا سا بیچ بڑا تھا۔ ارسہ نے جھک کر گلاس بیچ پر رکھا اور جانے کے لیے مڑی۔

”ارسہ۔۔۔ تمہاری اور سرتقی کی اسٹوری بڑی ان ہے آج کل۔“ مس صدف کی آواز تھی۔ ارسہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اب یہ کیا شروع کرنے والی تھیں۔ باقی دونوں ٹیچرز نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ پھر مس تھرہ ”پلیز ایکس کیوزی“ کہتے ہوئے پڑا ہاتھ میں پکڑے وہاں سے اٹھ گئیں اور چائے کا کپ وہاں ہی چھوڑ دیا۔ ارسہ رک گئی تھی لیکن جواب کوئی نہیں دیا، وہ کہتی بھی کیا۔

”بتاؤ نا، کیا سین ہے؟“ اسے ان الفاظ پر دھچکا سا لگا۔ یہ ایک عورت اس سے بڑھ کر ایک استاد کے الفاظ تھے۔ وہ مس صدف کے جوتوں پر نظروں جما کر کھڑی رہی۔

”سریہاں تو بڑے موڈ میں رہتے ہیں، گھر میں بھی ایسے ہی ہیں؟“ ساتھ چائے کی چسکی لی۔ ارسہ خاموش کھڑی جوتوں کی نوک دیکھتی رہی۔

”ویسے سرتقی ہیں بہت ہینڈ سم۔“ مس سدرہ کی آواز پر ارسہ نے ایک نظر ان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گلہ ابھرا۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ ”ارسہ بھی بہت کیوٹ ہیں۔ کپل اچھا ہے۔“ میم سدرہ نے اضافہ کیا۔

”لیکن مس ابھی ان کاموں کے لیے بہت عمر نہیں پڑی تھی اس کی۔“ مس صدف کو ناگوار گزری تھی یہ بات۔

”کہاں کے رہنے والے ہیں یہ لوگ؟ تم ملی ہو سرتقی کی فیملی سے؟“ پھر کچھ یاد آنے پر پوچھا۔ ارسہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”یا اللہ مجھے غائب کر دے یہاں سے۔“ علشبہ ہوتی تو بات سنبھال لیتی۔ اس کے تو حواس کام کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ ایسی صورت حال میں۔ لڑکیوں کو تو چپ کرنا ہوتا تھا لیکن نیچر۔ ان کا کیا کرتی؟ ”دیکھیں مس! نہ کوئی آگے نہ پیچھے، لعیم! نہ کوئی عمر۔ کیا مستقبل ہے اب اس کا؟“ بڑی جتنی نظروں سے مس سدرہ کو دیکھا۔ ارسہ اگلے ہی لمحے پھوٹ پھوٹ کر روکنے والی تھی۔ اس کا منہ سرخ ہو چکا تھا اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مس صدف نے مزید کچھ کہنے سے پہلے پڑا کا بڑا لقمہ لیا۔ پڑا ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس سے بھی تو لطف اندوز ہونا تھا نا جبکہ مس سدرہ اس کو دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلا رہی تھیں۔

”ارسہ! یہ ٹیسٹ ہیں۔ ان کی لسٹ بنا کر کلاس میں ڈسٹری بیوٹ کر دیں۔“ تقی تیزی سے ارسہ کے قریب آیا اور ارسہ کی طرف رول کیے ہوئے پیپرز بٹھائے۔ ”اوہ سوری۔“ تقی نے مس صدف اور مس سدرہ سے کہا۔ جیسے اپنے وہ بیان میں ہو اور اب اس بے وہیانی پر شرمندہ ہو۔ ارسہ پیپرز پکڑ کر تیزی سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

”اٹس اوکے سر! پڑا لیں۔“ مس صدف نے بڑی خوب صورتی سے مسکراتے ہوئے آفر کی۔ ”نو تھمنکس۔“ تقی تکلفاً مسکرایا۔

”ارے سر! آپ کو ڈائٹ کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں جوائن کریں۔“ مس صدف نے اصرار کیا۔ (اس عورت کی بے باکی اس کے میسجز اس کی کالز۔ توبہ ہے۔)

”نہیں شکریہ۔“ اب کے تکلفاً مسکرانے کی بھی زحمت نہیں کی اور اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا۔ اب کسی دھوپ چھاؤں نے اثر نہیں کرنا تھا۔ تقی نے صرف ارسہ کو وہاں سے پٹانے کے لیے یہ کیا تھا۔ جب ارسہ پانی لے کر نکلی تھی۔ تقی نے خفیف سا سر گھما کر اس کو باہر نکلتے دیکھا۔ یہاں سے ایک ٹیچر کی کرسی کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ تقی کی نظروں نے باہر

تک اس کا تعاقب کیا۔ باہر سردیوں کی سنہری دھوپ پھیلی تھی۔ اس نے سوچا۔ اسے کبھی چل کر باہر بیٹھنا چاہیے۔ اس لیے اس نے اخبار لپیٹا اور باہر جانے کے لیے اٹھا۔ باہر نکل کر اس نے ارسہ کو ایک نظر دیکھا۔ وہ اسے بے حد پریشان لگی۔ وہ لاشعوری طور پر وہاں ہی رک کر دیکھنے لگا۔ اس تک آواز پہنچ رہی تھی لیکن آواز واضح نہیں تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ جب ارسہ نے نفی میں سر ہلایا تب اس کے چہرے پر جو تکلیف تھی وہ بہت واضح محسوس ہوئی تھی اسے۔ تقی کے دماغ میں الارم سا بجا کہ اسے کسی طرح ارسہ کو وہاں سے ہٹانا ہے۔

وہ تیزی سے واپس آیا۔ دراز سے آج کا ٹیسٹ نکالا۔ اس نے ابھی دو تین پیپرز ہی چیک کیے تھے ان چیک کیے ہوئے پیپرز کو اوپر رکھا اور بے حد تیزی سے ارسہ تک پہنچ کر اسے وہاں سے ہٹایا۔ اب واپس آکر بیٹھ گیا تھا۔ ٹیسٹ چیک نہیں تھے۔ وہ گھر جا کر اس سے واپس لے سکتا تھا۔ مگر یہ تھا کیا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا مگر اس سب میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے بے حد بری لگ رہی تھی۔ وہ بریک ٹائم اوور ہونے تک گم صدم بیٹھا رہا۔

اور ارسہ کلاس روم کی طرف گئی تھی۔ علشبہ کلاس کے دروازے پر ہی کھڑی ارسہ کا انتظار کر رہی تھی۔ ارسہ ایک ہاتھ میں پیپرز دوپٹے اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی سختی سے بھینچے تقریباً ”بھاگتے ہوئے کلاس میں اپنی کرسی تک آئی۔ گالوں پر آنسو ایک قطار کی صورت بہہ رہے تھے۔ علشبہ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کیا ہوا؟ اس نے بس کرسی کے ستھ پر بیٹھ کر دونوں بازوؤں میں اسے بھینچ لیا۔ اس کے پاس تسلی دینے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ ارسہ کے ہاتھ میں پکڑے پیپرز بکھر گئے تھے۔ جیسے ارسہ خود بکھر گئی تھی۔

”علشبہ! میں مرجاؤں گی۔ میں مرجاؤں گی۔“ لوگوں کی ایسی باتیں مجھے مار دیں گی۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ یہ سب برداشت کر سکوں۔“ وہ روتے

ہوئے بول رہی تھی اور آواز میں اتنا درد اتنی تکلیف تھی کہ علشبدہ کے بھی آنسو نکل آئے۔

”بہت درد ہوتا ہے مجھے۔ بہت ہرٹ ہوتی ہوں میں۔ یہ پراکھاتے ہوئے‘ مزا لینے والی بات نہیں ہے۔ جب وہ پوچھتی ہیں کیا سین ہے؟ وہ سمجھ نہیں سکتیں مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ جب وہ کہتی ہیں یہ سب کرنے کی عمر نہیں تھی میری۔ جب وہ مجھے بتاتی ہیں میرا اب کوئی مستقبل نہیں۔ تو کوڑے لگتے ہیں مجھے‘ زخم بن جاتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتیں کہ ان زخموں پر مرہم رکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ اگر اسی طرح زخم لگتے رہے‘ تو مرحاؤں کی میں۔“ ارسہ نے سختی سے آنکھیں لمبھ کر کھولیں۔

”مشیش۔“ علشبدہ نے اسے خود سے الگ کیا۔ اس کے آنسو پونچھے اور اپنے بھی۔ وہ خود اس سے زیادہ رو رہی تھی۔ مگر ایسے نہیں چل سکتا تھا۔

”تمہیں ہمت نہیں ہارنی ارسہ۔ ہمت ہارو گی تو واقعی مرحاؤ گی‘ کسی کو اجازت مت دو کہ وہ تم پر جڑھائی کر سکے۔ خاموش رہو گی تو اسی طرح پیچھے پڑے رہیں گے لوگ۔ خیراب میں دیکھتی ہوں‘ کون تم سے کوئی ایسی ویسی بات کرتا ہے۔“ پھر نیچے بیٹھ کر تیزی سے پیپر ز سمیٹے اور ارسہ کو پانی لا کر پلایا۔ بریک ٹائم ختم ہونے کو تھا۔ اسے اپنی دوست کو مزید تماشا نہیں بننے دینا تھا۔

کالج سے گھر تک کا راستہ بہت مشکل سے طے کیا تھا ارسہ نے۔ عجیب سی تھکن پورے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ شام کو بستر پر لیٹ کر بے آواز روتے ہوئے سوچتی رہی کہ زندگی میں ہر چیز کیوں الٹ سی ہے۔ وہ ایسا کیا کر سکتی تھی کہ حالات کچھ سازگار ہو جاتے۔

”دھندلا گئی ہے‘ ہر چیز‘ منزل‘ کیا راستوں کے نشان تک مٹ گئے ہیں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے مدد مانگوں۔ مدد اللہ سے۔“ اس کے دل سے آواز آئی۔

”یا اللہ میں تھک گئی ہوں‘ عاجز آگئی ہوں۔ میں

اور برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بہت زیادہ ہے‘ مجھے بچالے‘ مجھے بچالے‘ مجھ پر رحم فرما۔“ اپنی سسکیں‘ چیخیں دباتے اللہ کو پکارا اور بے شک اللہ کو پکارنے والے خالی ہاتھ نہیں رہتے لیکن صبح تک وہ اس سب کی وجہ سے بخار میں جل رہی تھی۔

کالج نہ جانے پر علشبدہ نے لٹی سے پوچھا تھا اور ارسہ کے بیمار ہونے کا سن کر پریشان ہوئی۔ دوسرے دن پھر ارسہ کے کالج نہ آنے پر اس نے لٹی سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر ارسہ کو دیکھ سکتی ہے۔ وہ گھر سے اجازت لے کر آئی تھی پھر کیا اعتراض ہوتا تھا۔ گھر کے مین گیٹ پر تالا لگا تھا۔

”ارسہ کو باہر نہیں نکلنا ہوتا۔ مجبوری کی صورت میں پچھلا گیٹ اندر سے کھولا جاسکتا ہے۔“ لٹی نے تالا کھولتے ہوئے علشبدہ کو وضاحت دی۔ جس کی ضرورت نہیں تھی۔ ”میں جانتی ہوں سر۔“ علشبدہ نے کہا۔

صبح میں ارسہ نیم کے ٹیڈ منڈ درخت کے تنے کے ساتھ ٹھیک لگا کر کچی زمین پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ علشبدہ تیزی سے اس تک آئی۔

”ارسہ!“ علشبدہ نے اس کے سامنے پنچوں کے بل بیٹھتے ہوئے پکارا۔ ارسہ نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

وہ ننگے پیر بیٹھی تھی۔ کپڑوں اور ہاتھوں‘ پاؤں پر مٹی لگی تھی۔ ہونٹوں پر جی پٹری‘ اچھے بال‘ مسلے ہوئے کپڑے‘ خالی خالی سی ویران آنکھیں جن میں علشبدہ کو دیکھ کر بھی کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ وہ اسے بالکل اس درخت کی طرح اجڑی ہوئی لگی۔ علشبدہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ پہلے علشبدہ اسے دیکھتی تو وہ اسے شہزادی کی طرح لگتی تھی۔ شہزادی کو فقیرنی کے روپ میں دیکھنا اس جیسی مخلص دوست کے لیے ایک تکلیف وہ عمل تھا۔ علشبدہ کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ابھرے۔ لٹی اسے دیکھ کر اندر چلا گیا۔

”یہاں۔ اس طرح کیوں بیٹھی ہو ارسہ۔“ ”دھوپ میں بیٹھی ہوں۔“ ارسہ کی آواز میں بھی

نقاہت نمایاں تھی۔

”نہیں۔۔۔ اٹھو یہاں سے۔ اس طرح مت بیٹھو یہاں۔“ علشبدہ اسے اٹھا کر اندر لائی۔
”میں کھانا لے آؤں۔“ تقی کھانے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

علشبدہ کو اس پر بھی بہت ترس آیا۔ وہ بھی تو ابھی گھر آیا تھا۔ اب بنا آرام کیے اتنی دور کھانا لینے جانا اور ارسہ سارا دن کی بھوکی تھی۔ پتا نہیں صبح بھی کچھ کھایا تھا یا نہیں۔ اب اس حالت میں پانی تک پوچھنے والا کوئی نہیں تھا یہاں۔ اسے بے اختیار رونا آ رہا تھا اس وقت ارسہ کو اس حالت میں دیکھ کر۔ علشبدہ نے اس کے کپڑے بدلوائے۔ ہاتھ منہ اور پیرا چھپی طرح دھلوا کر کتنی بھی کی۔ تب اسے کچھ سکون ملا۔ تقی کھانا لے کر جلدی ہی آگیا تھا۔ علشبدہ نے کھانا نکال کر زبردستی ارسہ کو کھلایا۔ وہ بار بار ”میرا جی نہیں چاہ رہا بس کرو“ الٹی ہو جائے گی۔ اچھا تم خود بھی تو کچھ کھاؤ۔“ کہتی جا رہی تھی۔ لیکن علشبدہ نے اسے کھانا اور دوا کھلا کر ہی دم لیا۔ جبکہ تقی نے ایک نوالہ تک نہیں کھایا تھا۔ علشبدہ نے کھانا نکال کر پہلے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی تھی مگر وہ ”مجھے بھوک نہیں ہے“ آپ لوگ کھائیں۔“ کہتے ہوئے کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔



تین چھٹیوں کے بعد آج ارسہ کالج آئی تھی۔ علشبدہ ارسہ کو دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر اس تک آئی۔
”کیسی طبیعت ہے اب؟“ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر فکر مندی سے پوچھا۔
”میں ٹھیک ہوں۔“ ارسہ بے اختیار علشبدہ کے گلے لگی۔

”تم جیسے دوست اللہ ہر کسی کو دے۔“ باقی کلاس کے ساتھ سلام دعا کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے

بولی۔

”آمین۔۔۔“ علشبدہ ہنسی۔

”ویسے میں سمجھ رہی تھی تم کل آؤ گی کیا طبیعت کل بھی خراب تھی؟“
”نہیں۔۔۔ کل ٹھیک تھی میں۔ سر نے منع کر دیا تھا آنے سے۔“ ارسہ نے بتایا۔

”اہیں سر نے منع کر دیا کیوں؟“ علشبدہ کو ذرا حیرت ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ پتا ہے کل نا“ سر نے مجھے کیمسٹری کے نوٹس دیے اور کہا کالج جانے کے بجائے گھر بیٹھ کر یاد کر لوں۔ جتنا بھی یاد کر سکتی ہوں میں یا پھر ریسٹ کروں اور اگر بور ہوئی ہوں تو ان کالیپ ٹاپ استعمال کر سکتی ہوں کوئی پاس ورڈ نہیں لگا اور evo لپ ٹاپ والے بیک میں ہی رکھی ہے۔“ ارسہ بڑے بشاش لہجے میں بتا رہی تھی۔

”پھر کیا تھا لپ ٹاپ میں؟“ علشبدہ پر جوش ہوئی۔

”کیا۔۔۔“ ارسہ نے کندھے اچکا کر ”کیا“ کو کھینچا۔
”مجھے تو لپ ٹاپ استعمال کرنا ہی نہیں آتا۔“ وہ تو بس تقی کی اس آفر پر خوش تھی۔

”کیا تم نے آن ہی نہیں کیا؟“ علشبدہ کے جوش پر پانی پھرا۔

”یار۔۔۔ مجھے تو کمپیوٹر تک آریٹ کرنا نہیں آتا۔ لپ ٹاپ کا کیا کرتی خراب ہو جاتا تو۔۔۔“

”تو ہو جاتا۔ ارسہ تھوڑی ڈھیٹ ہو جاؤ یا۔۔۔ زندگی آسان ہو جائے گی یقین کرو۔“ علشبدہ کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔

”پاگل خراب ہو جاتا تو وہ کیا سوچتے کہ میں کتنی پینڈو ہوں۔ مجھے کسی چیز کا پتا ہی نہیں۔“

”نہیں پتا تو نہیں پتا اب انسان کو ہر چیز کا پتا نہیں ہو سکتا نا۔ جب تم استعمال کرو گی تو تمہیں آجائے گا“ ان کو کون سا پیدا ہوتے ہی ہر چیز کا پتا تھا۔ انہوں نے بھی تو کہیں نہ کہیں سے سیکھا ہو گا یا ہم آس پاس استعمال ہوتے دیکھ کر سیکھ جاتے ہیں چیزوں کو۔ اور تم کیا اس چیز کو لے کر احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہو۔“

باتیں کرتے ہیں۔ جیسے کال پر کرتے ہیں نا لوگ ایسے۔ کبھی۔۔۔

”کس سے باتیں کرتے ہیں؟“ علشبد نے فوراً

”لوکا اور پوچھا۔

”لوگوں سے۔۔۔“

”کن لوگوں سے۔۔۔“ علشبد نے سر ہٹا۔

”مجھے کیا پتا۔۔۔ میں تھوڑا ہی جانتی ہوں کسی کو۔۔۔“

”تو بات کیا کرتے ہیں؟“

”وہ پشتو میں باتیں کرتے ہیں۔ جو میرے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔“ ارسہ نے سر پکڑ کر جواب دیا۔

”تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔“ علشبد ہنس پڑی۔

”مجھے پتا ہے۔“ ارسہ بھی مسکراتے ہوئے بیگ کھولنے لگی۔



تقی بر نیل کو فون کر رہا تھا۔ آج جمعہ تھا وہ کل یعنی ہفتے کی چھٹی کی بات کر رہا تھا۔ ارسہ کے کان کھڑے ہوئے۔

”کل کی چھٹی۔۔۔ کیوں۔۔۔؟“ وہ کمرے سے باہر چبوترے پر ادھر ادھر چلتے ہوئے بات کر رہا تھا۔ ارسہ کوشش کے باوجود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ چھٹی کی کیا وجہ بتا رہا ہے سر کو۔ تقی جیسے ہی اندر آیا۔ ارسہ نے بے اختیار پوچھا۔

”آپ کل کلج نہیں جارہے؟“

”نہیں۔۔۔ کل میں اسلام آباد جاؤں گا۔ کچھ کام ہے۔ آگے پھر اتوار ہے۔ ایک رات رہ کر اتوار کی شام واپس آجاؤں گا۔“ ارسہ کو دیکھ کر بولا۔ اسے کچھ چیرت ہوئی کہ وہ بڑھ رہی تھی یا اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ارسہ کا سانس اٹکا۔ وہ رات اکیلے کیسے رہے گی۔ پھر پوچھ ہی لیا۔

”میں رات کو اندھیرے میں کیسے رہوں گی؟“

”رات کو اندھیرے میں کیا ہوتا ہے؟ اور میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“ تقی نے سوال کیا۔

پھر خود ہی واضح بھی کر دیا کہ مجھ سے کوئی امید مت

علشبد نے جیسے ڈانٹا۔

”ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں کہاں سے کچھ سیکھ سکتی تھی، کہیں آتی جاتی تو تھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ رات پلنی وی پر آٹھ بجے والا ڈراما دیکھا کرتی تھی۔ اب تو وہ بھی گیا۔ پھر تم ایک دوست ہو اور تم خود زیادہ عقل مند نہیں ہو۔“

”کیا۔۔۔؟“ علشبد نے گھورا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تم بہت عقل مند ہو۔“ ارسہ نے ہمیشہ کی طرح فوراً ہار مان لی۔ ”ویسے تم کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتیں علشبد؟“ علشبد ہنس پڑی۔

”ہوتی ہوں یا۔۔۔ سب ہی ہوتے ہیں، کسی نہ کسی وجہ سے۔ لیکن ہونا نہیں چاہیے۔ ہم کسی کی اچھی چیز کا مقابلہ اپنی کمتر چیز سے کرتے ہیں تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہی بندہ اپنی کسی کمی یا محرومی کو لے کر انہی احساسات سے دوچار ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر کیا فرق ہوا۔ اس میں اور ہم میں؟ ہیں تو سب ہی انسان نا۔ ہم ایویں متاثر ہوتے پھرتے ہیں۔ اپنے جیسے ہی انسانوں سے۔ سو جو ذرا! جو اللہ نے نہیں دیا اور نہیں دینا۔ وہ کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے بل پر؟ نہیں نا؟ اصل میں ہم سب ہی ایک جتنے بے بس محتاج اور عام انسان ہیں۔ پھر کیا ضرورت بڑی ہے کسی دوسرے انسان کی وجہ سے کچھ ایسا واپس ملنے کی۔“

”ہاں۔۔۔ واقعی!“ ارسہ نے دھیان سے سنا اور پھر سمجھ کر سر ہلایا۔

”اور خود کو دیکھو کس بات سے متاثر ہو رہی ہو۔“

علشبد کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ اب وہ ہنس رہی تھی۔

”کوئی نہیں۔۔۔ وہ تو میں نے ایسے ہی کہا بس۔“

اس نے علشبد کے بازو پر ہلکی سی چست لگائی۔

”اچھا۔۔۔ وہ خود کیا کرتے ہیں لپ ٹاپ پر؟“

علشبد نے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ کبھی نوٹس بناتے ہیں وہاں سے دیکھ کر۔ مودی، میوزک اور خبریں وغیرہ سنتے ہیں کبھی

READING
Section

اب بڑھو اپنا۔“ ارسہ نے گردن سیدھی کی۔ خجالت سے مسکرا کر دل میں سوچا۔
”جی ہاں۔ ہو گیا۔“ پھر دھیان سے پڑھنے کی کوشش کی۔ اس بار کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔



کالج میں جب تقی اپنا پیریڈ لینے نہیں پہنچا تو لڑکیوں نے ارسہ سے پوچھا کہ۔
”سرکیوں نہیں آئے؟“

”سرکام سے گئے ہیں۔ اس لیے نہیں آئے۔“ ارسہ نے مختصر جواب دیا۔ چھٹی پر لاشعوری طور پر اس کی نگاہیں تقی کو کھوج رہی تھیں۔ اس کے کہیں نظر نہ آنے پر دل پر دیرانی سی چھا گئی۔ وہ کالج سے نکلی اور گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ کالج کے اندر باہر بہت رش تھا۔ اتنے لوگوں میں بھی اسے اپنا آپ تنہا اور غیر محفوظ لگ رہا تھا۔ تین مہینے ہو گئے تھے تقی کے ساتھ آتے جاتے۔ آج اس کا نہ ہونا بہت محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے روڈ کراس کیا تو اسے کسی نے پیچھے سے پکارا۔
”ارسہ!“ تقی آگیا۔ وہ فوراً ”مڑی مگر وہ تقی نہیں تھا اور جو تھا۔ اس کا سامنا ہونے کی بالکل امید نہیں تھی اسے۔“

”حسن بھائی۔“ ارسہ کی آواز بڑبڑاہٹ کے مشابہہ تھی۔ احسن تیزی سے اس تک آیا۔
”ارسہ! یہ سب کیا ہے۔ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔“ میں اس شام پھپھو کی طرف گیا تو مجھے نور نے بتایا۔ لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم ایسی تو نہیں ہو۔ شاید انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ میں۔ میں تمہارے لیے فکر مند ہو رہا تھا لیکن میرا ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے۔ اس لیے پہلے آ نہیں سکا۔ خیر۔ ابھی آؤ میرے ساتھ گھر جا کر بات کرتے ہیں۔“ تیزی سے بولتے ہوئے ارسہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لے جانا چاہا۔

ارسہ نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور احسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔

رکھنا۔ ارسہ کو کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی بات۔ جب پہلے دن تقی نے کلاس میں آکر اپنا مختصر سا تعارف کرایا تھا تب اس نے بتایا تھا کہ اس نے اسلام آباد میں تعلیم مکمل کی ہے اور اس سے پہلے وہاں ہی جاب کر رہا تھا۔ جب پرنسپل صاحب نے اسے یہاں آنے کا کہا تھا کہ یہاں تعلیم کا بہت رجحان اور تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ اگر وہ یہاں آجائے تو یہ اس کے لیے اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کے لیے اچھا رہے گا۔ اگر اس نے اسلام آباد میں ہی پڑھا تھا اور وہاں ہی جاب بھی کرتا تھا تو امکان تھا کہ اس کا خاندان بھی وہاں ہی ہو۔ اس لیے وہ ارسہ کو وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ شاید تقی کی فیملی اسے قبول نہ کرے۔ یہ بھی ممکن تھا اس نے ابھی تک ان کو اس بارے میں کچھ بتایا ہی نہ ہو۔ یا جو بھی تھا مگر ارسہ فی الوقت اس بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ رات کو اکیلے نہیں رہ سکتی تھی اور چاہتی تھی تقی بھی اس بات کو سمجھے، مگر ارسہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

تقی اب کمرے کا دروازہ مقفل کر کے چیک کرنے والے کچھ پیپرزلے کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ کمرے کی واحد کرسی پر ارسہ براجمان تھی اور میز پر کتابیں اور نوٹس پھیلائے پڑھ رہی تھی مگر اب مزید پڑھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا دھیان ہٹ چکا تھا۔ وہ ہر منٹ بعد اپنی کتاب سے نظریں ہٹا کر گردن موڑ کر تقی کو پریشانی سے دیکھتی اور پھر واپس کتاب پر نظر ڈال کر اپنا ٹاپک سمجھنے کی کوشش کرتی، مگر ناکام رہتی۔ تنگ آ کر دونوں ہاتھ کتاب پر رکھ دیے، گردن سیدھی کی، آنکھیں بند کر کے لمبی سانس لی اور پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

تقی نے ایک دم اپنا پین رکھ کر اسے دیکھا۔ وہ کب سے اس کی بے چینی نوٹ کر رہا تھا۔ تقی اتنا اچانک متوجہ ہوا تھا کہ ارسہ اس پر سے اپنی نظریں بھی نہیں ہٹا سکی تھی۔

”کل صبح جلدی جاؤں گا اور شام کو جلدی واپس آ جاؤں گا۔ رات نہیں رمتا۔ ٹھیک ہے؟ ہو گیا۔“

”میں ایسی ہی ہوں۔۔۔ نور نے جو بتایا ہے وہ سچ ہے۔ کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔“ احسن ٹھہر سا گیا۔

”ارسہ!“ صدے سے اسے دیکھا۔

”میں نے تم سے محبت کی ہے۔۔۔ اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود تم سے شادی کرنا چاہی اور تم۔۔۔“

”اور میں ایک بدکردار لڑکی ہوں اور آپ کو اپنے انتخاب پر افسوس ہے۔۔۔ ہے نا؟“ اس نے احسن کی بات کاٹ کر کہا۔

”ہاں۔۔۔“ احسن نے حقارت سے کہتے ہوئے چند لمحے اسے دیکھا اور جھٹکے سے مڑ کر چلا گیا۔ ارسہ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔ پسینے سے بھیگی لرزتی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑا۔

ہوں۔۔۔ محبت۔۔۔ مجھ سے اتنی ہی محبت تھی میری اتنی ہی فکر تھی تو اسی شام پتا چل جانے پر بھی مجھے پوچھنے تک نہیں آئے۔ اس شام کیا اتنے عرصے تک میرا خیال نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں گی۔ کس حال میں ہوں گی؟ اب تین مہینے گزر جانے کے بعد میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں گی تو آپ ضرور یقین کر لیں گے میری بات کا۔ مجھے آپ سے کوئی کیریئر سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے احسن بھائی بس یہ ہو کہ آپ نور اور بابا مجھے کبھی دوبارہ نظر نہ آئیں۔ میں آپ کی وجہ سے اپنی زندگی میں اور کوئی مصیبت نہیں چاہتی۔“



ارسہ گھر پہنچ کر تقی کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آنگن میں شام کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ ارسہ اداس سی بیٹھی کھڑکی سے باہر صحن کو دیکھ رہی تھی۔

”تقی آج امیں پلینز۔“ صرف تقی کے نہ ہونے سے ہر چیز سے اتنی دیرانی اتنی اداسی ٹپک رہی تھی جانے وہ اس وقت کہاں تھا۔ ارسہ نے بڑی مشکل سے اپنے خیالات سے پیچھا چھڑا کر کتاب کھولی۔ اب

مغرب کے بعد اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ارسہ نے اٹھ کر سارے گھر کی لائٹیں آن کر دیں اور کھڑکی بھی بند کر دی۔ دروازے تو کالج سے آکر ہی بند کیے بیٹھی تھی۔ احسن بھائی سے سامنا ہونے پر عجیب ہی خوف دامن گیر ہوا تھا۔ مگر اب اندھیرے کے خوف نے بھی اس کے دل میں نیچے گاڑنے شروع کر دیے تھے۔

”تقی کب آئیں گے؟“ اس نے پریشانی سے سوچا۔ وہ کرسی پر بنا کوئی حرکت کیے بیٹھی تھی۔ اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر تقی آج نہ آیا تو۔۔۔ اور اگر وہ کبھی واپس نہ آیا تو۔۔۔؟ وہ یہ بات سمجھتی تھی کہ تقی کے دل میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے اور جس طرح کے حالات کے نتیجے میں وہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ وہ تقی کے دل میں شاید ہی کوئی مقام بنایا۔ وہ بھی اس صورت میں اگر تقی کی زندگی میں کوئی اور عورت نہ ہوئی۔ پھر اس کا خاندان۔۔۔ آف۔۔۔ اس نے اضطراب سے ٹھلنا شروع کر دیا۔ پھر تقی کی چارپائی کے نیچے پڑے اس کے سوٹ کیس پر نظر پڑی تو تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گھسیٹ لیا۔

یہ ایک بڑا سوٹ کیس تھا اور تقی کے کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ترتیب یاد رکھ کر کپڑے نکالنے شروع کیے۔ بہت ساری شے ترتیب سے پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ ابھی پیک تھیں۔ جینز، ڈریس، ہینٹس، اسٹائلش جیکٹس، ہر کپڑا ہی برانڈڈ تھا۔ ایک فولڈر فائل کھڑی کر کے ایک طرف رکھی گئی تھی۔ ارسہ نے نکال کر کھولی۔ سب سے اوپر ان کا نکاح نامہ تھا۔ وہ بہت دیر سے دیکھتی رہی۔ باقی اس کے اور یجنل ڈاکومنٹس تھے۔ اس کی ڈگریاں، سرٹیفکیٹس، اس کا اکیڈمک ریکارڈز بردست تھا۔ ایک کمپیوٹر کے کسی کورس کا سرٹیفکیٹ تھا اور ایک ٹیچنگ سرٹیفکیٹ۔ یعنی وہ پہلے اسلام آباد میں بھی ٹیچنگ ہی کر رہا تھا۔ وہ غور سے سب دیکھتی رہی۔ کانووکیشن ڈے کا ایک بڑا گروپ فوٹو تھا۔ ان میں اس نے تقی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پھر پہچاننے میں کامیاب رہی۔ اسے بہت خوشی ہوئی تھی اس پر۔ پھر

بہت دیر دیکھ کر فائل بند کر دی۔ سوٹ کیس کی ایک پاکٹ میں پیسے تھے۔ اس نے نکال کر گنے۔ ساڑھے تیرہ ہزار تھے۔ پھر واپس رکھ دیے۔ ایک موبائل فون کا ڈبا، ہیکٹ پر فوم گھڑی اور اسٹڈ کے کیزز باہر سے کی آواز پر ارسہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کو ساری ترتیب بھول گئی۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سوٹ کیس بند کر کے واپس دھکیلا۔ پھر کھڑے ہو کر خود پر قابو پاتے ہوئے آواز سننے کی کوشش کی۔ گلی میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ دیر ایک موٹر سائیکل کے گزرنے کی آواز آئی اور بس۔۔۔

ارسہ نے پھر سوٹ کیس کھول کر کیڑوں اور دوسری چیزوں کی ترتیب دیکھی اور پھر کچھ مطمئن ہو کر پینڈ کر دیا۔ پھر بے ارادہ ہی واش روم جا کر دیکھا۔ وہاں تقی کی ایک قمیص تھی۔ جو اس نے کل اتاری تھی۔ تقی ایک شرٹ ایک ہی دن پہنتا تھا۔ ارسہ تقی کی قمیص لے کر اپنی چارپائی پر آ بیٹھی اور منہ پر رکھ کر لیٹ گئی۔ ”آف تقی کی خوشبو۔“ آہستگی سے مسکرائی۔

”یہاں سب سے قیمتی ایک تقی ہیں اور ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں۔“ پھر سوچا۔ ”میں بھی کتنی پاگل ہوں نا، اگر تقی نے واپس نہ آنا ہوتا تو اپنی ساری چیزیں اس طرح چھوڑ کر جاتے اور اگر وہ مجھے کہتے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں تو۔ میں انہیں روک سکتی تھی بھلا۔“ سر جھٹکا۔

اتنے میں عشاء کی اذان ہونے لگی۔ دفعتاً وہ چونکی۔ قمیص منہ سے ہٹائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”باہر تو رات ہو گئی ہے۔ اب رات اور اندھیرے کا خوف اس پر حاوی ہوا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کو لگا کہ کچن میں کوئی ہے۔ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے جسم میں اتنی طاقت بچی نہیں رہی کہ وہ اٹھ کر کچن کا دروازہ بند کر سکے۔ یہ اس کی اپنی سوچ کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف کا نتیجہ تھا۔ اگلے لمحے وہ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اٹھی اور کچن کا دروازہ ٹھاک کی آواز سے بند کر دیا۔ خوف سے اس کے جسم پر لرز طاری ہو گیا تھا۔ گیٹ بجنے کی آواز آئی تو ارسہ کی چیخ نکل گئی۔

ایک لمحے کے لیے اس کو لگا تھا کہ کچن کا دروازہ بجایا ہو اندر سے کسی نے جو اس نے ابھی بند کیا تھا۔ گیٹ وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ کون ہو سکتا ہے۔ میں اس وقت باہر نہیں نکل سکتی۔ واپس اپنی چارپائی پر دونوں ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

”ارسہ۔!“ بہت دیر دروازہ بجانے کے بعد تقی نے گھبرا کر اسے آواز دی تھی۔

”تقی۔“ ارسہ نے تیزی سے بھاگ کر گیٹ کھولا اور کندھے سے نیچے تقی کا کوٹ دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تقی نے دیکھا وہ کانپتے ہوئے رو رہی تھی۔

”ارسہ۔ کیا ہو گیا؟ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟ سب ٹھیک ہے؟“ وہ بے طرح پریشان ہوا۔ جو بھی تھا یہ لڑکی تھی تو اس کی ذمہ داری۔

”تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟“ آخر تقی نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا اور زور دے کر پوچھا۔

”اندھیرا ہے۔“ ارسہ نے پیرا گراف کے دو الفاظ ہی بولنے ہوئے تھے۔ آگے خود سمجھو۔ وہ اندھیرے سے ڈر رہی تھی۔ تقی نے سمجھ کر گہری سانس لی۔

”تو صحن کی لائٹ جلا لی ہوتی اور اندھیرا کہاں ہے؟ دیکھو! اتنی روشنی تو ہے چاند کی۔“ ارسہ نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا اور پھر صحن میں پھیلی میٹھی چاندنی کو۔ ہاں واقعی اندھیرا کہاں ہے؟ اگر تقی جیسا چاند اس کی زندگی میں رہے تو اندھیرا ٹھہر سکتا تھا بھلا۔ اس نے سوچا۔

”اندرا چلو سردی ہے۔“ تقی بولا تو ارسہ چونک کر پیچھے ہٹی۔ تقی نے سارے شاپنگ بیگز ایک ہاتھ میں منتقل کیے اور گیٹ بند کر کے آگے بڑھ گیا۔

”دن بہت چھوٹے ہیں۔ ہر کام جلدی کرنے کے باوجود بھی میں لیٹ ہو گیا۔“ اپنی چارپائی پر بیٹھ کر شاپنگ بیگ ارسہ کی طرف کھسکائے۔ ”یہ تمہاری چیزیں ہیں۔“

ارسہ تقی کی طرف رخ کر کے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تقی کے ہونے سے دل میں اترنے والے اطمینان کو محسوس کرتے ہوئے جھک کر دیکھنے لگی کہ اس کے

رہتی ہے۔ سوائے اس وقت کے جب واقعی یاد رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“



”علشبد!“

”ہوں۔“ علشبد نے نوٹس سے سراٹھا کر پہلے سر کو دیکھا اور پھر ارسہ کو۔
”کیا ہے؟“

”سوری!“ ارسہ شرمندہ ہوئی۔ یہ سرتقی کی کلاس تھی۔ کچھ دیر بعد ٹیسٹ ہونے والا تھا۔ علشبد پوری طرح پڑھنے میں منہمک تھی۔ جب ارسہ نے اپنے دھیان میں اسے بلایا۔

”کوئی بات نہیں بولو۔“ علشبد نے سر کو دیکھ کر آہستگی سے کہا۔

”سرتقی کی ڈریسنگ کیسی ہوتی ہے؟ مطلب تمہیں کیسی لگتی ہے؟“ ارسہ کو اس وقت اپنا یہ سوال بے تکالفاً مگر پوچھ ہی لیا جو اس کے دل میں تھا۔ آواز بہت آہستہ رکھی کہ کہیں ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے۔ تقی کی کلاس میں کوئی بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ہی تقی خود کوئی فالتو لفظ منہ سے نکالتا تھا۔

”بہت اچھی ہوتی ہے کیوں؟“ علشبد نے جواب دے کر پوچھا۔

”ویسے ہی پوچھ رہی تھی یا رکہ واقعی اچھی ڈریسنگ ہوتی ہے یا صرف مجھے ہی لگتی ہے۔“

”نہیں۔ اچھی ہوتی ہے۔ واقعی اچھی ہوتی ہے۔“ علشبد نے ایک لمحے کے لیے اچھ کر ارسہ کو دیکھا، پھر سامنے دیکھنے لگی۔

”یاد پتا نہیں کیوں۔ مجھے سر کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ یہاں تک کہ جو چیز یہ استعمال کے بعد پھینک دیتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے وہ بھی اٹھا کر محفوظ کر لوں۔ ان کا صرف آس پاس ہونا بھی سکون دیتا ہے۔“ ارسہ رک رک کر بولی۔

”یعنی تمہیں سر سے محبت ہو گئی ہے۔“ علشبد

چہرہ بے تاثر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

لیے کیا آیا ہے؟ اس میں سوٹ تھے۔ تین بے حد خوب صورت ڈیزائنر سوٹ، ارسہ نے اب دل میں خوشی کو سرا بھارتے محسوس کیا۔ جس کے رنگ چہرے پر بھی پھیلنے لگے تھے۔ اسے تینوں سوٹ بہت پسند آئے۔ دوسرے بیگ میں جوتے تھے۔ وہ نکال کر پہننے لگی، تو دیکھا۔ اس کے پاؤں گندے تھے اور کچھ زخمی بھی۔ وہ ننگے پاؤں گیٹ کھولنے کے لیے بھاگی تھی اور کچے صحن میں چھوٹے چھوٹے پتھر، کنکریاؤں میں چبھے تھے۔ اب آہستہ آہستہ حواس واپس آنے پر درد محسوس ہو رہا تھا۔ جوتے بھی بہت اچھے تھے مگر سائز بڑا تھا۔ تقی اپنی گردن کا پچھلا حصہ دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ارسہ نے تیسرے بیگ کو دیکھا تو بول پڑا۔

”اس میں کھانا ہے۔“ تقی اپنے لیے کچھ نہیں لایا تھا۔ وہ تو یہاں بھی بازار سے سبزی لینے جاتا تو اپنے لیے کچھ خرید لانا تھا اور اب اسلام آباد سے اپنے لیے کچھ نہیں لایا تھا، ناقابل یقین۔

”تم نے کھانا بنایا؟“ تقی نے پوچھا تو اسے یاد آیا کہ اس نے تو کالج سے آکر کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ بنانا کیا

تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے سخت بھوک اور سردی لگ رہی تھی۔ ”سردی“ اس کی مثال کہاں تھی؟ وہ

بس ایک پتلا سا سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ ارسہ نے تقی کی چارپائی کے پار اپنی چارپائی کی طرف دیکھا تو اسے

وہاں اپنی شال پڑی نظر آئی اور ساتھ ہی اپنے تکیے پر بڑی تقی کی شرٹ۔ ”اوہ خدا۔ میں کن حالوں میں بیٹھی ہوں۔“ جواب نہ ملنے پر تقی ”اچھا کھانا نکالو“

کہتے ہوئے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

ارسہ کہنا چاہتی تھی کہ اسے یہ چیزیں بہت اچھی لگی ہیں اور تقی کا اس طرح اس کے لیے کچھ لانا اس کے لیے بہت اہم اور خوشی کی بات ہے مگر۔

تیزی سے اٹھ کر شال اوڑھی اور شرٹ تہ کر کے اپنے تکیے کے نیچے چھپائی۔ ”حد ہوتی ہے ارسہ

بدحواسی کی بھی۔ کسی چیز کو حاوی ہی تو نہیں ہونے دینا

ہوتا خودیر۔ عکرشہ باجی مجھے آپ کی ہریات ہمیشہ یاد

READING
Section

ماہنامہ شعاع فروری 2016 220

”شاید۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے تھانا۔“ ارسہ افسردہ ہوئی۔
 ”کیوں۔“ علشبدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یار مانا کہ ہم ایک دوسرے کے نکاح میں ہیں مگر یہاں یہ رشتہ قائم بھی رہے گا یا نہیں۔ ہمارے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ میں اتنے عرصے سے ان کے ساتھ ہوں مگر پھر بھی ابھی تک ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، کچھ بھی نہیں۔“ نہیں پر زور دیا۔ ”پتا نہیں کل کیا ہونے والا ہے۔ پھر بھی مجھے یہ دل کے قریب کیوں محسوس ہوتے ہیں؟“ ارسہ نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ ”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھانا۔“ اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

علشبدہ پر واضح ہوا کہ ارسہ، تقی کو کھونا نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ یہ رشتہ قائم رہے گا۔ اگر خداخواستہ یہ رشتہ قائم نہ رہتا تو اس کی دوست کا صرف گھر ہی نہیں دل بھی اجڑتا اور اصل میں دل کے اجڑنے کا مطلب ہی دنیا اجڑنا ہوتا ہے۔ علشبدہ نے اسے خود کو مضبوط کرو، ایک انسان پر دنیا ختم نہیں ہوتی، ٹائپ کی کوئی نصیحت نہیں کی۔ اس کی بجائے اس نے ارسہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دیا۔

”سنو ارسہ! ایسا ویسا کچھ نہیں ہونے والا۔ پتا ہے کیوں؟“ ذرا توقف کیا۔ ”کیونکہ میں تمہارے لیے بہت دعا کرتی ہوں اور پتا ہے نازعا میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی بس دعا کرو۔ دل میں برے خیالات کو جگہ مت دو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔“ علشبدہ کے دلاسہ دینے کا انداز اتنا اچھا تھا وہ اتنے پر یقین لہجے میں بولی تھی کہ ارسہ کے دل کا بو جھل پن یک دم غائب ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائیں۔ مگر تقی کے ڈر سے جلد ہی مسکراہٹ کا گلہ گھونٹ کر اپنے نوٹس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔



دو مہینے اور اسی طرح گزر گئے تھے۔ جب کلج کا دو

دن کا ٹور پلان ہوا لیکن تقی نے دو دن کی مزید چھٹی لی اور ارسہ کو لے کر اسلام آباد آگیا۔ ارسہ نے جب تقی سے ٹور کا پوچھا تھا تو التقی نے اس سے سوال کیا تھا۔ ”کیا تم ان لوگوں کے ساتھ ٹور پر جانا چاہتی ہو جو ہمیں کلج میں بھی اپنا وقت سکون سے نہیں گزارنے دیتے؟“ اس پر ارسہ خاموش ہو گئی تھی۔

ارسہ پہلی بار تقی کے خاندان سے ملنے والی تھی، جانے سب کا رد عمل کیا ہوتا۔ وہ پریشان تھی کہ اسے کوئی آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔ ایک طرف وہ جانا چاہتی تھی کہ تقی کا اصل کیا ہے؟ اس کی فیملی کیسی ہے؟ وہ پہلے کہاں اور کس طرح رہا کرتا تھا؟ اس کی زندگی میں کون کون ہے؟ مگر دوسری طرف خوف زدہ بھی تھی۔ رد کیے جانے کا خوف، بے عزت کر کے تقی کی زندگی سے الگ کیے جانے کا خوف۔ وہ اس طرح بے دخل اور بے گھر نہیں ہونا چاہتی تھی مگر آج یا کل یہ تو ہونا ہی تھا۔ ارسہ نے سارا سفر ان ہی سوچوں میں کم رہتے طے کیا تھا اور اب اسلام آباد کے ایک بے حد خوب صورت دو منزلہ گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

تقی کے ساتھ اندر داخل ہوتے اس کی ٹانگیں بری طرح کانپنے لگی تھیں۔ تقی بار بار میڑ کر اسے دیکھتا لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ بالآخر جھنجلا کر بیگ اٹھائے آگے بڑھ گیا۔ ارسہ کے سامنے تین سیڑھیاں تھیں اور آگے داخلی دروازہ جہاں تقی ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔ دروازہ آہستہ آہستہ خود ہی بند ہو رہا تھا۔ اندر تقی کی پر جوش آواز کے ساتھ کسی عورت کی آواز سن کر ارسہ کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ اسے اپنے سینے میں دل کے مقام پر باقاعدہ درد محسوس ہوا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ اسی طرح اپنے باپ کے ساتھ پول ہی کسی انجان، اجنبی گھر میں داخل ہوئی تھی تو اسے کیا سننے کو ملا تھا۔ وہ عورت اس کی پاک باز اتنی خوب صورت اور اتنی میران ماں کے بارے میں جن الفاظ میں بات کر رہی تھی وہ ایسے الفاظ تھے جن کی بازگشت کی وجہ سے اس کی کتنی ہی راتیں آنکھوں

میں کئی تھیں۔ چنگھاڑتی ہوئی آواز میں ارسہ اور اس کی ماں کو گالیاں دیتے ہوئے اسے جانے کو کہہ رہی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ اس کے لیے اس گھر میں ان کی زندگیوں میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ اسے کبھی یہاں نہیں رہنے دے گی۔

زندگی میں پہلی بار ارسہ کو کسی نے دھتکارا تھا۔ اس کے وجود کی نفی کی تھی۔ وہ یہ تکلیف ساری زندگی بھول سکتی تھی نہ ہی اس پائیندگی کا وہ بھیاں تک انجام دے۔ ”اب پھر وہی ہوگا“ تقی بھی میرے باپ کی طرح مجھے تنہا چھوڑ کر منظر سے غائب ہو چکا ہے۔ میں پیدا ہی ذلیل و خوار ہونے کے لیے ہوئی ہوں۔“ اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ کنپٹی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ نظریں سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے دروازے تک گئیں۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر سے ایک بہت حسین اور باوقار عورت چہرے پر مہربان مسکراہٹ لیے باہر نکلتی دکھائی دی اور پیچھے آتا تقی۔ ارسہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے آج تک اتنا خوب صورت اور پر نور چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

”سنگھا اے بچے (کیا حال ہے بچے؟) باہر وے ولاڑا اے (باہر کیوں کھڑی ہو؟) رازہ (آؤ۔)“ ارسہ ہونق ہوئی۔ انہوں نے دھیان دیے بغیر آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھام کر اسے پر بوسا دیا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے سے برسوں بعد ملی ہو۔ ”اتنی محبت۔“ ارسہ نے پیچھے کھڑے تقی کو دیکھا۔ آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔

”یہ میری آپا ہیں۔ میری بڑی بہن۔“ تقی نے تعارف کرایا۔

”دے لہ پختونہ ورزی۔“ (اسے پشتو نہیں آتی۔) اب کہ وہ ان خاتون سے مخاطب ہوا تھا وہ ایک دم ہنس پڑیں۔

”خسہ خسہ۔“ (اچھا۔ اچھا۔) ”تم شکل سے بالکل پٹھان لگا مجھے۔“ ارسہ کے برف ہوتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر تقی کی طرف

مڑیں۔ ”یہ تو بہت پیارا دکھتا ہے۔“ اب کہ تقی کو دیکھ کر کہا۔ تقی اثبات میں سر ہلا کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ”آجاؤ بچے۔“ انہوں نے بھی تقی کے پیچھے قدم بڑھائے۔ پیار کی حدت سے ارسہ کے اندر زندگی کی حرارت پیدا ہونے لگی تھی۔ آیا اس کے کانپنے کو تو سردی بہ محمول کر سکتی تھیں مگر اس کی شکل سے اصل معاملہ سمجھ میں آتا تھا۔ وہ اسے اس مشکل سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”یہ تقی کی آپا ہیں۔ انہوں نے کچھ برا بھلا تو کہا ہی نہیں۔“ ارسہ خوب صورتی سے سچے لاؤنج میں میٹر کے سامنے بیٹھنے تک یہی سوچ رہی تھی۔ آیا اس کے ساتھ بیٹھی تھیں اور اپنے بختون لہجے میں چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں۔ تقی سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر انہیں سن رہا تھا۔ تقی کی اردو بہت اچھی تھی لیکن پھر بھی جب وہ بولتا تو سننے والے کو اندازہ ہو جاتا کہ وہ پٹھان ہے۔ یہ سب ارسہ کی سوچ کے برعکس بہت اچھا تھا۔ تقی کے گھر کا کوئی فرد اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ واقعی ارسہ نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔

آپا کے علاوہ دلشاد سے تعارف ہوا۔ وہ ان کی ملازمہ تھی۔ آپا نے ارسہ سے اس کے خاندان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں تقی نے ان کو کیا بتا رکھا تھا۔

دونوں کو بہت سا کھلانے پلانے کے بعد وہ ارسہ کو ایک بیڈ روم میں چھوڑ گئی تھیں کہ وہ یہاں آرام کرے۔ ارسہ کتنی ہی دیر تحیر کے عالم میں بیڈ پر بیٹھی رہی۔ تو یہ تقی کا وہ خاندان جس کا خیال اگر سوتے میں آتا تو خوف و ڈر کی وجہ سے اس کی نیند اڑ جاتی۔ بیٹھے ہوئے آتا تو کھڑی ہو جاتی۔ کھڑے ہوئے آتا تو رگ و جان میں اضطراب دوڑ جاتا۔ یہ کوئی خواب تو نہیں ہے۔ یا کسی خواب کا خوب صورت حصہ اور کچھ ہی دیر میں وہ خواب کے بھیاں تک حصے میں داخل ہونے والی ہے۔ وہ بہت وقت انہی سوچوں میں گم رہی۔ پھر کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو چونک کر حال میں واپس

آئی۔

یہ دلشاد تھی۔ جو اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ ارسہ کو حیرت ہوئی۔ کھانا اب تیار ہوا ہے تو کچھ دیر پہلے جو اتنا کھایا تھا، وہ کیا تھا؟ اسے بالکل بھوک نہیں تھی مگر باہر تو جانا ہی تھا۔ اس نے سوچا شاید کھانے کی میز پر کسی اور سے تعارف ہو مگر وہاں تقی اور آیا ہی تھے۔

یہاں آئے ہوئے انہیں آج چوتھا دن تھا۔ ان چار دنوں میں اس نے آیا کے ساتھ اسلام آباد دیکھا تھا اور آیا نے ڈھیروں شاینگ بھی کرائی تھی اسے۔ وہ شکر منا رہی تھی کہ اس کی کچھ دن اپنے بد مزہ کھانوں سے جان چھوٹی۔ کبھی نمک مرچ زیادہ کبھی کم کبھی ہانڈی سے عجیب کچا کچا ذائقہ آنے لگتا۔ روٹی اکثر جل جاتی اس نے تقی کی برداشت کو سلام کیا۔

اسے یہاں دو سری صبح ناشتے کا واقعہ یاد آیا۔ قہقہے کے پرائٹھے بنے تھے۔ وہ اور آیا ناشتے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ جب تقی باہر سے آنا دکھائی دیا۔ شاید واک کر کے آیا تھا۔ آپا نے اسے ساتھ ناشتا کرنے کو کہا۔

”میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“ کہہ کر اوپر چلا گیا۔ دلشاد نے تقی کے لیے جو پرائٹھا لا کر رکھا، وہ ایک طرف سے ذرا سا جلا ہوا تھا۔ آپا نے فوراً ”اس کی جگہ دوسرا لانے کا کہا۔ پھر ارسہ کو بتانے لگی کہ تقی کھانے میں بہت نقص نکالتا ہے۔ اس کو بہت کم چیزیں پسند آتی ہیں۔ جلا ہوا پرائٹھا دیکھ کر تو وہ ناشتا کیے بنا ہی اٹھ جاتا ہے۔ ارسہ کو اس بات پر اتنی حیرت ہوئی کہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ منہ میں رکھنا ہی بھول گئی۔ تقی تو سب کچھ کھا لیتا تھا۔ پھر یہ کس تقی کی بات کر رہی تھیں۔

آپا نے اسے خاندانی تصویروں والا البم دکھاتے ہوئے سب کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہ چار بہن بھائی تھے سب سے بڑی آپا پھر ولی بھائی پھر زرمینے اور آخر میں تقی۔ تقی بہت چھوٹا تھا۔ جب ان کے والدین کی وفات ہو گئی تھی۔ آپا نے ہی تقی کو پالا تھا۔ وہ انہیں اکثر ”مورے“ کہہ کر بلاتا تھا۔

تقی کی چھوٹی بہن زرمینے ان لوگوں سے اگلی صبح ملنے آئی تھیں۔ ان کے انداز میں بڑی آپا جیسی گرم جوشی تو نہیں مگر سرد مہری بھی نہیں تھی۔ بس ساہو سا انداز تھا۔ جیسے پہلی بار کسی سے ملنے پر اکثر لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ بھی شادی شدہ اور بچوں والی تھیں۔ ان کا ایک بڑا خاندان تھا۔ وہ بس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔ پھر ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ولی بھائی آسٹریلیا میں اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھے اور آپا کے دونوں بیٹے بھی وہاں ہی ماموں کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے۔ آپا کے شوہر کا انتقال ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ ان کا آبائی گھر سوات لوہور میں تھا۔ جب ہی اس روز تقی نے کہا تھا۔ ”ہم پہاڑی لوگ ہیں۔“ وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد یہاں شفٹ ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کی اردو اتنی اچھی نہیں تھی۔ ارسہ کو ان کی باتیں سن کر بڑا مزہ آتا تھا اور کبھی ہنسی بھی۔ ارسہ کا سارا دن ان کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ ان سے ہر بات کر لیتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے اپنی ماں سے کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت ارسہ لان میں بیٹھی یہاں گزرنے والے وقت کو سوچ رہی تھی اور تقی ٹیرس پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

ارسہ نے سفید سوٹ اور جینز کا اشانلٹیں سا جیکٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں میں جوڑا، جواب تقریباً کھل چکا تھا۔ دوپٹا بس بائیں بازو پر ذرا سا ٹکا تھا اور باقی نیچے کھاس پر پڑا تھا۔ گود میں میگزین رکھے، کرسی کی پشت سے سر نکالے آنکھیں موندے بہت پر سکون اور مطمئن سی بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر جوس کا گلاس رکھا تھا۔ سفید کپڑوں پر پڑتی دھوپ کی وجہ سے اس کے ارد گرد نور کا ہالہ سا بن رہا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے کسی ملکہ کی طرح شان سے بیٹھی سرویوں کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

تقی اسے دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ ٹائم کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اسے اپنے دوست سے ملنے جانا ہے۔ وہ ٹیرس سے اتر کر لان میں آیا اور ارسہ کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس تک

پہنچا۔ جس کے گل دھوپ میں دھک رہے تھے۔ اس وقت تقی کو لگا کہ اس نے آج تک ارسہ سے زیادہ شہن دار لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچا آج اسے بات کر ہی لینی چاہیے۔ ارسہ نے کسی کی موجودگی محسوس کر کے آنکھیں کھولیں اور تقی کو دیکھ کر بوکھلا کر سیدھی ہوئی اور اپنا دہنا سنبھالا۔ تقی اس کے تاثرات دیکھ کر جھٹکا گیا۔

”یعنی کہ حد ہے۔ ابھی اتنے سکون سے بیٹھی تھی۔ میں کوئی دیو ہوں جو مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا سارا اطمینان اڑن چھو ہو جاتا ہے۔“ تقی کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

”تیا کہاں ہیں؟“ غصے میں ہی منہ میں آیا تو ماتھے پر ہاتھ ڈال کر پوچھا۔

”آہ اندر۔ اندر ہوں گی۔“ ارسہ نے اس کے غصے سے گھبرا کر اکتے ہوئے جواب دیا۔ تقی جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

”میں کیا ہوا؟“ پھر گھبراہٹ میں سامنے پڑا جوس کا گلاس اٹھلایا اور ایک ہی سانس میں سارا خالی کر دیا۔ ”ویسے یہ ہوتے کہاں ہیں؟ نظری نہیں آتے۔“ پھر کندھے اچکا کر گلاس اٹھا کر بچن کی طرف چل پڑی۔ اسے تقی ہیلمٹ اٹھا کر باہر نکلتا دکھائی دیا۔



رات کو ارسہ اپنے بیڈ روم میں تقی کا لایا ہوا سوٹ دیکھ رہی تھی۔ جو تین سوٹ تقی لایا تھا۔ ان میں یہ سب سے بہترین تھا۔ علشہ کو بھی یہی سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ سلائی بھی وہی کرا کے لائی تھی۔ ارسہ نے ابھی تک پہنا نہیں تھا۔ اس نے شیشے میں دیکھتے ہوئے سوٹ خود سے لگا کر دیکھا۔

”اس کی فٹنگ کچھ زیادہ ہی نہیں؟ پہن کر چیک کرتی ہوں۔“ وہ دن میں تقی سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ واپس کل جائیں گے یا پرسوں؟ مگر تقی کا غصہ۔ وہ ہنک سے کوئی بات ہی نہیں کہلاتی تھی۔ ”میرے خیال میں کل ہی واپس جانا ہو گا۔ چلو پھر ابھی نہا کر

پہنتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کیا لگتا ہے۔ یہاں میں خود ہی تو ہوں۔“ خود سے باتیں کرتی مسکرائی۔ ٹائم دیکھا۔ ساڑھے دس۔ ڈرائنگ ٹیبل پر پڑے کاسیٹس کے سلمان کو دیکھ کر مسکرائی۔ آج اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔

فیصلہ کر کے نہانے چل دی۔ نہا کر بال خشک کیے۔ ”اف گرم پانی سے نہا کر بھی سردی لگ رہی ہے۔“ پھر اپنے کارٹاے پر مسکراتی باہر آئی لیکن سامنے دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ تقی بیڈ پر۔ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ ”یہ کہاں سے آگے؟“ اس نے انگلی کا ناخن دانتوں میں دبایا۔ اس کے دوپٹے کا کچھ حصہ تقی کے کندھے اور کمر کے نیچے دبا تھا۔ اپنی جگہ کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا کروں؟

”یہ یہاں سو رہے ہیں تو پھر میں کہاں سوؤں گی؟“ آہستہ آہستہ چلتی بیڈ کے قریب آئی۔ پریشانی میں یہ بھی نہیں دیکھ پائی کہ اس سوٹ میں کیسی لگ رہی ہے۔ فی الحال اسے بس تقی کے نیچے دبا اپنا دوپٹا چاہیے تھا۔ تقی کو غور سے دیکھا وہ سو ہی رہا تھا۔ پھر جھک کر اپنا دوپٹا کھینچا۔ اسی اثنا میں لائٹ چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ جا کر یو پی ایس سے لگے انرجی سیور آن کرتی تقی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے بیڈ پر کھینچ لیا۔ ارسہ کے منہ سے دلی دلی چیخ ہی نکل سکی۔



دہ تپا کے کہنے پر ایک دن مزید ٹھہر کر اگلے دن واپس آگئے تھے۔ ڈیڑھ ماہ سے پھر وہی روئین تھی۔ تقی پہلے سے کچھ زیادہ ہی خفا معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کی وجہ ارسہ کی سمجھ میں آگئی تھی مگر جھک اور خفت و ندامت کی وجہ سے اپنے رویے کی وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ صبح ناشتا بنا رہی تھی اور تقی باہر صحن میں اپنی روئین کی مشکل مشکل ورزشیں کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک ارسہ کو چکر سا آیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر تھام کر خود کو سنبھالا۔

پھر ناشتا کرنے کو بھی اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا

پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں، وہ ابھی رہی یا نہیں۔
 ارسہ کین وقتوں سے بیگ سنبھالتے ہسپتال تک پہنچی
 تھی۔ تقی کو اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ارسہ کی
 نظروں میں زمین آسمان گھوم رہے تھے۔ قدم کہیں
 رکھتی اور پڑ کہیں اور رہا تھا۔ بیٹھنے کو بیٹھ ملا تو اس نے
 شکر کا کلمہ پڑھا۔



ارسہ اپنی باری پر چیک کرانے اندر گئی۔ تقی باہر ہی
 بیٹھ کر انتظار کر رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک
 کیا اور پھر معاملہ سمجھ کر اس سے پوچھا۔

”تم ارسہ ہونا؟ عاصمہ کی بیٹی؟“
 ”جی۔۔۔“ وہ بھی ڈاکٹر نوٹسین کو جانتی تھی۔ اپنی امی
 کے ساتھ پہلے بھی ان کے پاس آتی رہتی تھی۔
 ”تمہاری امی کا تو انتقال ہو گیا ہے نا؟“
 ”جی۔۔۔“ ارسہ نے ہولے سے سر ہلایا۔

”کس کے ساتھ آئی ہو؟“ ڈاکٹر نے افسوس سے
 سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”سر کے ساتھ۔۔۔“
 ”کون سر؟“ ڈاکٹر نے یونیفارم میں بلبوس لڑکی کو
 کچھ الجھ کر دیکھا۔ ارسہ فوراً ”سر تقی کہنے والی تھی، مگر
 یہ سوچ کر خاموش رہی کہ ان کو کیا پتا سر تقی کون ہیں۔
 یہ تو سر کو نہیں جانتی نا۔“

”بولو۔۔۔“ ارسہ اب بھی کوئی جواب نہیں دے
 پائی۔ ”نام کیا ہے سر کا؟“
 ”سر تقی۔۔۔“

”رضیہ باہر سے تقی نام کے بندے کو پلائیں۔“
 رضیہ نامی نرس ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھی۔ ”جی
 اچھا۔۔۔“ کہتے ہوئے دروازے سے ہی واپس ہوئی۔
 تقی اندر آیا تو ڈاکٹر نے اسے بیٹھنے کا کہا اور پھر
 چبھتے لہجے میں پوچھا۔

”یہ آپ کی اسٹوڈنٹ ہیں۔“
 ”جی یہ میری وائف ہیں۔ اتفاق سے اسٹوڈنٹ
 بھی۔۔۔“ تقی ارسہ سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور معاملہ
 فہم تھا۔ ”ارسہ کی بچی۔۔۔“ تقی نے اسے گھورا۔

تھا۔ وہ بس بے دلی سے ناشتا ٹھونس رہی۔ تقی روز کی
 طرح بے حد سنجیدگی سے کھا کر اٹھ گیا۔ کالج میں پہلی
 ہی کلاس میں ارسہ کو متلی محسوس ہوئی۔ وہ علشبہ کے
 ساتھ کلاس سے باہر آئی۔ صبح جو تھوڑا بہت ناشتا کیا تھا
 اب وہ بھی نکل گیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں سر کو بتاتی ہوں۔ وہ تمہیں
 ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں۔“ علشبہ نے فکر مندی
 سے اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر کہا۔

”نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں اب۔ یہ صبح سے بلکہ
 کل سے طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔“ ارسہ
 نے علشبہ کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے جانے سے
 روکا۔

”کل سے۔۔۔ اور تم نے ابھی تک ڈاکٹر کو نہیں
 دکھایا۔“ علشبہ نے گھورا۔

”کچھ نہیں ہوا، چلو کلاس میں۔“ چھٹی سے پہلے
 ارسہ کو پھر ایک بار باہر آنا پڑا تھا۔ اب اسے بری طرح
 چکر آرہے تھے۔ تقی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے
 حسب معمول ارسہ کو آتے دیکھ کر چلنا شروع کر دیا۔
 علشبہ نے آگے بڑھ کر تقی کو صورت حال سے آگاہ
 کیا۔ ارسہ بھی ان لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔

”کیا ہوا ارسہ؟“ تقی نے غور سے اس کا چہرہ
 دیکھا۔ وہ واقعی بیمار اور نڈھال سی لگی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ متلی ہو رہی ہے بار بار۔“ ارسہ
 کے لیے اب بولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

”سر آپ اسے اسپتال لے جائیں، یہ کل سے بیمار
 ہے۔“ علشبہ کے کہنے پر تقی نے ایک بار پھر ارسہ کو
 دیکھا۔

”کل سے بیمار ہے۔“ اسے تو پتا ہی نہیں چلا۔
 پھر ذرا چونک کر بولا۔ ”ہاں چلو۔“

”میں بھی ساتھ چلوں؟“ علشبہ نے پوچھا۔
 ”نہیں علشبہ، تم گھر جاؤ یا۔ تمہاری امی پریشان
 ہوں گی۔“ ارسہ نے اسے روکا۔

”ٹھیک ہے، تم اپنا خیال رکھنا۔“
 تقی کالج سے نکل کر قریبی ہسپتال کی طرف چل

گی۔ ”ہوں۔۔۔ ہرینڈ“ وائف ایسے ہوتے ہیں۔“ ارسہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے سوچا لیکن اس کا وائف کہنا اسے کہیں بہت اچھا بھی لگا تھا۔

”اوس۔۔۔ اچھا۔۔۔ کتنا عرصہ ہوا ہے آپ کی شادی کو ارسہ؟“ اب کی بار ذرا مسکرا کر پوچھا گیا۔ ”پچھ ماہ۔۔۔“ جواب تقی کی طرف سے آیا۔



گھر پہنچ کر ارسہ نے جوتے اتارے اور دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ اس کی ہمت بالکل جواب دے گئی تھی۔ تقی اس کے لیے پانی لے آیا۔ پھر ایک پلیٹ میں کچھ کھجوریں دھو کر اس کے سامنے لا کر رکھیں۔ ارسہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو تقی ”رکو“ کہتے ہوئے تیزی سے مڑا اور ایک ڈونگے میں پانی بھر لایا۔

”اس میں ہاتھ دھولو۔“ ارسہ کسی معصوم بچے کی طرح اسے دیکھتے ہوئے اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

تقی کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا تو وہ کھجوریں کھانے لگی لیکن یہ کیا۔ اس میں تو گھٹلی کی جگہ بادام ہے۔ ”یہ اس میں کسے آیا؟“ اس نے سوچا۔ پھر ایک ایک کر کے ساری کھجوریں کھول کر دیکھیں۔ سب میں ہی بادام تھا۔ اس کے لیے یہ نئی بات تھی۔ پہلے بادام اور کھجوریں الگ کر کے رکھیں۔ پھر مزے سے سب کھا گئی۔ اسے یہ ذائقے بہت بھلے لگے اور اپنی توانائی بحال ہوئی محسوس ہوئی۔

ارسہ برتن اٹھا کر کچن میں آئی تو تقی کچن میں تھا۔ بلیو جینز اور گرے آدھی آستینوں والی ٹی شرٹ میں اس کے بازوؤں کے مسلز نمایاں ہو رہے تھے۔ ارسہ نے دیکھا وہ رولی بنا رہا تھا۔ سوا چار ہو گئے تھے۔ صبح ناشتے کے بعد اب تک اس نے دو کپ چائے ہی پی ہوگی۔ اب اسے بھوک لگی تو خود ہی رولی بنانے لگا۔ ارسہ تیزی سے آگے بڑھی۔

”میں رولی بناتی ہوں۔“ تقی جھینپ گیا۔

”نہیں۔۔۔ تم بیمار ہو، جا کر چیخ کرؤ، میں بنالیتا ہوں۔“

”میں ٹھیک ہو گئی ہوں۔“ ارسہ کسی صورت

”مبارک ہو۔۔۔ آپ کی وائف امید سے ہیں۔“ ڈاکٹر کی بات پر تقی کی مسلسل ہلتی ٹانگ ساکت ہوئی۔ ارسہ نے بھی اپنے ہاتھوں سے نظریں ہٹا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ پھر واپس غائب دماغی سے گود میں رکھے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

”یہ بہت اچھا ہوا۔ عاصمہ نے اپنی بیٹی کو پہلے ہی اپنے گھر کا کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کے بعد یہ اب کہاں رہ رہی ہوگی۔ اس کے توفادر بھی نہیں ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے قریبی رشتہ دار وغیرہ بھی کوئی نہیں۔“ ڈاکٹر صاحبہ کو صبح وقت یاد نہیں تھا۔ ارسہ کی امی کو وفات ہوئے دس ماہ سے اوپر کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ارسہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تقی کو ہی ”جی“ کہنا پڑا۔ جبکہ ارسہ سوچ رہی تھی۔

”تقی کی چپ کو توڑنے کے لیے اتنی ہی بڑی بات کا ہونا ضروری تھا۔ ورنہ ہماری زندگیاں جمود کا شکار ہو رہی تھیں۔ روز ایک سادون۔۔۔ لیکن تقی کا رد عمل کیا ہو گا۔ کوئی مثبت تبدیلی آئے گی یا یہ اسے ایک اور مصیبت کی طرح لے گا؟ اگر۔۔۔“ تقی نے جھک کر اس کا بیگ اٹھایا۔

”چلو۔“ تو ارسہ چونک کر اٹھی اور تقی کے پیچھے باہر نکل آئی۔ اس نے تقی اور ڈاکٹر کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ اسی غائب دماغی سے روڈ کر اس کرنے جارہی تھی۔ تقی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور اس کے کان کے قریب جھکا۔

”ارسہ! یہ اتنی بڑی گاڑی ہے۔ اس کے ٹائر دیکھو۔ اور سے گزرتے بھی دیں منٹ لگائے گی۔“ ارسہ منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگے تقی نے تھوک نکلا اس کا ہاتھ پکڑا اور نرم تھا اسے لگایا ابھی کھڑے کھڑے گر جائے

لے جانے لگی۔



تقی کمرے سے باہر چوتھے پر بیٹھا تھا۔ نہ مارکیٹ گیا تھا نہ گراؤنڈ میں کھیلنے۔ کسی نقطے پر نظریں جمائے گہری سوچ میں گم تھا۔ شاید کسی الجھن کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ ارسہ نے چند لمحے دیکھنے کے بعد پکارا۔
”سر! چائے۔“

”ہوں! ہاں!۔“ وہ چونکا۔

ایک ہاتھ سے چائے کا کپ اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر احتیاط سے اپنے ساتھ بٹھایا۔ ارسہ اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی محسوس ہی نہیں کر پائی۔ جب بھی وہ قریب آتا اسے جان کے لالے پڑے ہوتے تھے۔ وہ بہت خاموش تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ارسہ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے گردن موڑ کر اس کو دیکھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بہت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ارسہ ایک دم خوف کا شکار ہوئی۔ وہ جانے کیا کہنے یا کرنے والا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک ارسہ نے اس کے چہرے پر خوشی کی چمک واضح طور پر دیکھی تھی۔ وہ یقیناً خوش تھا۔ یہ اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی۔ اتنے مہینوں میں پہلی بار اس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ جس کی وجہ سے ارسہ نے پریشانی کے بوجھ میں کمی محسوس کی تھی۔ اجنبیت کا گراف گرا تھا۔ پھر اب ایسا کیا ہو گیا تھا؟ ارسہ کی سوچوں کو بریک لگے۔ جب تقی نے ہلکی آواز میں بولنا شروع کیا۔

”ارسہ!“ تھوڑے توقف کے بعد پھر بولا۔ جیسے بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو یا سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

”میں جانتا ہوں۔ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو اور شاید کبھی رہ بھی نہ سکو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری زندگی میں جتنی مشکلات ہیں۔ ان سب کی بنیادی وجہ

نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے خود روٹی بنائے۔ اسے پتا تھا اسے روٹی پکانی نہیں آتی۔

”نہیں۔ میں بنالوں گا تم جاؤ۔“ وہ بس اسے وہاں سے بھیجنا چاہتا تھا۔ ارسہ تقی کے ساتھ بحث نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے مجبوراً وہاں سے نکل آئی۔ پھر کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھو کر بیٹھی تو تقی روٹی بنا چکا تھا۔ تقی نے ارسہ کی طرح پہلے میز دونوں چارپایوں کے درمیان لا کر رکھی۔ پھر سالن اور پانی پھر روٹی لینے چلا گیا لیکن روٹی میز پر رکھنے کے بجائے کھڑا رہا۔ ارسہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس نے انگلی اٹھا کر وارن کیا۔
”روٹی جیسی بھی ہوئی۔ تم ہنسو گی نہیں۔“ ارسہ مسکرائی، ہنسی میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں ہنسوں گی۔ آپ بھی تو نہیں ہنستے تھے میرے مہینوں (نقشوں) پر۔“

تقی زور سے ہنس پڑا۔ ”تمہاری بات اور ہے۔“ ارسہ نے پہلی بار اسے ہنستے دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں سکپڑے مہسوت سی اسے دیکھے گئی۔ اس نے روٹی رکھی تو ارسہ نے دیکھا۔ تقی نے بھی اس کی طرح ہی سب سے بہتر بنی روٹی سب سے اوپر رکھی تھی۔ روٹیاں گول کے قریب بھی نہیں تھیں اور کچھ زیادہ ہی جل گئی تھیں۔

”روٹی بنانا مشکل کام ہے۔ دوسری بنانے تک پہلی جل جاتی ہے۔“ وہ منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔

ارسہ نے ہنسی روکنے کے لیے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ تقی کو پتا تھا اسے سخت ہنسی آرہی ہے مگر اس نے ”ہنس لو“ نہیں کہا۔ ر کے نا میں نے تو بھی تو اتنا عرصہ ہنسی ضبط کرتے گزارا ہے۔ اب تقی سے خود روٹی نہیں کھائی جارہی تھی۔ پھر جلد ہی ہاتھ روک کر بولا۔

”اب چائے تم ہی بنا لینا۔ میں مارکیٹ جاتا ہوں۔ گوشت اور پھل لانے ہیں۔“ یہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ ارسہ ہاتھ کے اشارے سے اسے ویرتن اٹھانے سے روک کر خود اٹھی اور برتن کچن میں

میں ہوں۔ میرے لیے اس طرح بات کرنا بہت مشکل ہے مگر میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک خود غرض انسان ہوں۔ میری خود غرضی نے ہی تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم آج اس حال میں نہ ہوتیں۔ اگر وہاں سے بات شروع کروں جب میں یہاں آیا اور کیسے آیا تو۔۔۔ اس سے پہلے میں اسلام آباد کے ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتا تھا۔ یہ ڈگری مکمل کرنے کے بعد میری پہلی جاب تھی۔ میں اپنے بھائی کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے جو کام ملا وہ کیا۔ پھر یہاں ایوانٹ ہوا۔ پہلی بار کالج میں، پہلی جو کلاس لی تھی وہ تمہاری کلاس تھی۔ اتنی بڑی کلاس میں اتنی زیادہ لڑکیوں کے درمیان، جس نے مجھے متوجہ کیا، وہ تم تھیں، ان شارٹ اپنی پوری زندگی میں کسی سے اس حد تک متاثر نہیں ہوا۔ یہ صرف تمہاری خوب صورتی، تمہاری معصومیت نہیں تھی۔ کالج کے تمام ریکارڈ بریک کرتا ہوا، تمہارا فرسٹ ایئر کارڈ، تمہارے سب ٹیسٹ، کلاس میں تمہارا سویر اور منفرد انداز یہاں تک کہ ٹیچرز میننگ میں بھی کئی مرتبہ تمہارا ذکر ہوتا تھا اور پرنسپل اتنے احترام اور فخر سے تمہارا نام لیتے کہ میں سوچتا تھا کہ کوئی اتنا پرفیکٹ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ارسہ کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ وہ ذہین اور محنتی تھی۔ اس لیے اس کا رزلٹ اچھا آیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اس نے کبھی خود کو اتنا خاص خیال نہیں کیا تھا، جتنا وہ بتا رہا تھا۔ یہ انکشاف اسے حیران کر رہا تھا کہ وہ اتنی خاص تھی کہ اس کھڑی ناک والے مغرور سے بندے کو متاثر کر گئی تھی۔

”ارسہ! یونیورسٹی اور یہاں کالج میں بھی کتنی ہی لڑکیوں نے مجھے متوجہ کرنے اور میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی مگر میں ایسی کوشش تمہارے لیے کرنا چاہتا تھا اور شاید کرتا بھی۔ اگر مجھے یہ پتا نہ چل جاتا کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے اور تم اپنے منگیترو کو پسند بھی کرتی ہو۔“ ارسہ نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر

اس طرف دیکھا۔

”منگنی والی بات ان تک کیسے پہنچی؟“

”یہ سن کر بہت برا محسوس ہوا تھا۔ جیسے دل خالی خالی سا ہو گیا ہو۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، تب ان دنوں پرنسپل صاحب نے تمہیں اکیڈمی بھی بلا لیا تھا کہ تمہیں ایکسٹرا پڑھایا جائے۔ بے بسی کی انتہا پر تھا میں۔ چاہتا تھا تم نظر ہی نہ آؤ اور کبھی سوچتا، چلو اتنا بھی غنیمت ہے، تمہیں دیکھ تو لیتا ہوں۔ کبھی سوچتا تھا تمہیں انور کروں۔ کیونکہ تم میری تو کبھی نہیں ہو سکتیں۔ جانتا تھا تمہاری اور میری دنیا بالکل الگ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر تمہارے دل میں کوئی اور بتا ہے۔ آہ۔ میں بتا نہیں سکتا، کس طرح کی متضاد سوچیں مجھے بے چین رکھتی تھیں۔ اب صورت حال اس سے زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ اور میں نے خود کی ہے۔“ ارسہ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ لقمی خاموش ہو گیا تھا مگر ارسہ ساکت بیٹھی رہی وہ جانتی تھی، ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی۔ لقمی نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”ارسہ! اس روز اکیڈمی میں جب وہ سب ہوا۔ میری غلطی تھی۔ مجھے اندر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں اکیلا بیٹھے دیکھ کر سوچا بھی تھا کہ اندر نہ جاؤں۔ تم تو چھوٹی اور معصوم ہو۔ تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ مجھے تو سمجھنا چاہیے تھا نا لیکن تمہارا ٹائم ویسٹ نہ ہو اس خیال سے تمہیں وہ نوٹس دینے آگیا۔ میرا ارادہ نوٹس دے کر فوراً وہاں سے نکل جانے کا تھا مگر تمہارے سوال پر رکن پڑا اور اس طرح اتنا ٹائم گزر گیا۔“ ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”تمہارے فادر کا مجھے کھپڑ مارنا، اس قسم کے الزام گالیاں۔۔۔“ آنکھیں بھینچتے ہوئے سر جھٹکا۔ ”وہ بھی تمہارے سامنے۔ بہت زیادہ تھا یہ۔ آپ جس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے سامنے اس طرح کی کوئی چھوٹی سی بات بھی نہیں ہونی چاہیے۔ بہت انسلٹنگ تھا۔“

پھر تمہارا میری زندگی میں شامل ہو جانا اور میرے پاس بھی تمہیں دینے کو ایسا کچھ نہیں تھا۔ جو تمہارے

شایان شان ہوتا۔ جو اس پریشانی کے بعد تمہاری زندگی میں کوئی آسانی لے کر آتا۔ یہ گھر جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا نہ کوئی سامان ضرورت کی کئی چیزیں بھی نہیں تھیں۔ سہولتیں کیا ہوتیں۔ کالج میں بھی ہم لوگوں کے لیے موضوع بن کر رہ گئے تھے۔ اس ساری صورت حال نے میرے دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اچانک ہر چیز کنٹرول سے باہر لگنے لگی تھی۔“

ارسہ کو سخت افسوس ہوا اس کی سوچ جان کر۔ وہ اس کے التفات کی ایک نگاہ کو ترس رہی تھی اور اس نے کیا کیا سوچ کر خود کو ہلکان کر رکھا تھا۔ اب بندہ پوچھے ان سے خوشی کب سے مادی چیزوں سے مشروط ہونے لگی۔ میں کیا مادہ پرست لگتی ہوں ان کو۔ ”میں تمہیں وقت دینا چاہتا تھا۔ آیا نے بھی ساری بات سن کے یہی کہا تھا کہ تمہارا خیال رکھوں۔ تمہیں تنگ نہ کروں کوئی زبردستی نہ کروں تمہارے ساتھ۔ تاکہ وقت آنے پر تم اپنی مرضی اپنی خوشی کے مطابق فیصلہ کر سکو۔ اسلام آباد میں جب تم لان میں بیٹھی تھیں میں تم سے یہی کہنے آیا تھا۔ تمہیں یہی سب بتانا چاہتا تھا لیکن تم۔۔۔ خیر۔۔۔ اصل میں جب میں اس ماحول۔۔۔ ان سوچوں سے کسی حد تک آزاد ہوا تو میرا دل تمہاری طرف کھینچنے لگا تھا۔ تم سے فاصلہ برقرار رکھنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے لیے۔۔۔ یقین کرو میں نے پوری کوشش کی تھی تم سے دور رہوں۔۔۔ لیکن اس رات۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں تو صرف تمہیں بتانے آیا تھا کہ کل ہم واپس جائیں گے تم تیار رہنا۔ اس رات کے بعد تمہاری ناگواری۔۔۔ بلکہ اپنے لیے نفرت واضح محسوس کر سکتا تھا میں۔“ اس نے اپنے بال مٹھیوں میں بھیجے۔ ”مجھے معاف کر دو ارسہ!“

ارسہ کے دل نے ایک پیٹ مس کی۔ ہاں اس نے واقعی نفرت محسوس کی تھی اپنے دل میں لقی کے لیے۔ لیکن اس کی وجہ وہ نہیں تھی جو وہ سمجھ رہا تھا۔ ”مجھے پتا ہے اب اس معافی کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نہیں کہتا تم مجھے لانا“ معاف کرو۔ نہیں کرنا۔

مت کرو۔ سزا دو۔ جو چاہے سزا دو۔“
(سزا۔ اب اب آپ چپ ہی کر جائیں تو بہتر ہے بہت بول لیا آپ نے۔) ارسہ کو ترس آ رہا تھا اس سے وہ سمجھتی تھی صرف وہی مشکل میں ہے۔ مگر لقی اس سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ یہ اس کو آج پتا چلا تھا۔ ارسہ کا معصوم سادل اس کی پریشانی کا سوچ کر پکھلا۔

”اگر تم بچے کی ذمہ داری نہیں چاہتیں میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں اپنے منگیترے سے شادی کرنا چاہتی ہو یا اس کے علاوہ کچھ۔ بلا جھجک اپنی خوشی سے فیصلہ کرو۔ تم جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہو گا۔ میں تمہیں پوری طرح سپورٹ کروں گا۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ کسی نے گیٹ زور سے دھڑ دھڑایا۔ لوہے کے گیٹ کی زوردار آواز پر دونوں اچھل کر رہ گئے۔ شام گہری ہو چکی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی مگر دونوں کو اس کا احساس نہیں تھا۔

”تم اندر جاؤ۔“ وہ کہتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ارسہ نے چائے کے کپ کو دیکھا۔ جس کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا گیا تھا۔ بھاپ اڑاتا چائے کا کپ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔



گیٹ پر ساتھ والی شینہ باجی کا بیٹا تھا۔ ”مما کہہ رہی ہیں۔ پانی بھر لیں میں موٹر چلانے لگی ہوں۔“ پیغام پہنچا کر واپس بھاگ گیا۔ پانی بھرنا لقی کی ہی ذمہ داری تھی۔ ارسہ باہر ہوتی تو پانی کی بوتلیں اٹھاتی اور لقی خاموشی سے اٹھانے دیتا۔ وہ کہیں اور مصروف ہوتی تو کولر اور دو بوتلیں خود ایک ہی بار اٹھا کر لے آتا۔ پینے کا تازہ پانی بھر کر پین میں رکھا اور واپس آیا۔ ارسہ اپنی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی تھی۔

لقی ارسہ کے مقابل اپنی چارپائی پر اسی کے انداز میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کیا ارسہ کو کچھ نہیں کہنا تھا؟ اس نے چھ مہینوں کی بات کی تھی۔ اتنی لمبی بات کے بعد اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا؟ لقی کی آنکھوں

میں بے قراری ابھری۔ وہ اتنی خاموش کیوں ہے؟
ارسہ نے اچانک بولنا شروع کیا۔

”میری پیدائش سے پہلے میرے والدین میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ امی اور میں نانا کے گھر رہتے تھے۔ مجھے میری نانی نے بتایا تھا کہ میرے امی بابا کی پسند کی شادی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے دادا نے بابا کو گھر سے نکال دیا تھا لیکن وہ کچھ عرصہ ہی اپنی پر آسائش زندگی کے بغیر رہ پائے تھے۔ پھر ان دو چیزوں دولت اور اپنی محبوب بیوی (جو ان کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی) پر دولت کو ترجیح دی اور امی کو چھوڑ کر دادا کی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔ آپ کو یا کسی کو بھی اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہوں نے مجھے ایسے کیسے چھوڑ دیا۔ وہ ایسے ہی ہیں۔“ ”بزدل اور خود غرض“ امی اس بارے میں بات نہیں کرتی تھیں۔ میں نے بابا کو تصویر کے علاوہ پہلی بار امی کی ڈپٹی کے بعد دیکھا تھا اور پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ جس پر میری سوتیلی امی اور بابا کا زبردست جھگڑا ہوا تھا مگر پھر وہ ”مصلحتاً“ خاموش ہو گئیں۔ جس کی وجہ اب سمجھ میں آتی ہے۔ خیر ان کے علاوہ اس گھر میں ایک میری سوتیلی بہن نور اور دو چھوٹے بھائی فیضان اور مبشر تھے۔

نور کا رویہ شروع میں میرے ساتھ اچھا تھا لیکن بعد میں۔ دراصل وہ اپنے ماموں کے بیٹے احسن بھائی کو پسند کرتی تھی اور وہ بھی اس کو بہت محبت اور توجہ دیتے تھے مگر یہی بات نور کو میرے لیے بالکل پسند نہ آئی۔ ایک دن میں برآمدے میں بیٹھی تھی۔ میرے سامنے نور اپنے ماموں کے گھر گئی مگر جلد ہی بہت غصے میں لوٹی اور میرے پاس آکر زور زور سے چلانے لگی۔ وہ مجھے گالیاں دے رہی تھی۔ بہت برا بھلا کہہ رہی تھی کہ میں احسن بھائی کو اس سے چھین لینا چاہتی ہوں۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گی۔

احسن بھائی اپنی امی کو میرے لیے پرد پوزل لانے کو کہہ رہے تھے۔ اس بات کی وجہ سے نور آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ مجھے احسن بھائی میں کوئی دلچسپی نہیں

ہے۔ میں نے نور کو یقین دلانے کی بہت کوشش کی تھی مگر نور کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی۔ اب وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ شامل ہو گئی تھی ان کے ہر منصوبے میں دونوں مل کر روز کوئی نہ کوئی الزام میرے سر دھرویتیں اور بابا کی طبیعت سے واقف ہونے کی وجہ سے کامیاب بھی رہتیں۔ کچھ ہی عرصے میں حالات ایسے ہو گئے تھے کہ بابا اچھے خوش گوار موڈ میں بھی مجھے دیکھ لیتے تو ان کے ماتھے پر بل آجاتے۔

ایکڈمی میں جو ہوا، وہ سب بھی فریم کیا گیا تھا۔ میں اس سے بچ نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ سب ملے ہوئے تھے نوکر تک ان کے تابع تھے وہ سب وہاں اس طرح نہ ہوتا تو کہیں اور ہو جاتا لیکن وہاں ہونے کا نقصان یہ ہوا کہ آپ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔“ ارسہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بہت روائی سے بول رہی تھی۔

”جو بھی ہوا اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے پتا ہے آپ کی نیت بری نہیں تھی۔ آپ اس بات کو لے کر مکملی فیل مت کریں، پلیز۔“ تقی ساکت بیٹھا اسے سن رہا تھا۔

”ایک اور بات جس نے آپ کو بھی پریشان کیا ہوا ہے اور میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا کہ میری منگنی والی بات آپ تک کیسے پہنچی؟ کالج کی اور لڑکیوں نے بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھا تھا۔“ اس بات پر تقی کے تاثرات بدلے تھے۔ ”نور نے یہ بات احسن بھائی سے کہی تھی، تاکہ وہ مجھ سے دور رہیں۔ احسن بھائی نے بھی یہی سوال کیا تھا مجھ سے، لیکن میری کوئی منگنی نہیں ہوئی۔ کبھی نہیں ہوئی۔“ نور دیتے ہوئے بولی۔ ”کیا واقعی؟“ تقی بے اختیار بول پڑا۔

”جی۔“ لیکن آپ سے ایسا کس نے کہا؟
”مجھے۔ میں پہلے چھٹی سے بارچ منٹ پہلے کالج سے نکل آیا کرتا تھا نا۔ اس روز کالج گیٹ پر ایک لڑکی کار سے نکلتے ہوئے کسی سے کہہ رہی تھی۔ آپ ارسہ کا پیچھا چھوڑیں اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے منگیتر کو پسند کرتی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے یہ

سب وہ مجھے سن رہی ہو۔ وہ لڑکی غصے میں تھی۔ اس لیے اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ ہاں یہ وہ نور ہی تھی جو اکیڈمی میں بھی تمہارے ساتھ آئی تھی۔“

”اس دن احسن بھائی کا برتھ ڈے تھا۔ انہوں نے نور کو اس کے اسکول سے پک کیا اور پھر مجھے لینے آئے تھے۔ تاکہ ہمیں لہجہ پر لے جاسکیں۔ وہ ہمیشہ نور کو اپنی برتھ ڈے پر لہجہ پر لے جاتے تھے۔ اب مجھے بھی لینے آئے تھے۔ نور اسی وجہ سے غصے میں تھی اور شاید وہاں سے ہی کچھ اور لڑکیوں نے سنا ہو گا یا کسی ایک نے سنا ہو گا اور آگے بات کی ہوگی۔“ تقی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اس سے زیادہ آج تک کسی بات نے یوں مضطرب نہیں کیا تھا مگر اس بات کی حقیقت کیا تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے ایک لمبا عرصہ اتنی تکلیف میں گزارا تھا۔

ارسہ تھوڑی دیر سوچنے کے لیے رکی کہ اسے مزید کس بات کی وضاحت کرنی تھی پھر بولی۔ ”سر! میرے بابا نے آپ کے ساتھ جو کیا میں اس پہ بہت شرمندہ ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔ بھول جاؤ اس کو۔ ہم کبھی اس پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔“ ارسہ کو ٹوکتے ہوئے قطعیت سے بولا۔

”اوکے۔۔۔“ ارسہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ گھر اور سہولیات کی بات کر رہے تھے۔ میں نے جس گھر میں ہوش سنبھالا وہ اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا لیکن وہ میری زندگی کا خوب صورت دور تھا۔

میں کبھی اس چیز کو لے کر احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئی کہ میرے پاس اچھا بڑا گھر اور قیمتی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر کبھی ایسا خیال آیا بھی تھا تو اب احساس ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ خوشی ان چیزوں کی محتاج نہیں ہوتی اگر ہوتی تو اپنے باپ کے عالی شان گھر میں

گزر اوقت مجھے بھیانک خواب کی طرح نہ لگتا۔ خوش وہی لوگ رہتے ہیں جو اپنے پاس موجود نعمتوں پر راضی رہتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں۔ ورنہ خواہشات کی تو

کوئی حد نہیں ہوتی۔ سب جانتے ہیں یہ بات اور ہمیں

یاد بھی رکھنی چاہیے۔“ تقی کو اپنی جھنجلاہٹیں یاد آئیں۔ وہ کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔

”آپ سہولیات سے نہیں اپنے رویے سے میری زندگی میں آسانی لاسکتے تھے مگر آپ تو مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے لا تعلق ہی ہو گئے۔ کبھی مجھے جاننے سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ ارسہ نے آج ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

”آئم سوری ارسہ! میں مانتا ہوں۔ میں کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا تھا لیکن تم نے بھی تو ایسی کوئی کوشش نہیں کہ یہ سب بہتر ہو جاتا۔“

”آپ اپنے چہرے پر نولفٹ کا بورڈ چسپاں کیے رکھتے تھے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ سے کوئی بات کرتی بلکہ مجھے تو ضرورت کی مختصر سی بات کرنا بھی ہمیشہ مشکل لگا ہے۔ آپ نے بتا نہیں کیا سوچ سوچ کے اپنے اور میرے درمیان پہاڑ کھڑے کر رکھے تھے۔ آپ تک کیسے پہنچ پاتی اور دو سرا یہ کہ۔۔۔“ تقی جواب میں کچھ کہنے والا تھا۔ پھر ”ہاں بولو“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”دو سرا یہ کہ مجھے لگتا تھا کہ آپ مجھے سخت ناپسند کرتے ہوں گے۔ کیونکہ مجھے زبردستی آپ پر مسلط کر دیا گیا تھا اور میں سوچتی تھی ہو سکتا ہے آپ پہلے سے شادی شدہ ہوں، منگنی شدہ ہوں اور نہیں تو شاید کہیں کمینڈ ہوں۔ کچھ بھی ممکن تھا۔“ تقی ہنس دیا۔ ارسہ نے اسے قدرے الجھ کر دیکھا۔

”ارسہ صرف میں نے ہی نہیں کچھ اخذ کیا اپنی طرف سے، تم نے بھی کیا۔ نولفٹ کا بورڈ شاوی شدہ، منگنی شدہ، کمینڈ۔۔۔ اب تو جانتی ہو، ایسا کچھ نہیں تھا مگر خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔“ تقی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”اب سو جاتے ہیں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”جی بالکل سو جاتے ہیں۔“ ارسہ تیزی سے بولی اور لیٹ بھی گئی۔ (اگلی بات ابھی نہیں کر سکتی تھی۔) تقی کو بھی تھوڑی حیرت ہوئی، اس کے اس طرح اچانک بات ختم کرنے پر۔

”ارسہ! کھانا کھا کر۔“ تقی نے ٹوکا۔

”جی اچھا۔“ ارسہ جھینپ کر کہتے ہوئے پھر اٹھ بیٹھی۔ کھانا کھا کر سونے تک ان کی آپس میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگرچہ کہنے سننے کو اور بہت کچھ تھا مگر آج جو باتیں ہوئی تھیں، دونوں اپنی اپنی جگہ ان ہی کو سوچنے اور سمجھنے میں مصروف تھے۔



وہ اتوار کی سنہری خوش گوار سی صبح تھی۔ ارسہ کی آنکھ اپنے وقت پر ہی کھل گئی تھی۔ وہ کمبل ہٹاتے ہوئے اٹھی اور تقی کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرف کروٹ لیے بے خبر سو رہا تھا۔ تقی کو سوتے ہوئے دیکھنا اس کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ سوتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی معصومیت ہوتی کہ ارسہ کے لیے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ وہ استحقاق سے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور اپنی جگہ سے اٹھی۔ آج وہ ناشتے میں کچھ خاص بنانا چاہتی تھی۔ ارسہ ناشتا تیار کر کے تقی کو اٹھانے آئی۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس کی نیند میں خلل تو نہیں ڈالنا چاہتی تھی مگر ناشتا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

”سر!“ تھوڑا جھجک کر تقی کا کندھا ہلایا۔ پہلے کبھی قریب نہیں جاتی تھی۔ دور سے اس وقت تک آوازیں دیتی رہتی جب تک وہ اٹھ نہ جاتا۔ ”سرا تمہیں ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”ہوں اچھا۔“ تقی آنکھیں ملستا اٹھ بیٹھا۔ تقی کے منہ ہاتھ دھونے تک ارسہ نے ناشتا میز پر لا کر رکھا۔

تقی ”واؤ“ کہتے ہوئے ناشتے سے انصاف کرنے لگا۔ اسے رغبت سے کھاتے دیکھ کر ارسہ کو خوشی ہو رہی تھی۔ اپنا ناشتا ختم کر کے وہ اٹھی اور تقی کو چائے دی۔

”تم خود چائے کیوں نہیں پیتیں؟“ تقی نے آج بوجھ ہی لیا۔

”یہی ہے مجھے پسند نہیں۔“ سادگی سے ہاتھ ہلاتے

ہوئے بولی۔

”کمال ہے۔“ تقی بہت حیران ہوا تھا اس بات پر۔ ارسہ چائے بالکل نہیں پیتی تھی۔ تقی کی کوئی کال آرہی تھی۔ میوبائل سائلنٹ تھا اور اسکرین بار بار روشن ہو رہی تھی۔

”سر آپ کی کال آرہی ہے شاید۔“ ارسہ کی نظر

پڑی تو بولی۔

”سر کی بچی“ آتی رہے کال یہ تم مجھے ”سر“ کیوں کہتی ہو۔ جیسے کسی اجنبی سے بات کی جاتی ہے۔ جب تم مجھے سر کہہ کر مخاطب کرتی ہو تو مجھے لگتا ہے تم کہہ رہی ہو حد ادب سے۔ فری ہونے کی کوشش مت کرنا۔ یہ جو تم مجھے سر سر کہہ کر چڑھاتی رہی ہو نا اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“ تقی منہ بناتے ہوئے بولا۔ ارسہ کا منہ پہلے تو حیرت سے کھلا، پھر ہنسی آئی مگر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”جی اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے مجھے کلاس سے باہر نکالا تھا نا۔ اس کے لیے میں تبھی آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”تمہیں ابھی تک یاد ہے۔“ تقی ہنسا۔

”مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کیونکہ ایسا میرے ساتھ پہلی اور آخری مرتبہ ہوا ہے۔“

تقی کو یاد آیا کہ اس نے کیوں ارسہ کو کلاس میں نہیں آنے دیا تھا۔ ”تم نے مجھے انگور کیوں کیا تھا؟“ تقی نے ابرو اچکایا۔

”میں نے انگور نہیں کیا تھا۔ میں سر سے بات کر رہی تھی۔“

”جو بھی تھا لیکن تمہارے تاثرات بڑے مزے کے تھے اس وقت۔“ تقی کی آنکھوں میں شرارت ابھری۔

”کیا؟“ ارسہ نے مصنوعی غصے سے گھورا۔ ”تو ٹھیک ہے پھر میں کالج میں بھی ”سر“ نہیں کہوں گی اب۔“

”کیا واقعی؟“ تقی نے آنکھیں پھیلائیں۔

”جی بالکل۔ اور اب مجھ پر اس طرح رعب

جمانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“
 ارسہ نے بیویوں والی دھونس جمائی۔ پھر موبائل کی
 طرف اشارہ کر کے خالی کپ اٹھاتے وہاں سے اٹھ
 گئی۔ تقی قہقہہ لگاتے ہوئے موبائل کی طرف متوجہ
 ہوا۔



بے یقین ہونے سے پہلے دعائیں سن لی گئی تھیں۔
 غلط فہمیوں کے بادل جو ان کے درمیان دوری اور
 اجنبیت کا موجب بنے ہوئے تھے، چھٹ گئے تھے۔
 ایک وقت لگا تھا مگر اب ارسہ کو اپنی کوئی تکلیف یاد
 نہیں رہی تھی۔ وہ معمول کے کام پٹا کر کتابیں لے کر
 صحن میں آ بیٹھی تھی۔ تقی ناشتے کے بعد کہیں چلا گیا
 تھا اور اب خود ہی پیچھے گیٹ سے اندر آ گیا تھا۔ کچن
 سے ایک ٹوکری میں مالٹے اور پلیٹ لے کر ارسہ کے
 ساتھ آکر بیٹھا۔

”چلو مالٹے کھاتے ہیں۔“

اس وقت ارسہ کو کچھ ایسا ہی کھانے کی خواہش
 ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم مسکرائی۔
 ”ضرور۔“ اسے اپنے دل میں خوشی اور طمانیت
 کی لہریں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔
 ”پہلے مقابلہ ہوگا۔ سب مالٹے چھیل کر اس پلیٹ
 میں رکھیں گے۔ پھر کھائیں گے۔ اب چھیلنا شروع
 کرو دیکھتے ہیں کون زیادہ چھیلتا ہے۔“ تقی ٹوکری میں
 آٹھ مالٹے رکھ کر لایا تھا۔

ارسہ نے مسکرا کر ”اوکے“ کہتے ہوئے چیلنج قبول
 کیا۔

اس نے نفاست سے چھیلتے ہوئے بمشکل تیسرا مالٹا
 اٹھایا تھا کہ تقی نے تیزی سے باقی سارے مالٹے چھیل
 کر ہاتھ اٹھا دیے۔ ”میں جیت گیا۔“ جبکہ جلدی
 چھیلنے کے چکر میں بہت سے مالٹے زخمی کر دیے تھے۔
 ”نفاست بھی کسی چیز کا نام ہے۔“ ارسہ نے ناک
 چڑھائی۔

”میڈم مقابلہ نفاست کا نہیں، زیادہ چھیلنے کا

تھا۔“ اس نے مکھی اڑائی۔

”اوکے۔۔۔“ ارسہ کو مانتے ہی بنی۔ ”لیکن اب یہ

کھائے گا کون؟“

تقی نے ٹوکری ہٹا کر پلیٹ درمیان میں رکھی۔ ”تم
 دیکھتی جاؤ۔“ ارسہ اور وہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔
 ارسہ مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہنستا مسکراتا،
 باتیں کرنا کتنا مختلف لگ رہا تھا۔ اس کے وجہ سے چہرے
 کو زندگی کی رونق اور جاذب نظر بنا رہی تھی۔
 ”ارسہ۔۔۔!“

”جی۔۔۔“ وہ تھوڑا چونکی۔

”ارسہ! تم بے بی کی ذمہ داری سے پریشان تو نہیں

ہو؟ سچ بتانا۔“

”نہیں زیادہ پریشان نہیں ہوں۔“ ارسہ مسکرائی۔

”اور کم پریشان کس بات پر ہو؟“ تقی نے بے

ساختہ پوچھا۔

”میں سوچ رہی ہوں، میں بہت موٹی ہو جاؤں گی۔

کلج میں عجیب لگے گا، ہے نا؟“ اس نے تائید چاہی۔

تقی ہنس پڑا۔

”نہیں یا۔۔۔ اتنی کیوٹ لگو گی تم۔ کب سے

تمہیں اتنا سہم دیکھ رہا ہوں۔ کچھ چیخ تو ہونا چاہیے نا۔

ویسے دو تین ماہ میں پیرز ہو جائیں گے۔ پہلے ہی قری

ہو جاؤ گی کلج سے، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

”ہاں واقعی۔۔۔“ ارسہ نے مطمئن ہو کر مالٹے کی

پھانک منہ میں رکھی۔ پھر تھوڑا سوچ کر گویا ہوئی۔

”میں ایک نیا یونیفارم پہناؤں گی، ٹھیک ہے؟“

”بالکل ٹھیک۔۔۔“ تقی نے اتفاق کیا۔

”خوش۔۔۔؟“ تقی نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکایا

جبکہ اس کی آنکھوں میں کوئی الجھن تیر رہی تھی۔

”میں ناخوش کیوں ہوں گی؟“ ہاتھ میں پکڑی

پھانک واپس پلیٹ میں رکھی۔

”تقی آپ نے دیکھا۔ ابھی تو بے بی اس دنیا میں آیا

بھی نہیں اور کتنی چیزیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔“ وہ جیسا سے

جھکی پلکوں کے ساتھ بول رہی تھی۔

تقی کے اندر جیسے ٹھنڈک اتری۔ کتنا اچھا لگا تھا

اس کے منہ سے اپنا نام سنا۔ ”ہاں واقعی سب کتنی چیزیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔“ ارسہ کے چہرے پر نظریں گاڑھے بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”بالکل۔“ ارسہ نے سر ہلایا۔ ”کسی انسان کا اس طرح کی نعمت پر ناشکرا بن جتنا ہے؟“

”بٹ ارسہ! اسلام آباد میں وہ سب کیا تھا؟ وہ میری غلط فہمی تو نہیں ہو سکتی۔“ ارسہ جو ابھی تقریر کے موڈ میں آئی تھی۔ اس کی بات پر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

”نہیں۔ غلط فہمی تو نہیں تھی۔“ اب ارسہ سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔

”کیا آپ اس سب کو بھول نہیں سکتے؟“ ارسہ نے فرار کی راہ تلاسنی چاہی۔

”ویل۔۔۔ بھول تو جاؤں گا ہی۔۔۔ لیکن۔۔۔“

”وہ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ ازدواجی زندگی کا کیا مطلب ہوتا ہے، میریڈ لائف، میاں بیوی کے حقوق و فرائض کیا ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اگلی صبح مجھے آپا نے سمجھائی تھیں۔“ ارسہ نے تقی کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہہ دیا۔

”کیا؟“ بات سمجھنے کے بعد تقی کی آنکھیں پھٹیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

”یعنی تم نے آپا کو بتا دیا کہ میں۔۔۔ یعنی تمہیں آپا نے بتایا کہ۔۔۔ یعنی تم۔۔۔“ تقی کوئی بھی جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔ ”ارسہ سہ!“ اب دونوں ہاتھ منہ پر رکھے رکوع میں جھکا تھا۔ ارسہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ لیکن اب میں مینس ایبل (سمجھ دار) ہو چکی ہوں۔“

”کیا کہا؟“ تقی جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

”مینس ایبل۔“ تقی کے حلق سے تھمہ برآمد ہوا۔

”فائنلی۔۔۔ اتنی سمجھ دار بیوی میرے لیے بہت بڑا گفٹ ثابت ہو سکتی تھی مگر بخت ہی ہوئی۔“

ارسہ کو اس کی آخری بات سمجھ نہیں آئی مگر سر ہلادیا۔



یہ اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ اسپتال کا کمرہ تھا۔ تقی اپنی بیٹی کو احتیاط سے اٹھائے کھڑا تھا۔ ارسہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں خوشی اور تشکر کے جذبات کے تحت نم ہو رہی ہیں۔ وہ سر جھکائے اپنی بیٹی کو دیکھے جا رہا تھا۔ آپا نے تقی کے لیے کرسی ارسہ کے بیڈ کے قریب رکھی، ارسہ کا ہاتھ چومنا اور باہر نکل گئیں۔

”تقی بیٹھ جائیں۔“ ارسہ نے کہا۔

”ارسہ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ دیکھو نا۔۔۔ یہ ہماری بیٹی ہے۔“ ارسہ کے قریب ہو کر بچوں کی طرح اسے دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ارسہ نے بھی نم آنکھوں سے مسکراتے اثبات میں سر ہلایا۔

”اللہ نے ہمیں کیا عطا کر دیا۔ کتنی بڑی خوشی دے دی۔ میں اللہ کا شکر ادا کیسے کر پاؤں گا؟“ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر سرخ پھیر کر خود پر قابو پاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے سر جھکائے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگا اور ارسہ، تقی کو۔ اسے شام کو ڈسچارج ہو جانا تھا۔

”ارسہ! جب یہ بڑی ہو جائے گی تب تم اس کی آپا لگوگی۔ جیسے میری آپا۔ تمہیں پتا ہے آپا کی اور میری عمر میں بیس سال کا فرق ہے اور تمہارا ہوا اٹھارہ کا۔“

”میرا سترہ کا۔ میں چار دن بعد سترہ سال کی ہو جاؤں گی۔“ ارسہ نے تصحیح کی۔

”سترہ کیسے؟ سولہ میں میٹرک اور اٹھارہ میں انٹراور تم انٹر کر چکی ہو۔“

”نہیں۔۔۔ میں ایک سال آگے ہوں۔ میں نے ایک سال پہلے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔“ ارسہ نے فخر سے بتایا۔

”سمجھ گیا۔ تم آفت کی پرکا۔ ہوگی۔ اس لیے تمہاری اماں نے تمہیں۔ ایک سال پہلے اسکول بھیج دیا۔“ تقی نے دانت نکالے۔ وہ ایک نظر ارسہ کو دیکھتا اور واپس اپنی گود میں سوئی نرم و نازک گلابی سی بچی کو دیکھنے لگتا۔

”جی نہیں۔ میری اماں کو مجھے بڑھانے کا شوق تھا۔ اس لیے مجھے ایک سال پہلے اسکول میں داخل کرایا تھا۔“

”تم مجھ سے آٹھ سال چھوٹی ہو۔“ تقی پر ابھی انکشاف ہوا تھا۔ ”میں پچیس کا ہوں۔“

ارسہ کو پہلے ہی پتا تھا۔ ایک اور ریسرچ کے مطابق عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات نوٹ کرتی ہیں اور یاد بھی رکھتی ہیں۔ ارسہ نے اس دن بڑی باریک بینی سے تقی کے ڈاکو منٹس کا جائزہ لیا تھا۔

”لیکن آپ نے ایک سال کیا کیا؟ بائیس سال میں ماسٹرز مکمل ہونا چاہیے تھا۔ ایک سال اسلام آباد میں جاب کی، ایک سال یہاں ہو گیا۔ اب آپ کو ابھی چوبیس کا ہونا چاہیے تھا نا۔“

”تم ایک سال آگے ہو سکتی ہو۔ میں ایک سال پیچھے نہیں ہو سکتا۔“ تقی نے منہ بنایا۔ ”خیر تمہیں تو ویسے ہی ہر کام جلدی جلدی کرنے کا شوق ہے۔ جلدی اسکول کنیں۔ جلدی شادی کی اور اب جلدی ہی اماں بھی بن کنیں۔“

”تقی۔۔۔ اس کی طرف رخ کیا۔“

”ویسے تو ایک منٹ بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ اتنا عرصہ چپ کیسے رہے تھے؟“

”ہاں واقعی۔۔۔ پتا نہیں کیوں میری بولتی بند ہو گئی تھی لیکن اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے۔ تم نے مجھے اتنا ڈرا کے رکھا ہوا تھا اور ابھی بھی ڈراتی ہو۔“

”میں ڈراتی ہوں۔۔۔؟“ ارسہ پر صدقاتی کیفیت طاری ہوئی۔ ”بس اب کچھ مت بولے گا آپ۔“

”جی اچھا۔۔۔“ بڑی فرماں برداری سے فرمایا گیا مگر جس طرح خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ ارسہ کو اندازہ تھا ابھی پھر کوئی پھلجھری چھوڑے گا۔

”ویسے اب میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم اتنی دیر بعد سینیس ایبل کیوں ہوئیں۔“

”آہ تقی! انھیں اور جائیں یہاں سے۔“

”تم مجھے جانے کا کہہ رہی ہو؟“ تقی کو جیسے یقین نہ

”آپ نے دیکھا۔ ماما آپ کے بابا کو کیا کہہ رہی ہیں۔ تم ذرا میری پرنسز کو بڑا ہونے دو پھر دیکھنا۔“

ارسہ نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ آنکھیں بند کر کے لفظ ”ماما“ کی مٹھاس محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ اب کوئی بات نہیں کروں گا میں تم سے۔“ تقی نے فیصلہ کن انداز اپنایا اور خاموش ہو گیا۔ ارسہ نے گردن موڑ کر تقی کو دیکھا اور مسکرائی۔

”تقی! تقی نے ان سنا کیا۔“

”تقی۔۔۔ ی۔۔۔“ اب کی بار چیخ سے مشابہہ آواز میں بلایا۔

”کیا ہے؟“ اب کی بار وہ نظر انداز نہ کر سکا۔

”خاموش تو خود بھی نہیں رہ سکتیں نہ تم۔“

”ایسا ہی ہے۔“ ارسہ مسکرائی اور سیدھی ہوتے ہوئے نظریں چھت پر گاڑ دیں۔

”مجھے دنیا میں صرف ایک مرد سے محبت ہوئی ہے اور وہ آپ ہیں اور میری دنیا آپ سے شروع ہو کر آپ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ سب میں اس وقت نہیں کہہ پائی تھی جب آپ نے کہا تھا۔“ تقی اس کو دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ دھیان سے سن رہا تھا۔

”ارسہ! میں کب سے یہ سننا چاہتا تھا یار۔ تب نہیں تو کیا اس کے بعد بھی تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں ملا کہ تم مجھے یہ سب بتائیں؟ اگر یہ سب کہنے کے لیے تم آج کی طرح کسی خاص موقع کا انتظار کر رہی تھیں نا۔ تو تم بہت بے وقوف ہو۔“

ارسہ نے واپس چھت کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس سے کہا۔ ”مجھے پتا ہے۔ میں بہت سی غلطیاں کرتی ہوں۔“

”ان غلطیوں کے باوجود بھی تم مجھے دل و جان سے قبول ہو۔ اگر وقت پیچھے جائے اور مجھے انتخاب کا موقع دیا جائے تب بھی میں تمہارا ہی انتخاب کروں گا۔“

تقی نے بات ہی ختم کر دی۔

”تقی آپ اتنے خاص ہیں کہ مجھے آسانی سے مل

اور قیمتی سوٹ دلایا تھا۔ جب میں نے پہن کر دکھا تو میں بہت خوش ہوئی مگر اگلے ہی لمحے ایک سوچ کی وجہ سے میری خوشی پھیلنے لگی کہ اتنا اچھا سوٹ پہن کر کیا کروں گی؟ کون دیکھے گا مجھے جانا ہی کہاں ہوتا ہے۔ پھر میں نے امی سے پوچھا۔ کیا اس دنیا میں مکمل خوشی نہیں مل سکتی؟ امی نے کہا، نہیں پوری خوشی تب ملے گی۔ جب ہم پل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ وہی دائمی خوشی ہوگی۔ تب ہم ہمیشہ خوش رہیں گے۔ یعنی دنیا میں دائمی خوشیاں تو کسی کو مل ہی نہیں سکتیں، کیونکہ دنیا تو اس لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ اس کے لیے تو جنت بنائی گئی ہے۔“ لقی کی مسکراہٹ ظاہر کرتی تھی کہ وہ اس بات سے متفق ہے۔

بھی نہیں سکتے تھے۔ مجھے لگتا تھا، میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ اتنا برا کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ ماں، باپ، گھر اور میری عزت بھی۔ اس الزام کے بعد میں خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔ میں رات کو اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتی تھی مگر اس وقت ذلت اور بے عزتی کا احساس اتنا گہرا تھا کہ مجھے بھول گیا تھا، میں کہاں ہوں۔ کتنا اندھیرا ہے اور کس دیرانے میں پڑی ہوں۔ مجھے بس یہی احساس تھا کہ میرے منہ پر مٹی لگی ہے۔ جو لوگوں کے جوتوں سے دہاں پہنچی تھی۔“ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا اور کنپٹی سے بہتا ہوا بالوں میں جذب ہو گیا۔“ اس کے بعد بھی ذہنی اذیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوتی کہ میں زندہ کیسے ہوں۔ لیکن آپ کو پتا ہے لقی! اتنا سب برا ہونے کے باوجود بھی کچھ چیزیں بہت مثبت تھیں، جنہیں میں تب محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ کیا ہوتا اگر آپ کوئی بد فطرت انسان ہوتے؟ اگر آپ اگلی صبح اکیڈمی نہ آتے یا پرنسپل کو بلا کر نہ لاتے؟ کیا ہوتا اگر آپ میرے ساتھ نکاح جیسا پاکیزہ رشتہ نہ جوڑتے اور میرے باپ کے تھپڑ اور گالیوں کا بدلہ مجھ سے لینے کی کوشش کرتے۔ کیا ہوتا اگر آپ کی فیملی مجھے قبول نہ کرتی۔ جس طرح انہوں نے مجھے محبت اور عزت دی۔ اگر ایسا نہ کرتے تو میرا مقام کیا ہوتا؟ آپ اس شام بھی بات نہ کرتے اور ہمارے درمیان غلط فہمیاں اسی طرح برقرار رہتیں، اس صورت میں مجھے ریگنسنسی پیریڈ میں کس قسم کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا؟

ایک وقت تھا جب میں سوچتی تھی کہ اس کے بعد میں کبھی خوش ہو ہی نہیں سکتی۔ چونکہ وہ تکالیف کا ایک لمبا دور تھا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ تکلیف کی مدت کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ ہمیں ہرگز ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے دیکھیں، آج میں اتنی خوش ہوں کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اللہ نے مجھے میری توقعات سے بڑھ کر نوازا ہے۔

ایک مرتبہ عید پر مجھے امی نے بہت خوب صورت

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کزن

فوزیہ کسمین



قیمت - 750/- روپے

مفت

پتہ: عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر 32735021

وہ ایک تو کم زور تھی دوسری گہری سانولی رنگت پر قدرتی سنہرے بالوں نے اسے مزید مصحکہ خیز بنا دیا تھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے جیسے اس نے خود کو قابل دید بنانے کے لیے اسے بالوں کو سنہری رنگت دی ہو۔ جب کالج میں تھی تو اکثر لڑکیاں اسے ٹوک دیتی تھیں۔

”تم نے بال کیوں رنگے ہیں؟“

”اگر رنگنے ہی تھے تو کوئی اور رنگ دیا ہوتا۔“

”ہاں یہ رنگ تم پر بالکل نہیں بیچ رہا۔“ ایک کے بعد ایک لڑکی اپنی اپنی بولی بولنا شروع ہو جاتی اور شروع میں تو وہ صفائی پیش کرتی قسمیں کھاتی کہ یہ اس کے قدرتی بال ہیں پھر جب لڑکیاں ہستیں اور بنانے والے کی شان میں قصیدے پڑھتی ہوئی جاتیں تو اس کا دل

محتاج تھے۔ کیونکہ وہ ہر فن مولا تھی۔ خدا نے اگر کہیں اسے محروم رکھا تھا تو کہیں نوازا بھی تھا۔ ایک تو اس کی آواز میں بے پناہ مٹھاس تھی جس سماعت سے ٹکراتی وہ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ دوسرے پڑھنے میں بہت اچھی تھی۔ شروع سے ہر کلاس میں اول آتی رہی تھی پھر بھی ابا نے بی اے کے بعد اسے مزید پڑھنے کی اجازت نہیں دی اور شاید اماں بھی نہیں چاہتی تھیں جب ہی اسے گھرداری میں لگا دیا تھا۔ جبکہ اس کے بعد کی شامکہ رو رد کر پاس ہونے کے باوجود مار کر رہی تھی۔ پھر مریم گو کہ سب سے چھوٹی تھی لیکن انٹر کے بعد ہی ابا نے

رنگت عبد اللہ



چاہتا ان کا منہ نوچ لے۔ اب وہ ایسی بنائی گئی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

”پتا نہیں بنانے والے نے میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا ہے۔“ وہ حد درجہ شاکہ تھی۔ مزید ستم ظریفی کہ باقی سب بہن بھائی خوب صورت ہی نہیں بہت خوب صورت تھے اور اس کا مذاق۔ اڑاتے تھے۔ جب ہی اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ اور بد لحاظی عود کر آئی تھی۔

پہلو تھی کی اولاد تھی اس کے باوجود اماں ابا میں سے کسی کی توجہ حاصل نہیں کر پائی تھی۔ بلکہ وہ اسے یوں نظر انداز کرتے جیسے اشعر شامکہ اور مریم سے پہلے کوئی وجود دنیا میں آیا ہی نہ ہو حالانکہ سب اسے دوست کے

اس کی شادی کر دی تھی۔ کیونکہ اس نے خود ہی مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اس کے لیے اچھے رشتے بھی موجود تھے۔ رشتے تو شامکہ کے لیے بھی بہت آتے تھے لیکن اسے یونیورسٹی جانے کا شوق تھا۔ اس لیے اس نے اماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ماسٹر سے پہلے شادی نہیں کرے گی اور اماں ابا کو اس کی یعنی شامکہ کی فکر بھی نہیں تھی۔ فکر تھی تو اس کی جس کے لیے بھولے سے بھی کسی نے جھولی نہیں پھیلانی تھی اور وجہ صاف نظر آتی تھی۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر آپس بھرتیں جس سے وہ اور چڑ جاتی تھی اور پھٹ پڑتی۔

جب یہ طے ہے اماں کہ مجھے ساری زندگی آپ کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



Downloaded From
Paksocietyty.com

READING
Section



نظروں کے سامنے رہنا ہے تو دل پر پتھر رکھ لیں۔ آپ کی آپس میری قسمت نہیں بدل سکتیں۔“

”اے شکل اچھی نہیں ہے تو منہ سے بات تو اچھی نکالا کر۔“ یہ اماں کا مخصوص جملہ تھا۔

”جن کی شکلیں اچھی ہیں وہ کون سی اچھی باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے سلگ کر سر جھٹکا تھا۔

”اچھا چل ہانڈی روٹی کی فکر کر۔“ اماں نے جھٹ اسے کچن کا راستہ دکھایا کیونکہ جب وہ بولنے پر آتی تو پھر اسے چپ کرانا مشکل ہو جاتا تھا۔

”ہانڈی روٹی بس ان ہی کاموں کے لیے رہ گئی ہوں میں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آئی تو پھر اس کی بڑبڑاہٹ اماں کی دھاڑ پر تھمی تھمی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی چلائے تھے۔

”کہاں ہے نامراد، مرود، آج میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”الہی خیر۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا جبکہ اماں بوکھلا گئیں۔

”کیا ہو گیا ہے۔ خیر تو ہے؟“

”اے لاڈلے کی خیر مناؤ۔ اشعر۔ اشعر۔“ اماں اس سے کہہ کر اشعر کو پکارنے لگے۔ تو وہ کچن سے نکل کر بولی۔

”اشعر ابھی نہیں آیا ابابا!“

”آئے گا بھی کیسے جب تک جیبیں خالی نہیں کرے گا۔ حرام خور۔ میں بھی کہوں، دو دن سے کیسے اتنی شرافت سے دکان پر آ بیٹھتا ہے۔ کم بخت، موقع کی تلاش میں تھا۔ ادھر میں نماز کے لیے نکلا ادھر وہ سارا گلہ خالی کر گیا۔“ ابابا غصے سے بولتے ہوئے چارپائی پر ڈھسے گئے۔

”کون اشعر!“ اماں کے انجان بننے پر ابابا کا پارہ مزید جس حساب سے چڑھا اس سے وہ خائف ہو کر اندر چلی آئی۔

”کیا ہوا؟“ شائلہ نے اسے دیکھ کر ابابا کی آواز کی منت اشار کر کے پوچھا تو وہ تلملاتے ہوئے کہنے لگی۔

”حد کرتی ہیں اماں بھی۔ یوں بن جاتی ہیں جیسے اشعر کی حرکتوں سے واقف ہی نہ ہوں۔“

”اب کیا کیا ہے اس نے؟“

”ابا کی دکان سے پیسے اٹھا کے لے گیا ہے بلکہ چوری کر کے گیا ہے۔“ اس نے بتایا تو شائلہ نے صرف سر جھٹکا وہ بھی بے نیازی سے جس پر وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ کیونکہ ادھر ابابا چلا کر بول رہے تھے۔

”بس اب میرے گھر کے دروازے بند ہو گئے اس پر۔ خبردار جو تم نے اسے گھر میں گھسایا تو۔“ ابابا کے فیصلے کا اماں پر جانے کیا اثر ہوا۔ وہ بہر حال رات بھر جاگتی رہی تھی کہ جانے کس وقت اشعر آجائے۔ اس کے کان دروازے پر ہی لگے رہے تھے لیکن کوئی دستک سنائی نہیں دی۔

پھر فجر میں اس نے گھر کا کونا کونا دیکھ ڈالا کہ شاید اشعر دیوار پھلانگ کر آیا ہو اور کسی کونے میں پڑ کر سو گیا ہو لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ اماں سر پر دوپٹہ باندھے سو رہی تھیں۔ اور ابابا کے خراٹوں میں ایسی غراہٹ جیسے اپنے شکار پر جھپٹنے کو تیار ہوں۔ وہ دبے پاؤں کچن میں آ گئی۔

اس کے سر میں ٹھہسی اٹھ رہی تھیں۔ رت جگمگ سے زیادہ اشعر کی فکر نے دماغ ہلا ڈالا تھا کہ جانے وہ رات بھر کہاں رہا ہو گا حالانکہ وہ کوئی بچہ نہیں تھا پھر جو حرکت اس نے کی تھی اس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے تھی

لیکن وہ کیا کرتی، دل کے ہاتھوں مجبور تھی جو تفحیک کا نشانہ بننے کے باوجود سب کی خیر مانگتا تھا۔ حالانکہ یہی اشعر اس سے چھوٹا ہونے کے باوجود اسے عجیب و غریب ناموں سے پکارتا تھا۔ بے شک وہ برا مانتی تھی اس سے جھگڑتی بھی تھی لیکن اس کے لیے کبھی برا نہیں سوچتی تھی۔

”یا اللہ! اشو جہاں بھی ہو اسے اپنی اماں میں رکھنا۔“ وہ چائے پیتے ہوئے مسلسل اشعر کی اماں مانگتی رہی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد شائلہ معمول کے مطابق تیار ہو کر یونیورسٹی چلی گئی۔ لیکن ابابا خاصی تاخیر سے دکان

کے لیے نکلے تھے اور اتنی دیر جو وہ گھر میں رہے تو مسلسل انگارے چباتے رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا اماں بالکل چپ تھیں ورنہ سارا محلہ سنتا۔ پھر جاتے جاتے ابا اماں کو تینہبہ بھی کر کے گئے تھے کہ اگر اشو کو گھر میں گھسایا تو وہ انہیں نکال باہر کریں گے۔

”اماں۔“ ابا کے جانے کے بعد وہ اماں کے پاس آئی۔

”کیا ہے۔“ اتنی دیر سے خاموش اماں اسے کاٹ کھانے کو روڑیں۔

”اب تجھے کیا تکلیف ہے۔“

”اٹھیں ناشتا کر لیں۔“ اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا تب شاید اماں کو احساس ہوا۔

”نہیں مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔ پتا نہیں میرے بچے نے کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔“ اماں رونے لگیں۔

”اوہو اماں! اب اشو کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ اس کے منہ میں فیڈر دینی پڑے گی“ پھر پیسے لے کر بھاگا ہے۔ بھوکا نہیں ہو گا۔“ وہ خود بھی پریشان تھی لیکن اماں کو تسلی دے کر زبردستی منہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا دیا اور چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف پڑھی تھی کہ ٹیلی فون کی بیل پر جھٹکے سے واپس پلٹی تھی۔ اس کے خیال میں اشعر ہو گا جب ہی رسور اٹھاتے ہی بے تابی سے بولی۔

”ہاں اشو! کہاں ہو؟“

”خوش قسمت ہے اشو جس کے لیے کوئی تڑپتا ہے۔“ ادھر جانے کون تھا وہ ٹھٹک گئی۔

”کون؟“

”ایسی ہی تڑپ کا طلب گار۔“ بڑی عاجزانہ درخواست تھی۔ وہ سلگ گئی۔

”دیکھو! داغ خراب مت کرو اگر کوئی اور کام نہیں ہے تو کچھ کھا کر سو رہو۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور جلدی سے ناشتا لے کر اماں کے پاس آئی تو وہ پوچھنے لگیں۔

READING
Section

”کس کا فون تھا۔“

”کسی کا نہیں یہ بتائیں اب اشو کا کیا کرنا ہے؟“

”کیا کرنا ہے؟“ اماں الٹا سے دیکھنے لگیں۔

”میرا مطلب ہے اس نے بہت غلط حرکت کی ہے۔ ابا کا غصہ ناجائز نہیں ہے۔ آپ خوا مخواہ اس کی حمایت مت کیجئے گا۔ اور نہ اس کے لیے پریشان ہوں۔ آجائے گا دھکے کھا کر منحوس۔“ اس کے آخری لفظ پر اماں کو پٹنگے لگ گئے۔

”وہ منحوس ہے اور تو کیا ہے۔“

”اس سے بڑی منحوس۔“ وہ کہہ کر اماں کے پاس سے ہٹ گئی۔

فون کی بیل پھرنے لگی تھی۔ اگر اشو کا خیال نہ ہوتا تو وہ اپنے کام میں مصروف رہتی مجبوراً ہاتھ میں پکڑی پتیلی بچ کر بھاگی تھی۔

”ہیلو۔“

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں کہ کچھ کھا کر سو رہوں لیکن ڈرتا ہوں۔“ وہی آواز وہ جھنجھلا گئی۔

”اف۔!“

”پلیز فون بند مت کرنا۔“ اس نے فوراً کہا تو وہ نرج ہو کر بولی۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔“

”بتاؤں گا۔“ اس کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ ہنسنے لگی۔ ہستی چلی گئی۔ ادھر شاید وہ حیران تھا یا اس کی ہسی میں کھو گیا تھا۔

”سنو کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ بمشکل ہنسی رکنے پر بولی تھی۔ ”میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی کیونکہ میں خود ایک مسئلہ ہوں۔“

”یہ تم سے کس نے کہا؟“ اس کے پوچھنے پر وہ پھر بگڑ گئی۔

”کسی نے بھی کہا ہو تمہیں کیا اور تم کیا بار بار یہ نمبر ملتا رہے ہو کوئی اور نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”ہے۔ بہت نمبرز ہیں لیکن مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔“ اس کی بات پر وہ اچھل پڑی۔

”ہیں۔! کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”آرام سے سنو تو بتاؤں۔ تم تو فوراً ہی ہتھ سے اکھڑ جاتی ہو۔“

”کیونکہ میں ایسی ہی ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون بچ دیا اور وہ جو کوئی بھی تھا اسے فالتو، نکما جیسے القاب سے نوازتے ہوئے واپس کچن کی طرف جارہی تھی کہ اماں کی آواز سن کر اچھنبے میں گھر گئی۔

”یہ اماں کس سے باتیں کر رہی ہیں۔“ زیر لب خود سے کہتے ہوئے وہ کمرے میں آئی اور اماں کی بات سننے ہی ٹھٹک کر انہیں دیکھے گئی۔ اماں موبائل فون کان سے لگائے یقیناً ”اشعر سے کہہ رہی تھیں۔“

”نہیں نہیں، تم ابھی گھر مت آنا۔ تمہارے ابا بہت غصے میں ہیں اور دیکھو پیسے سنبھال کر خرچ کرنا۔“ اماں! اس نے انتہائی ناسف سے پکارا تھا جواب میں اماں نے پوچھا کھورا کہ وہ مزید کچھ کہہ نہ سکی۔ البتہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن میں آئی۔ پھر رات میں وہ شامکے سے اچھ رہی تھی۔

”تمہیں پتا ہے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اماں بھی ایشو کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ اسے مشورے دے رہی تھیں پیسے سنبھال کر خرچ کرنا۔“

”ظاہر ہے ماں ہیں۔“ شامکے کو لڈ کریم سے اپنے پیروں کا مساج کرتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔

”ماں ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اولاد کے برے کاموں میں بھی ان کا ساتھ دیا جائے۔“ وہ مزید سلگ کر بولی تو شامکے چڑ گئی۔

”اوہو تو تم مجھے کیوں سنارہی ہو؟“

”کیوں؟ تم اس گھر کی فرد نہیں ہو؟“ اس نے چیخ کر ٹوکا تو شامکے ذو معنی انداز میں بولی۔

”بس کچھ دنوں کی بات ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں شامکے ہنسنے لگی تو وہ کچھ عجیب سا محسوس کرتے ہوئے بس اسی قدر بولی۔

”تو تم۔“

”میں نہیں رہ۔ وہ مرنا ہے مجھ پر۔ کہتا ہے مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔“ شامکے مزے سے اور بھی جانے کیا کیا بتائے جارہی تھی لیکن اس کا ذہن اسی بات پر اٹک گیا تھا۔

”تم مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔“ اور اگلے دن وہ انجان ہال ریسو کرتے ہی اس پر چڑھ دوڑی۔

”تم کتنے جھوٹے مکار ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں پر لڑکی سے ایک ہی بات کہتے ہو کہ مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔“ ادھر وہ ارے ارے کر رہا تھا لیکن وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔ آخر وہ زور سے چلایا۔

”شٹ اپ۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی تو قدرے رک کر وہ جیسے ضبط سے بولا تھا۔

”تمہیں میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مانا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو چاہو کہہ دو۔“

”تم میرے قابل نہیں ہو!“ وہ قدرے سنائے میں آگئی تھی۔ ”کیا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھ سے کہے۔“

”تم میں کیا کمی ہے؟“ وہ اس کی دور سے آتی آواز سن کر پوچھ رہا تھا۔

”ہیں۔“ اس نے چونک کر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر آواز دبا کر پوچھنے لگی۔

”کون ہو تم۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”میں کون ہوں؟ اب تو میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہاں تھوڑا تھوڑا یاد ہے، کبھی لوگ مجھے جان عالم کے نام سے پکارتے تھے اور میں صرف نام کا ہی نہیں سچ مچ ایک عالم کی جان تھا۔“ وہ رک رک کر بولی رہا تھا۔

”اور اب؟“ اس کی آواز ہنوز دھیمی تھی۔

”اب تو میں اور میری تنہائی۔ گزشتہ پانچ سالوں سے میں اپنی تنہائی سے باتیں کر رہا تھا۔ تھک گیا تو ٹیلی فون کا سہارا لیا اور پھر مجھے تم مل گئیں۔ جانے کیوں مجھے لگا جیسے تم بھی میری طرح تنہائی کا شکار ہو۔“

”نا؟“ وہ جانے کیسی آس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے

اپنے آس پاس دیکھا پھر آہستہ سے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔



وہ بچپن سے اپنے لیے جو رویے اور لہجے دیکھتی اور سنتی آرہی تھی ان کے باعث تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی اس کی سماعت میں بھی کوئی اپنے نرم دلنشیں لہجے سے امرت گھول سکتا ہے۔ بے نام سفر تھا اور بالکل انجانا جس کی شاید کوئی منزل ہی نہیں تھی اور یہ نہیں تھا کہ اس نے آنکھ بند کر کے اس راہ پر قدم رکھ دیے تھے۔ خود کو بہت سمجھایا بہت روکا تھا اور ابھی بھی روکتی تھی۔ کبھی تو دل مان جاتا لیکن اکثر بغاوت کر جاتا تھا اور وہ اس سے یوں باتیں کرتی جیسے صدیوں کی آشنائی ہو بہت عام سی باتیں ہوتی تھیں۔

”ابھی تم کیا کر رہی تھیں؟“

”واؤ! یہ تو میری فیورٹ ڈش ہے۔“

کبھی حیرت سے کہتا۔ ”گھر کا سارا کام تم کرتی ہو؟“ پھر سراہتا۔

”گڈ۔۔۔ اس کا مطلب ہے اس گھر کی سب سے اہم فرد تم ہو۔ بالی سب تمہارے محتاج۔“ اور ایسی ہی باتوں میں کہیں جانے انجانے میں وہ اس کے دل کے تار چھولیتا تھا۔

”تمہاری آواز میں ایسی خوب صورت کھنک ہے کہ دل چاہتا ہے تم بولتی رہو۔ پتا ہے میں ساری زندگی تمہیں خاموشی سے سن سکتا ہوں۔“

اور اس دن وہ بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی

رہی تھی۔ بولتی، ہنستی پھر رونے لگتی۔

میں اسے بتا دوں گی کہ بس آواز ہی آواز ہے۔ اس نے سوچا ضرور لیکن کہتے کہتے رہ گئی۔ اچانک خائف ہو گئی تھی کہ اگر اس نے بھی سب کی طرح تمسخر اڑا کر فون بچ دیا تو پھر وہ باتیں کس سے کرے گی۔ دن بھر میں چند لمحے تو میسر آتے تھے جب وہ خود کو بھی بھول جاتی

تھی۔

اسے کہا پتا میں کیسی ہوں۔ اس نے بھی نہیں پوچھا اور اگر کبھی پوچھ لیا تو کہہ دوں گی میں دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہوں۔ ہا ہا۔۔۔ اپنی سوچ پر وہ خود ہی ہنسی

تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کی روٹیں وہی تھیں لیکن مزاج بدل گیا تھا۔ پہلے جو اماں اور بہن بھائی کی باتوں کا چٹاخ پٹاخ جواب دیتی تھی اور کام کے دوران بھی جو مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھاتی رہتی تھی تو اب ایسا نہیں تھا۔ اس کی اپنی دنیا جگمگاتی تھی۔ جس میں مگن ہو کر یہ نہیں تھا کہ وہ اطراف کا ہوش بھلا بیٹھی تھی۔ سب خبر رکھتی تھی۔ شامکے کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی جھولی پھیلائے آں موجود ہوتا تو پہلے کی طرح وہ کملائی اور کڑھتی نہیں تھی۔ مزید مہمانوں کے جانے کے بعد اماں سے رشتے کی پوری تفصیل پوچھتی اور شامکے کی شادی میں دلچسپی ظاہر کرتی تھی۔ اماں اس کی اس تبدیلی پر حیران بھی تھیں اور خوش بھی اس پر مستزاد اسے کم روی کے طعنے دینے بھی چھوڑ دیے تھے۔ اس کے برعکس شامکے کے لیے کوئی رشتہ آتا تو اماں اس سے نظریں چرانے لگتیں۔ البتہ اشو جو مزید بگڑ کر گھر لوٹا تھا وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔

”تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے ٹرے سجا سجا کر اندر بھیجتی رہو۔“ اس وقت بھی وہ اس کے سامنے بیکری کے لوازمات کے شاہر ز رکھ کر ہنستا ہوا گیا تھا۔ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا نہ اس کے دل سے ہو کہ اٹھی۔ سلیقے سے ہر شے ٹرے میں منتقل کی پھر شامکے کو بلائے اندر آئی تو اس کی تیاری دیکھ کر بے ساختہ بولی۔

”ماشاء اللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔“

”میں ہوں ہی پیاری۔“ شامکے نے اتر کر کہا۔ تو اس نے مسکراتے پر اکتفا کیا۔ پھر بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے ٹرے اور ساتھ چائے بھی بنا دی ہے۔ لے جاؤ۔“

”وہ تو میں لے جاؤں گی یہ بتاؤ کیسے لوگ ہیں۔ میرا مطلب ہے اشو بتا رہا تھا یہ لمبی سی گاڑی میں آئے ہیں اور خواتین دیکھنے میں ہی ڈیٹھس وغیرہ کی لگ رہی ہیں۔“ شائلہ نے پر شوق انداز میں پوچھا تو وہ اعلیٰ کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”پتا نہیں میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں جاتے ہوئے سرسری سا دیکھا ہے۔“

”تم بھی بس۔“ شائلہ چلی گئی تو وہ کچھ دیر کمرے میں ہی رہی پھر رات کا کھانا بنانے کی غرض سے کچن میں آئی تھی کہ شائلہ تن فن کرتی ہوئی آئی اور اس سے بولی۔

”جاؤ تمہیں اماں بلارہی ہیں۔“

”مجھے۔۔۔“ اس نے حیرت اور نا سمجھی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں تمہیں جاؤ برتن اٹھالو۔“ شائلہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ابھی تو مہمان موجود تھے پھر برتن اٹھانے کا کیا سوال۔

”پتا نہیں۔“ وہ پہلے ابھی پھر سر جھٹک کر ڈرائنگ روم میں آئی تو اسے دیکھتے ہی ایک خاتون بولیں۔

”یہ صاعقہ ہے؟“

”جی یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے۔“ اماں نے کہا تو خاتون فوراً بولی تھیں۔

”ہم اس کے لیے آئے ہیں۔“

”جی! اماں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں جتنی غیر یقینی تھی اس سے کہیں زیادہ غیر یقینی سے وہ ان خواتین کو دیکھ رہی تھی۔

”بہت تعریف سنی ہے ہم نے اس کی کہ بہت سکھز سلیقہ شعار ہے آپ کی بیٹی ہم اپنے بیٹے کے لیے ایسی

ہی لڑکی چاہتے ہیں۔“ خاتون اماں سے مخاطب تھیں۔

اور وہ سراسیمہ لگے پیروں جو چلی تو اپنے کمرے میں بھی ایسے ہی داخل ہوئی تھی۔

”میں نے تو صاف منع کر دیا۔“ عقب سے شائلہ

لی آواز من لڑوہ ایک دم پانی تھی۔
”نکتہ انتہی نہیں لگتیں ایسی عورتیں تیری بناوت۔“ جتنی بندہ جیسے ساتھ ویسا ہی نظر آئے۔ بن بن کے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“ شائلہ تلملا تلملا کر بول رہی تھی۔ اس ہی سبب سے اس کا بدن بل کھا رہا تھا۔

”ویسے بھی میں تو اسے پسند کرتی ہوں۔ وہ میں نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا نہیں تھا۔“ شائلہ کی خجالت پھپھائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”ارے بھئی وہی۔۔۔“ شائلہ جانے کے یا دلائے جا رہی تھی کہ فون کی بیل سن کر وہ بلا ارادہ ہاں ہاں کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ یوں بھی وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سر جھٹک کر ہیلو کہا تو اوپر سے وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا۔

”کیا ہو رہا تھا۔“ اس کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہو گئی۔

”ارے! کیا بہت تھک گئیں۔ کیا کر رہی تھیں؟“ وہ اس کی گہری سانس کو تھکن پر محمول کر کے پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں بس ایسے ہی۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی خاص کام نہیں کر رہی تھی۔“ وہ جانے کیوں ہنسی عجیب سی ہنسی تھی جو غالباً محسوس کر کے ہی وہ پوچھ رہا تھا۔

”کچھ چھپا رہی ہو؟“

”ہیں۔۔۔“ وہ چونکی پھر سنبھل کر بولی۔ ”تم مجھے جانتے ہی کتنا ہو۔“

”بہت زیادہ نہیں لیکن پھر بھی جانتا ہوں۔“

”مثلاً۔۔۔“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”مثلاً“ یہ کہ تم بہت اچھی بہت پیاری لڑکی ہو۔ ساری دنیا کو اپنا غلام بنا سکتی ہو۔ کیونکہ تمہارے اندر

ایثار اور خدمت گزاری کا جو جذبہ ہے وہ شاید ہی کسی اور میں ہو۔“ وہ بہت دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔

صاعقہ کی آنکھوں میں اچانک ڈھیر سا راپانی جمع ہو گیا۔

”ہیلو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“ اس نے پکار کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔
”یتا نہیں۔“

”مجھے پتا ہے اور ایک اور بات بتاؤں۔“ اس نے کہا تب ہی اماں کے پکارنے پر اس نے گھبرا کر فون بند کر دیا اور تیزی سے باہر آئی تو اماں کے ساتھ مہمان خواتین جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

”اچھا تو پھر آپ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔“ مہمان خاتون نے اماں کو اصرار سے دعوت دی پھر اسے دیکھ کر مسکرائیں اور جاتے جاتے اس کے ہاتھ میں اچھے خاصے نوٹ تنہا گئی تھیں۔

”اے اللہ تیرا شکر میری بیٹی کا نصیب جاگا۔“ اماں خوشی سے پھولے نہیں سار ہی تھیں۔ جبکہ اشوا اور شائلہ نے اس کے ساتھ ساتھ مہمان خواتین کا ریکارڈ بھی لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

”آخر انہیں کیا نظر آیا ضاعقی (صاعقہ) میں؟ عقل پر پتھر پڑ گئے یا سچ مچ اندھی تھیں؟“

”کہہ تو تھیک رہے ہیں۔“ وہ کچھ نہیں بولی لیکن دل میں ان دونوں سے اتفاق کر رہی تھی اور شاید حیران تو اماں بھی تھیں لیکن بظاہر اشوا اور شائلہ کو گھر ک رہی تھیں پھر بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگتیں تو وہ نظریں چرا جاتی۔

اگلے دن مارے تجسس کے شائلہ بھی اماں ابا کے ساتھ لڑکا دیکھنے چلی گئی تو پہلی بار خود سے نظریں چرا کر دل نے خوش گمانیوں کا دامن تھام لیا۔ وہ بظاہر اوھر اوھر کے کاموں میں مصروف تھی لیکن درحقیقت اماں ابا کی واپسی کی منتظر تھی۔ وقت کسی طرح گزر رہی نہیں رہا تھا اور آج فون بھی خاموش تھا۔ ورنہ وہ اس سے باتیں کر کے دھیان بٹالیتی۔ اشو بھی پتا نہیں کہاں غائب تھا۔ وہ اکیلی سارے گھر میں چکرائی پھری۔ پھر جب ڈور بیل بجی تو اس کا دل قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

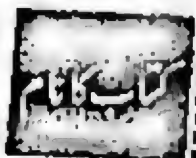
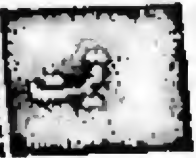
خود کو بمشکل بھاگنے سے روکا اور جا کر دروازہ کھولا تو اماں ایسے دیکھ کر بولیں۔

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت کرد پوش



450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفرنامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفرنامہ	مگرمی مگرمی پھر مسافر
225/-	طہر و مزاح	خمار گندم
225/-	طہر و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوسچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند نگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈ گراہیلن پو ابن انشاء	اعدہ حاکموں
120/-	ادہنری ابن انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طہر و مزاح	ہاتیں انشاء جی کی
400/-	طہر و مزاح	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

”اشو نہیں ہے کیا؟“ اس نے ابا کے ڈر سے نفی میں سر ہلایا لیکن ابا کی نظریں اسی پر تھیں اور خلاف عادت کچھ کے بنا وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”دروازہ بند کر لو۔“ اماں کہتے ہوئے ابا کے پیچھے چلی گئیں تو اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے شاملہ کو دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں جلن آمیز چہن کے ساتھ مسخر بھی تھا۔

”کیا ہوا؟“ ڈوبتے دل کے ساتھ اس کے ہونٹ بلے تھے۔

”ہائے بے قراری!! اندر تو چلو۔“ شاملہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے کی طرف پرمہ گئی تو وہ اس کے پیچھے مرے مرے قدموں سے آئی تھی۔

”کیا بتاؤں صاعقہ اتنے امیر کبیر لوگ۔ اتنا شاندار بنگلہ، یہ لمبی لمبی گاڑیاں تو کروں کی فوج۔“ امارت کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاملہ کی آنکھوں میں حسرت بھری چمک تھی۔

”اور وہ...؟“ وہ... وہ... وہ... اس کا دل وہ وہ کی تکرار کر رہا تھا۔

”سچ میں تو بہت امیر ہیں ہوئی۔ کھانا بھی بہت شاندار تھا۔ پیٹ بھر گیا لیکن نیت نہیں بھر رہی تھی۔“ اس کا دل چاہا پرمہ کر شاملہ کو جھنجھوڑ کر کہے۔

”یہ سب چھوڑو۔ اس کا بتاؤ وہ کیسا ہے؟“ لیکن وہ ضبط سے کھڑی رہی کیونکہ شاملہ کا جواب جانتی تھی۔

”پہلے خود کو تو دیکھو۔“

”اب دیکھو اماں ابا کیا فیصلہ کرتے ہیں؟“ شاملہ پیروں سے سینڈل نکالتے ہوئے پھر کہنے لگی۔ ”راستے میں اماں کی باتوں سے تو لگا جیسے وہ رضامند ہوں لیکن ابا بالکل خاموش تھے۔“

”کیوں؟“ اسے خود نہیں پتا اس کے منہ سے یہ ایک لفظ کیسے نکل گیا تھا۔

”اس لیے کہ لڑکا ہے تو بہت خوب صورت لیکن

شاملہ اسے سولی پر چڑھا کر مزہ لے رہی تھی۔ اس

نے اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر منتقل کیا تھا۔

”سچ بہت افسوس ہوا“ بے چارہ لنگڑا ہے۔“ شاملہ نے افسوس بھی یوں کیا جیسے جب ہی تو تمہارے لیے آئے اور وہ اگر پیروں کو مضبوطی سے نہ جما چکی ہوتی تو یقیناً ڈھسے جاتی۔ جبکہ اب سن ہو گئی تھی۔

”خیر میں اس کی تصویر لانی ہوں۔ ابھی دکھاتی ہوں۔“ شاملہ کہتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ تو وہ ایسے ہی گم صمم بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔

”ہاں۔“ شاملہ کپڑے تبدیل کر کے واش روم سے نکلی تو اپنا پرس کھول کر تصویر نکالنے لگی پھر اس کے ہاتھ میں تصویر تھما کر بولی۔

”دیکھو کتنا خوب صورت ہے۔“ اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں تو شاملہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”دیکھ تو لو۔“

”مجھے نہیں دیکھنی۔“ وہ تصویر بیڈ کار پر پھینک کر لیٹے ہی لحاف میں چھپ گئی۔



صبح اس کی چند می آنکھیں شدت گرمی کے باعث نظریں نہیں آ رہی تھیں۔ آنکھوں میں جلن الگ الگ مچ رہی تھی۔ چولہے کے پاس کھڑے ہونا عذاب ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے سب کے لیے ناشتا بنایا اور ابا کے جاتے ہی معمول کے کاموں میں لگ گئی۔ آج شاملہ جانے کس خوشی میں ابھی تک بڑی سو رہی تھی۔ وہ تو کبھی یونیورسٹی گولی نہیں کرتی تھی۔ اماں چلا چلا کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر اسے پکار کر بولیں۔

”اے صاعقہ! دیکھو تو اسے کیوں ابھی تک پڑی سو رہی ہے۔ اتنا دن چڑھ آیا۔“

”دن ہی چڑھا ہے ناں اماں قیامت تو نہیں آگئی۔“ شاملہ غالباً ”لحاف میں سے منہ نکال کر چٹلخ سے بولی تھی۔“

پتا نہیں قیامت کیسی ہوتی ہے اس نے
کپڑے مشین میں ڈالتے ہوئے سوچا پھر بٹن گھما کر
اماں سے دوسرے کھانے کا پوچھنے اندر آئی تو شاملہ کہہ
رہی تھی۔

”اماں آپ ان سے پوچھتیں تو سہی کہ انہیں
ہمارے گھر کا پتا کس نے دیا؟“

”کسی نے بھی دیا ہو۔“ اماں نے اسے دیکھ کر
شاملہ کو ٹالا تھا پھر اس سے پوچھنے لگیں۔ ”کپڑے
دھل گئے تمہارے؟“

”بس آخری چکر ہے۔ آپ بتائیں دوسرے
کھانے میں کیا کچے گا؟“ اس نے شاملہ کی بات سے
خود کو انجان ظاہر کر کے پوچھا۔

”کچھ بھی پکالو۔ مگر تمہیں مریم بھی آئے گی۔ پلاؤ
شوق سے کھاتی ہے۔ پلاؤ کے ساتھ سالن روٹی بھی بنا
لینا۔“ اماں نے کہا تو شاملہ فوراً بولی۔

”ہاں سالن روٹی ضرور ہو۔ میں پلاؤ نہیں کھاتی۔“
”مجھے پتا ہے۔“ وہ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی تھی۔

بھر جو وہ کچن میں مصروف ہوئی تو اسے مریم سے حال
حال پوچھنے کی فرصت ہی نہیں ملی نہ اس کے بچے کو گود
لینے کی۔ یوں بھی وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں نے اسے
خاص طور سے کیوں بلایا ہے۔ لیکن اس کے اندر کوئی
تجسس نہیں تھا جب ہی اس نے اندر سے آتی
آوازوں پر کان نہیں دھرے اور اپنے کام میں مصروف
رہی۔ اس دوران وقفے وقفے سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی
تھی۔ جس پر کام کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رکے ضرور
تھے لیکن وہ بھاگ کے سننے نہیں گئی۔ گو کہ شاملہ نے
ہر بار اسے پکار کر فون اٹھانے کو کہا تھا پھر اسے خود ہی
اٹھنا پڑا اور ہر بار وہ فون کرنے والے کو گالیاں دیتے
ہوئے اندر گئی تھی آخر میں اماں سے الجھ رہی تھی کہ وہ
یہ برائے زمانے کا ٹیلی فون سیٹ پھینکیں اور سی ایل
آئی لگوائیں۔

بہر حال کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شاملہ اور
مریم اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ دونوں اس سے چھوٹی
تھیں اور اس وقت اس کی آپا جان بنی ہوئی تھیں۔

مریم پتا نہیں اماں کی زبان بول رہی تھی یا وہ خود بھی یہی
چاہتی تھی کہ وہ اس رشتے پر ہامی بھر لے۔ اور شاملہ
مریم سے اتفاق بھی کرتی لیکن آخر میں یہ بھی ضرور
کہتی کہ تم سوچ لو۔

اور وہ کیا سوچتی خود سے آگاہی نے اسے اپنی ہی
نظروں میں بے مایہ کر دیا تھا۔

”پھر میں اماں سے کیا کہوں؟“ آخر میں مریم نے
پوچھا تو وہ دل گرفتہ سے بولی۔
”ابھی کچھ مت کہو۔“

”ہاں ٹھیک تو ہے۔ دو چار دن کی بات تو نہیں ہے۔
زندگی بھر کا معاملہ ہے خوب اچھی طرح سوچ لو۔“
شاملہ نے فوراً اس کی تائید کرتے ہوئے کہا پھر مریم
سے بولی۔ ”تم اماں سے کہہ دو جلدی مچانے کی
ضرورت نہیں ہے۔ شکل صورت کا کیا ہے وہ تو اللہ کی
بنائی ہوئی ہے باقی تو ہر فن مولا ہے صاعقہ۔“ اس نے
شاملہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا جو گھما پھرا کر اس کی
کم روی جتا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن سوچنے میں زیادہ وقت نہیں
لگانا۔ ایسا نہ ہو۔“ مریم بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئی
تو وہ چائے بنانے کا کہتے ہوئے پھر کچن کی طرف آرہی
تھی کہ فون کی بیل رینگ گئی۔

”اب تو میں وہ گالیاں دوں گی کہ۔۔۔“ شاملہ غصے
میں اٹھی تھی کہ اس نے روک دیا۔

”نہیں رہنے دو۔ اس وقت ناویہ فون کرتی ہے۔“
اس نے جا کر ریسور اٹھا کر ہیلو کہا تو وہ پوچھنے لگا۔
”کیا بہت مصروف ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ اس کے اختصار پر وہ کہنے لگا۔
”تو بتا دو کب فارغ ہوگی۔ میں اس وقت فون کر
لوں گا۔“

”نہیں ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے میں اب فارغ
ہوں۔“

”تھینک گاڈ! پتا ہے میں اس وقت سے یہ سوچ کر
پریشان تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھ سے بات ہی
نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے کہا تو وہ سوچ کر بولی۔

”پریشان کیوں۔ تمہیں ایسے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ میں کبھی اچانک غائب بھی ہو سکتی ہوں۔“

”غائب مطلب؟“ اس نے فوراً ٹوکا۔

”مطلب میری شادی ہو سکتی ہے یا پھر میں مر سکتی ہوں۔“

”اللہ نہ کرے۔ ہاں شادی والی بات ٹھیک ہے۔ کیا تمہاری شادی ہو رہی ہے؟“

”پتا نہیں کوئی اور بات کرو۔“ اس کے اندر کا بوجھل پن اس کی آواز میں در آیا تھا جسے اس نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

”سنو! میں نہیں جانتا تمہارے نزدیک میری کتنی اہمیت یا کیا حیثیت ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی۔“

”ایک تم ہی تو ہو۔“ اس کا دل اسی لے پر دھڑکا تھا۔

”لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ کہ میرے لیے اس ساری دنیا میں ایک صرف تم ہو اور میں تم سے کہوں گا اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔“

”دکھ۔ دکھ تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔“

”اس چھوٹے سے لفظ میں کیا کچھ ہے یہ بھی تو دیکھو۔“ اس کی بات پر وہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

”ہیلو صاعقہ۔“ قدرے رک کر اس نے پکارا تو وہ آہستہ سے ریسور رکھ کر کچن میں جا چھپی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اسے اپنے گھر میں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ کیونکہ اماں نے اسے مسلسل اپنی نظروں میں رکھ لیا تھا۔ اور ان کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔

”کیا سوچا تم نے؟ اس کے بعد جیسے باور بھی کراتی تھیں کہ اس کے بعد کوئی نہیں۔۔۔ لیکن کوئی تھا۔

رینڈوا چار بچوں کا باپ جس کی بیوی چوتھے بچے کی پیدائش پر جانبر نہیں ہو سکی تھی اور اب اسے بچوں

کے لیے گھر میں عورت کی ضرورت تھی۔

ضرورت؟؟ تو وہ ضرورت تھی۔ چاہت تو نصیب والے ہی بنتے ہیں۔ اور اس کے لیے نصیب کہاں۔ وہ تو احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے لیے ایسے ہی رہ گئے ہیں۔ بہر حال ایسوں میں ہی اسے انتخاب کا تھوڑا غرور ضرور مل گیا تھا۔

”سنو، تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“ اس وقت شائلہ نے بہت تیکھے انداز میں پوچھا تو فوری طور پر وہ سمجھی نہیں۔

”کیسا مسئلہ؟“

”وہ جو تمہارے لیے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ روز فون کر کے پوچھتے ہیں کہ کب آئیں۔ اماں کب تک انہیں آس میں رکھیں گی؟“

شائلہ کی وضاحت پر وہ بے دلی سے بولی۔ ”میں کیا کہوں میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔“

”کیا؟ اتنے دنوں سے تم نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ سنو بات وہ کرو جو اگلے کو ہضم ہو۔“ شائلہ جانے کیوں چڑی ہوئی تھی۔

”میں نے سچ کہا ہے۔ تمہیں سچ ہضم نہیں ہو رہا تو میں کیا کروں۔ چلو ایسا کرو تم بتا دو۔“ اس نے کہا تو شائلہ تپ کر بولی۔

”میں کیوں بتاؤں۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔“ ”جب صرف زندگی گزارنی ہے تو وہ تو یوں بھی گزر رہی ہے۔“ وہ عجیب سے احساس میں گھری تھی۔

”اس کا مطلب ہے تم نے بھی خواب سجا رکھے ہیں۔“ شائلہ کی ہنسی میں تمسخر تھا۔

”ہاں، لیکن میرے خوابوں میں کوئی حسین راہگزر نہیں ہے۔ رنگ بھی ٹیلا ہے۔ ایسا ہی جیسے میرے ناخن ہیں۔“ وہ اپنے ناخن دیکھ رہی تھی۔ شائلہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن جانے کیوں چپ ہو گئی تھی۔ شاید اس پر ترس آیا تھا آخر کوماں جانی تھی۔

”خیر تم اماں سے کہہ دو میں انہیں ایک دو دن میں بتا دوں گی کہ مجھے لنگڑے کے خدمت گار بننا منظور ہے یا چار بچوں کی یا۔“ آخری یا پر اس کی آنکھوں میں ہلکی

ی چمک لہرائی تھی جس پر شائلہ چونکی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی سوال کرتی وہ وہاں سے اٹھ آئی لیکن اس کا اپنا ذہن آخری یا میں اڑکا تھا۔

”کیا کروں۔ کیا اپنے دکھ اس کی جھولی میں ڈال دوں؟“ رات کتنی دیر تک وہ خود سے پوچھتی رہی۔ کبھی جواب ہاں میں آتا کبھی ناں میں۔

”کیا ہو گا زیادہ سے زیادہ وہ بھی سب کی طرح مجھ پر ہنس لے گا۔“

”یونہی سہی۔“ اس نے سوچ لیا اور اگلے دن جب اس کا فون آیا تو وہ اپنی ہمتیں یکجا کرنے میں لگی رہی۔ ”کیا بات ہے۔ تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟“ آخر اس نے ٹوکا تھا۔

”وہ میں۔۔۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ہاں کہو۔ کوئی۔۔۔! دوسری بار مان بھرا اصرار تھا اور کوئی تو تھا جسے اس پر مان تھا۔ اس نے اسی مان کی ڈوری تھام لی۔

”تم مجھ سے شادی کرو گے۔۔۔؟“ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ گہری خاموشی۔ جبکہ اس کا سارا دھیان اس کی طرف تھا۔

”جواب دو۔ ہاں یا نہ۔ بولو نا۔ خدا کے لیے کچھ کہو۔ میرا ہاتھ تھامو گے۔ تھام لو۔ نکال لو مجھے اس گرداب سے۔“ وہ ٹوٹ گئی، بکھر گئی۔ متیں کرنے لگی۔ ”میں تمہیں بہت سکھ پہنچاؤں گی۔ میں، میں ہر فن مولا ہوں۔ سارے کام منٹوں میں کر سکتی ہوں۔ تمہیں کسی کام کے لیے کہنا نہیں پڑے گا سب تیار ملے گا اور بد کے میں کچھ مانگوں بھی نہیں۔ بس یہ مان مجھے بخش دو۔ ہمیشہ کے لیے ہیلو ہیلو۔“ وہ بے قراری سے پکار رہی تھی اور اسی روانی سے اس کے آنسو چھلک رہے تھے۔ دوسری طرف سے فون بند نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ بولا نہ ہنسا۔ کاش ہنس لیتا تو یہ تسلی ہو جاتی کہ وہ بھی اوروں جیسا ہے۔ اس کی چپ نے تو مار ڈالا۔

اور اس روز شاید زندگی میں پہلی بار وہ سب کی فکر چھوڑ کر لحاف میں جا چھپی تھی۔ وہ سوئی نہیں تھی بس

سوئی بن گئی۔ وقفے وقفے سے اماں کی پکار پھر تشویش۔ ”اے دیکھو تو کیا ہوا ہے اسے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ ایسے تو کبھی نہیں سوئی۔ اس نے کسی بات پر کان نہیں دھرے۔ اپنے میالے خوابوں میں پناہ ڈھونڈتی رہی تھی۔



جب خدمت گارہی بننا تھا تو پھر لنگڑا ہوا یا رنڈوا کیا فرق پڑتا تھا۔ لیکن یہاں اس نے پہلے چار بچوں کا سوچا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں جانے انجانے میں وہ بچوں کے ساتھ زیادتی کر بیٹھی تو محشر میں اس کی پکڑ نہ ہو جائے۔ اس نے لنگڑے کے حق میں منظوری دے دی تو اماں نے اسی وقت اوہر فون کھڑکا دیا تھا۔ اس کے بعد شائلہ کی شامت آگئی۔ اماں اس کے سر پر خوار صفائی دھلائی یہ کرو وہ کرو۔ جس نے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ ہاتھ سے زیادہ زبان چلا رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات۔

”مجھ سے نہیں ہوتا اماں۔ صاعقی سے کہیں ناں۔“

”نہیں صاعقہ اب کوئی کام نہیں کرے گی۔ چند دن کی مہمان ہے۔“ اماں کا جواب بھی اس کے اندر کے سنائے کو نہیں توڑ سکا تھا۔

شام میں وہی دو خواتین اور ان کے ساتھ تیسری لڑکے کی بہن غالباً ”جنتس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی تھی اور اسے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ یقیناً ”شاکڈ تھی۔“

میرے اتنے خوب صورت بھائی کے لیے یہ۔۔۔!! اس نے ایسی ہی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ پھر کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد شاید وہ ماں کے سمجھانے پر ہی اس کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ ”تمہارا نام۔۔۔؟“ ”صاعقہ۔۔۔“

”مجھے پتا ہے کیونکہ اتنے دنوں سے گھر میں تمہارا ذکر ہو رہا ہے۔ میں حمزہ کی چھوٹی بہن ہوں۔ لیکن میں

اسے بھائی جان وغیرہ نہیں کہتی۔ تمہیں بھی بھابھی نہیں کہوں گی۔ اب یہ مت پوچھنا کیوں۔“ اس نے کہا تو وہ سبے ساختہ بولی۔
”تمہارا نام۔؟“

”پنکی۔ اصل نام تو کچھ اور ہے جو شاید اب میرے می ڈیڈی کو بھی یاد نہیں ہو گا اس لیے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ پنکی خاصی باتونی تھی۔ جتنی دیر بیٹھی مسلسل بولتی رہی اور وہ بس اسے دیکھتی رہی محسوس کرتی رہی اس کی باتوں میں کہیں کہیں تقاضا بھی جھلک رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ اسے اپنے بھائی کے ساتھ میچ کرتی نہیں لگ رہی۔ جب ہی ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے پہلی بار وہ تصویر اٹھا کر دیکھی جو شائلہ سے لے کر اس نے پونہ رکھ دی تھی۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ اس میں کوئی عیب بھی ہو سکتا ہے۔

پتا نہیں یہ شروع سے ٹانگ سے محروم ہے یا کسی حادثے میں۔ سوچتے ہوئے اسے اس سے اس وقت ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

پھر اگلے روز دوبارہ میں پنکی آگئی اور اماں سے پوچھ کر اسے اپنے ساتھ بیوی پارلر لے آئی۔ شہر کا مہنگا ترین پارلر جہاں چار گھنٹے وہ ایک ہی زاویے سے آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے آئینے میں وہ خود کو دیکھتی نہیں رہ گئی تھی کیونکہ چار گھنٹے کی محنت نے اسے کوئی حور پری نہیں بنا دیا تھا۔ بس یہ تھا کہ مستقل بے توجہی کے باعث جو چہرہ بے رونق ہو گیا تھا وہ قدرے صاف اور چمکتا ہوا لگ رہا تھا اور بال رنگنے سے بھی کافی فرق پڑا تھا۔ باقی مین نقش وہی تھے۔ پنکی بیوٹیشن سے اسی سے متعلق بات کر رہی تھی۔ پھر جب اسے واپس گھر چھوڑا تو کہنے لگی۔

”تمہیں شادی تک روزانہ اسی پارلر جانا ہے۔ پک اینڈ ڈراپ کے لیے می گاڑی بھیج دیں گی ٹھیک۔“ اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
”مجھے یقین ہے چند دنوں میں تم اچھی لگنے لگو گی۔“

پنکی کا انداز جتانے والا نہیں تھا۔ غالباً ”بے دھیانی میں کہہ گئی تھی۔ لیکن اس نے بری طرح محسوس کیا اور دل چاہا کہ وہ اپنے لنگڑے بھائی کے لیے کوئی اس جیسی دیکھ لو۔

”میں چلتی ہوں اور ہاں حمزہ نے تمہارے لیے یہ بھیجا ہے۔“ پنکی نے کہتے ہوئے گاڑی کے اندر سے ایک گفٹ بیگ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ”پنکی اوکے بائے“ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”ہونہ۔۔“ وہ سر جھٹک کر اندر آگئی تو اماں اسے دیکھنے لگیں جبکہ شائلہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”ارے! تم تو کافی چینیج ہو گئی ہو۔“ پھر اماں سے کہنے لگی۔ ”دیکھیں اماں! یہ ایسے ہی سر جھاڑ منہ پھاڑ پھرتی تھی۔ اگر شروع سے خود پر توجہ دیتی تو اب تک وہ بچوں کی ماں بن چکی ہوتی۔“

اماں نے اس سے نظریں ہٹا کر شائلہ کو دیکھا لیکن بولیں کچھ نہیں۔

پھر چند دنوں میں اتنا ضرور ہوا کہ اسے آئینے میں خود کو دیکھنا اچھا لگنے لگا تھا اور جہاں تھوڑی خود پسندی آئی وہاں قسمت سے شامی ہو گئی کہ اس کے نصیب میں لنگڑا کیوں لیکن اب جبکہ شادی میں چند دن رہ گئے تھے تو وہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی اور منع کرتی بھی تو کس بنیاد پر۔

وہ جو اس کے سارے دکھ لینے کی بات کر رہا تھا وہ طویل خاموشی کے بعد آج اس سے پوچھ رہا تھا۔

”سنو! کیا واقعی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔۔“ وہ اچانک سخت ہو گئی تھی۔

”نہیں!! پھر اس دن۔۔؟“

”محض مذاق تھا۔“ وہ فوراً بولی۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ اس نے بھی فوراً کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

”جھوٹ کیوں بولوں گی۔ کیا تمہیں یاد نہیں اس

سے پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اچانک غائب ہو

سکتی ہوں۔ میری شادی ہو سکتی ہے۔ تو میری شادی

میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔

”یہ تکلیف کیا کم ہے کہ۔۔۔“ اس نے خود ہی اپنی سوچ پر ہرے بٹھا دیے۔

اب جو بھی ہے جیسا بھی ہے زندگی اس کے ساتھ گزار لی ہے۔“ اس نے سمجھوتا ضرور کر لیا لیکن دل میں ایک پھانس چھپی رہ گئی تھی۔

صبح وہ اپنے معمول کے مطابق فجر میں ہی اٹھ گئی۔

اطمینان سے نماز پڑھی۔ اس کے بعد کچھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ گھر میں تو اسی وقت سے روٹین کے کام شروع ہو جاتے تھے۔ یہاں پتا نہیں کیا معمول تھا۔

اس نے کھڑکی سے ذرا سا پردہ سرکا دیا اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر اجالا پھیلتے ہوئے دیکھنے لگی۔ حالانکہ یہ سب اس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن پھر بھی نیا تھا کیونکہ یوں فراغت سے وہ پہلی بار کائنات کو منور ہوتے دیکھ رہی تھی۔

جب سورج کی پہلی کرنیں براہ راست اس کی آنکھوں پر پڑیں تب پردہ برابر کر کے اس نے رخ موڑا تو نظروں کے سامنے حمزہ آ گیا۔ وہ سینے تک کمر اور ڈھبے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ پہلے بے دھیانی میں اور پھر پورے دھیان سے بھی اسے ہی دیکھ گئی۔

”ایسے وجہہ چہرے کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر یہ مکمل ہوتا تو کتنی لڑکیاں بلکہ ہر لڑکی اس پر مرتی اور اس وقت میری جگہ کوئی پری وش ہوتی۔ اور یہی بات اسے کم مائیگی اور کم روی کے احساس سے نکلنے نہیں دے رہی تھی۔“

وہ معذور ہے تب ہی وہ اس کی زندگی میں آئی ورنہ تو وہ اسے کبھی دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ یہ سوچ یہ احساس اتنا زور آور تھا کہ رات اس کی محبتیں بھی اسے زائل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

”صاعقہ!“ وہ پکارنے کے ساتھ اٹھ رہا تھا۔ وہ چونک کر پہلے بلا ارادہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر خیال آنے پر اس کی بیساکھی اٹھالائی۔

”تھینک یو!“ وہ اس کے ہاتھ سے بیساکھی تھام کر مسکرایا پھر پوچھنے لگا۔ ”تم کب اٹھیں۔۔۔“

اس وقت طے تھی۔

”تم خوش ہو اس شادی سے؟“ اس نے رک کر پوچھا تو وہ ضبط سے بولی تھی۔

”ناخوش بھی نہیں ہوں۔“

”وضاحت کرو گی؟“

”نہیں اور اب تم مجھے فون مت کرنا۔ میں نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں۔“ وہ کہہ کر فون رکھنا چاہتی تھی کہ ادھر اس نے سمجھ کر فوراً روکا۔

”ایک منٹ اتنا بتا دو کیا تم نے کبھی تنہائی میں مجھے سوچا تھا؟“ وہ خاموش ہو گئی۔

”جواب دو۔ ہاں یا نہ۔ بولو نا۔ خدا کے لیے کچھ کہو۔“ وہ اس کے بعد بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا تھا۔

”یہ میں ہوں؟“ آئینے میں ایک ٹک خود کو دیکھتے ہوئے اس کا دل بار بار یہی تکرار کر رہا تھا۔ لیسن کلر کا جھلملاتا شرارہ سوٹ پیسجنگ جیولری اور یقیناً ”میک اپ“ کا کمال تھا جو وہ واقعی خوب صورت لگ رہی تھی اور یہ پہلی بار تھا کہ اس کی نظریں خود پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ دروازہ کھلنے بند ہونے کی آواز اس نے سنی ہی نہیں۔ جب حمزہ نے سلام کیا تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا تھا۔

اس کی نظریں بہت دھیرے دھیرے حمزہ کے چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کے ایک پیر پر جا ٹھہری تھیں۔

”میں تمہارا تھینک فل ہوں کہ تم نے مجھے میرے ادھورے وجود کے ساتھ قبول کر لیا۔“ وہ اس کے سامنے آ بیٹھا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یقیناً“ تم بہت بڑے ظرف کی مالک ہو۔“

ظرف۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ نہ میرا ظرف بڑا ہے نہ تمہارا۔ ہم دونوں مجبور تھے۔

”میرے پاس تمہیں دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”اور جو تم کہو گی۔ تمہاری خوشی میرے لیے سب سے اہم ہے۔ ان اولین لمحوں میں“

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

ناشتے کے بعد سرے میں آئی تو سمجھتے ہوئے حمزہ سے کہنے لگی۔

”آپ کو پینکی کو ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔“
 ”پاکل ہے وہ۔“ حمزہ نے سر جھٹکنا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر بولا۔ ”ڈونٹ کیئر۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔“
 ”پینکی ناراض ہو گئی ہے۔“ وہ بیٹھی تب بھی وہی بات۔

”نہیں۔ کہانا پاکل ہے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر میں بھاگی چلی آئے گی۔ ویسے اگر وہ ناراض ہو بھی جائے تو۔“

”اچھا نہیں لگے گا۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔
 ”اس کا مطلب ہے تم صلح پسند ہو۔ اچھی بات ہے۔“ وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر پوچھنے لگا۔ ”اور کیا کیا پسند ہے تمہیں؟“

”آپ بتائیں؟“ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو الٹا اس سے پوچھ لیا۔

”بچھے۔“ وہ ایک لحظہ رک کر گویا ہوا۔ ”کائنات کی ہر شے جسے دیکھتے ہی خدا یاد آئے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ حسن پرست ہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔ حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا تھا کہ ملازمہ دروازے میں آکر بولی۔

”صاحب! بی بی کے گھر والے آئے ہیں۔“

”انہیں یہیں لے آؤ۔“ حمزہ ملازمہ کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس کے بازو کے حلقے سے نکل کر کچھ فاصلے پر جا بیٹھی۔

شائلہ اور مریم آئی تھیں۔ شاید ناشتا وغیرہ لے کر ان کے خیال میں بڑے لوگوں کی صبح بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی لیکن ان دونوں کو فریش دیکھ کر شائلہ کو حیرت ہوئی اور بے ساختہ اظہار بھی کر گئی۔

”ارے، میرا تو خیال تھا ہمیں گھنٹہ بھر تم لوگوں کے اٹھنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”آپ کا خیال درست ہو سکتا تھا اگر جو صاعقہ

”میں فجر میں اٹھنے کی عادی ہوں۔“ وہ جواب دیتی ہوئے اس کے ایک پیر کی چپل بیڈ کے نیچے سے نکالنے کے لیے جھک گئی۔ تو شانوں پر ڈھلک آنے والے بال حمزہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

”تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں۔“
 رنگنے سے خوب صورت لگنے لگے ہیں۔“ اس کی صاف گوئی پر وہ انجان سا بن گیا۔

پھر جب تک وہ واش روم سے نکلتا اس نے عادت کے مطابق بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پھولوں کی پتیاں سمیٹ دیں۔ جس پر حمزہ نے واش روم سے نکلتے ہی اعتراض کیا۔

”یہ سب تم نے کیوں کیا۔ ابھی ملازمہ آتی ہو گی۔“ وہ خاموش رہی تھی۔

”اچھا چلو! ممی ناشتے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔“ حمزہ نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ اسی خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

ڈائننگ روم میں حمزہ کے ممی ڈیڈی اور پینکی جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ اس نے سلام کیا اور جب دیکھا کہ حمزہ آرام سے بیٹھ گیا ہے تب وہ بھی بیٹھ گئی۔

”لو بیٹا! جو تم پسند کرو۔“ ممی اسے اپنی مدد آپ کا کہہ کر خود ڈیڈی کو ناشتہ سرو کرنے لگیں تو اس نے کن اکیوں سے حمزہ کو دیکھا اور اس کی طرح سلائس کے ساتھ انڈے کی پلیٹ اٹھالی۔

”ہاں حمزہ... پینکی جیسے اچانک یاد آنے پر بولی تھی۔“ رانیہ کا فون آیا تھا۔ بہت دور رہی تھی۔

”شٹ اپ۔“ حمزہ نے ہلکے انداز میں پینکی کو ٹوکا تو وہ چیخ کر بولی۔

”واٹ شٹ اپ۔ تم نے اسے۔“

”آئی سے شٹ اپ۔“ حمزہ کی آواز تیز ہو گئی تب ممی نے مداخلت کی۔

”پینکی خاموشی سے ناشتا کرو۔“

”نہیں کرنا مجھے ناشتا۔“ پینکی غصے سے اٹھ کر چلی گئی تو وہ جو انجان اور لا تعلق تھی خائف ہو گئی اور

عادت کے مطابق فجر میں نہ اٹھ گئی ہوتیں۔ ”حمزہ نے شائلہ سے کہتے ہوئے محبت بھری نظر اس پر ڈالی تھی۔ ”کمال ہے۔ ایک ہی رات میں آپ اس کی عادات سے بھی واقف ہو گئے۔“ شائلہ کی ہنسی عجیب تھی یا شاید حمزہ کو محسوس ہوئی جو وہ نظر انداز کر کے اٹھنے لگا تو صاعقہ فوراً ”اس کی بیساکھی لے آئی۔“ ”آپ کہاں جا رہے ہیں حمزہ بھائی؟“ مریم نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

”ماما کے پاس تاکہ آپ لوگ ایزی ہو کر اپنی بہن سے باتیں کریں۔“ اس کے جواب پر شائلہ فوراً ”بولی۔“ ”ہم تو آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے بہن سے تو ہم گھر جا کر باتیں کر لیں گے۔“

”گھر جا کر؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”جی! ابھی ہم صاعقہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پھر شام کو آپ آئے گا۔“ شائلہ نے کہہ کر شوخی سے صاعقہ کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھی۔ ”اچھی بات ہے۔“ وہ کیوں کس لیے کا سوال اٹھائے بنا کمرے سے نکل گئی تھی شائلہ اس سے بولی۔ ”چلو صاعقہ! تم تیار ہونا یا چھینچ کرو گی؟“

”نہیں لیکن۔“ وہ کچھ پریشان ہو گئی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

”کیا لیکن؟ ہمارے ہاں کا یہی رواج ہے۔ اماں نے بھی کہا ہے تمہیں ساتھ لے کر آئیں۔ کیوں مریم؟“ شائلہ نے تصدیق کے لیے مریم کو مخاطب کیا تو وہ کہہ وہ ان دونوں سے چھوٹی تھی لیکن جلد شادی ہو جانے کے باعث تجربے میں بڑی ہو گئی تھی تب ہی سمجھ واری سے کہنے لگی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو شائلہ! لیکن پہلے اسے اپنی ساس اور میاں سے تو اجازت لینے دو۔ ایسے ہی تو ہمارے ساتھ نہیں چل پڑے گی۔“

”ایسے ہی کیوں؟ ابھی میں نے حمزہ کو بتایا تو ہے اور اس نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔“

”پھر بھی جاؤ صاعقہ! تم اپنی ساس سے پوچھ لو۔“ مریم نے کہنے کے ساتھ اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ

منون نظروں سے اسے دیکھتی کمرے سے نکل گئی۔ اسے نہیں یاد کبھی اماں نے اسے اپنے سینے میں بھینچ کر چٹا چٹ پیار کیا ہو جیسے اب کر رہی تھیں تب ہی وہ حیران اور بوکھلا بھی گئی تھی۔ ”کیا ہو گیا ہے اماں! کیا میں شائلہ اور مریم کی طرح خوب صورت ہو گئی ہوں۔“ اس نے کہا تو شائلہ زور سے ہنسی جس پر اماں اسے گھور کر بولیں۔ ”خوب صورتی نصیب میں ہوتی ہے بیٹی اور تو بڑے نصیبوں والی ہے۔“

”بس رہنے دیں اماں۔ بڑے نصیبوں والی! مجھے تو اس پر ترس آ رہا ہے۔ بے چاری ساری زندگی بیساکھی پکڑے کھڑی رہے گی۔“ شائلہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور اماں یقیناً ”اسے بے نقط ستانے والی تھیں لیکن اس نے اماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ اس کی خاطر خود پر جبر کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔“

”سوری، تمہیں برا لگے۔“ شائلہ کو احساس نہیں ہوا تھا بلکہ مزید اس پر جتنا چاہتی تھی۔ وہ سمجھ کر بھی مسکرا دی۔

”نہیں، تم جانتی ہو۔ میں کبھی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوتی۔“

”اوہو یہ تم دونوں کیا باتیں کرنے لگیں۔ تم بیٹھو صاعقہ اور مجھے بتاؤ حمزہ بھائی نے تمہیں منہ دکھائی میں کیا دیا۔“ مریم نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا کر شوق سے پوچھا تو وہ بے ساختہ بولی۔

”سب کچھ۔“

”مطلب۔۔۔؟“ شائلہ کو تجسس ہوا۔ ”مطلب انہوں نے کہا وہ میری ہر خواہش پوری کر دیں گے۔ ویسے فارملیٹی کے لیے انہوں نے یہ انگوٹھی پہنائی تھی۔“ اس نے بتاتے ہوئے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ سامنے کر دیا۔

”ڈائمنڈ۔“ اشتیاق سے دیکھتے ہوئے مریم کی آنکھیں چمکنے لگیں اور شائلہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یہی فون کی بیل بجنے لگی وہ کیونکہ کھڑی تھی اس لیے فون

سنے چلی گئی لیکن چند لمحوں میں ہی برہنہ ہوتے ہوئے واپس آئی تو مریم نے بلا ارادہ پوچھ لیا۔
”کس کا فون تھا؟“

”یتا نہیں کوئی گونگا تھا۔“ شائلہ کے جواب پر اس کی دھڑکنیں مدھم مدھم ہوئی تھیں اور ذہنی رو بھٹکنے لگی تھی کہ اس کے سیل فون پر مہیج ٹون نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے سیل آن کیا۔ حمزہ کا مہیج تھا۔
”مس یو۔ Miss u۔“



اس کی شادی کو دو مہینے ہو گئے تھے بظاہر سب ٹھیک تھا بلکہ بہت اچھا۔ حمزہ کے پیار بڑے بزنس میں تھے اور ان کا ایسا ہی انداز تھا۔ اس کا سامنا ہوتا تو جیسے رک کر پوچھتے۔

”کیسے ہو بیٹا۔؟“

”سب ٹھیک ہے نا۔“

”کوئی برا بھلا تو نہیں۔“

”اوکے بی بی۔“ وہ آگے بڑھ جاتے تب اس کی سانس بحال ہوتی اور ماما کا لیا دیا انداز تھا۔ جبکہ پنکی کی اپنی دلچسپیاں تھیں، موڈی بھی تھی، کبھی بہت اچھے موڈ میں ہوتی اور کبھی بیزار نظر آتی۔ اس وقت جانے کس موڈ میں تھی کہ اسے بچن سے کھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئی اور بیڈ پر بٹھا کر پوچھنے لگی۔
”تم ہر وقت بچن میں کیوں کھسی رہتی ہو؟“

”ہر وقت تو نہیں بس اس وقت ایک دو ڈشز بنا لیتی ہوں یا پھر جب حمزہ کا چائے کافی کا موڈ ہوتا ہے تب۔“
اس کے جواب پر پنکی خاموش ہو گئی تو قدرے رک کر وہ پوچھنے لگی۔

”کیا تم یہی پوچھنے کے لیے مجھے یہاں لائی ہو۔“

”نہیں مجھے تم سے ایک اور بات کرنی ہے۔“ پنکی نے کہا تو وہ والیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”پہلے یہ بتاؤ تم حمزہ کے ساتھ خوش ہو۔“ پنکی ایک دم اس کے سامنے یوں بیٹھی تھی جیسے اسے بھجورنے کا ارادہ ہو تب ہی وہ اندر سے خائف ہو

گئی۔

”بتاؤ!“ پنکی نے واقعی اس کا ہاتھ پکڑ کر جارحانہ انداز میں ہلایا تب وہ جی کڑا کر کے بولی۔

”ہاں میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔“

”اب وجہ بھی بتاؤ؟“ پنکی نے کہا تو وہ الجھ گئی۔

”مطلب۔۔؟“

مطلب تم کیوں خوش ہو ایک ایسے شخص کے ساتھ جو تمہارے ساتھ چل نہیں سکتا۔ تمہیں کہیں لے جا نہیں سکتا۔“ پنکی کو۔۔ جانے کیا ڈپریشن تھا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے پنکی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”کیوں فرق نہیں پڑتا۔ کیا تمہارے پاس دل نہیں ہے۔ دماغ نہیں ہے۔ تم سوچتی نہیں ہو کہ کاش حمزہ اپنے پیروں پر چل سکتا۔ تمہیں اس کی بیساکھی بری نہیں لگتی؟“

”جب حمزہ کو میری صورت بری نہیں لگتی تو مجھے اس کی بیساکھی بھی بری نہیں لگتی۔“ اس کے جواب پر پنکی بری طرح جھنجھلا گئی۔

”اوکاڈا! کیسی لڑکی ہو تم۔ حمزہ کو تمہاری صورت کیوں بری لگے گی۔ تم اس کی پسند ہو۔ اس کی ضد تھی کہ وہ شادی کرے گا تو تم سے ورنہ کسی سے نہیں۔“ پنکی نے اسے دشت حیرت میں دھکیل دیا تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھے گئی۔

”یہی سچ ہے۔ میں نے اور ماما نے تمہیں حمزہ کی وجہ سے قبول کیا ہے۔ ورنہ اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین سمجھیں۔“

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں حمزہ کی پسند کیسے ہو سکتی ہوں۔ اس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں اگر دیکھ لیتا تو۔“

”اچھا تم حمزہ سے پوچھنا۔“ پنکی اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”کیا پوچھوں۔۔؟“

”ہی کہ خیر چھوڑو۔ مجھے اصل میں کوئی اور بات کرنی تھی۔“ پنگی کو اصل بات یاد آئی تو سر جھٹکا۔
”اور کیا بات؟“ وہ پھر خائف ہوئی۔

”اصل میں حمزہ میرا ایک ہی بھائی مجھے بہت پیارا ہے۔ جب ایکسڈنٹ میں اس کی ایک ٹانگ خراب ہوئی تو یقین کرو میں بہت روئی تھی ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی اور یہ غم مجھے گھلائے جا رہا تھا کہ حمزہ کبھی دونوں پیروں پر نہیں چل سکے گا لیکن پھر پاپا نے مجھے تسلی دی کہ وہ حمزہ کی مصنوعی ٹانگ لگوا دیں گے لیکن۔“ پنگی خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی کہ اس نے کھرا کر ٹوک دیا۔

”لیکن کیا؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے؟“

”ہے ممکن لیکن حمزہ نہیں مانا۔ میں نے اس کی اتنی منتیں کیں اب بھی کرتی ہوں اور وہ جو میری کوئی بات رد نہیں کرتا یہاں پتا نہیں کیوں کچھ سننا ہی نہیں چاہتا۔ تم، تم کو اس سے۔“ پنگی نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔ کیونکہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس کی پسند ہو۔ وہ اپنی پسند پا کر بہت خوش ہے۔ لیکن میں اس کی خوشی کو اور انداز سے سوچتی ہوں میرا مطلب ہے میں چاہتی ہوں وہ تمہارے ساتھ گھومے پھرے۔ لائف انجوائے کرے۔ سمجھ رہی ہوں۔“

اور وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ پنگی نے پھر کہا تھا کہ تم اس کی پسند ہو اور اس کا ذہن اسی بات میں الجھ رہا تھا۔ وہ پنگی سے ہامی بھر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ حمزہ واش روم میں تھا۔ اسے یہ بہت غنیمت لگا کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ دل کی طرح اس کے چہرے پر بھی غیر معمولی خاموشی پھیل گئی ہے۔ ساتھ سوالیہ نشان بھی تھے۔ کیونکہ وہ تو ابھی تک حمزہ کی محبتیں سمجھنے سے قاصر تھی۔ کہاں یہ بات کہ وہ اس کی پسند ہے۔ اگر وہ اپنی کم روی سے آگاہ نہ ہوتی اور تفحیک کا نشانہ نہ بن چکی ہوتی تو اس وقت اس کی کیفیت مختلف ہوتی۔ دل خوشی سے بے قابو ہوتا اور

حیران ہو ہو کر سوچتی کہ حمزہ نے اسے پہلے کہا اور پسند کیا کہ وہ اس کی چادر سن گئی۔ پھر اس سے اٹھلا کر پوچھتی بھی۔ لیکن اب تو وہ حیران سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی نیا مذاق تو نہیں ہونے والا۔ وہ بہت کچھ سہ چکی تھی لیکن اب اپنی تفحیک تزییل نہیں سہپائے گی۔

”یا اللہ! میں کیا کروں۔ انتہائی بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تب ہی واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے خود کو ٹارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن حمزہ دیکھ چکا تھا فوراً نہیں ٹوکا جب بیٹھ گیا تب پکار کر بولا۔

”صاعقہ! میرے پاس آؤ۔“ وہ سرعت سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے۔ تم رو رہی تھی؟“ حمزہ کے نرم لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔ اس نے انکار کیا نہ اقرار۔ سر جھٹکا لیا تو وہ اس کی پیشانی پر جھولتی لٹ اپنی انگلی سے ہلاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”کسی نے کچھ کہا ہے یا میری کوئی بات بری لگی ہے؟“

”نہیں ہنس پونہی۔“

”کیا پونہی۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سمجھ گئی کہ وہ جانے بنا چین نہیں پائے گا تب بمشکل بات بتائی۔
”وہ اماں کا فون آیا تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ارے کیا ہوا ہے انہیں۔ کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔“ حمزہ نے تشویش سے پوچھا۔

”پتا نہیں زیادہ بات نہیں ہوئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دنوں کے لیے اماں کے پاس رہ آؤں۔“ اسے اچانک فرار سوچ گیا۔

”ہاں کیوں نہیں ضرور جاؤ۔ یوں بھی جس طرح تم ان کی خدمت کر سکتی ہو شائلہ تو نہیں کر سکتی۔“ حمزہ نے اجازت دینے کے ساتھ کہا تو وہ دل ہی دل میں بات بن جانے پر شکر کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیسے پیاری ہو گئی ہوں۔ شکل تو وہی ہے میری۔
ناک نقشہ بھی کہیں بدلتا ہے۔“ وہ بے وحیانی میں
اپنے چہرے کا ایک ایک نقش چھونے لگی۔
”تو پہلے تمہارا ناک نقشہ کون سا تھا۔ بس تم خود پر
توجہ نہیں دیتی تھیں۔ صرف بال کلر کرنے سے ہی کتنا
فرق پڑا ہے۔ یہ تم پہلے بھی کر سکتی تھیں۔“
”اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔“ وہ تنک آکر اٹھ کھڑی
ہوئی۔

”تو جا کہاں رہی ہو۔“ مریم نے فوراً ٹوکا۔
”اماں کو دیکھو، کب سے پکانے میں لگی ہیں۔
مجھے تو مہمانوں کی طرح بٹھا دیا ہے۔ کسی کام کو ہاتھ
نہیں لگانے دیتیں۔“ اس نے کہا تو مریم ہنستے ہوئے
بولی۔

”ظاہر ہے اب تم پر آئی ہو چکی ہو۔“
”تو کیا کروں مجھ سے نہیں فارغ بیٹھا جاتا۔“
”اچھا ابھی تو بیٹھو۔ یہ بتاؤ کتنے دن رہو گی؟“ مریم
نے اس کا ہاتھ کھینچ کر بٹھا دیا۔

”باقاعدہ دن طے کر کے نہیں آئی تھی۔ جب دل
چاہے گا چلی جاؤں گی۔“

”کیا کہنے تمہارے دل کے ہمارے تو دل کے
ارمان دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔ ابھی جب آرہی تھی تو
میری ساس ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھیں جلدی آنا
جلدی آنا۔“ مریم یہ دکھڑے پہلے بھی روتی تھی تب وہ
اس پر ترس کھاتی تھی۔ اب ہنس کر بولی۔

”ہاں تو بے چاری تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی بنا۔“
”بس رہنے دو۔ بے چاری ہو نہ۔“ مریم نے جل
کر سر جھٹکاتے ہی ٹیلی فون کی بیل بج اٹھی۔
”اے دیکھنا کس کا فون ہے۔“ اماں کچن سے چلائی
تھیں۔

”حمزہ بھائی کا ہو گا۔ تم جاؤ۔“
”کوئی نہیں حمزہ میرے سیل پر کال کرتے ہیں۔“ وہ
کہتے کے ساتھ لیٹ گئی تو مریم منے کو اس کے پاس لٹا
کر چلی گئی۔

پھر شام میں ماما سے لینے آگئیں تو جہاں وہ ان کی

اماں کے ہاں آئے اسے تیسرا دن تھا۔ اس دوران
حمزہ مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔ کبھی فون کرتا
— کبھی مہیج گویا اسے پل بل کاٹنا دشوار تھا۔
اماں اس کے لیے حمزہ کی بے قراری دیکھ کر اس پر نہال
ہوتی رہتیں۔ جبکہ اسے اب بھی ڈور کا کوئی سیرا نہیں مل
رہا تھا۔ اس وقت وہ پنکی کی باتیں سوچ رہی تھی۔

”تم حمزہ کی پسند ہو۔ اس کی ضد تھی کہ وہ شادی
کرے گا تو تم سے ورنہ نہیں۔“ پھر وہ صاف گوئی سے
بولی تھی۔ میں نے اور ماما نے تمہیں حمزہ کی وجہ سے
قبول کیا ہے۔“

پنکی کی صاف گوئی کے باعث وہ اس کی دوسری
باتیں نہیں بھلا پا رہی تھیں نہ وہ حمزہ کی محبتوں سے منکر
تھی۔ سچائیوں میں ہی الجھ رہی تھی کہ مریم نے آکر
ایک دم اپنے بچے کو اس کی گود میں ڈال دیا۔

”ارے۔“ وہ اچھل پڑی۔ ”تم کب آئیں؟“
”ابھی۔“ مریم کھلکھلاتے ہوئے اس کے قریب
بیٹھ گئی۔ ”اماں نے بتایا تم آئی ہو تو میں چلی آئی۔
تمہارے سسرال آنا تو بہت مشکل ہے۔“

”کیوں؟“ وہ چونچے پر جھکی تھی۔ سسرال نچا کر کے
مریم کو دیکھنے لگی۔

”اتنی دور جو رہتی ہو۔ بندہ ہزار کالوٹ تو صرف
کرائے کے لیے رکھے۔ خیر یہ بتاؤ کیسی ہو۔ حمزہ بھائی
کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں۔“
”کوئی خوشخبری؟“ مریم کی معنی خیز مسکراہٹ سے
وہ جھینپ گئی۔

”ابھی تو تم اپنی خوشخبری سنبھالو۔“ اس نے بچہ
مریم کی گود میں ڈال دیا۔

”کیوں تمہیں شوق نہیں ہے؟“ مریم نے کہا پھر
اس کا گال چھو کر بولی۔

”ویسے صاعقہ! شادی کے بعد تم بہت پیاری ہو گئی
ہو۔“

آئد پر حیران تھی وہاں اماں ان کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔

”آپ بیٹھیں ناں یہاں بیٹھیں۔“

”میں پھر کسی دن فرصت سے آؤں گی“ ابھی تو میں صاعقہ کو لینے آئی ہوں۔“ ماما سہولت سے کہہ کر اس سے مخاطب ہو گئیں۔ ”بیٹا حمزہ تمہارے بغیر بہت اداں ہے۔ تم اتنی دیر اس سے دور مت رہا کرو۔ بے شک روزانہ گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے آجایا کرو لیکن۔“

”جی جی میں بھی اس سے یہی کہہ رہی تھی کہ پہلے اسے اپنے میاں کا خیال کرنا چاہیے۔“ اماں نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا تو اس سے پہلے کہ اماں اپنے حساب سے سمجھ کر مزید کچھ بولتیں وہ فوراً ”چلنے کو تیار ہو گئی۔“

”تمہاری بہن شائلہ کی کہیں بات ہو گئی۔ آئی مین انکم جمنٹ؟“ راستے میں ماما نے اس سے پوچھا تو وہ جواب دینے کی خیال میں تھی چونکہ کر بولی۔

”جی جی نہیں۔“

”کیوں؟ خوب صورت لڑکی ہے پھر کیوں ابھی تک۔“

”وہ اصل میں ماسٹرز کر رہی ہے۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”ہوں۔“ ماما خاموش ہو گئیں انداز سوچتا ہوا تھا پھر کہنے لگیں۔ ”مجھ سے مسز رانا نے کہا ہے اپنے بیٹے کے لیے کہ کوئی لڑکی بتاؤں۔ مجھے تمہاری بہن کا خیال آیا۔ ابھی میں نے خاص طور سے شائلہ کو دیکھا ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ مسز رانا اور ان کے بیٹے کی بھی یہی ڈیمانڈ ہے۔“

”اور آپ کے بیٹے کی ڈیمانڈ کیا تھی؟“ اس نے سوچا اور خاموشی سے انہیں دیکھے گئی۔

”میرا خیال ہے تم پہلے اپنے پیرئس سے بات کر لو۔ اگر وہ کہیں گے تو پھر میں مسز رانا کو لے جاؤں گی۔“ انہوں نے آخر میں اسے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

پھر ماما سے گھر پر اتار کر چلی گئیں۔ انہیں کہیں اور

جانا تھا اور وہ اس نئی بات کو سوچتے ہوئے سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس کی سماعت سے بنگلی کی آواز ٹکرائی تھی۔

”یہ صاعقہ ہے۔“ اس نے رک کر دیکھا بنگلی کے ساتھ اس کی ہم عمر لڑکی بیٹھی تھی۔ خوب صورت اسٹائلش۔

”صاعقہ! یہ رانیہ ہے۔ میری بیسنٹ فرینڈ۔“ وہ سلام کرنا چاہتی تھی کہ رانیہ چیخ نما آواز کے ساتھ بولی تھی۔

آئی کانٹلی لوس۔ (میں یقین نہیں کر سکتی) ”تم جاؤ صاعقہ! حمزہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔“ بنگلی نے فوراً ”کہا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تو بیڈ پر نیم دراز حمزہ اسے دیکھتے ہی گنگناٹے لگا۔

تیرے بنا سانس بھی چلتی تھی تیرے بنا دل بھی دھڑکتا تھا یاد نہیں تھا یاد آیا

وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔ ”مانتی ہوں آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ سارے میں اپنی محبت کا اشتہار لگا دیں۔“

”مطلب۔؟“ ”مطلب ابھی ماما نے سب کے سامنے کہہ دیا کہ حمزہ تمہارے بغیر اداں ہے۔“ اس نے بتایا تو ہنستے ہوئے حمزہ نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

”غلط تو نہیں کہا ماما نے۔“ ”لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔“ اس کے روٹھے انداز پر وہ بے چین ہو گیا۔

”سوری“ سوری جانو آئندہ احتیاط کروں گا۔“ وہ اس کے سینے سے سر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تو وہ نرمی سے اس کا گال چھو کر بولا۔

”اب یہ بھی بتا دو کہ تمہیں اور کیا کیا اچھا نہیں لگتا۔“

”اور۔۔“ سوچتے ہوئے معا ”اسے یاد آیا کہ اول

روز اس نے بوچھا تھا کہ اور کیا کیا تمہیں پسند ہے۔
اس وقت وہ چٹکی کے ناراض ہونے پر خائف تھی۔
چٹکی کو حمزہ نے ڈانٹا تھا جب اس نے کہا تھا۔

”حمزہ رانیہ کا فون آیا تھا۔ بہت دور ہی تھی وہ۔“
”رانیہ۔“ اپنی ہی سوچ میں اس کے منہ سے نکلا
تھا اور حمزہ چونک گیا۔

”رانیہ!! تم رانیہ کو جانتی ہو؟“ اب وہ چونکی تھی۔
”نہیں وہ ابھی آتے ہوئے سرسری ملاقات ہوئی
ہے۔ چٹکی بتا رہی تھی اس کی بھیسٹ فرینڈ ہے۔“

”اور۔۔ اور کیا بتایا چٹکی نے۔“ وہ جانے کیا جانا چاہا
رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”اور تو کچھ نہیں۔“

”ہا۔۔۔“ وہ گہری سانس کھینچ کر بات بدل گیا۔ ”تم
نے بتایا نہیں اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”ماشاء اللہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا خیال تھا آپ
آئیں گے۔ اماں کو دیکھنے نہ سہی مجھے لینے۔“ وہ شاکی
نہیں تھی لیکن حمزہ کو لگا تھا۔

”مجھے تمہیں لانے لے جانے میں کوئی اعتراض
نہیں لیکن شاید تمہیں اچھا نہ لگے کہ میں تمہارے گھر
والوں کے سامنے لا بھی نہیکتا ہوا آؤں۔“ وہ اس کی
بات پر جربز ہو کر بولی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ پھر ایک دم اسے پکار کر
کہنے لگی۔ ”حمزہ آپ آرٹیفشل ٹانگ کیوں نہیں لگوا
لیتے بلکہ آپ کو بہت پہلے لگوائینی چاہیے تھی۔“
”ہاں سب نے کہا لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ اسے حمزہ کا خاموش ہو جانا محسوس ہوا
تھا۔

”اچھا پہلے تم مجھے چائے پلاؤ۔ بہت دن ہو گئے
تمہارے ہاتھ کی چائے پیے۔“ یہ پہلا موقع تھا کہ حمزہ
نے خود اسے اٹھا دیا تھا۔ وہ خاصی بد مزہ ہوئی کہ جو بات
کہنے کے لیے اسے سوچنا پڑ رہا تھا وہ اتفاقہ طور پر
اچانک ہو گئی تھی تو حمزہ جیسا کہ چٹکی نے کہا تھا کہ وہ سننا
ہی نہیں چاہتا تو اسے ٹوکا تو نہیں لیکن اپنے پاس سے
بہانے سے ہٹا دیا تھا گو کہ وہ اس سے دوبارہ بھی کہہ سکتی

تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر حمزہ
بیساکھی کے سارے ہی کیوں چلنا چاہتا ہے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ صرف حمزہ
کے لیے ہی نہیں پورے گھر کے لیے اہم ہو گئی تھی۔

کیونکہ ہر فن مولا تھی۔ ہر کام ذمہ داری سے کرتی تھی
تو ماما نے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا تھا اور اب اکثر باتوں
میں اس سے مشورہ بھی کرنے لگی تھیں۔ اسے یہ
سب اچھا لگنے لگا تھا۔ لیکن وہ جو اول روز بلکہ یہاں
آنے سے بھی پہلے اس کے اندر یہ احساس جڑ پکڑ گیا
تھا کہ وہ چاہت نہیں ضرورت ہے۔ چاہت تو نصیب
والے ہی بنتے ہیں تو اتنی اہمیت حاصل ہونے اور
خصوصاً ”حمزہ کی چاہتوں پر ایمان لانے کے باوجود وہ اس
احساس سے نکل نہیں پاتی تھی۔ کبھی خائف ہوتی
کبھی بے چین۔

اس وقت وہ اسی احساس میں گھری حمزہ کی ٹیبل
صاف کر رہی تھی۔ رات بہت دیر تک وہ لیپ ٹاپ پر
مصروف رہا تھا شاید پرشربھی استعمال کیا تھا کتنے پیپرز
بکھرے پڑے تھے اس نے پہلے فالتو پیپر ڈسٹ بن
میں ڈالے پھر کام والے پیپرز احتیاط سے ایک دوسرے
پر جما کر ٹیبل کی دراز میں رکھنے لگی تھی کہ وہاں پہلے
سے موجود پیپر پر اس کی نظریں جم گئیں۔ جس پر اس کا
نام لکھا تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے وہ پیپر نکالا تو
اس کے نیچے ویسا ہی دوسرا موجود تھا پھر وہ ایک کے بعد
ایک دیکھتی چلی گئی جیسے اس کے نام کا ورد کیا گیا تھا۔ پھر
ایک پیپر پر کچھ اور بھی لکھا تھا۔ اس نے وہ ہاتھ میں
لے کر نظروں کے سامنے کر لیا۔ اس کے نام کے ساتھ
اس کی اماں کے گھر کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا تھا۔ پھر اس
کی باتیں۔

وہ کہتی ہے مجھ سے شادی کرو گے۔ جواب وہاں یا
ناں۔ خدا کے لیے کچھ کہو۔ میرا ہاتھ تھا مو گے۔“

”اف۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔
تمام پیپر دراز۔ میں بند کر کے وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اس

کا ذہن اچانک باؤف ہو گیا تھا۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ
ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کیے ساکت بیٹھی تھی اور

جانے کب تک بیٹھی رہتی کہ بیساکھی کی آواز پر وہ ایک دم اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی اور واش بیسن کا نل کھولتے ہی اس کی آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ وہ روتی جاتی اور منہ پر پانی کے چھپا کے مارتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے آئینہ دیکھا۔ خود اسے اپنا چہرہ عجیب سا لگا۔

ایسی ہی تو ہوں میں، ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنی پھر یہ حمزہ میرے ساتھ کون سا مذاق کرنے جا رہا ہے۔ خوب صورت لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے میرا انتخاب کیوں کیا۔ میں اس کی پسند کیسے بنی۔ کیا صرف فون پر بات کر لینے سے وہ سوچتی چلی گئی۔ پھر کچھ ٹھان کر ہی واش روم سے نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر حمزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی۔

”کیا بات ہے صاعقہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”آپ ذرا اسی بات پر پریشان کیوں ہو جاتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوا مجھے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ضبط کے باوجود اس کے لہجے میں ناگواری در آئی تھی۔ جسے محسوس کر کے حمزہ خاموش ہو رہا تھا۔

”میں چائے لاتی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور منٹوں میں چائے لے کر واپس آئی تو اس کے پاس بیٹھ گئی۔

حمزہ کی نظریں اس کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ غالباً اس کے رونے کا سبب سوچنے لگا تھا اور وہ سمجھ کر اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

”کیسی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے کہ میری بات ہی نہیں مانتے۔ اس کا مطلب ہے۔“

”ایک منٹ۔“ وہ ٹوک کر پوچھنے لگا۔ ”کیا بات نہیں مانی میں نے تمہاری؟“ وہ جو میں نے آرٹیفشل ٹانگ لگوانے کا کہا تھا۔“

”وہ تو تم اس لیے خفا ہو؟“ وہ کچھ نہیں بولی سر جھکا کر اس کے ہاتھ کی پشت پر ابھری نس کو انگلی سے چھیڑنے لگی۔

”بے وقوف۔ اتنی سی بات پر اتنے آنسو بہا

ڈالے پھر اس روز تم نے کہا تو نہیں تھا پوچھا تھا۔ نہیں تو اسی وقت لگو الیتا۔“ اس نے اتنے پیار سے کہا کہ وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”مجھو لگ گئی۔“ وہ مسکرایا تو اس نے پھر نظریں جھکا لیں۔

”اور کوئی بات؟“ حمزہ نے اپنی نس پر حرکت کرتی اس کی انگلی پکڑ کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔

”ایک اور بات۔“

”کہو۔ ایک نہیں ہزار باتیں کہو سب مانوں گا۔“

”منوانی نہیں پوچھنی ہے۔ ایک بات اور آپ وعدہ کریں سچ بتائیں گے۔“ اس نے یونہی سر جھکائے ہوئے کہا تو کچھ دیر وہ خود ہی قیاس کرتا رہا پھر کہنے لگا۔

”میں نے پہلے کبھی تم سے کچھ غلط کہا ہے۔ جھوٹ بولا ہے۔ اگر تمہیں کہیں ایسا لگا ہو تو بتاؤ۔“

”نہیں، آپ نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔ ابھی بھی سچ بتائیں آپ نے مجھے شادی سے پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔؟“ اس نے ایک دم سے سوال کر کے اسے دیکھا تو ایک لمحہ کو اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

”بتائیں حمزہ۔ میں نہیں چاہتی مجھے کسی اور کی زبانی کوئی ایسی بات بتا چلے جسے سن کر میرا مرجانے کو دل چاہے۔“

”دیکھو صاعقہ میں تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا لیکن سچائی بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ لہذا تم اس بات کو چھوڑ دو۔“ حمزہ کے لہجے میں عاجزی تھی پھر بھی وہ اڑ گئی۔

”نہیں میں جاننا چاہتی ہوں کیونکہ مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ میں آپ کی پسند ہوں اور آپ کی ضد تھی کہ شادی کریں گے تو مجھ سے ورنہ نہیں۔“

”یہ یہ تم سے کس نے کہا؟“ وہ حیران اور کچھ بوکھلایا بھی تھا۔

”خاص طور سے کسی نے نہیں۔ شادی والے روز کوئی کہہ رہا تھا۔“ اس نے پتلی کا نام نہیں لیا پھر کہنے لگی۔ ”ایسے ہی کسی روز میں کچھ اور بھی سن سکتی ہوں۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ خود۔“ حمزہ

نے گہری سانس کھینچتے ہوئے بیڈ کی سرس رکھ لیا اور آنکھیں بند کیں تب وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جانے کیسی اذیت تھی جس کا تصور بھی وہ سہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ اپنی ضد اپنا سوال واپس لے لے کہ وہ بولنے لگا۔

”یہ چند سال پہلے کی بات ہے اس وقت میں مکمل تھا۔ زندگی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مجھ پر مہربان تھی اور میں بجائے رب العزت کا شکر ادا کرنے کے اپنا حق سمجھتے ہوئے یاروں دوستوں کے ساتھ موج مستی میں وقت گزار رہا تھا۔ لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں لیکن میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا یہ نہیں تھا کہ میں بہت مغرور تھا بس میرا اپنا اسٹائل میری اپنی سوچ تھی۔ میں خواہ مخواہ لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں سوچتا بس جو اچھی لگے گی اس کے ساتھ سرس ہو جاؤں گا اور پھر مجھے بنگی کی دوست رانیہ اچھی لگی۔ وہ بھی میری طرف مائل تھی اور ابھی ہماری ایک دو ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں کہ۔۔۔“ وہ جانے کس خیال سے کانپ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا لیکن بولی کچھ نہیں تو خاصی تاخیر سے وہ پھر گویا ہوا۔

”اس روز میں اپنے دوست کاشی کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ دور سے بس اسٹاپ پر ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ کاشی نے بھی اسے دیکھا تھا۔ گہری سانولی رنگت پر سنہری بال۔ عجیب مضحکہ خیز لگ رہی تھی کہ ہم دونوں کے قہقہے ابل پڑے۔ اس کا ریکارڈ لگاتے ہوئے ہوئے ہم دونوں بے تحاشا ہنس رہے تھے تب اوپر والے کو شاید اپنی تخلیق کا مذاق اڑانا پسند نہیں آیا اور ہمارا ایکسٹنٹ ہو گیا۔ کاشی تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا اور میں۔۔۔“ اس کی شاید آواز ساتھ چھوڑ گئی اور وہ سنائے میں آچکی تھی۔

”جانے کتنے دن میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا پھر ہوش میں آتے ہی میری نظروں میں اس لڑکی کا چہرہ سما گیا۔ میں آنکھیں بند کر تاریا کھولتا ہر طرف مجھے وہ ہی نظر آنے لگی اور میں احساس جرم میں مبتلا ہوا۔ مجھے چین سب کھو بیٹھا۔ اللہ سے توبہ کرتا معافی

مانگتا پھر بھی میرا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران رانیہ نے مجھے بہت سہارا دینے کی کوشش کی لیکن میرا ضمیر مجھے بری کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ سوتے جاگتے وہ لڑکی یوں میرے حواسوں پر چھا گئی کہ مجھے لگتا زندگی بس صرف وہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اس دوران گھر والے میرے لیے کتنے پریشان رہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب چاہتے تھے کہ میں آرٹھفیشل ٹانگ لگوا لوں لیکن میں تیار نہیں ہوا کیونکہ اللہ کی بنائی صورت کا مذاق اڑا کر جو گناہ میں نے کیا اس کے مقابلے میں یہ سزا بہت کم تھی کہ میں ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ مجھے تو اس سے بڑی سزا

”سزا۔۔۔“ چھنا کے سے کچھ ٹوٹا تھا وہ ایک دم چیخ پڑی۔

”نہ ضرورت نہ چاہت۔ سزا؟“ تو آپ نے مجھے اپنے لیے سزا کے طور پر منتخب کیا۔ میں سزا ہوں۔ میں آپ کے لیے سزا ہوں حمزہ!

”نہیں صاعقہ!“ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔

”کیا نہیں۔“ وہ حواسوں میں نہیں رہی تھی۔

”ابھی آپ نے خود کہا کہ آپ اس سے بڑی سزا کے مستحق تھے۔ یوں آپ نے سوچا ہو گا کہ جس پر ہنسے تھے ساری زندگی اس کی صورت دیکھتے رہیں ایسا ہی ہے ناں۔“ وہ کرب سے آنکھیں بند کر کے نفی میں سر ہلانے لگا۔

”لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ بری بھلی جیسی بھی ہوں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دے سکتی۔ کہاں سزا بن کر نازل ہو جاؤں۔ نہیں۔“

”صاعقہ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میری بات سنو۔“ شدت جذبات سے حمزہ کی آواز پھٹ رہی تھی۔

”بس اب کچھ نہیں سننا مجھے۔“ وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر تیزی سے کھڑی ہوئی تو بڑی زور کا چکر آیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”صاعقہ۔“ وہ اس کی طرح پھرتی سے نہیں اٹھ

سکتا تھا لیکن اٹھنے ضرور لگا تھا۔ ”کیا ہوا صاعقہ؟“ وہ ان سنی کر کے آگے بڑھی پھر دروازے سے پلٹ کر بولی تھی۔

”آپ کی سزا ختم ہوئی حمزہ! وہ سزا جو آپ نے خود اپنے لیے تجویز کی تھی۔ میں جاری ہوں۔“

”صاف“ حمزہ کا اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔



”اچھا ہوا تم آگئیں۔“ اماں خوش ہو کر اسے گلے لگا کر بولیں۔ ”میں ابھی تمہیں فون کرنے والی تھی۔“ وہ اماں سے نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ معمول سے زیادہ صفائی نظر آرہی تھی۔

”تمہاری ساس نے بھیجا ہو گا نا تمہیں۔“ اماں اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”سمجھ دار عورت ہے۔ سوچا ہو گا بڑے لوگوں سے تم ڈھنگ سے بات کر سکو گی۔“

”کیا کہہ رہی ہیں اماں کون بڑے لوگ؟“ اس نے تنک آ کر ٹوکا تو اماں متعجب ہوئیں۔

”ہیں! تمہیں نہیں پتا۔ تمہاری ساس نے شائلہ کے لیے جو رشتہ بتایا تھا شام میں انہیں لے کر آرہی ہیں۔“

”اچھا۔۔۔ ہاں ذکر کیا تھا انہوں نے۔“ اس نے بمشکل اپنی حیرت چھپائی تھی۔

”پھر تم بتاؤ چائے کے ساتھ ناشتے میں کیا کیا رکھیں۔“ اماں کو اپنی خوشی میں اس کا اترا چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے نہیں بتاؤ دل چاہے رکھ دیجئے گا۔“ اس کے جھنجھلا نے پر اماں ٹھٹھکی گئیں۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔ سردی سے پھٹا جا رہا ہے۔ بھاری بھی ہو رہا ہے۔“ وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی۔

”ارے۔“ اماں نے اسے لپٹا لیا۔ تمہیں پہلے بتانا چاہیے۔ چلو لیٹ جاؤ، ادھر نہیں، آؤ ادھر آؤ۔ میں

شائلہ سے کہتی ہوں تمہیں موسیٰ کا جوس نکال دے۔“ اماں اسے لٹانے تک بولتی جا رہی تھیں پھر شائلہ کو دیکھا وہ اپنی خوب صورتی کو مزید چمکانے میں لگی ہوئی تھی۔

”اے بس کرو۔ دیکھو بہن آئی ہے۔ ذرا اس کے لیے موسیٰ کا جوس نکال دو۔“ اماں نے شائلہ سے کہا تو اس سے پہلے وہ بول پڑی۔

”رہنے دیں اماں میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”چلو جب دل چاہے بتا دینا۔“ شائلہ نے جان چھڑائی تو اماں اسے سخت ست کہتے ہوئے خود ہی جوس نکالنے چلی گئیں اور وہ لحاف میں چھپ جانا چاہتی تھی تاکہ اپنی بد قسمتی کا ماتم کر سکے۔ اس نے حمزہ سے کہا تھا۔

”میں نہیں چاہتی مجھے کسی اور کی زبانی کوئی ایسی بات پتا چلے جسے سن کر میرا مرجانے کو دل چاہے۔“ اور اس کا سچ مچ مرجانے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن یہ اپنے اختیار میں نہیں تھا اور اختیار تو آنسوؤں پر بھی نہیں رہا تھا جو آنکھوں کے کناروں سے نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اماں جوس لے کر آئیں تو اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں لیکن اماں نے زبردستی اسے اٹھا کر جوس پلایا۔

”بس اماں! اب میں سو رہی ہوں۔ مجھے مت اٹھائیے گا۔“ اس نے پھر لیٹتے ہی لحاف سر تک کھینچ لیا تھا۔

پھر وہ یوں سوئی کہ مہمانوں کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس کی آنکھ اماں کی آواز پر کھلی تھی جو اس کے سرہانے کھڑی جانے کس سے کہہ رہی تھیں۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی بتا رہی تھی سر بھی بھاری ہو رہا ہے۔ مجھے تو خوشخبری لگ رہی ہے۔“

”خوشخبری؟“ اس نے بے اختیار منہ پر سے لحاف ہٹایا تو اماں کو کھڑے دیکھ کر سٹپٹ گئی۔

”کیسی طبیعت ہے بیٹا! تمہیں صبح بتانا چاہیے تھا میں اسی وقت تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی۔“ اماں نے

اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ جزبہ ہونے لگی۔
 ”چلو اٹھو فریش ہو جاؤ پھر ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے
 گھر چلیں گے۔“ ماما کو وہ منع نہیں کر سکی۔ سستی سے
 اٹھ کر واش روم چلی گئی اور جب منہ ہاتھ دھو کر نکلی تو
 کمرے میں صرف شائلہ تھی۔

”ماما اکیلی آئی ہیں۔ میرا مطلب ہے دوسرے
 مہمان بھی تو آنے تھے۔“ اس نے شائلہ سے پوچھا تو
 وہ کھلکھلا کر بولی۔

”وہ بھی آئے تھے۔ پھر تمہاری طبیعت کا سن کر
 تمہاری ساس نے انہیں رخصت کر دیا۔“
 ”اور تمہارا کیا معاملہ رہا؟“

”پسند آگئی میں انہیں باقاعدہ منگنی کی تاریخ طے کر
 کے گئی ہیں۔“ شائلہ بہت خوش تھی۔ وہ اسے مبارک
 باد دے کر بالوں میں برش کرنے لگی۔

”تم واپس یہیں آؤ گی یا ساس کے ساتھ گھر چلی جاؤ
 گی۔“ شائلہ نے الماری کھولتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ برش رکھ کر کمرے سے نکلی تو ماما
 اسی کے لیے کھڑی تھیں۔ اماں سے اجازت لے کر
 اسے جلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے چل پڑیں۔ وہ
 ایک لحظہ کو اماں کے پاس رکی پھر ماما کے پیچھے آگئی۔

ماما نے پہلے گائٹا گولوجسٹ سے اس کا چیک اپ
 کرایا تو اس نے انہیں دادی بننے کی خوشخبری سنائی۔

”ٹائکس۔“ ماما واقعی خوش ہو گئیں جبکہ وہ اندر
 سے خائف ہو چکی تھی کیونکہ اس کی اپنی زندگی کی ناؤ
 ڈول رہی تھی۔ بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ جب گاڑی گھر
 کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تب چونکنے کے ساتھ وہ
 پریشان ہو گئی۔

”ماما! مجھے اماں کے گھر جانا تھا۔“

”ارے! پہلے حمزہ کو تو گڈ نیوز سناؤ۔ کتنا خوش ہو گا
 وہ۔ چلو۔“ ماما نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تو
 ناچار اسے اترنا پڑا۔ خود کو انتہائی بے بس محسوس
 کرتے ہوئے وہ ماما کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے
 ہی رک گئی تھی۔

”حمزہ! مبارک ہو۔ تم باپ بننے والے ہو اور میں

دادی۔“ ماما نے خوش ہو کر حمزہ کو بتایا تو اس نے ذرا سی
 پلکیں اٹھائیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی
 آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی کہ وہ بے اختیار اس
 کی طرف کھینچی چلی آئی۔

”تم آرام کرو صاعقہ اور اپنی غذا اور دوا کا خیال رکھنا
 اور حمزہ! تمہیں بھی اس کا خیال کرنا ہے۔ چائے کافی
 بنانے کے لیے ملازم موجود ہیں۔ سبار بار صاعقہ کو
 دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماما ان دونوں کو
 ہدایات دینے کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے چلی گئیں
 تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”تم۔“ حمزہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

”آپ بہت برے ہیں۔“ اس نے ایک دم ہاتھ
 نیچے گرا دیے۔ مجھے اپنی محبتوں کے حصار میں جکڑ کر کیا
 سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ رہ
 لوں گی میں آپ کے بغیر۔“

”لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ
 میرے لیے زندگی صرف تم ہو۔“ حمزہ نے اسے کھینچ کر
 اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں میں منہ چھپا کر
 جذبات سے بو جھل آواز میں بولا۔

”زندگی صرف تم ہو۔ سنا تم نے بات تلافی کی۔
 ہوتی تو میں تم سے معافی مانگ لیتا لیکن یہاں تو عالم یہ
 تھا کہ دل دھڑکتا ہی تمہارے نام سے تھا۔ تب میں نے
 رب سے تمہیں مانگا۔ جانتی ہو میں نے کیا کہا تھا۔ میں
 نے کہا تھا یا اللہ جب میری سزا کے دن تمام ہو جائیں تو
 جزا کی صورت مجھے صاعقہ عطا کرنا۔“

”آپ۔“ اس نے حمزہ کے سینے سے سر اٹھا کر
 اسے دیکھا تو وہ نیم مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر
 ہلا کر بولا تھا۔

”تم سزا نہیں جزا ہو۔“

صلی اللہ علیہ وسلم

یوم کشمیر پر آزادی کے متوالوں کے نام،



یہ کون تھی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چمن چمن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ

جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم
کیوں کوچ کے سنس سنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجان
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی،
اے پوچھنے والے پر دیسی!
یہ طفل و جواں

اُس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں

جس میٹھے نور اور کرڑی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجان
جگ جگ جگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پر دیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زلیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!
فیض احمد فیض

جو آج میرے پاس بڑی دیر تک رہا
وہ میرا علم شناس بڑی دیر تک رہا

چہرے پہ اپنے ہجر کی اک دھول تھی عیاں
یہ درد مجھ کو اس بڑی دیر تک رہا

وہ معتبر جہاں میں اس طرح سے ہوا
اس پر میرا لباس بڑی دیر تک رہا

اخبار میں نمایاں تھی شب خون کی خبر
پھر خوف اور ہراس بڑی دیر تک رہا

ڈالا گیا تھا دلیں کے محسن کو قید میں
ہر شخص ہی اُداس بڑی دیر تک رہا

مبھولا نہیں میں اس سے پھڑنے کا حادثہ
جو میرے آس پاس بڑی دیر تک رہا

عابد معروف

میں آرزوئے جاں لکھوں یا جان آرزو
تو ہی بتا دے ناز سے ایمان آرزو

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے گلستان آرزو

ایمان و جاں نثار تیری اک نگاہ پر
تو جان آرزو ہے تو ایمان آرزو

اک وہ کہ آرزوؤں پہ بیٹے ہیں عمر بھر
اک ہم کہ ہیں ابھی سے پشیمان آرزو

دل میں نشاطِ رفتہ کی دھندلی سی یاد ہے
یا شمع وصل ہے تر دامان آرزو

اختیار کو زندگی کا مہر و سا نہیں رہا
جب سے لٹا چکے سرو سامان آرزو
اختر شیرانی

شروعات

بیوی نہ آپ بہت بھوکے ہیں۔ آپ کو کوئی بھی بیوقوف بنا سکتا ہے۔

شوہر: شروع تو تمہارے ابا نے ہی کیا تھا۔

علیشہ: بیک۔ کراچی

اظہار ہمدردی

ایک صاحب کوچ میں سوار ہوئے تو کنڈیکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ”سر! کل آپ کوچ سے اترنے کے بعد خیریت سے گھر پہنچ گئے تھے نا؟“ ”ہاں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ان صاحب نے خیریت سے کہا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ کل ایک مسافر کوچ میں سوار ہوا تو آپ اسے اپنی سیٹ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جبکہ اس وقت کوچ میں صرف آپ دو ہی مسافر تھے۔ باقی سب سیٹیں خالی پڑی تھیں۔“ کنڈیکٹر نے آہستہ سے جواب دیا۔

ماریہ عمران۔ سکھر

آگہی

بیوی نے شوہر کا موبائل دیکھا تو فون بک میں لڑکیوں کے نمبر کچھ اس طرح سے محفوظ تھے۔

پڑوسن کی بیٹی

نئی بیٹی

پرانی بیٹی

سامنے والی بیٹی

اوپر والی بیٹی

کلچ والی بیٹی

یہ دیکھ کر بیوی خوش ہو گئی اور دیکھنے کے لیے کہ میرا

نمبر کس نام سے ہے بیوی نے اپنے نمبر سے جب کال ملائی تو اسکرین پر لکھا ہوا تھا ”پاگل کی بیٹی“ فاکہہ سہیل۔ کراچی

لاجواب

فریدہ نے نسیم سے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کیا سوچ کر ان صاحب سے شادی کا فیصلہ کیا ہے وہ تو تمہارے مقابلے میں بڑی عمر کے ہیں۔ ان کے منہ میں دانت تک نہیں اور وہ گنجنے بھی ہیں۔“ ”یہ تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔“ نسیم نے بے پروائی سے کہا۔ ”وہ تو پیدائش کے وقت بھی ایسے ہی تھے۔“

زمینب خان۔ لاہور

دفاع

مقدمے کی سماعت آخری مراحل میں تھی۔ ملزم نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے وکیل صفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے سنج صاحب بولے۔

”پولیس نے تمہیں ڈاکا ڈالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ دکان دار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے زبورات بھی تمہارے قبضے سے برآمد ہوئے ہیں اس کے علاوہ تم آٹھ مرتبہ کے سزا یافتہ ہو تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا وکیل تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے؟“

ملزم نے جواب دیا۔

”یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔“

یسری قریشی۔ چکوال

قیمت

گاہک: اس ٹائی کی قیمت کیا ہے؟

دکان دار: ”چالیس روپے۔“

گاہک: چالیس روپے میں تو جوتے کے دو جوڑے آجاتے ہیں۔“

دکان دار: مگر جناب جوتے آپ گلے میں نہیں لٹکا سکتے۔“

عائشہ ملک۔ خانیوال

انتقام

شادی کی پانچویں سالگرہ پر بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔

”ڈر بے میں جو بڑا سامرغام موجود ہے۔ اسے نکال کر فنج کرو۔ تاکہ شادی کی سالگرہ کی خوشی میں اچھے کھانے پکائے جاسکیں۔“

شوہر نے سخت لہجے میں کہا۔ ”پانچ سال پہلے جو کام ہوا تھا اس کا انتقام تم اس بے چارے مرغے سے کیوں لینا چاہتی ہو؟“

ممتاز طارق۔ حیدر آباد

کشش

شریر طالب علم نے استاد سے استفسار کیا۔ ”جناب عالی! عورت کی کشش اور زمین کی کشش میں کیا فرق ہے؟“ ”کچھ زیادہ نہیں“ استاد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”دونوں ہی آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔“ ارم فاطمہ۔ ٹھٹھہ

سوال

ایک ڈاکٹر اپنی مریضہ کا ذہن اس کے شروع ہونے والے آپریشن سے ہٹانے کے لیے اس سے منگائی پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے بیٹے کا میڈیکل کالج میں داخل ہوا ہے تو اس پر کتنا مالی بوجھ برپا کیا ہے۔

آخر میں چلتے چلتے اس نے مریضہ سے کہا۔ ”آپ سے کل آپریشن تھیٹر میں ملاقات ہوگی“ آپ کوئی سوال پوچھنا چاہتی ہیں؟“ ”میں کس چیز کے پیسے دے رہی ہوں۔ شادی کے یا یوشن کے؟“

رائیل ابرو۔ لاڑکانہ

پہلی بار

عابد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس روز اس کی بیوی نے اسے دفتر فون کر کے بتایا تھا کہ آج وہ پہلی بار کھانا تیار کرے گی، لیکن جب عابد گھر پہنچا تو اس کی بیوی کچھ مایوسی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے ہاتھ اور چہرہ مرج مسالوں اور چکنائی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ مردہ سے لہجے میں اس نے بتایا کہ کھانے میں سلاوا اور چٹنی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

”لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ تم دو تین ڈشیں تیار کرو گی اور گھر میں تمام سودا سلف موجود تھا؟“ عابد نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ڈشیں تو میں نے تقریباً تیار کر ہی لی تھیں۔“ بیوی نے بتایا۔

”لیکن جب میں گوشت بھون رہی تھی تو بوٹیوں میں آگ لگ گئی۔ آگ بجھانے کے لیے میں نے انہیں چکن کے قورے میں ڈبو دیا لیکن قورمہ سویٹ ڈش میں گر گیا اور سویٹ ڈش کا باؤل فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اس دوران چولہے کی آگ بھی بری طرح بھڑک اٹھی۔ اسے بجھانے کے لیے مجھے اس پر راستہ ڈالنا پڑا۔“

ابھی بیوی کی داستانِ غم جاری تھی کہ عابد ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں سلاوا اور چٹنی کھا کر ہی گزارا کر لوں گا۔“

”مزید۔۔۔ شریف آباد“



ہکات کی کھیل کا مکمل

گڑ یا شاہ ————— کھروڈ پکا

بے مقصد سب لوگ مسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سناٹے کی دہشت کتنی ہے
لفظ تو سب کے ایک جیسے ہیں کیسے بات کئے
دنیا داری کتنی ہے اور چاہت کتنی ہے

ستیدہ نسبت زہرا ————— کھروڈ پکا

دل کے نازک آنگن میں کیسی پاگل لڑکی ہے وہ
ڈھیروں پھول کھلا لیتی ہے سُرخ گلابوں کے موسم میں
اقرا، عمرہ ————— کراچی

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو
ثمرہ یاوید ————— بسم اللہ پور

ورق ورق پر تیری حقیقت
تیرا فسانہ تیری محبت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی
تیری ہی یادوں کے باب نکلے
رافیہ بتول ————— گوبلی

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
عشق پر زوئی نہیں ہے یہ وہ آتش قالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

زوبار سیالہ ————— لاہور

پھر اس کی یاد، پھر اس کی طلب پھر اس کی باتیں
اسے دل تجھے لگتا ہے سکوں راس نہیں

صبا نوشاہی، مینا بخاری ————— ڈوگر جرات

جنوری کی سردیوں میں ایک آتش دان کے پاس
گفتگوں تنہا بیٹھنا سمجھتے شرارے دیکھنا
جب کبھی فرصت ملے تو گوشہ تنہائی میں
ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا

حورین زیب ————— کھروڈ پکا

وہ زخم دے کے مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
اب ازل سے بڑھ کے طبیعت شناس کیا دے گا
وہ میرے اٹک بچھلے گا کس طرح محسن
سمندروں کو وہ صحرا کی پیاس کیا دے گا
عذرا ناصر، اقصی ناصر ————— کراچی

رستہ کھن دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی
پھولوں کا بکھرا تو مقتدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی
شبنم شمشاد ————— یزمان

سبھی آگئیں یوں ہی بے سبب
سبھی چھا گئیں یوں ہی دودھ و شب
سبھی شوق میں سبھی چپ سی ہیں
یہ باتیں بھی تم سی ہیں !
نخبہ اکرم ————— گھاؤں گوبلی

زرد موسم کے آجال لمحوں میں
ہم دو پرے کے یوں ہی ہنستے ہنستے
یار اب اب تو کوئی تعبیر بخش دے
کہ جھک گئیں آنکھیں خواب ہنستے ہنستے

ثناء عبدالقیوم ————— بنکہ چیمہ

برف ایسی کہ پگھلتی نہیں پانی بن کر
پیاس ایسی کہ بجھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں
اچھی لگتی نہیں اس درجہ شناسانی بھی
ہاتھ ہاتھوں سے ملاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

کبریٰ عباسی ————— ہری پور

میں نے مہتاب کی کمر توں سے پچا یا تھا جسے
دھوپ اوڑھے ہوئے پھرتا ہے وہ بانڈی میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بازار کی تجاویز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی عبادت فرمائی تو اس سے پوچھا۔

”تمہیں کس چیز کی خواہش ہے؟“

اس نے کہا: ”گندم کی روٹی کو جی چاہتا ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کے پاس گندم کی روٹی ہو، اپنے بھائی کے ہاں بھیج دے۔“ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کسی کا مرحق کسی چیز کی خواہش ظاہر کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کھلا دے۔“

بازار کی تجاویز

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک دن بازار سے گزرے دیکھا کہ لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔

”کسی کو یہ اختیار نہیں ہے مسلمانوں کے بازار نمازیں کے مسئلے کی طرح ہیں۔ جو لوگ آج آگے بڑھ گئے ہیں وہ کل اس کو چھوڑ دیں۔“
(کنز العمال - جلد 3 - صفحہ 172)

اقوال حضرت علیؑ

”زندگی اس کے لیے نہ گزارو جس کے لیے تم زندہ ہو بلکہ زندگی اس کے لیے گزارو جو تمہاری وجہ سے زندہ ہے۔“

حضرت علیؑ نے پوچھا کیا انسان سب سے بڑا کب بنتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: جب وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھنے لگے۔“

”جو شخص اپنے ہر کام کو پسند کرتا ہے اس کی عقل

میں نقص آجاتا ہے۔“
”مجھے کبھی آدمی پر تعجب ہوتا ہے جو زندگی تو مفلسوں کی طرح گزارتا ہے مگر آخرت میں حساب مال داروں والا دیتا ہے۔“
سیدہ لو باسجاد - کھروٹ پکٹا

امام غزالیؒ کہتے ہیں،

”بھوک سے پہلے کھانا مکروہ بھی ہے اور مذموم بھی۔“

”کھانے میں عیب نہ نکالو، ناپسند ہو تو نیت کھاؤ۔“
”جو مہمان خود آجائے اس کے لیے تکلف نہ کرو اور جس کو خود بلاؤ اس کے لیے تکلف میں کچھ کمی نہ کرو۔“
”بجس کے اندر بیٹھ کر قریب تر لوگوں کی فرائج پری کرو۔“
”میزبان کو انتظار نہ کراؤ۔ وقت پر پہنچا کرو۔“
”مہمان کے آگے کھانا رکھنے سے پہلے اہل و عیال کا حقہ نکال لو۔“

حکایت سعدیؒ

ایک درویش ساری رات عبادت کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو دُعا مانگی لیکن عیب سے آواز آئی کہ تیری دُعا قبول نہ ہوگی۔ غصوں وقت برباد نہ کر۔“
دوسری رات وہ پھر عبادت میں مصروف رہا اور صبح کے وقت پھر دُعا مانگنے لگا۔ اس کے ایک مرید کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اس کی دُعا رد ہوگئی ہے۔ وہ درویش کو عبادت میں مصروف دیکھ کر بولا۔

”جب آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کی دُعا قبول نہ ہوگی تو کیوں مشقت اٹھاتے ہیں؟“
درویش کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے بولا: ”تو ٹھک

کہتا ہے لیکن میں کیا کروں کہ اس دروازے کے سوا کوئی اور دروازہ بھی تو نہیں ہے۔
شیخ سعدیؒ نے اس حکایت کے ذریعے یہ بات بتائی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا نہیں اور عقل مند آدمی ہر حالت میں چاہے دعا قبول ہو یا نہیں، اللہ سے ہی مانگتا ہے۔

نصیحت،

جس پر نصیحت اذرنہ کرے، وہ جان لے کہ میرا دل ایمان سے خالی ہے۔

(حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ)

اہل بعیرت کے لیے ہر ایک نگاہ عبرت اور ہر ایک تجربے میں نصیحت ہے۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ)

تو جتنی چاہے مجھے نصیحت کر۔ جہشی کی سیما ہی کبھی دھونے سے دھو نہیں ہوتی۔

(شیخ سعدیؒ)

کسی کو ایسے فعل سے جو خود تیری ذات میں ہے منع نہ کر جب تک کہ تو خود اس کو ترک نہ کر دے۔

(بقراط)

مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ جنہیں اعمال ہوتے ہیں۔

(نویان ثوری)

عزرا ناصر۔ اقصی ناصر۔ کراچی

درویش کی دعا،

بیان کیا جاتا ہے کہ زمانے کا ستایا ایک درویش ایک امیر کے دروازے پر گیا اور صدا لگائی۔ یہ امیر بہت کجوس اور معزور تھا۔ درویش کی صدا سن کر اس نے اسے خیرات کی جگہ جھڑکیاں دیں۔

اس امیر کے ہمسائے میں ایک غریب نابینا شخص رہتا تھا۔ درویش امیر کی ڈیوڑھی سے مایوس ہو کر لوٹا تو نابینا

نے اسے اپنا مہمان بنا لیا اور جو کچھ میسر تھا، درویش کے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ اخلاقی اور مروت کی باتوں سے اس کا دل خوش کیا۔

درویش اس کے حسن سلوک سے بہت مسرور ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر اس کی خیر و فلاح کے لیے دعا مانگی اور رخصت ہو گیا۔

نابینا شخص نے درویش کے ساتھ یہ اچھا سلوک لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ ترس کھا کر کیا تھا۔ ایک وقت ساکھانا کھلا دینا کوئی ایسی بڑی بات بھی نہ تھی۔ لیکن اللہ کو اس کی یہ نیکی پسند آئی۔ اس کے حق میں درویش کی دعا قبول ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی کے چند قطرے ٹپکے اور اس کی اندھی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو سب حیران ہوئے اور دن و رات درویش کی کرامت کا سارے شہر میں چرچا ہو گیا۔ یہ خبر اس کجوس اور معزور امیر نے سنی تو حسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”اے کجوس! یہ شاہباز میرا تھا جو نابینا کے جال میں پھنس گیا۔ یہ دولت تو میرے لیے تھی جو اسے مل گئی۔ ہمسائے نے یہ بات سنی تو کہا۔

”یہ شاہباز مجھے کس طرح مل سکتا تھا جو میری

جو ہے کی طرح دانت نکوسے ہوئے ہے۔“
شیخ سعدیؒ نے اس حکایت میں یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو ہر وقت بھلائی پر آمادہ رہنا چاہیے۔

نہ جانے کب اور کس رنگ میں اللہ کی رحمت اس کے دروازے پر آجائے۔ اگر اس کا رویہ درست نہ ہو تو وہ فیض یاب نہ ہو سکے گا۔

کردار کی پہچان،

• تمہارا چال چلن اس بات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم کس چیز کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔
• اگر میرے قلم سے نکلے ہوئے ایک فقرے یا میری زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے میرے دوست یا دشمن کے دل کو تسکین بخشی تو میرے لیے یہ دنیا بھر کی تمام نعمتوں سے افضل ہے۔

(مشہور انگریزی شاعر ملکا س)

سدہ بتول۔ ملتان

رکھ،

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یا رسول ناما پاتا ہے اسے

دکھ کا الیکٹرک شاگ دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ دکھ کی بھیڑ سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بخوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتا ہے۔

(بالوقد سیم)

عائشہ انصاری۔ حیدر آباد

رشتہ

ہم کسی سے رشتہ جوڑتے ہیں تو اس کی نہ کوئی وجہ مزد ہوتی ہے مگر بعد میں وہ وجہ ختم ہو جاتی ہے اور صرف رشتہ رہ جاتا ہے۔

حمیرا نوشین۔ منڈی بہاؤ الدین

دور بھاگ

قسمت کی جگہ سے، جھگڑے اور مقدمہ بازی سے، سمدھیانہ کے پڑوس سے، غیبت کرنے اور سننے سے، غش نادلوں اور سالوں سے، نشہ بازوں سے، بُری محبت سے۔

ممکن نہیں

جیسی محبت میں بیٹھے اور ویسا نہ بنے، ہر کام میں جلدی کر لے اور نقصان نہ اٹھائے۔ بہمت اور استعجال کو شعار بنائے اور مراد کو تیرہ پیچے، عورتوں کی محبت میں بیٹھے اور سروانہ ہو، دوسروں کے جھگڑے میں پڑے اور پھر آفت میں نہ پھنسے، دنیا سے دل لگائے اور ہشیان نہ ہو، زیادہ باتیں کرے اور کوفت نہ اٹھائے۔

آتی ہے

محنت و دیانت اور کفایت شعاری سے دولت، بے ادبی کرنے سے بد نصیبی، فضول خرچی سے مفلسی، بڑوں کی محبت میں بیٹھنے سے عقل، غیبت کرنے اور

سننے سے بیماری، مصیبت و تکلیف میں صبر کرنے اور شکوہ نہ کرنے سے راحت، یتیم بیوہ اور وقف کے مال ناحق کھانے سے بربادی۔

ظاہر مت کر

کسی کا عیب، دل کا بھید، سفر کرنے کی سمت، اپنی تجارت کا نائدہ اور نقصان امانت کی بات، پوری طاقت، زیادہ ضرورت۔ عینی سحر۔ ہری پور

باتیں یاد رکھنے کی

وہ کسی بڑی چیز کے حاصل ہو جانے سے چھوٹی چیز کو بھلا نہ دیں کیونکہ جہاں سوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تلوار کام نہیں آتی۔
وہ تجربہ انسان کو غلط فیصلے سے بچاتا ہے مگر تجربہ غلط فیصلے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

وہ کوشش کیجیے جن کے ساتھ عمر گزارنے کا سودا طے کرنا ہو ان سے دل ملیں یا نہ ملیں، ذہن ضرور ملتے ہوں۔
عمارہ رفیق۔ قاضی پور

اچھا کام

روانہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو کہتا ہے اگر کوئی اچھا کام کرنا ہے تو کر لو کیونکہ آج کے بعد میں کبھی بھی پلٹ کر نہیں آؤں گا۔
مدد محمد نورین مہک۔ برنالی

اندازِ نظر

ایک شخص کی کلہاڑی کھو گئی تو اس کے دل میں شک بیٹھ گیا کہ کلہاڑی پڑوسی کے بیٹے نے چرائی ہے۔ اس نے لڑکے کی چال کا بغور جائزہ لیا تو اس کی چال بالکل چوروں کی سی لگی۔ اس نے لڑکے کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ وہ بھی چوروں جیسے تھے۔ اس نے لڑکے کا انداز گفتگو دیکھا وہ بھی بالکل چوروں جیسا تھا۔ مدعا یہ کہ لڑکے کی ساری حرکات و سکنات چور ہونے کی چغلی کھاتی تھیں۔
لیکن ایک دن وہ کسی کام سے باہر نکلا تو راستے میں کلہاڑی پڑی مل گئی اور جب اسے لڑکے کی تمام حرکات و سکنات میں معصومیت نظر آنے لگی۔





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ
حاضر ہیں
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو صحت و سلامتی کی
بہترین حالت میں رکھے۔ آمین

پہلا خط بنگلہ صدر کو گیرہ ضلع اوکاڑہ سے فاطمہ اور
خدیجہ کا ہے، لکھتی ہیں۔

ڈھم ڈھما ڈھم ڈھم۔ نہیں نہیں جناب یہ ڈھول کی
نہیں بلکہ ہمارے دل کی آواز ہے۔ جو 3 جنوری کو رات 7
بجے میری سسٹر خدیجہ کے انکشاف پر نکلی تھی۔ انکشاف
نہیں بلکہ بریکنگ نیوز اور وہ یہ تھی کہ اس دفعہ خط لکھ دو
میں پوسٹ کرو آؤں گی۔ دراصل بات کچھ یہ ہے کہ
مابدولت پر تو کب سے بازار میں ”لور لور“ (اکیلے) پھرنے پر
پابندی عائد ہو چکی ہے۔ تو پھر سارے ”غیر قانونی“ کام
کروانے کے لیے خدیجہ کے۔ ”ترلے“ کرنے پڑتے
ہیں۔ اب جلدی خط پوسٹ کروانے کے لیے بستر بھی خود
بچھانے پڑیں گے (کیونکہ یہ کام خدیجہ کے ذمہ ہے) چلو کوئی
بات نہیں ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا
ہے۔ وہ تو پھر میری کیوٹی سی سسٹر ہے۔

یہاں پر ایک گزارش کرنی تھی کچھ ریڈر سسٹرز کو
شکایت ہوتی ہے کہ رومانس کم ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ
رسالے وغیرہ مل کلاس گھرانوں میں ہی زیادہ پڑھے جاتے
ہیں اور ابھی تک بہت سے والدین رسالے پڑھنے پر
معتراض ہیں۔ میرے گھر میں بھی یہی سچویشن ہے۔ ہم ابھی
تک پی ٹی وی کے ڈرامے دیکھتے ہیں۔ ہمارے گھر کیبل
نہیں ہے۔ بچھلے دنوں ایک ڈرامے میں رومانٹک سین
تھا۔ بھائی نے چینل بدل دیا۔ اگر ہمیں رومانس دیکھنا ہو تو
میڈیا کم نہیں ہے۔ ہم صاف ستھرا ادب چاہتے ہیں۔ جو
کچھ ذریعے کے لیے ٹینشن ریلیز کر سکے۔ اگلا ناول سمیرا حمید کا
ہونا چاہیے۔

ایمل رضا اور سمیرا حمید کے لکھنے کا انداز ایک جیسا
ہے۔ (میرے نزدیک) پر اس دفعہ ایمل کا افسانہ کچھ متاثر
نہ کر سکا۔ (معذرت) صدف آصف کی کہانی کافی ڈفرنٹ
تھی۔ ویلڈن صدف آصف جی۔ سروے کے سوالات

دلچسپ تھے۔ منناز یوسف کا تیسرے سوال کا جواب
دلچسپ تھا۔ جب تجھ سے نانا جوڑا ہے کہ بارے میں میرا
خیال ہے کہ بہن ”ن۔ف“ سے معذرت کے ساتھ کہ
ان کے ساتھ کوئی اتنا بھی ظلم نہیں ہو اور نہ ہمارے
معاشرے میں کیا کیا نہیں ہوتا۔ ان کے شوہران کے ساتھ
تھے۔ ساس مندوں کو ان کے ساتھ کوئی ذاتی عناد نہیں تھا۔
بھئی مجھے تو یہی لگا کہ انہوں نے اپنی خود ساختہ مظلومیت کو
بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ میری دو سسٹرز بھی اسی
طرح بہت بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم کا حصہ ہیں۔ ہمارا بھی
جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ جس میں میرے دو بھائیوں کے
خاندان اور ہماری فیملی رہتی ہے۔ معمولی شکایات تو پیدا ہو
ہی جاتی ہیں۔ باقی اللہ کا شکر ہے یہ سب تو زندگی کا حصہ
ہے۔

میں اپنی طرف سے خط مکمل کر چکی تھی مگر جب رات
کو خاک نشین پڑھا تو دل نے گواہی دی کہ محفل تو شفق

وہ سبق کتابوں میں درج تھا ہی نہیں
جو سکھایا ہمیں زمانے نے!!!

اب آتے ہیں رسالے کی طرف سروے بہت اچھا رہا
مختلف خیال کے لوگوں کی رائے جان کر اچھا لگا، حرا قریشی
لفظوں کے ذریعے حیران کر رہی ہیں واہ واہ بہت خوب۔
وال افضل آپ نے اتنا مختصر کیوں لکھا؟ آمنہ ولید مہناز
یوسف، مانکہ کوثر سب کو پڑھ کر اچھا لگا۔ بریکنگ نیوز
بہت مختلف سب کی تھیں۔

رابعہ انعم نیوز اینکر کو پڑھا۔ شاہین رشید کے سوال
بہت خوب پتا نہیں اوگوں کی زندگیاں، فیس بک، انٹرنیٹ
پر ہی ختم جا رہی ہیں۔ ہر چیز کا مثبت پہلو ہوتا ہے مگر پاکستانی
عوام کچھ زیادہ ہی اس کے نشے میں گم ہے یہ سچ معلومات
ملتی ہیں پر صرف باتوں، دوستی پر ٹائم ویسٹ کرنا ہی ہے ایک
طرح۔!

”جب تجھ سے ناتا جوڑا (ب) ف کراچی“ سچ آپ کی
باتیں پڑھ کر حقیقت کا ادراک ہوا، واقعی زندگی پھولوں کی
سچ نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی ای سے بولا کہ آپ مجھے
بتائیں، آپ کے لیے لکھتی ہوں۔ اس سلسلے میں، ای ہاتھ
نہیں آرہیں بس ہنستی ہیں۔ آج تو میں نے اتنا دکھ بھرے
لہجے میں کہا کہ میری خودگی ہو گئی ہوتی تو آج آپ کی منتیں
ترلے نہ کر رہی ہوتی۔ اب ای کا قہقہہ شان دار اور مزے
کا ہے۔ ہا ہا ہا۔ امید ہے دنیا قائم۔ میری ای کبھی تو بتائیں گی۔
صبر آنا انتظار۔

ہماری ای اور بڑے بھائی نے ہمارے لیے بہت محنت
کی ہے۔ اور آج ہم سب بس بھائی تعلیم یافتہ ہیں۔ ادھر
لڑکیوں کو پہلے پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ ہمیں دیکھتے
ہوئے بہت ساری فیملیاں پڑھنے لگیں۔ پروردگار کا
کرم کہ جیسے کا طریقہ سکھایا اور مزید سیکھنے کی خواہش۔

میں PHD کرنے کے لیے اپریل میں باہر جا رہی ہوں۔
پلیز میرے لیے دعا کیجئے گا۔ شعاع، خواتین کرن سے بہت
کچھ سیکھا سلسلے وار ناول پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا
ہے شروع کیا اور ابھی ختم مزا نہیں آتا۔ (محبت ابر
رحمت) سالار حسین اور آپ کی بے تکلفی اور باتیں پڑھ

افتخار نے لوٹ لی ہے۔ زبردست، امیزنگ، میں حسنی کی
موت پر منال کے ساتھ روئی ہوں۔ میرا تکیہ میرے ان
آنسوؤں کا گواہ ہے۔ ویسے اگر حسنی نہ مرنے تو بھی کہانی میں
ایک تشنگی رہ جانی تھی۔ ویلڈن شفق جی۔ فراز اینڈ میں
کہاں سے ٹپک پڑا۔ پھر بھی یہ اس کی اعلا ظرفی تھی کہ
زارا کے ساتھ کھڑا ہوا بٹ اگر وہ حسنی کے ساتھ مصطفیٰ کی
جگہ دکھایا جاتا تو پھر زیادہ بہتر تھا۔ اچھا اب میں ایک تحفے
کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ یہ تحفہ جو کہ ایک دل کی
صورت میں ہے۔ میری بس خدیجہ کے نازک نازک
ہاتھوں کا کمال ہے۔ اور اس نے ضروری تاکید کی ہے کہ
اسے ریڈی میڈ نہ سمجھا جائے۔ یہ دل دنیا میں ہر اس انسان
کے پاس ہے جس سے خدیجہ پیار کرتی ہے۔

ج، پیاری فاطمہ! سدا خوش رہو اور خدیجہ کو ہماری طرف
سے بہت بہت پیار۔ خدیجہ کی ہنرمندی کا شاہکار، خدیجہ
آپ کا دل تو سیدھا ہمارے دل میں اتر گیا۔ بہت خوب
صورت، بہت شاندار۔ فاطمہ نے تو صرف خط لکھا ہے
آپ نے تو اپنا سونے جیسا دل ہی ہمیں دے دیا ہے۔
شکریہ۔ اور بھئی فاطمہ! پورا شعاع پڑھ کر تبصرہ کرنا تھا نا۔ یہ
تو آپ نے عقل مندی کی کہ روئیں نہیں۔ آنسو بہت

قیمتی ہوتے ہیں انہیں خواہ مخواہ لٹانا فضول خرچی ہے
اور یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ پر
پابندی کیوں لگ گئی ہے؟

سیدہ نسبت زہرا نے کہروڑ پکا سے لکھا ہے

اتنے سال گزر گئے حیرت کی انتہا ہوتی ہے کہ وقت
کیوں اتنی تیزی اور جلدی سے گزرتا ہے۔ پہلی شعاع کو
پڑھتے بہت کچھ یاد آ رہا ہے آپ نے اتنے اچھے انداز میں
لکھا کہ ”ایک عمر گزار کر بھی اس کی حقیقت نہیں کھلتی۔“
گزری زندگی کا ہر ایک لمحہ میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ رہا
ہے کہ آخر میں نے کیا تو کیا؟ یہ سوال بے چین کر رہا
ہے۔ انسان اپنی طرف سے بہت کوشش کرنا ہے پھر بھی
نجانے کتنے دکھ اور پچھتاوے رہ جاتے ہیں کہ کاش اس
نے بہتر کرتے بہر حال جو گزر گیا وہ گزر گیا۔

کر مزا آیا) دیری گز حرا بتول باقی کہانیاں اور افسانے بھی ٹھیک لگے اب کے برس ”بنت سحر محبت کو اپنے لفظوں میں پرونے کا قرینہ رکھتی ہیں ان کا طرز اسلوب اور منظر کشی بہت زبردست لگی۔ در ثمن (سرگودھا) آپ کہاں گم ہیں۔ ایک اچھی سی اسٹوری لے کر انٹری دونوں؟

فرحت اشتیاق منتظر ہیں آپ کو پڑھنے کے لیے۔ رنگوں، تتلیوں، پھولوں اور ساون پر باتیں کرتی راحت جبیں اپنے ہونے کا احساس دلائیں ناں۔

لبنی جدون حقیقت سے روشناس کروانے والی بہترین لکھاری بس آخر میں۔

بارش کے مفہوم کو سمجھو ننھی ننھی بوندوں سے مل کر اک دریا بن جاؤ، موسم ہے آزاوی کا سچا پیاری نسبت! آپ کے خط مختلف سلسلوں کے لیے آپ کا انتخاب ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس بار تو آپ کا خط ہمیں زیادہ ہی اچھا لگا ہے۔ بھی اتنی بڑی خوش خبری جو ہے۔ ایک چھوٹے سے شہر کی باسی پی ایچ ڈی کرنے باہر جا رہی ہے۔ خوشی کی تو بات ہے نا۔ بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ آپ کی امی اور بڑے بھائی واقعی قابل تحسین ہیں جنہوں نے آپ سب بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔

تبصرہ حسب معمول بہت اچھا ہے۔ فرحت اشتیاق راحت جبیں در ثمن اور لبنی جدون تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آمنہ ریاض چوہدری نے دو کھویا گجرات سے لکھا ہے سب سے پہلے جلدی جلدی ”سیاہ حاشیہ“ پڑھی کیونکہ پیپر بھی تیار کرنا تھا۔ بینش پر بہت غصہ آتا ہے مجھے۔ اس کے بعد ”ایک ننھی مثال“ پڑھی۔ مثال بالکل پاگل لڑکی ہے جو واقع پر غصہ اور شک کر رہی ہے۔ پھر اپنی اور دوست مریم بٹ کی فیورٹ ”رقص بسمل“ پڑھی۔ کہانی پڑھنے کا مزاج آیا جب تیمور کے گھراور کا استقبال ہوا۔ پھر ”تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔“ پڑھا۔ میری بہن کو میری طرف سے سیلوٹ۔ آئی اگر میں نے کوئی ناول منگوانا ہو یا ڈائجسٹ لگوانا ہو تو پیسے کیسے بھیجوں؟

پاری آمنہ! ایک پرچے کو ایک سال تک گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے آپ 720 روپے اس ایڈریس پر

منی آرڈر کر دیں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی کتاب منگوانے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ آپ کتاب کی قیمت اس ایڈریس پر منی آرڈر کر دیں۔ مکتبہ عمران ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی۔

نوال گوندل نے صوفی شی سے لکھا ہے

ہمارے علاقے میں ان دنوں بہت سردی ہے اور میں رضائی میں دیک کر رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ جو مزہ ہاتھ میں پکڑ کر پڑھنے کا ہے وہ لیپ ٹاپ پر پڑھنے میں کہاں۔ ”رقص بسمل“ تو اب بہت ہی تھک گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانی دور کرے۔ ناول خاک نشین ”شفق افتخار“ نے بہت اچھا لکھا۔ علی حسنین بے چارے کو مروادیا عباس نے نام سے یہ کوئی نئی رائٹر لگیں۔ کیا مہوش افتخار کی بہن ہیں۔ انداز ملتا جلتا ہے۔ اس بار ناولٹ دو ہی تھے بلکہ ایک ہی صدف آصف کا۔ کیوں کے دوسرا تو سلسلے وار ہے نا، ہمارا پیارا ”سیاہ حاشیہ“ صدف کا بھی دل نہیں توڑتی۔ بہت اچھا لکھا انہوں نے اور ہاں یہ مصباح علی کو کہنا تھا کرن میں تو ناول لکھ لکھ کر بہت جھنڈے گاڑ لیے ہیں۔ ہمیں افسانے پر ہی مڑنا پڑتی ہیں۔

رجد پیاری نوال! مصباح علی واقعی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہم نے ان سے کہا ہے شعاع کے لیے مکمل ناول لکھیں۔ انہوں نے شعاع کے لیے ایک طویل ناول لکھا ہے جو کئی اقساط پر مشتمل ہے لیکن اس کی اشاعت کے لیے انتظار

کرنا پڑے گا۔ شفق افتخار نئی مصنفہ ہیں ان کا مہوش افتخار سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

سلمیٰ زبیر لاہور سے لکھتی ہیں

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا پھر حمد و نعمت پڑھ کے دل کو سرور حاصل ہوا۔ پیاری باتیں پڑھ کے بہت سی معلومات میں اضافہ ہوا۔ انعم فیاض اور رابعہ انعم سے انٹرویو اچھا رہا۔ ”تم کو چاہ کے بھی“ بہت اچھا تھا پڑھ کے مزہ آیا۔ ”سیاہ حاشیہ“ کی تو بات ہی مت کریں ہر شمارے میں بہت خوب صورت کہانی ہوتی ہے۔ افسانے تمام زبردست اور سبق آموز تھے۔

ج۔ پیاری سلمیٰ! کہانی پڑھے بغیر کچھ کہنا مشکل ہے بلکہ بعض اوقات تو پڑھ کے کے بھی کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ جب ہم کسی کہانی پر کچھ نہ کہیں تو وہ خود ہی سمجھ جایا کریں کہ ہم دیگر قارئین پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کو شعاع پسند آیا یہ جان کے ہمیں بھی مزہ آیا۔

نمرہ ہاشمی کنڈیاں سے لکھتی ہیں

خواتین 'شعاع' چھ سال سے بڑھ رہی ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ پلیز نظر انداز نہیں کرنا، ورنہ آپ کی ایک بہت پیاری معصوم سی قاری بہن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ مجھے ننگ نیم سے کوئی نہیں پکارتا، تو آپ سے ریکویسٹ ہے کہ پلیز مجھے ننگ نیم سے بلائیے گا۔ دیکھتے ہیں اپنی نئی بہن کے لیے کیا نام منتخب کریں گی۔ آپ... میں چار بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن ہوں۔ شادی شدہ نہیں ہوں مگر منگنی شدہ ہوں اور میری منگیتر میرے ماموں کے بیٹے ہیں۔ میرے ننھیال میں سے صرف میری امی کو بہت شوق ہے رسالے پڑھنے کا، وہ بارہ سال کی تھیں جب سے رسالے پڑھنا شروع کیا اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میرے نانا جی اور نانی امی نے کبھی مخالفت نہیں کی ان کی ہمارے دوھیال میں تو رسالے پڑھنے کا جنون ہے، جسے دیکھو ہاتھ میں خواتین 'شعاع' میرے ابو اور بھائیوں کو بھی بہت شوق ہے۔ شعاع کے سب ہی سلسلے اچھے ہیں مگر "جب تجھ سے نانا جوڑا ہے" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے مگر افسوس میں اس میں شرکت کے قابل نہیں ہوں۔ ان شاء اللہ اگلے سال اس میں شرکت کروں گی، کیونکہ اگلے سال شادی متوقع ہے۔ اصل میں ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی

کم عمری میں شادی کرنے کا رواج ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اپنے پیارے گھر اور گھر والوں کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ پیارے شعاع کا ساتھ بھی چھوٹ جائے گا، کیونکہ ماموں لوگوں کی نظر میں رسالے پڑھنا برا کام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے داغ خراب ہوتا ہے۔ اکثر میری بے عزتی بھی کر دیتے ہیں اسی وجہ سے۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ لڑکیوں کی تربیت میں ماؤں کے بعد شعاع، خواتین کا ہاتھ ہے۔ آخر میں شاہین رشید صاحبہ سے فرمائش ہے کہ فہد مصطفیٰ کا انٹرویو شائع کریں پلیز۔

ج۔ پیاری نمرہ! آپ نے لکھا کہ خط شائع نہ ہوا تو دل شیشے کی طرح کرجی کرجی ہو جائے گا، بھئی اتنی پتھر دل دنیا میں

کانچ کے دل کا کیا کام....؟ دل کو مضبوط بنائیں۔ پیاری نمرہ! آپ کی فرمائش پر آپ کو تھکام دیا ہے، ویسے آپ کا نام تو بہت پیارا ہے، آپ کو ننگ نیم کی کیا ضرورت ہے۔ ہونے والی سسرال کے خیالات جان کر دل افسردہ ہوا لیکن آپ پریشان نہ ہوں اگر وہ ایک دفعہ ہمارے رسالے بڑھ لیں گے تو ان کی رائے بدل جائے گی اور پھر وہ آپ کو خود شعاع لا کر دیں گے۔ مگر آپ پہلے ان کا دل جیتنے کی کوشش کریں، پھر اپنی بات منوائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ شعاع بڑھ کر وہ آپ کی عزت اور قدر بھی کریں گے۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچائی جا رہی ہے۔

عظمیٰ شفیق جڑانوالہ سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھا جو کہ پورے رسالے کی جان ہے۔ زبردست جا رہا ہے۔ شفیق افتخار کا ناول متاثر کن نہ تھا۔ "ابر رحمت" بس سو سو تھا۔ مصباح علی کا افسانہ امیزنگ تھا۔ صرف لکھنے پہ اتنی تذلیل۔ شازیہ جمال کا افسانہ عمدہ تحریر تھی ایمل رضا بلاشیہ کمال رائٹر ہیں مگر اس دفعہ مزہ نہیں آیا۔ نمبروں افسانہ نسیم شریف کا تھا۔ اس کہانی پہ تو پورا ناول ہونا چاہیے تھا۔ "ایک تھی مثال" پورنگ لگنے لگا ہے۔ صدف آصف کا ناولٹ ویسے تو اچھی تحریر تھی لیکن بیس سال کی اجیہ کا پرانے کپڑے جمع کرنا پھر ان کی مرمت کرنا اور پھر غریبوں میں جا کے تقسیم کرنا بالکل ہضم نہ ہوا۔ "نانا جوڑا ہے" میں حصہ لینے والی بہن کا پورا نام کیوں نہیں ہوتا۔

ج۔ عظمیٰ! ہر ماہ خط لکھنے والی قاری بہنوں کا خط پانچ چھ ماہ موصول نہ ہو تو ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔ دو مہینے

مہینوں کی غیر حاضری کو تو ہم مصروفیت کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں مگر اب پتا چلا کہ یہ مصروفیت نہیں ناراضی ہے۔ پتا ہے ہماری روی کی ٹوکری نے سخت احتجاج کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے وہ روی کی ٹوکری ہے منی نہیں جسے یوں بدنام کیا جا رہا ہے۔ "جب تجھ سے نانا جوڑا ہے" ہے میں بہنوں کا پورا نام اس لیے شامل نہیں ہوتا کہ بہر حال انہیں اسی گھر میں رہنا ہے۔

آسیہ ارم نے ملیر کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں "تجھ سے نانا جوڑا ہے" پر پہنچی۔ کراچی سے ن ف کی آپ بیٹی اچھی تھی۔ پتا نہیں تمہیں اتنا ڈرتی کیوں ہیں جس

دن میرے حوصلے نے قلم کا ساتھ دیا تو میں اپنے پورے نام کے ساتھ جلوہ گر ہوں گی۔ ”خط آپ کے“ میں ربیعہ حسین (کراچی) کا خط پسند بھی آیا مگر ربیعہ آپ شاید مصنفہ کی تحریریں پڑھتی ہیں، صرف کرداروں پر غور نہیں کرتیں، جیسے آپ بینش کو صحیح (پرفیکٹ) کہہ رہی ہیں اور بڑی اماں اور ان کی اولاد کو غلط، تو میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں کہ بینش ایک احساس کمتری میں مبتلا خود غرض پر سنالٹی ہے اور بڑے ابا کو غلط گائیڈ کر کے تیمور، ڈیزی اور طیبہ کو ڈانٹ پڑواتی رہی ہے۔ اگر ربیعہ جی آپ کے ساتھ بھی کوئی خواہ مخواہ مقابلے بازی کرے گا تو آپ کیا کہیں گی۔ ہاں آپ نے یہ صحیح کہا کہ تیمور کو بالکل ہی ماورائی مخلوق دکھایا گیا ہے۔ بہن کے حوالے سے بھی اور ماورا کے حوالے سے بھی۔ میں تو بہت عرصے سے کہہ رہی ہوں کہ اگر نبیلہ کی کوئی سیریس مجبوری ہے تو پلیز اس کا اینڈ کیے بغیر ہی اسے بند کر دیں، ورنہ نبیلہ کا ایج خراب ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ کا ربیعہ کی تنقید کا جواب پسند نہیں آیا۔ آپ تو کم از کم یہ نہیں کہیں۔ بینش کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ شازیہ جمال کا ”محرومی“ بہت اچھا افسانہ تھا ایمل رضا کی ”سورج کے پار“ ایک اچھی اور مغنور اسٹوری تھی۔ ”تم کو چاہ کے“ بس ٹھیک ہی تھی۔ کافی جگہ پر جھول رہ گیا۔ کیا سرفراز اتنا فارغ بندہ تھا کہ سب کام دھندے چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ اتنے مہینے ننبیال میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتا رہا، وہ بھی بھیس بدل کر۔ یہ بات ہنقم نہیں ہوتی۔ مصباح علی نے بہت اچھا افسانہ لکھا۔ واقعی آج بھی ایسے لوگ ہیں جو ایسی سوچ کے حامل ہیں۔ صائمہ اکرام کا موسٹ فیورٹ ”سیاہ حاشیہ“ پڑھا۔ اس بار

آپ نے عدینہ کو کچھ عجیب حرکتیں کرتے نہیں دکھایا مطلب ابھی اوریدانے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا اور عدینہ اس کے قدموں میں بچھنے کو تیار ہوئی۔ اس کا سامان بھی خود سیٹ کر رہی ہے، جبکہ عدینہ ایک ریزرو پر سنالٹی ہے۔ باقی تمام اسٹوری ہمیشہ کی طرح سپر ڈپر رہی، آپ نے اپنی تحریر کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ میری بھانجی کی شادی ہے، مصروفیت زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں دے رہی، کیونکہ میرے میکے اور سسرال میں اگر ایک پتا اضافی بھی مل جائے تو مجھے طلب کر لیا جاتا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگا لیں کہ ایک پیر گھر میں اور ایک میکے میں ہے کہ جن بہن

کی بیٹی کی شادی ہے، وہ بیوہ ہیں اور امی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ شادی میں ہار ڈالنے ہیں یا گھر سے پکڑا سنے ہیں سے لے کر بھائی پوچھتے ہیں کہ بیٹھے میں گاجر کا حلوہ ہو یا گلاب جامن۔ ایک بھائی دو سرے سے پوچھتا ہے کہ عاشی کو بتادیا کہ کھانے والے کی بکنگ کروادی ہے تو دوسرے کا فون آتا ہے کہ باقی سارے معاملات صحیح جارہے ہیں نا۔ (پیارے سب مجھے گھر میں عاشی کہتے ہیں۔) اللہ کا شکر ہے ان محبتوں کا۔

ارے آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میں پانچ بہن بھائی میں بڑی نہیں ہوں۔ دو مجھ سے بڑے اور دو مجھ سے چھوٹے بہن بھائی ہیں مگر کیونکہ ان سب کو آپس میں ملائے رکھنے والی میں وہ کڑی ہوں جو سب کے لیے مضبوط سہارا ہوں۔ صرف میکے میں یہ حال نہیں ہے۔ سسرال میں بھی الحمد للہ یہی حال ہے۔ کوئی بھی فرد ہو سب کو بہت محبت سے باندھ کر رکھتی ہوں۔

ج۔ پیاری آسیہ اللہ تعالیٰ آپ سے محبت کرنے والوں کو سلامت رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ دوسروں کی خوشیوں، غموں میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں، ان سے اپنے تو کیا غیر بھی محبت کرتے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ آپ کو سسرال بھی قدردان ملی ہے۔ آپ نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر خط لکھا۔ بہت شکریہ۔ تنقید و تعریف مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ بینش کے لیے ہم نے جو لکھا، اس کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ بینش صحیح کر رہی ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ بینش کو محبت سے محرومی نے مستقم مزاج بنادیا ہے۔

”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ اس سلسلے میں شرکت کرنے والی قارئین ہمیں اپنا پورا نام لکھ کر بھیجتی ہیں لیکن

ہم احتیاط کے پیش نظر شائع نہیں کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا مقصد کسی کے گھر میں آگ لگانا یا کسی کی تھچیک کرنا نہیں ہے، بلکہ گھروں کے ان مسائل کو سامنے لانا ہے جنہوں نے بہت سی لڑکیوں کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔

توبہ نور نے کشن گڑھ بھاول نگر سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع اچانک 30 دسمبر کو مل گیا۔ غیر متوقع طور پر حالانکہ 29 کو ہی دکان والا کہہ رہا تھا کہ 2 جنوری کو آئے گا۔ اچانک ملنے کی خوشی بھی بہت

ہوئی۔ ”خاک نشین“ سو سو تھی۔ حسنی اور منال کی محبت قطعی غیر ضروری اور مجھے تو غیر اخلاقی بھی لگی۔ دوست کی منکوحہ سے محبت وہ بھی نکاح کے بعد۔ پہلے کی بات ہوتی تو کچھ بات بھی تھی اور بالکل افسانوی طریقے سے آخر میں فراز صاحب بھی اکھڑے ہوئے۔ خون جگر دے کر بہر حال مجرم کیفر انجام تک پہنچ گئے۔ سودن چور کے تو۔۔۔ ایممل رضانے حسب معمول اچھا لکھا۔ نیا اور بہترین افسانہ۔ خوش آمدید ایممل رضا۔ ”تم کو چاہ کے“ بس ٹھیک ہی تھی۔ اس طرح کا ڈراما شاید ہی حقیقت میں کوئی کرتا ہوگا۔ بند ہوتی کتابوں میں تتلیاں ڈال دیں یہ کس نے رسموں کی آگ میں لڑکیاں ڈال دیں اور بھی فاترہ چندا کو کہیں سے ڈھونڈیں۔ کرن کے قارئین انہیں زیادہ عزیز ہیں؟ خیر کو ششیں تو جاری ہیں کہ ہم ہی چلو کرن کے قاری بھی بن جائیں۔ حالانکہ سمیرا باجی کہہ رہی ہیں ”میری شادی کے بعد تم لوگوں سے یہ دونوں بھی نہیں منگوائے جانے“ ”جنور“ کے اینڈ تک ان کی شادی متوقع ہے۔

ج۔ پیاری ٹوسیہ! فاترہ افتخار تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ اپنی سمیرا باجی کو ہماری طرف سے شادی کی مبارکباد دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہت ساری خوشیوں سے نوازے۔ (آمین) اور ہاں بھی ہمت کر کے رسالے آپ کو خود منگوانا پڑیں گے۔ ہارون آباد سے تو آپ کی سمیرا باجی نے نہیں بھیجے۔

جمبر خورد ضلع چٹوکی سے ثناء خان نے لکھا ہے

حسب معمول سارے سلسلے ذوق و شوق سے پڑھے پھر صدف آصف کا ناولٹ ”تم کو چاہ کے“ نہایت خوب صورت اور ہلکی پھلکی تحریر پڑھ کر مزہ آگیا اور صدف آصف کی یہ نصیحت ”ایش! رشتے ہمیشہ وہیں جوڑنے چاہئیں جہاں محبت کے ساتھ عزت بھی ملے۔ زندگی تو بہت سادہ ہوتی ہے مگر ہماری خواہشیں اسے پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔“ ”ویل ڈن! صدف آصف۔“ ”سیاہ حاشیہ“ بہت ہی عمدہ تحریر۔ ”ایک تھی مثال“ اور ”رقص بسک“ اب ختم ہو جانے چاہئیں۔ شوق افتخار کا ”خاک نشین“ میں حسنی کی موت اور زارا کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی نے اداسی اور افسردگی کی اتھاہ گھرائیوں میں دھکیل دیا۔ حرا بتول کا ”ابر راجت“ بھی بہت اچھا لگا۔ اس ماہ کے شعاع میں کوئی بھی

چیز ایسی نہیں جو پسند نہ آئی ہو۔ میں نے ایم اے اردو اور ایم اے ایجوکیشن کیا ہوا ہے۔ کتابوں سے عشق ہے۔ کھانے کے لیے کچھ نہ ملے لیکن پڑھنے کے لیے کتاب مل جائے۔

ج۔ پیاری ثناء! آپ کی کتاب سے محبت تو اسی سے ظاہر ہے کہ آپ نے دو سبجیکٹس میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ نے گاؤں میں رہتے ہوئے اعلا تعلیم حاصل کی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

عظمیٰ اظہر خان نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اگر مکمل ناول کو صفحے کے ایک جانب لکھا جائے تو خاصے صفحات درکار ہوں گے، تو کیا پھر بھی اس بنڈل کو ایک لفافے میں بھیجا جائے؟ اصل میں میں نے بھی ایک ناول لکھا ہے اور پچھلے تین چار سال سے لکھا پڑا ہے میرے پاس گھر میں بھیجے کی ہمت نہیں کر پارہی۔

ج۔ عظمیٰ! آپ تو کراچی میں رہتی ہیں۔ آپ ناول کسی کے ذریعے بھیجوا سکتی ہیں اور خود بھی پہنچا سکتی ہیں۔ اگر صفحات بہت زیادہ ہیں اور ڈاک سے بھیجنا چاہتی ہیں تو دو لفافوں میں بھی بھیج سکتی ہیں۔

عائشہ نے نیومری (سوراسی) سے شرکت کی، لکھتی ہیں

جب ٹو کلاس میں تھی تو میری بڑی بہن میری اردو کی ریڈنگ ٹھیک کروانے کے لیے ڈائجسٹ پڑھوایا کرتی تھی، خوب مار مار کے، بہر حال وہ مار بھی بے کار نہ گئی، آج میں ایک پتھر ہوں، آپ کے اور میرے پیارے شہر کی کراچی یونیورسٹی سے بونٹی میں ماسٹرز کیا اور اپنے ساتھ کے گاؤں میں 14 اسکیل کی سائنس پتھر ہوں۔ ڈائجسٹ رائٹرز

کا اسلامک ٹرینڈ بہت بہترین لگا، بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ کے ساتھ ایک بات شیئر کرنا چاہوں گی، بہت سی لڑکیوں کی طرح ہمارے گھر میں بھی ابو کی طرف سے ڈائجسٹ پڑھنے پر سختی تھی، جواب خود ہی ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ جو میں نے دریافت کی وہ یہ کہ ایک دن میں نے کچھ مردانہ قسم کے ڈائجسٹ لیے ریڑھے سے اور جب وہ ریڑھے تو کانوں سے بھی دھواں نکلا۔ بہت بے باک، بہت

فضول، تب مجھے ابو کی بات سمجھ میں آئی، سوچا اگر وہ یہ بڑھتے رہے ہیں تو وہ اپنی جگہ ٹھیک سوچتے ہیں مگر ہمارے ڈائجسٹ کو کوئی عالم بڑھ لے تو بھی کچھ سبق ہی سیکھے گا۔

ج۔ پیاری عائشہ! آپ نے باٹنی میں ماسٹر کیا، اب اپنے گاؤں میں علم کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ گاؤں میں ہی جاب کر رہی ہیں، جبکہ دیہی علاقوں کے بہت سے طالب علم میڈیکل کی تعلیم حاصل کر کے بڑے شہروں میں جاب کرتے ہیں اور ان کے گاؤں طبی سہولیات سے محروم رہتے ہیں۔

آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ اب آئندہ باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ آپ تو دوسری کلاس سے ہمارے پرچے کی قاری ہیں۔

نور عبدالسلام نے نواب شاہ سے لکھا ہے

شعاع کا سب سے بیسٹ سلسلہ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ مجھے بہت پسند ہے۔ پر اس میں شامل ہونے کے لیے بہت زیادہ ہمت چاہیے جو دیکھتے ہیں کب تک آتی ہے۔ شعاع کے سب سے سلسلے بہت اچھے جارہے ہیں۔

ج۔ نور عبدالسلام! اگر اپنے سے لکھنے کی ہمت نہیں کرپا رہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ آپ کسی بھی فرضی نام سے لکھ سکتی ہیں۔ مقصد تو اپنا تجربہ دوسروں تک پہنچانا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

منزہ عطا کوٹ ادو سے شریک محفل ہیں

ہم چودہ سال سے شعاع کی خاموش قاری ہیں۔

”رقص بسکل“ یہ ناول بہت اچھا ہے۔ پہلے میری پسندیدہ رائٹر ہیں، میری تو جان ہے یہ۔ شفق افتخار آپ نے تو کمال کر دیا۔ اتنا اچھا ناول لکھا۔ صائمہ جی! آپ کا ناول ”سیاہ حاشیہ“ یہ ناول بھی بیسٹ جائے گا، بہت اچھا ناول ہے۔ میں آپ کو مزے کی بات بتاؤں، ہم سب کزن

آٹھ رسالے پڑھتی ہیں، ہم سب نے رسالے تقسیم کیے ہوئے ہیں، ایک ایک رسالہ سب کزن لیتی ہیں۔ بات ہے سب سے پہلے پیاری خالہ زہرا، صاعقہ، نجمہ زونیرا، حنا، رانی، عاصمہ، مدیحہ، میری بہن عاصمہ اور مدیحہ یہ دونوں مفت خوریاں ہیں۔ ٹوبہ اور میں خود منزہ۔

منزہ! آپ تمام لوگوں کا شکریہ۔ دیکھیے اتفاق میں

کتنی برکت ہے۔ آپ امداد باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہر ماہ سب رسالے پڑھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا یہ اتفاق و محبت ہمیشہ قائم رکھے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بشری عباسی نے ہری پور گاؤں ڈاک خانہ کالنجو سے لکھا ہے

شعاع میں مسلسل دو ماہ سے خط بھیج رہی ہوں مگر میرے خط شائع ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ ہمیشہ کی طرح ”سیاہ حاشیہ“ نے ٹاپ کیا۔ بہترین کہانی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ افسانے بھی بہت پسند آئے۔ ”ایک ٹھی مثال“ ہماری موٹ فیورٹ رائٹر نے کیا اسٹوری لکھی ہے۔ ”رقص بسکل“ بھی بہت عمدہ کہانی ہے۔

ج۔ پیاری بشری! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ دو ماہ سے آپ مسلسل خط لکھ رہی ہیں اور آپ کے خط شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ اگر آپ جلدی خط لکھیں تو شامل ہو سکتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ علیم الدین نے اورنگی ٹاؤن کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

حرا بتول کا ”ابر رحمت“ نام ہی کی طرح خوب صورت ناول، تمام ناول اور ناولٹ بہت ہی اچھے اور زبردست تھے۔ افسانوں میں سب سے اچھا ”سورج کے یار“ لگا۔ ”سیاہ حاشیہ“ میرا فیورٹ ہے۔ ”تاریخ کے جھروکوں“ کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ اس سلسلے میں چنگیز خان اور ہلا کو خان کا بھی قصہ شامل کریں پلیز۔ ایک درخواست اور ہے شازیہ چوہدری کا ناولٹ ”آجکل میں جگنو“ دوبارہ شائع کریں۔

ج۔ پیاری عائشہ! آپ کے شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔ کوشش کریں گے کہ آپ کی فرمائش کو پورا کر سکیں۔

افشاں علی نے کراچی سے لکھا ہے

پچھلے سال جہاں ”جام آرزو“ کا اینڈ مزہ دے گیا، وہیں نایاب جیلانی کا مکمل ناول اپنے شرارتی فقروں کے ہمراہ دل کو چھو گیا، جبکہ بنت سحر کا افسانہ بھی قابل تعریف رہا۔ سال نو کے حوالے سے کیا گیا سروے نظر سے گزرا۔ سب ہی کے جوابات بہت عمدہ تھے۔ حرا قریشی کا خط ہویا سروے

READING
Section

277 2016 فروری

ہمیشہ منفرد لفظوں کے پیرہن سے سجا نظر آتا ہے۔ سیدہ نسبت زہرا کا انداز بھی پسند آیا۔ افسانوں میں محرومی اچھا سبق آموز افسانہ تھا۔ ”اب کے برس“ بنت سحر نے پھر سے لفظوں کا خوب صورت سا جال بچھا کر دل کو گرفت میں لے لیا۔ اس ماہ کا ٹاپ آف دی لسٹ افسانہ ”میرے لفظ کو جو زباں ملے“ تھا۔ صدف آصف کا ناولٹ بھی اچھا رہا۔ ”خاک نشین“ یوں تو اچھا ناول تھا مگر اس کے اینڈ پر ہمیں اعتراض ہے۔ علی حسنین کا یوں اچانک مرجانا دکھ دے گیا مگر اس سے زیادہ دکھ سب سے آخری پیرا گراف کو بڑھ کر ہوا، مسلمان ہوتے ہوئے بھی لوگ کس طرح غیر مسلم رواج اپنانے اور اندھی تقلید کرنے میں مگن ہے۔ ”محبت ابر رحمت“ بہت ہی خوب صورت ناول رہا۔ اب بات کریں گی شعاع کے سب سے زبردست سلسلے کی ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ بہت ہی انوکھا اور اچھا سلسلہ ہے۔ ایسی باہمت و باحوصلہ خواتین کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس سلسلے سے بہت سی خواتین کو حوصلہ ملتا ہوگا۔ ہماری ریکویسٹ ہے اس سلسلے کو برقرار رکھا جائے۔

ج۔ پیاری افشاں! اتنے پیار بھرے انداز میں اتنا جامع اور تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے آپ کے پیار بھرے الفاظ سیدھے ہمارے دل میں اتر گئے۔ خط قطع برید کے بعد شائع ہو تو غم نہ کریں کہ محبت کرنے والوں کے لیے دو چار پیار بھرے الفاظ بھی بہت ہوتے ہیں۔ اب آئی ہیں تو محفل میں آتی جاتی رہیں گی۔ ”خاک نشین“ میں کسی غیر مسلم رواج کو دکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کا پرچار کر رہے ہیں بلکہ معاشرے کا چلن ہی ایسا ہو گیا ہے اس کو واضح کیا ہے۔ آپ نے غلطی کی نشان دہی کی۔ تمہ دل سے شکریہ آئندہ احتیاط کریں گے۔

اقصی شمس صفر روڈ مانسہرہ سے شریک محفل ہیں

سرورق بس گزارا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت زبردست تھیں۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ مجھے بہت پسند ہے۔ نادیہ حسین کا انٹرویو اچھا رہا۔ ایک چینل سے ڈراما سیریل ”ایک بھی مثال“ دکھایا جا رہا ہے۔ انتہائی بکواس کردار اور بوگس اداکاری۔ بدلتا خراب ہو گیا قسم ہے۔ ”سیاہ حاشیہ“ ایک دم زبردست تحریر۔ صائمہ اکرم نے ”سیاہ حاشیہ“ کے افسانے سب اچھے تھے۔ ”رقص بسمل“

اچھی ہے، پر ماورا کا کردار مجھے بالکل پسند نہیں، خواجواہ ڈسٹ بتی ہے، دل میں لڈو پھونکتے ہوں گے۔ ولید کا کردار مجھے پسند ہے فنی سا۔ کچھ قاری بہنوں سے دلی انیسیت ہے۔ جیسے سیدہ نسبت زہرا، نوال افضل گھمن، حراقہ نشی، نمرہ اقرا، مسرت الطاف، یا سمین حنفی جو کہ کچھ عرصے سے غائب ہیں۔ ڈاکٹر عائشہ، گڑیا شاہ وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ان سب کو خوش رکھے۔

ج۔ پیاری اقصی! آپ کی پیار بھری دھونس پر آپ کا پچھلے ماہ کا خط اس ماہ شامل کر رہے ہیں لیکن یہ پہلی دفعہ ہے۔ اس لیے یہ رعایت کی جا رہی ہے۔ آئندہ وقت پر موصول نہ ہوا تو... پھر آپ سمجھ جائیں۔

”سیاہ حاشیہ“ میں آپ کے سارے انداز سے درست ہیں سوائے ایک کے... کون سا انداز غلط ہے۔ یہ ہم نہیں بتائیں گے۔ آپ کو پڑھ کر خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

عمیرہ بتول اللہ بخش سعیدی نے حیدر آباد سے لکھا ہے

سال نو نمبر شمارہ جنوری کا ہمیں مل گیا۔ حمد و نعت ایمان کو مضبوط بناتی ہیں۔ سلسلے تمام خوب صورت ہیں ہمیشہ پسند آتے ہیں اور آئے ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ پہلی دفعہ پورا پڑھا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو آدھا ادھورا پڑھ کے چھوڑتی تھی۔ ہمیں ان کا یہ جملہ ”نظر نہ آنے والے کام“ بہت پسند آیا۔ ہمیں یعنی مجھے بھی اسے چھوٹے سوٹے کاموں سے سخت الرجی ہوتی ہے۔ اس ماہ کی کھانکھلا ہٹوں میں بندہ نواز نے ہمیں خوب ہنسایا۔ نظموں میں پروین شاکر کی نظم کچھ کچھ سمجھ میں آئی باقی تو ادھی ادھوری سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آئے الفاظوں کے، مگر اپنی طرف سے معنی گھڑنے کے علاوہ میں بڑوں سے بھی پوچھ لیتی ہوں۔ ”بدلہ“ کہانی پڑھی۔ سوری افسانہ بڑا مزے دار، آخری پیرا گراف نے دل کو چھو لیا۔ میں نے ایک لطیفہ ”وجہ پریشانی“ بھیجا آپ نے سمجھا اور لیس فرام کراچی کے نام سے شائع کر دیا وہ۔

ج۔ پیاری سمیرا! صرف وہی خطوط روی کی نذر ہوتے ہیں جو تاخیر سے موصول ہوتے ہیں۔ آپ کا خط یہ بروقت ملا۔ اس لیے شامل اشاعت ہے۔ احمد فراز اور خمار بارہ بنکوی کی غزلوں میں نہایت سادہ الفاظ تھے، پھر بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ حیرت کی بات ہے جبکہ خط سے تو ہمیں آپ

بہت ذہین اور پڑھی لکھی لگتی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ بڑوں سے پوچھ لیتی ہیں۔ سوال کرنے سے ہی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کا جھجھکایا ہوا لطیفہ کسی دوسرے نام سے شائع ہو گیا اس کے سہو کے لیے معذرت شمعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔

فبیحہ بابر نے اسلام آباد سے لکھا ہے

ناچاہتے ہوئے بھی پہلے ”ایک تھی مثال“ پڑھا۔ ٹی وی پر تو کہانی کا سارا ناس مار دیا ہے۔ صرف جلدی ختم کرنے کے چکر میں کتنے پہلو چھوڑ دیے ہیں۔ مکمل ناول میں حرا بتول کا ”ابر رحمت“ زیادہ اچھا لگا بلکہ بیسٹ لگا۔ ناولٹ میں ”سیاہ حاشیہ“ میں جو کچھ صائمہ اکرم دکھا رہی ہیں ہم سب بھی کچھ حد تک وہی کچھ پیروی کر رہے ہیں۔ گڈ صائمہ اصف کا ”تم کو چاہ کے“ اچھا ناپک تھا۔ کسی حد تک ایشال بے چاری ٹھیک بھی تھی۔ بھئی فرسٹ امپریشن بھی کسی چیز کا نام ہے نا۔ ہا ہا ہا۔ اس بار سارے افسانے اچھے تھے بلکہ ناولز پر نمبر لے گئے۔ مجھے سب سے زیادہ ایمل رضا کا ”سورج کے پار“ اور مصباح علی کا ”زباں ملے“ بہت ہی پسند آیا۔ مصباح نے بھی درست دکھایا۔ سوچوں کو کاغذ پر اتارنا کون سا گناہ ہے۔ سچ تو یہ ہے جو لوگ رسالوں کو برا کہتے ہیں ٹی وی پر سب سے آگے بیٹھ کر ناولز کے ڈرامے دیکھ رہے ہوتے ہیں داد کے ساتھ۔ شمعاع کا سلسلہ ”تم سے ناتا جوڑا“ واہ۔۔۔ بھئی واہ۔۔۔ جلے دل کے سارے پھپھولے وہ بھی مریج مسالہ لگا کر۔ سب ہی کو شغل مل گیا۔ ہونے چاہئیں ایسے پلیٹ فارم جہاں اپنی بھڑاس نکال لو۔ بلکہ دو چار گالیاں بھی نکال لو۔ حرا قریشی اور شہناز یوسف کو پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ بے چاریاں۔ انٹرویو اچھا لگا مگر اب سوال بدل لینے چاہئیں۔ ہاں سالانہ تبصرہ کسی نے خاص نہیں کیا۔

ج۔ پیاری فبیحہ ”تجھ سے ناتا“ دل کے پھپھولے پھوڑنے کا شغل نہیں بلکہ وہ لوگ جو دوسروں کی بیٹیوں کو

اپنے گھرا کر بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی گوشت پوست کی بنی جذبوں سے گندھی نازک دل لڑکیاں ہیں۔ انہیں آئینہ دکھانے کا سلسلہ ہے۔ شاید کہ کسی کا بھلا ہو جائے کوئی اپنی روش بدل لے۔ اس کے پیچھے صرف یہ مقصد کار فرما ہے۔

ٹی وی پر ”ایک تھی مثال“ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر ہمیں قارئین کے بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔



قارئین متوجہ ہوں!

- 1- ماہنامہ شمعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
- 2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس ممکن نہیں ہوگی۔
- 6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7- ماہنامہ شمعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شمعاع

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شمعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل خیر ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



والثیر

والثیر کا اصلی نام فرانسو "ماری ارویہ" ہے۔ 1694ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ رجسٹرار تھا اور ماں ایک شریف گھرانے کی خاتون تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ والثیر نے اپنی غصہ والی طبیعت اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی اور ذہانت ماں سے۔

والثیر کے پیدا ہونے میں اس کی ماں کو اتنی تکلیف ہوئی کہ وہ جانبر نہ ہو سکی۔ وہ خود بھی از حد کمزور تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دائی نے گود میں لیتے ہی کہہ دیا تھا۔ "بچہ ایک دن سے زیادہ نہ جیے گا۔" لیکن اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ وہ 86 سال تک زندہ رہا۔ البتہ بیماریوں اور جسمانی تکلیفوں میں ہمیشہ مبتلا رہا۔

والثیر کا ایک بھائی "ارمان" بھی تھا۔ جسے آزاد خیالی کے جرم میں کلیسا کے حکم سے قتل کر ڈالا گیا تھا۔ والثیر کا باپ دونوں لڑکوں کو "ناگل" کہا کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ والثیر بالکل ناکارہ نکلے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ

ایک دن یہی "ناکارہ" پورے یورپ میں سب سے بڑا اہل قلم تسلیم کیا جائے گا۔ والثیر کی ماں کے انتقال کے بعد اس کا خاندان پیرس چھوڑ کر دیہات میں جا بسا۔ یہاں ایک دولت مند فاحشہ نے والثیر کو دیکھا اور اس میں آثار ذہانت و نجابت پائے۔ چنانچہ مرنے سے پہلے وہ یہ نیک کام کر گئی کہ دو ہزار فرانک والثیر کو دے گئی۔ تاکہ اس روپیہ سے وہ کتابیں خرید سکے۔

والثیر کو ان کتابوں سے بڑا فائدہ حاصل ہوا اور وہ عمر بھر اس آبرو باختہ عورت کا احسان مند رہا۔ اس کے بعد وہ پادریوں کے پاس دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا۔ اس نے فن مناظرہ اور علم کلام سیکھا۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے باپ کی ناراضی کے باوجود اس نے شعر و ادب کا پیشہ منتخب کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس پیشے کے متعلق خود اس کی (والثیر) رائے یہ تھی۔

"شعر و ادب کا مشغلہ ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے بے فائدہ بننا ہو اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سر پر بوجھ بننا چاہتے ہوں۔ یہ ان لوگوں کا پیشہ ہے جو بھوکا مر جانا پسند کرتے ہیں۔"

1725ء میں والثیر نے اپنے والد سے علیحدہ ہو کر پیرس میں رہائش اختیار کی۔ اسی زمانہ میں لوئی چہارم نے انتقال کیا اور لوئی پانزدہم تخت نشین ہوا۔ بادشاہ کمسن تھا۔ ملک میں بد امنی پھیل گئی۔ والثیر شورش پسندوں میں داخل ہو گیا اور اپنی بے باکی اور جرات کی بدولت جلد ممتاز ہو گیا۔ اس کی جرات کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ نائب سلطنت نے کفایت شعاری کے خیال سے شاہی اصطبل کے آٹھے گھوڑے بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ اس پر والثیر نے ایک مضمون لکھا۔

"کاش! نائب سلطنت آٹھے گدھوں کی فروخت کا حکم بھی صادر کر دیتے جو حکومت کی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔"

حکام کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو سخت برہم ہوئے۔ ایک دن نائب سلطنت نے والثیر کو کسی تفریح گاہ میں دیکھا تو اس سے کہا۔

"میں تم سے شرط باندھتا ہوں کہ عنقریب تمہیں ایسی جگہ بھیجوں گا۔ جسے تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

والثیر نے تمسخر سے سوال کیا۔ "وہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟"

نائب نے کہا۔ "باشل کی تاریک کوٹھریاں۔" اس نغمہ نگار کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ والثیر کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ کاش! اس وقت کی حکومت کو معلوم ہوتا کہ ایک دن یہی

”باشل“ والٹیر کے پیدا کردہ انقلاب کے ہاتھوں منہدم ہو کر رہے گا۔ اس وقت تک والٹیر اپنے اصلی نام ”فرانسواری ارویہ“ سے مشہور تھا۔ قید ہونے کے بعد اس نے ایک فرضی نام اختیار کیا۔ جو ”والٹیر“ تھا۔ یہ فرضی نام اس قدر مشہور ہوا کہ آج کی تاریخ کے سوا کہیں بھی اس کا اصلی نام نہیں مل سکتا۔

قید خانے میں ہی اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”مہنریاڈ“ تصنیف کی۔ یہ دراصل ہنری چہارم کا قصہ تھا جو پہلے پروٹسٹنٹ ہوا تھا۔ پھر دوبارہ کیتھولک ہو گیا اور آخر کار قتل کیا گیا۔ قید خانے میں وہ گیارہ مہینے رہا۔ اسی اثناء میں اسے سخت جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔ لیکن بعد میں خود نائب سلطنت کو اس پر رحم آگیا اور اسے عزت کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

باشل سے نجات پانے کے بعد والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما ”ڈیویب“ لکھا۔ یہ ایک نہایت ہی دروازہ انگیز قصہ ہے۔ یہ ڈراما بہت مقبول ہوا اور مسلسل 45 دن پیرس کے تھیٹروں میں دکھایا گیا۔ اسی ڈرامے میں اس نے اپنے یہ انقلاب انگیز خیالات ظاہر کیے تھے۔

”ہمارے کاہن (حکام) ویسے نہیں ہیں جیسا سادہ لوح اور عوام انہیں سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی قوت پر یقین کرنا اور ایمان لانا چاہیے۔ ہر چیز خود اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہیے۔ درحقیقت ہماری عقل ہی ہمارا معبود ہمارا عبادت خانہ اور ہماری کاہن (حاکم) ہے۔“ اسی ڈرامے سے والٹیر نے چار ہزار فرانک حاصل کیے۔ والٹیر کے تمام دشمنوں خصوصاً ”کلیسائی حریفوں“ نے بیک زبان کہا۔

”شیطان اس کے اندر حلول کیے ہوئے ہے۔“ چنانچہ سینٹ بوف کا قول ہے کہ ”پلیس اس کے جسم میں ہے۔“

رومیسٹر کہتا ہے کہ ”یہ شخص جنم کی تمام قوتوں اور ہولناکیوں کا مالک تھا۔“ دراصل والٹیر اپنے وقت کا پورا آدمی تھا۔ یورپ کی اٹھارویں صدی کی ادبیات کی نئی تصویر ہم اس فلسفی شاعر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں اس کی جملہ بھلائیاں اور برائیاں دونوں عجیب ہو گئی ہیں۔ کبھی وہ نہایت سنجہ خلق بد اطوار، نفاس

اور بے اصول نظر آتا ہے۔ کبھی ازحد سیف، مہذب، سنجیدہ اور با اصول نظر آتا ہے۔ والٹیر ایسی ہی متناقض صفات و اخلاق کا مجموعہ ہے۔

والٹیر کافی محنتی تھا۔ کام سے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی چستی کے ثبوت میں خود اس کے اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

”سستی اور عدم ایک چیز ہے۔“ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

”تمام آدمی اچھے ہیں۔ سوائے ان کے جن کے پاس رہنے کے لیے کوئی کام نہیں۔“

داسیر اور روسوان ہی دونوں نے فرانس کی ختم ریزی کی اور وہ سب کچھ مہیا کیا۔ جس کی اس انقلاب میں ضرورت تھی۔ نپولین اعظم کہا کرتا تھا۔

”بوربون (فرانس کا شاہی خاندان) اپنا تخت و تاج محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اگر والٹیر اور روسو کا منہ بند کر دیتا۔“

ایک موقع پر والٹیر نے کہا۔ ”جب قوم سوچنے لگ جائے تو منزل مقصود تک پہنچنے سے اسے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔“

والٹیر کے ظہور کے ساتھ ہی فرانس نے سوچنا شروع کیا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔

نت کو بھی اپنے عہد میں اتنا اقتدار حاصل

نہیں ہوا۔ جتنا والٹیر نے حاصل کیا تھا۔ تمام جہاں اس کا مخالف تھا۔ کلیسا جو اس وقت کی سب سے بڑی قوت تھی۔ والٹیر کی دشمن تھی۔ حکومت خون کی پاسبان تھی۔ اسے قید کیا گیا۔ جلا وطن کیا گیا۔ اس کی کتابیں روکی گئیں۔ جلائی گئیں۔ حتیٰ کہ چھاپنے بیچنے اور پڑھنے والوں تک کو سزا دی گئی۔ مگر والٹیر کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا۔ وہ تمام دشمنوں پر غالب آیا۔ تمام مشکلات پر فتح مند ہوا۔

قدرت نے اس کی عمر میں برکت دی۔ چھیالیس سال زندہ رہا۔ قدیم نظام کی خرابیاں معلوم کیں اور ان کے خلاف جہاد کیا اور جب مرا تو فتح مند تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ”تاریخی شخصیتیں“ سے انتخاب) تابندہ گوہر قریشی۔ ملتان

READING
Section

دستک دستک دستک

شایین رشید

”آج کل ایک اسکرپٹ پہ کام کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ جلدی مکمل ہو جائے گا۔“
”آپ کو لکھنے کا بھی شوق ہے؟“
”لکھنے کا شوق ہی تو مجھے اس فیلڈ میں لے کر آیا۔ اصل میں تو میں ڈرامہ نویس ہی بننا چاہتی تھی اور چاہتی ہوں اور اس سے پہلے کہ میں اپنا شوق کسی پہ ظاہر کرتی یا کسی کو اپنا اسکرپٹ دکھاتی، مجھے ایک ایف ایم چینل سے آفر آئی اور میں نے اس آفر کو قبول کر لیا کہ اس کے ذریعے راسے ہموار ہوں گے۔“
”تو پھر راسے ہموار ہوئے؟“

”ہاں۔۔۔ مگر ڈرامہ تو رہ گیا دو سرے شعبوں میں کام ملتا رہا۔ میں آر جے بنی، پھروی جے بنی اور پھر ڈرامہ آرٹسٹ بن گئی۔“

”تو ڈرامہ نگار بھی بن جائیں گی ان شاء اللہ۔ کم کام کرتی ہیں آپ اسی لیے کہ شوق نہیں تھا؟“
”نہیں اب تو شوق ہو گیا ہے اور کم کام اس لیے کرتی ہوں کہ میں چاہتی ہوں کہ کم کام کروں اور اچھا کروں۔ کبھی کبھی آؤں، تاکہ لوگ میرا ڈرامہ شوق سے دیکھیں کہ نوین وقار ہے اس ڈرامے میں تو یقیناً سیریل اچھا ہو گا۔“

”آپ آر جے رہیں۔ وی جے رہیں اور ایک دو ڈراموں میں کام بھی کر چکی تھیں مگر عالمگیر شہرت ”ہم سفر“ نے دی۔ ایسا ہی ہے نا؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسا موڑ ضرور آتا ہے جو اسے یا تو بہت زیادہ بلند رتبہ دیتا ہے یا ناکامی دیتا ہے۔ ”ہم سفر“ بھی ایک ایسا ہی موڑ تھا میری زندگی میں۔ جس نے مجھے راتوں رات شہرت دی۔“
”اس سیریل میں آپ ”خود کشی“ کر لیتی ہیں۔“

حقیقت میں ایسی ناکامی ہوتی تو۔۔۔؟“



نوین وقار

”کیسی ہیں؟“
”اللہ کا شکر ہے۔“
”حال ہی میں آپ کا سیریل ”مول“ ختم ہوا ہے۔ بہت خوب۔۔۔ پر فارمنس دی آپ نے؟“
”شکریہ۔۔۔ اس سیریل کا فیڈ بیک بہت اچھا رہا۔“
”ایسی صبر کرنے والی اور قربانی دینے والی خواتین ہوتی ہیں؟“
”جی بالکل ہوتی ہیں۔ بہت سے گھرانوں میں اس کردار سے زیادہ صبر کرنے والی خواتین دیکھی ہیں۔“
”پڑھی لکھی خواتین میں اتنا صبر نہیں ہوتا قربانی تو غریب عورت کے حصے میں ہی آتی ہے؟“
”ایسا نہیں ہے قربانی عورت کے ہی حصے میں آتی ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر۔“
”مختصر۔۔۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

READING
Section

282 2016 فروری

فوائمن اور شہزادوں کے لئے اپنی مرضی کا پہلا نامہ

خاتونِ طاہرہ

فروری 2016ء کے شمارے کی ایک جھلک



● عمیرہ احمد کا ناول ”آبِ حیات“

● نمرہ احمد کا مکمل ناول ”نمل“

● ”عمیرہ ہادی اور وادی“ راشدہ رفعت کا مکمل ناول

● ”شہر آشوب“ آمنہ العزیز شہزاد

● کا مکمل ناول تکمیل کے مراحل میں

● آمنہ ریاض کا ناول ”دشتِ جنوں“

● سوراٹک، تمثیلہ زاہد، حریم فضل عباسی، سعدیہ اصغر،

فرزانہ کمرل، امیل رضا اور شازیہ جمال طارق

● کے افسانے

● ٹی وی فنکارہ ”ماہرہ خان“ سے ملاقات

● باتیں ”حریم فاروق“ سے

● ”کرن کرن روشنی“ احادیث کا سلسلہ

● نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے

● اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں

فروری 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

”انسان کو اس حد تک نہیں جانا چاہیے۔ میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ زندگی خدا کی نعمت اور بہت حسین چیز ہے۔ اسے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔“

”عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جس کردار سے شہرت ملتی ہے، پھر اسی طرح کے رول آفر ہونے لگتے ہیں۔ تو کیا آپ کے ساتھ ایسا ہوا؟“

”نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مجھے ہمیشہ اچھے کردار کی آفر ہوتی اور ہم سفر کے کردار کو بھی ہم مکمل طور پر منفی نہیں کہہ سکتے۔ یہ پوزیٹو نیگیٹو تھا۔ حقیقت سے قریب تھا۔ لڑکیاں جب محبت میں چوٹ کھاتی ہیں تو پھر وہ نیگیٹو ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر انتقام کا ایک جذبہ آ جاتا ہے۔“

”ابتداً آپ نے ایک کامیڈی سیریل سے کی۔ ”یعنی کی آئے گی بارات“ میں بھی آپ کا کردار حقیقت نسبتاً ”کامیڈی تھا“ تو آپ ایزی کہاں فیل کرتی ہیں۔ سنجیدہ کرداروں میں یا کامیڈی میں؟“

”کام اگر مزے کا ہو، میری مرضی کا ہو تو میں ہر جگہ ایزی فیل کرتی ہوں۔ مجھے کامیڈی رولز میں بھی مزہ آیا اور سنجیدہ میں بھی لیکن پھر بھی مجھے کامیڈی رول کرنے میں تھوڑی مشکل ہوتی۔ میرے نزدیک کامیڈی کرنا تھوڑا مشکل کام ہے۔“

”نہیں! آپ ابھی بھی ریڈیو پر پروگرام کرتی ہیں۔ لوگ سنتے ہیں آپ کو؟“

”بہت سنتے ہیں اور باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں اور دلچسپ بات بتاؤں کہ میں لائیو کالز بھی لیتی ہوں اور میرے پروگرام میں اکثر مشہور شخصیات بھی آتی ہیں تو اس وقت مجھے بہت شرمندگی ہوتی جب لوگ مہمانوں کو نظر انداز کر کے مجھ سے بات کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

”اچھا۔ ہو سکتا ہے انہیں وہ مہمان ہی پسند نہ ہوں اور وہ اس لیے آپ سے بات کرتے ہوں؟“

”ہاں۔ ایسا ہی ہو گا لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ میرے مہمانوں سے بھی باتیں کریں۔“

”جی مزاج کیسے ہیں؟“
”الگ ذہن۔۔۔“

”چپ رہو۔۔۔“ میں بہترین پرفارمنس دی آپ

نے۔ اب کس میں اپنی اداکاری سے چونکا رہی ہیں؟“
”ڈوڈرا سے ہیں۔ ایک حبیب حسین کا ہے جو کہ
آپ کے انٹرویو کے آنے تک آن ایر، وچکا، ہوگا اور
ایک کی ریکارڈنگ کے لیے لاہور میں ہوں۔ اب یہ
نہیں بتا کہ کب مکمل ہوگا۔“

”بھئی کراچی، بھئی لاہور، لائف ڈسٹرب نہیں
ہوتی؟“

”نہیں۔۔۔ کیوں ڈسٹرب ہوگی۔ اداکاری میرا جنون
ہے اور اس کے لیے مجھے کہیں بھی جانا پڑے میں
ضرور جاؤں گی۔“

”جنون تو آپ کو کلاسکل ڈانس کا بھی تھا؟“
”تھا کیا۔۔۔ ہے۔ مگر ہمارے ملک میں رقص کو کچھ
زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، ماحول سازگار
نہیں ہے، ورنہ میں نے تو باقاعدہ رقص سیکھا ہوا ہے
اور سیکھنے کے لیے میں انڈیا گئی تھی اور پنڈت پر جو
مہاراج سے میں نے رقص کی ٹریننگ حاصل کی
تھی۔“

”کام کے معاملے میں لاہور بہتر ہے یا کراچی؟“
”ایک زمانہ تھا جب سب کچھ لاہور میں تھا۔
فلمیں بھی لاہور میں بنتی تھیں اور ڈرامے بھی۔ اب
صورت حال بدل گئی ہے، اب کراچی میں بہت کام
ہو رہا ہے۔ فلمیں بھی کراچی میں ہی زیادہ تر بن رہی
ہیں اور ڈرامے تو خیر بن ہی کراچی میں رہے ہیں۔ تو
اب تو ایسا لگتا ہے جیسے پورا لاہور کراچی میں شفٹ
ہو گیا ہے۔ تو بس ہمیں تو کام کرنا ہے، خواہ وہ کراچی ہو
یا لاہور۔“

”فلم کی بات چلی ہے تو آپ کچھ کر رہی ہیں فلم کے
لیے۔۔۔؟“

”فی الحال تو کچھ نہیں کر رہی فلم کے لیے۔ مگر میرا



”لوگ میوزک سننا زیادہ پسند کرتے ہیں یا آپ کی
باتیں؟“

”دونوں۔۔۔ باتیں بھی اور میوزک بھی۔ میں اپنے
پروگرام میں ہر ٹاپک پر بات کرتی ہوں۔ شاید اس لیے
لوگ میرے پروگرام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔“
”آپ کے مزاج کی خولی؟“

”کہ میں بہت ہلکے کرنے والی لڑکی ہوں۔ ہنستی
بھی ہوں، ہنسباتی بھی ہوں اور موڈی بھی ہوں۔“
”کوئی دیرینہ خواہش؟“

”پوری دنیا کا سفر کرنا چاہتی ہوں۔ گھومنا چاہتی ہوں
اور زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔“
”طبیعت میں تیزی ہے یا سستی؟“

”سچ بتاؤں۔۔۔ میری طبیعت میں سستی ہے اور کبھی
کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میری یہ سستی میرے کام
میں رکاوٹ نہ بنے۔“
”ضدی ہیں؟“

”اپنے کام کے معاملے میں ضدی ہوں۔ جس کام
کا ارادہ کر لوں کر کے رہتی ہوں۔ اپنے کام سے بہت
مخلص ہوں۔“

ارادہ ضرور ہے۔ نہ صرف فلم میں کام کروں گی، بلکہ فلم پروڈیوس کرنے کا بھی۔ ان شاء اللہ جلد ہی آپ کو اچھی خبر ملے گی فلم کے حوالے سے۔ کیونکہ آج کل فلم کے لیے ماحول بھی سازگار ہے اور لوگ فلم دیکھنا بھی چاہتے ہیں۔“

”آج کل ڈراموں میں جو ماحول اور جو کہانیاں دکھائی جا رہی ہیں اس سے آپ مطمئن ہیں؟“

”بالکل نہیں۔۔۔ یہ سب کچھ ریٹنگ کے چکر میں ہو رہا ہے اور بہت غلط ہو رہا ہے۔ آج جو کچھ آپ دکھا رہے ہیں اس کا اثر فوری طور پر تو نہیں ہو گا لیکن دس پندرہ سال کے بعد اس کے غلط نتائج ہمارے سامنے آئیں گے اور پھر ہم بچھتا میں گے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ لڑکیاں غلط راہ پر جا رہی ہیں۔ گھر سے بھاگ رہی ہیں۔ بغیر شادی کے بچے ہو رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”تو کوئی کہنے والا نہیں ہے کیا؟“

”یہی تو۔۔۔ یہ کام پیسہ کا ہے وہ ان چیزوں پر نظر رکھے کہ ہمارا منڈیا ڈراموں کی صورت میں کیا دکھا رہا ہے۔ آزادی کی بھی ایک حد مقرر ہونی چاہیے۔ آپ برائیاں دکھا میں مگر ان کا انجام بھی برا دکھا میں۔ انجام ایک قسط کا اور برائی کئی اقساط پر۔۔۔ یہ غلط بات ہے۔“

”اب اس فیلڈ میں پیسہ بھی بہت ہے۔ پیسے کو ہر کوئی ترجیح دیتا ہے، آپ بھی دیتی ہوں گی؟“

”میں نے کبھی پیسے کو اہمیت نہیں دی اور نہ ہی میں پیسے کے لیے کام کرتی ہوں اور نہ مجھے شہرت کی طلب ہے۔ مجھے کام کا جنون ہے، یہ اس وقت کی بات ہے، جب میں اس فیلڈ میں نئی نئی آئی تھی میں نے اپنے کام سے اپنے آپ کو منوایا ہے اور اب اگر مجھے اچھا معاوضہ ملتا ہے تو اس میں میری محنت کا بہت عمل دخل ہے اور اب ہم ان فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی ایک ایک سال کی بکنگ ہوتی ہے۔“

”آج کل کی لڑکیوں کے لیے کیا کہیں گی؟“

”آج کل کی لڑکیوں کے لیے کہوں گی کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ انہیں اتنے سارے چینلز مل گئے اور وہ آج کے اس دور میں ہیں جہاں کام کی اور ٹیلنٹ کی ڈیمانڈ ہے۔ اچھا ماحول ہے اور اچھے کیرے وغیرہ ہیں۔“

”آج کی عورت کیا اتنی ہی مظلوم ہے جتنی دکھائی جاتی ہے؟“

”میرے خیال سے نہیں، کیونکہ اب عورت باشعور ہے۔ پڑھ رہی ہے اور محنت کر رہی ہے۔ ایسے ڈرامے ہمارے معاشرے کا اچھا تاثر پیش نہیں کرتے۔ دوسرے ممالک میں بھی یہ ڈرامے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟“

”میں مطمئن اس لیے ہوں کہ اپنی پسند کے کردار لیتی ہوں۔ ہر آفر کو قبول نہیں کرتی۔ میں نے اب تک جتنا کام کیا اس کے لیے میں شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ہر کام کو انجوائے کیا ہے۔“



سچی بات سچ



شہرہ بخاری

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

جنرل رانی کے نام سے مشہور ہونے والی اقلیم اختر رانی رشتے میں عدنان سمیع کی نانی تھیں۔ جنرل رانی کی بیٹی عروسہ عالم پچھلے کئی سال سے بھارت میں بھارتی پنجاب کے ایک سیاست دان ارمندر سنگھ کی دوست بن کر رہ رہی ہیں۔ بھارتی میڈیا میں تو یہ خبریں بھی چھپی تھیں کہ عروسہ اور ارمندر سنگھ شادی کر چکے ہیں لیکن ارمندر سنگھ کی بیوی نے اس کی تردید کی۔ یہ عروسہ عالم عدنان سمیع کی خالہ ہیں۔ بھانجے نے 2001ء اور خالہ نے 2004ء میں پاکستان چھوڑا لیکن اس وقت جنرل پرویز مشرف حکومت نے ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی، کیونکہ ان کے خاندان کے اہم اداروں سے مضبوط تعلق تھے۔ عدنان سمیع خان کے والد ارشد سمیع خان بھی پاکستان چھوڑ کر امریکہ چلے گئے اور ان کا انتقال ممبئی میں ہوا تھا۔ ارشد سمیع پاکستان ایر فورس میں اسکورڈن لیڈر تھے اور پینٹھ کی جنگ میں انہوں نے ستارہ جرات بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں میں سفیر رہے۔ 1989ء میں کینسر کا شکار ہوئے تو بے نظیر بھٹو نے ان کا علاج سرکاری خرچ پر برطانیہ میں کرایا۔

جعلی ویڈیو

2009ء میں سوات میں ایک خاتون کو کوڑے مارے جانے کی ایک ویڈیو منظر عام پر آئی جس نے ہمارے ملک کے ٹیلی وژن چینلز کو باگل کر دیا۔ تمام چینلز نے ہر تیس منٹ کے وقفے سے اسی ویڈیو کو بار بار چلایا اور دنوں ہفتوں اس پر پروگرام بھی کیے۔ مذاکرے ہوئے جس میں شریک کچھ لوگوں نے تو اسلام کی سزاؤں کو ظلم و جبر قرار دے دیا جبکہ سنجیدہ حلقے اس وقت بھی یہ کہہ رہے تھے کہ یہ ویڈیو جعلی ہے



سلسلہ

عدنان سمیع خان کو بار بار بھک میں مانگی جانے والی بھارتی شہریت بالآخر مل ہی گئی لیکن اب باقی ماندہ زندگی عدنان کو بھارت سے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ عدنان سمیع خان نے بھارتی شہریت ملنے پر وزیراعظم نریندر مووی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹوئٹر پر بے ہند کا نعرو بھی لگا دیا۔ عدنان کے اس نعرے کا جواب بھارتی صحافی شیکھر گیتا نے دیا۔

”جے ہند کا نعرو لگا کر ہمیں خوش کرنے کی کوشش نہ کرو، تم اپنے وطن کے نہ بن سکے، ہمارے کیا بنو گے؟“ (یعنی وہ کیا کہتے ہیں کہ دھوبلی... گھر... گھاٹ... سمجھے؟)

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ بھی خان کے دور ہیں



رہا ہے۔ میں تو ایک اسٹوڈنٹ ہوں مجھے جہاں سے کچھ سیکھنے کو ملے گا میں اس سے ضرور کچھ سیکھوں گی۔ میڈم سنگیتا کے پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں ہم بھی ان کے سینئر ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ (اور عمل کتنے پر کرتے ہیں؟) ان کے ساتھ دوستانہ ماحول میں کام ہو رہا ہے۔ (خیال رہے کام بھی ہو کہیں دوستی ہی نہ ہو۔)

ادھر ادھر سے

ستم ظریفی دیکھتے جو کام میں نے کیا جس کی وجہ سے مشرف اور اس کے بعض ساتھی زلت کے بجائے سر اٹھانے کے اور سیدھا چلنے کے قابل ہوئے، مشرف نے جو کچھ میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ سلوک کیا اسے احسان فراموشی ہی کہہ سکتے ہیں، اگر جناب بھٹو، غلام اسحاق خان، جنرل ضیاء الحق اور محترمہ بے نظیر صاحبہ اس پروگرام کو چلنے نہ دیتیں اور نواز شریف صاحب جرات اور حب الوطنی کا مظاہرہ نہ کرتے تو ہم سب مودی کے حکم اور خواہش کے مطابق گردنیں جھکا کر اور ادب سے اس کے سامنے مارچ کر رہے ہوتے۔

(ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔ سحر ہونے تک)

کیونکہ کوئی عورت اتنے کوڑے کھا کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ خیر۔ اب 13 جنوری 2016ء کو سپریم کورٹ نے از خود نوٹس کیس کا فیصلہ سنا دیا کہ یہ ویڈیو جعلی ہے۔ جعلی ویڈیو چلانے والے اکثر جھنڈاز نے یا تو اس خبر کو نشر ہی نہیں کیا یا پھر سرسری سی خبر چلا دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے ہی تو اس خبر کو لے کر اتنا شور مچایا کہ سوات آپریشن کی راہ ہموار ہو گئی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سے ساری دنیا میں پاکستان کا نام بدنام ہو گا۔ اس ویڈیو کے ذریعے سوات امن معاہدے کو تباہ و برباد کیا گیا۔ کئی نام نہاد اسلام دشمن این جی اوز مالا مال ہو گئیں۔ (بھئی انہوں نے اس ویڈیو کے حق میں ریلیاں اور پروگرام جو کیے۔) لیکن وہ کس منہ سے عوام کا سامنا کریں گے؟ (اس ملک پاکستان میں یہی آزادی تو ہے کہ کچھ بھی کر کے آپ جواب دہ نہیں ہیں۔) ایک دلچسپ بات یہ کہ اس جعلی ویڈیو کو تو بار بار چلایا گیا۔ اس جھوٹ پر دنوں ماتم ہوا لیکن سپریم کورٹ کے اس فیصلے کا چینل پر کوئی ذکر ہی نہیں۔ (صحافت اسی کو کہتے ہیں؟)

دوستی

نئے لوگوں نے جب فلم بنانے کی ٹھانی تو فلم کا وہ ٹریٹڈ جو فلم انڈسٹری کو تباہ کر چکا تھا بدل دیا اور روزِ حاضر کو سامنے رکھتے ہوئے فلمیں بننا شروع کر گئیں۔ اب وہ ڈائریکٹر جو لکیر کا فقیر بنے فلمیں بناتے تھے وہ بھی اس تبدیلی میں شامل ہونا شروع ہو گئے ہیں سنگیتا بھی ان

ہی لوگوں میں شامل ہیں۔ ان کی فلم ”تم ہی تو ہو“ میں متیرا کو کاسٹ کیا گیا ہے۔ سنگیتا اس بارے میں کہتی ہیں کہ میری فلم میں کوئی آئٹم سانگ نہیں ہے۔ متیرا اس فلم میں اہم کردار ادا کر رہی ہے فلم انڈسٹری کو متیرا کی صورت ایک باصلاحیت اداکارہ ملے گی۔ (ویسے متیرا کے ہوتے ہوئے آئٹم سانگ کی ضرورت بھی نہیں ہے) متیرا اس بارے میں کہتی ہیں کہ ”مجھے میڈم سنگیتا کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھنے کو مل



موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

چقندر کی سلاوا اور بج ڈرینگ کے ساتھ

ضروری اشیاء :

چقندر
کینو کارس
تیل
نمک
سفید مرچ
رائی
کینو کے چھلکے
پیاز گول کٹی ہوئی
ترکیب :

چقندر کو اپالیں جب ٹھنڈے ہو جائیں تو انہیں چھیل لیں۔ انہیں کیورز کی شکل میں کاٹیں پھر ان کو ٹھنڈا کر لیں۔ کینو کارس، تیل، نمک، مرچ، رائی (پسی ہوئی) اور کینو کے چھلکوں (پسے ہوئے) کو ایک پیالے میں خوب اچھی طرح سے ملا لیں اور یہاں تک کہ ایک جان ہو جائیں۔ اس ڈرینگ کو چقندر کے ٹکڑوں پر ڈالیں اور گول کٹی ہوئی پیاز کے ساتھ سجائیں۔
کشمیری دم آلو

اشیاء :

آلو
تیل
خشک کشمیری مرچیں
دہی
الپنچی
خشک اورک
سونف

تیل
لونگ
نمک
بھنا ہوا دھنیا
گرم مسالا
ترکیب :

آلوؤں کو چھیلیں اور انہیں نمکین پانی میں پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور درمیانی آنچ پر تیلیں یہاں تک کہ ان کا رنگ سنہرا بھورا ہو جائے، خشک کشمیری لال مرچوں کو پیش لیں۔

پسی کشمیری لال مرچ میں پسی ہوئی (الپنچی) خشک اوراک اور سونف کے ساتھ دہی کو پھینٹیں۔ ایک پیٹن میں تیل گرم کریں اور لونگ ڈال دیں۔ نصف کپ پانی اور نمک ڈال کر اسے ابال لیں۔ پھر اس میں دہی کا آمیزہ ڈالیں اور اسے ابال لیں۔ پھر تیلے ہوئے آلو ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ آلو گریوی کو جذب کر لیں اور تیل اوپر آجائے۔ مازہ بھنے اور پسے ہوئے زیرے اور پسے ہوئے گرم مسالے کے ساتھ سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

کھنڈوی

اشیاء :

سواکب
ایک انچ کا ٹکڑا
دودھ
ایک کپ
حسب ذائقہ
نصف چائے کا چمچ

بیس
اورک
ہری مرچیں
دہی
نمک
ہلدی

لال مرچ (پسی ہوئی) آدھا چائے کا چمچہ
تیل تلنے کے لیے
ترکیب :

مونگ کی دال کو صاف کر کے دھولیں۔ مونگ کی دال کو دو کپ پانی میں دو گھنٹے تک بھگو دیں۔ بھگوئی ہوئی مونگ دال کو زیرہ اور ہری مرچوں کے ساتھ پیسیں۔ دو کھانے کے چمچے کے برابر پانی میں نمک ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔

پنیر کو کش کر لیں اور کٹی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور ہرا دھنیا نمک اور پسی لال مرچ کے ساتھ ملائیں اور الگ رکھ لیں۔

توے یا فرائی پین میں تیل گرم کریں۔ آمیزے کو چمچے سے تھوڑا تھوڑا توے پر ڈالیں اور اسے پھیلا دیں

تاکہ یہ تقریباً "چار پانچ انچ کا پین کیک بن جائے تقریباً" آدھا منٹ تک فرائی کریں۔

دو کھانے کے چمچے کے برابر پنیر کو پہلے اوپر کے حصے پر چھڑکیں۔ آمیزہ کے اطراف میں بھی تھوڑا سا تیل چمچے سے ڈالیں اور درمیانی آنچ پر پندرہ سیکنڈ تک پکائیں۔

آمیزے کو پلٹ دیں اور دوسری جانب درمیانی آنچ پر دو منٹ تک پکے دیں۔ آمیزے کے اطراف میں چمچے سے تیل ڈالیں اور اسے پلٹ دیں۔ درمیانی تیز آنچ پر ایک منٹ مزید پکائیں۔ پودینے یا اپنی پسند کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

ایک کھانے کا چمچہ
نصف کپ
چار کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچہ
دو کھانے کے چمچے

لیموں کارس
پانی
تیل
رائی

کٹا ہوا ہرا دھنیا

ترکیب :

بیس چھان کر ایک برتن میں رکھ دیں۔ ایک تھالی کے الٹی جانب تھوڑی سی چکنائی لگا کر رکھ دیں۔

وہی میں پانی ملا کر لسی بنائیں۔ بیسن میں پسی اور ک اور ہری مرچیں نمک پسی ہلدی، لیموں کا رس اور لسی ملائیں۔ یہ احتیاط کریں کہ گٹھلیاں بننے نہ پائیں۔

اس آمیزے کو اتنا پکائیں کہ وہ گاڑھا ہو جائے برابر ہلاتے رہیں۔ پھر اس آمیزے کو گرم حالت میں چکنی کی گئی تھالی پر پتلا پتلا پھیلا دیں۔

جب ٹھنڈا ہو جائے تو نمک پارے کی شکل کے ٹکڑے کاٹیں۔

تیل گرم کر کے اس میں رائی ڈالیں۔ ٹکڑوں پر بگھار لگا دیں۔ کٹے ہوئے دھنیے کے پتوں کے ساتھ پیش کریں۔

مونگ کے چیلے

اشیاء :

مونگ دال (دھلی ہوئی)

ایک کپ
ایک چائے کا چمچہ

زیرہ

ہری مرچیں

نمک

دو عدد

حسب ذائقہ

سو گرام

آدھا کپ

آدھا کپ

دو کھانے کے چمچے

پنیر

کٹی ہوئی پیاز

کٹے ہوئے ٹماٹر

کٹا ہوا دھنیا



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔
صندل دو ڈپاؤڈر اور ملکانی مٹی میں عرق گلاب ملا کر
پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے پر صاف
پانی سے دھولیں۔ یہ ماسک آپ کے چہرے سے اضافی

چکنائی جذب کرے گا۔ گردوغبار اور میل صاف
کر کے ملائمت بخشنے گا۔

شہد اور جو (باریک پیس کر) ملا کر پیسٹ بنائیں۔
تقریباً "آدھے گھنٹے تک چہرے پر لگا رہنے دیں پھر سلاہ
پانی سے دھولیں۔

روغن بادام سے چہرے پر روزانہ ہلکے ہاتھ سے
ماساج کریں۔ اس سے جھریاں ختم ہوتی ہیں۔ جلد
ملائم ہوتی ہے اور رنگت بھی نکھرتی ہے۔

ایک چمچہ بیسن میں ایک چمچہ دہی ملا کر پیسٹ
بنائیں۔ ماساج کر کے تھوڑی دیر تک لگے رہنے
دیں۔ خشک ہونے پر سلاہ پانی سے دھولیں۔ (گرمیوں
میں صرف بیسن ہی کافی ہوگا) اس سے کیل مہاسے
ختم ہوتے ہیں۔

دودھ میں لیموں کا رس ملا کر روزانہ رات کو ماساج
کرنے سے جلد نرم و ملائم ہوتی ہے۔

دودھ میں تھوڑے سے بادام پیس کر اسکرپ
بنائیں۔ ہلکے ہاتھ سے ماساج کریں۔ پھر دھولیں۔

بھٹے ہوئے ہونٹوں پر بالائی کا ماساج کریں پھر ہلکا نیم
گرم گہڑا یا تولیہ ہونٹوں پر رکھ کر ہلکے ہلکے رگڑیں۔
اس سے ہونٹوں کی ساری مردہ کھال صاف ہو جائے گی
اور ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔

لیموں کے رس میں ذرا سی چینی گھول کر ہونٹوں پر
ماساج کریں۔ اس سے ہونٹ گلابی ہوتے ہیں۔

گلیسرین اور عرق گلاب کا خوب اچھی طرح ایڑیوں
پر ماساج کریں پھر موزے پہن لیں۔

نیم گرم پانی میں ایک چمچہ سیمپو ڈال کر پاؤں
ڈبوئیں۔ اس سے قبل کسی تیل سے ماساج کر لیں تو

زیادہ بہتر ہو جائے گا۔ پھر جھانویں سے ایڑیاں
رگڑیں۔ یہ عمل ہفتے میں کم از کم تین بار کریں۔

سردیوں میں جلد کی دیکھ
بھال ایک اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ جلد بہت زیادہ خشک
ہو کر پھٹنے لگتی ہے۔ چہرے کے ساتھ ساتھ پیروں اور
ایڑیوں کی جلد بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک
وجہ سردیوں میں پانی کا کم استعمال بھی ہے۔ بارہ سے
چودہ گلاس پانی ہر موسم میں ہمارے جسم کے لیے
ضروری ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جسم میں پانی کی
کمی دور کی جائے۔ اس کے علاوہ مختلف پھلوں کے
جوس بھی پیے جاسکتے ہیں۔ سردیوں میں منہ دھونے
کے بعد مونسچو انر کا استعمال ضرور کریں اور باہر
جاتے ہوئے سن بلاک لگانا نہ بھولیں۔ یہ نہ صرف
گرمی بلکہ سردی کی دھوپ سے بھی محفوظ رکھے گا۔
جلد کا خیال رکھنے کے لیے مہنگی کریموں اور لوشن کا
استعمال ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے آپ دہی
ٹوٹکے اور سبزی فروٹ سے بھی مدد لے سکتی ہیں
جیسے۔

سردیوں کی خاص سوغات گاجر جس کا نہ صرف حلوہ
بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا رس پینے کے ساتھ ساتھ
چہرے پر بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے رنگت نکھرتی
ہے۔

نماڑ کا رس چہرے کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس
سے بلیک ہیڈز بھی ختم ہو جاتے ہیں اور رنگت بھی
صاف ہو جاتی ہے۔

چہرے اور جسم کی خشکی کے لیے زیتون کے تیل کی
مالش کی جاسکتی ہے۔ زیتون کے تیل کے مستقل
استعمال سے جھریوں کی آمد مست رٹ جاتی ہے۔

عرق گلاب، لیمن جوس اور گلیسرین کا آمیزہ نہ
صرف چہرے بلکہ ہاتھ پاؤں کو بھی ملائم رکھتا ہے۔
آٹے میں دودھ اور لیمن جوس ملا کر لیپ کریں۔